
مارچ 2018
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ——— امتہ الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالد جیلانی

قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز



کہنی سُنی — مدیرہ — 14
کرن کرن روشنی — ادارہ — 15
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 272

آپ سے کیا پردہ

چھپے پھرتے سناٹے میں — انشا جی — 20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 270

شہرت سے

باتیں علی مرتضیٰ سے — شاہین رشید — 27

انٹرویو

نبیلہ ابر راجہ — شاہین رشید — 22

ناول

حاصل — نمرہ احمد — 214
دشتِ جنوں — آمنہ ریاض — 30

مکمل ناول

اقرار کا موسم — ایمل رضا — 70
سرخ گلابوں کا موسم — نایاب جیلانی — 144

ناولٹ

قسمت سے فرار — میمونہ صدف — 122
ست پھلاں لائی — نفیسہ سعید — 190

افسانے

سوداگر — سمیرا حمید — 59
لفظ جڑے لگتے ہیں — قانتہ رابعہ — 140
مٹھی میں جگنو — قرۃ العین سکندر — 110
باذوق — واعظہ زیدی — 67

نظمیں غزلیں

غزل — جگر مراد آبادی — 263
نظم — شازیہ مفتی — 263
غزل — نذیر قیصر — 264
غزل — عنبر رضاوی — 264



700 روپے
6000 روپے
7000 روپے

رنگا رنگ پھول

رنگارنگ سلسلہ — شگفتہ جاہ — 265
خبریں وبریں — واصفہ سہیل — 282

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 268

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 288

پکوان

موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 286
آپ کا باورچی خانہ — فردوس نصیب — 284

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 290

مارچ 2018
جلد 45 شمارہ 11
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کہی ان کہی

خواتین کا مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

تحریر ہو یا تقریر، جذبات و احساسات کی ترجمانی الفاظ کرتے ہیں۔ جب تک یہ لکھے یا بولے نہ جائیں، بے اثر ہوتے ہیں لیکن جب یہ تحریر ہو جائیں۔ زبان سے ادا ہو جائیں تو کمان سے نکلے تیر ہوتے ہیں۔ ان کو واپس لوٹانا ناممکن ہوتا ہے۔ پھر تردیدوں اور وضاحتوں سے بات نہیں بنتی۔ ایسے میں خاموشی زیادہ بہتر انتخاب ہوتی ہے۔

الفاظ کی روح سچائی اور صداقت ہوتی ہے۔ الفاظ میں جتنی سچائی ہوگی، وہ اتنا ہی دلوں میں گھر کریں گے۔ جھوٹ کو خواہ کتنے ہی خوبصورت الفاظ کے پیراہن میں پیش کیا جائے، وہ بے اثر ہوتا ہے۔ وقتی طور پر اگر کامیاب ہو بھی جائے تو سچائی ایک نہ ایک دن سامنے آکر رہتی ہے۔ ہمارے مذہب میں تو مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہمارے ہاں دونوں انفرادی اور اجتماعی سطح پر لفظوں کی حرمت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ہمارے چند الفاظ کس طرح کسی کے دل کو زخمی کر دیتے ہیں، کسی کے دامن کو داغ دار کر دیتے ہیں، کسی کے کردار کی دھجیاں بکھیر کر اس کی زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں، ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اجتماعی سطح پر تو یہ رجحان اور بھی شدت پکڑتا جا رہا ہے۔ جب سے میڈیا آزاد ہوا ہے اور چینلز کی تعداد بڑھی ہے۔ سب کو کھلی آزادی ہے۔ آپ کسی کے متعلق بڑی سے بڑی بات، سفید جھوٹ بنا کسی ثبوت اور تحقیق کے بول سکتے ہیں۔ اپنی ذاتی پسند ناپسند، حسد، جلن کی بنیاد پر کسی کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ پھر دوسری جانب سے بھی جوابی کارروائی ہوتی ہے۔ غیر مہذب اور نامناسب الفاظ کا استعمال ہوتا ہے، بے بنیاد الزامات لگائے جاتے ہیں۔

الفاظ کے انتخاب میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اس وقت جب ہم کسی اہم منصب یا اہم عہدے پر فائز ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت دی ہے تو اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ ہم اس صلاحیت کو مثبت طریقے سے استعمال کریں۔ اپنے الفاظ، اپنی تحریر سے سچ کی خوشبو کو پھیلایا جائے۔ امید کے چراغ روشن کیے جائیں۔

سالگرہ نمبر۔ سروے،

اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کے لیے تیاریاں جاری ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ سالگرہ نمبر ہر لحاظ سے منفرد اور خوبصورت ہو۔ مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں جگہ پا سکیں۔

سروے کے سوالات ہم پچھلے ماہ یعنی فروری کے شمارے میں دے چکے ہیں۔ ہماری جو قارئین سروے میں حصہ لینا چاہتی ہیں۔ ان سوالوں کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 10 مارچ تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- ایمل رضا کا مکمل ناول۔ اقرار کا موسم، ، نایاب جیلانی کا مکمل ناول۔ سرخ گلابوں پہ شبنم،
- میمونہ صدف اور نفیسہ سعید کے ناولٹ، ، آمنہ ریاض اور عزہ احمد کے ناول،
- سمیرا حمید، تانیہ ذوالعبر، واعظہ زیدی اور قرۃ العین سکندر کے افسانے،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ نبیلہ ابر راجہ سے ملاقات، ، معروف ٹی وی فنکار علی مرتضیٰ سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

خوش خبری

حضرت ابن شماسہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ قریب الوفات تھے۔ وہ کافی دیر تک روئے اور اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔ تو ان کا صاحبزادہ کہنے لگا۔

''ابا جان! کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں خوش خبری نہیں دی تھی؟ کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں خوش خبری نہیں دی تھی؟ (دو مرتبہ انہوں نے کہا۔) چنانچہ آپ نے اپنا چہرہ اس کی طرف پھیرا اور فرمایا:

''بے شک سب سے افضل (توشہ آخرت) جو ہم تیار کریں، وہ ہے اللہ کی توحید کی گواہی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ مجھ پر تین قسم کے حالات آئے (یعنی میں تین دوروں سے گزرا):

1- میں نے اپنا یہ حال دیکھا کہ مجھ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنے والا کوئی نہ تھا، اس وقت سب سے زیادہ محبوب بات میرے لیے یہی تھی کہ اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قابو پا لوں تو آپ کو قتل کر دوں۔ اگر میری موت اسی حالت میں آ جاتی تو یقیناً میں جہنمیوں میں سے ہوتا۔

2- پھر جب اللہ نے اسلام کی محبت میرے دل میں ڈال دی تو میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دایاں ہاتھ پھیلائیں تاکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے عمرو! کیا بات ہے؟''

میں نے کہا: ''میں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بتلاؤ،

تمہاری کیا شرط ہے؟''
میں نے کہا: ''یہ کہ میرے گناہ بخش دیے جائیں۔''
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام پہلے کے گناہوں کو گرادیتا (ختم کردیتا) ہے۔ اور ہجرت اپنے ماقبل کے گناہوں کو گرا دیتی ہے اور حج پہلے کے گناہوں کو گرا (مٹا) دیتا ہے؟
(چنانچہ اسلام قبول کرکے میں نے آپ کی بیعت کرلی، اس کے بعد یہ حال ہوگیا کہ) مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب اور میری نظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ جلیل القدر کوئی نہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلالت کا نقش اس طرح میرے دل میں تھا کہ میں نظر بھر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اور اگر مجھ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک بیان کرنے کو کہا جائے تو میں اسے بیان نہیں کرسکتا، اس لیے کہ میں نے کبھی نظر بھر کر آپ کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر میری موت اسی حال میں آجاتی تو یقیناً امید تھی کہ میں جنتیوں میں سے ہوتا۔

3-(اس کے بعد) پھر ہم کئی چیزوں کے ذمہ دار بنائے گئے (حکومتی مناصب پر فائز ہوئے) میں نہیں جانتا ان کے بارے میں میرا کیا حال ہوگا؟ پس جب میں فوت ہوجاؤں تو میرے جنازے کے ساتھ نہ تو کوئی نوحہ کرنے (رونے پیٹنے) والی عورت ہو اور نہ کوئی آگ۔ اور جب تم مجھے دفنا چکو تو مجھ پر تھوڑی تھوڑی کرکے مٹی ڈالنا، پھر میری قبر پر اتنی دیر کھڑے رہنا کہ جتنی دیر میں ایک اونٹ ذبح کرکے اس کا گوشت بانٹ دیا جائے تاکہ میں تم سے مانوس رہوں اور دیکھوں کہ اپنے رب کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو کیا جواب دیتا ہوں۔'' (مسلم)

فوائد ومسائل:

1- حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کے تین دور فرمائے ہیں: ایک اسلام سے قبل، دوسرا اسلام کے بعد اور تیسرا، جب وہ حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب (گورنری وغیرہ) پر فائز ہوئے۔ اس تیسرے دور کی گراں بار ذمہ داریوں سے وہ خوف زدہ تھے کہ ان میں کوتاہیوں کا ارتکاب نہ ہوگیا ہو جن کی وجہ سے بارگاہ الٰہی میں گرفت ہو۔

2- اسلام سے قبل کی شدید عداوت، قبول اسلام کے بعد شدید محبت میں تبدیل ہوگئی۔

3- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلالت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں نقش تھی۔

4- موت کے وقت تقصیر (کمی کوتاہی) کے خوف اور اللہ کی رحمت کی امید سے رونا جائز ہے۔

5- اللہ کی رحمت کی بشارت کے ذریعے سے قریب الموت شخص کی تسکین خاطر کا اہتمام کرنا چاہیے۔

6- اسلام، ماقبل کے سارے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، بشرطیکہ اس کے بعد صحیح معنوں میں اسلام وایمان کے تقاضوں کو بروئے کار لایا جائے۔ اسی طرح ہجرت، حج اور نماز وغیرہ سے انسان کے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

7- میت پر بین اور نوحہ کرنا منع ہے۔

8- موت سے پہلے وصیت کرنا مستحب ہے بالخصوص ان بدعات ورسومات کی بابت، جن کے ارتکاب کا اندیشہ ہو۔

9- قبر میں منکر نکیر فرشتوں کے سوال کرنے کا اثبات، جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

10- دفنانے کے بعد قبر پر دیر تک کھڑے رہنا اور میت کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرنا، سنت ہے، جیسا کہ دوسری روایات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے بارے میں حکم موجود ہے۔

11- دفنانے کے فوراً بعد قبر پر نیک لوگوں کی موجودگی سے صاحب قبر کو تسکین ہوتی ہے اور سوال جواب میں آسانی، اس لیے حدیث میں تاکید ہے کہ کھڑے ہوکر اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو۔

وصیت اور دعا کروانا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
''اور اس (بات) کی وصیت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی اور یعقوب نے بھی: اے بیٹو! بے شک اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند کرلیا ہے، پس جب تمہیں موت آئے تو اس حال میں آئے کہ تم مسلمان ہو۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب (علیہ السلام) کو موت آئی، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: ''تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟'' انہوں نے کہا۔ ''ہم آپ کے اور آپ کے باپ دادا، ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق (علیہ السلام) کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک ہے اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔''

فائدہ آیات:

اس میں موت کے وقت وصیت کرنے کا ذکر ہے جس سے امام نووی رحمتہ اللہ نے استدلال فرمایا ہے کہ سفر کے وقت بھی وصیت کرنا جائز ہے کیونکہ موت کا تو کوئی وقت مقرر ہی نہیں ہے اور سفر میں موت کا امکان حضر (اقامت) سے زیادہ ہوتا ہے، اس لیے سفر کے وقت بھی وصیت کردینا بہتر ہے۔

خطبہ

احادیث میں سے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کھڑے ہوکر خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد وثنا بیان کی، وعظ کیا اور نصیحت فرمائی، پھر فرمایا:

''اما بعد، اے لوگو! یقیناً میں بھی ایک انسان ہوں، قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا فرستادہ آجائے اور میں اس کا پیغام قبول کرلوں (کیونکہ اسے رد کرنا تو کسی انسان کے بس ہی میں نہیں۔) اور میں تمہارے، یعنی جنوں اور انسانوں کے اندر دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں: ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ چنانچہ تم اللہ کی کتاب کو پکڑو اور اسے مضبوطی سے تھام لو۔'' پھر آپ نے اللہ کی کتاب پر (عمل کرنے پر) ابھارا اور اس کے بارے میں ترغیب دی۔ پھر فرمایا:
''(اور دوسری چیز) میرے اہل بیت رضی اللہ عنہم ہیں۔ میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ یاد دلاتا ہوں (کہ ان پر کوئی زیادتی نہ کرنا۔)'' (مسلم)

فوائد ومسائل:

اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بشریت کے حوالے سے فرمایا کہ انسان کی طرح موت سے مجھے بھی مفر نہیں۔

اہل بیت کی فضیلت بھی اس سے ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ کہ ان کا معاملہ نہایت نازک ہے، اس لیے انسان کو ان کا تذکرہ کرتے وقت نہایت محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ ان کی گستاخی ہو نہ غلو۔

نصیحت

حضرت ابوسلیمان مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔
''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم ایک جیسی عمر کے نوجوان تھے۔ ہم بیس راتیں آپ کے پاس قیام پذیر رہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے مہربان اور نرم مزاج تھے، چنانچہ آپ کو خیال ہوا کہ ہم اپنے گھر والوں (کی ملاقات) کے مشتاق ہوگئے ہیں، چنانچہ آپ نے ہم سے پیچھے چھوڑے ہوئے ہمارے گھر والوں کی بابت پوچھا تو ہم نے آپ کو اس کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

(جسے سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''تم اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلے جاؤ اور وہیں رہو اور انہیں بھی (دین کی باتیں) سکھاؤ اور انہیں (بھلائی کا) حکم کرو اور فلاں نماز فلاں وقت میں پڑھو اور فلاں نماز فلاں وقت میں۔ جب نماز کا وقت ہوجائے تو تم میں سے ایک آدمی اذان کہے اور

تم میں سے جو بڑا ہو، وہ تمہیں نماز پڑھائے۔"
(بخاری و مسلم)

اور بخاری نے اپنی ایک روایت میں یہ اضافہ کیا ہے:

"اور اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔"

فوائد و مسائل:

1- اس میں ایک تو نوجوانوں کے علم دین حاصل کرنے کے شوق کا بیان ہے، جس کے لیے انہوں نے گھر بار چھوڑ کر سفر کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر سفر کرنے کی بھی ضرورت پیش آجائے تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔

2- استاد یا منتظم کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلباء کے حالات سے آگاہ رہے اور اس کے مطابق مناسب اقدامات اور ہدایات کا اہتمام کرے۔

3- جن کو دین کا علم اور شعور حاصل ہو جائے، ان کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو بھی دین سکھائیں جو دینی علوم اور دین سے بے بہرہ ہیں۔

4- پورے شوق اور جذبے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔

5- نمازوں کے لیے اذان کا اہتمام ضروری ہے۔

6- پیشوائی کی خصوصیات میں سب برابر ہوں تو پھر جو عمر میں بڑا ہو، وہ امامت کا حق دار ہے۔ پیشوائی کی خصوصیات میں سب سے پہلی خصوصیت قرآن کریم کو اچھے انداز سے پڑھنا اور دوسرے نمبر پر قرآن و حدیث کا علم ہے، یعنی جو سب سے اچھا قاری ہو، وہ امامت کا سب سے زیادہ حق دار ہے، اس کے بعد جو بڑا عالم ہو، وہ ہے۔

7- اذان اور امامت کی مذکورہ ہدایت کا مطلب ہے کہ ہر جگہ اور ہر وقت اذان دے کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔ مدرسہ ہو یا تجارتی مرکز، سفر ہو یا حضر۔

8- نماز میں مطلوب صرف رکوع، سجدہ کرنا ہی نہیں جیسا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ نماز ہی پڑھنی ہے جیسے پڑھ لی جائے۔ اس حدیث میں بتایا گیا کہ نماز اس طرح ادا کرنا ضروری ہے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی ہے۔

دعا کروانا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرے کی اجازت مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمادی اور فرمایا:

"اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعا میں ہمیں نہ بھولنا۔" یہ آپ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ اس کے بدلے میں مجھے ساری دنیا بھی مل جائے تو مجھے خوشی نہ ہو (یعنی یہ کلمہ ساری دنیا سے بڑھ کر مجھے عزیز ہے۔)

اور ایک روایت میں ہے: "اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعا میں ہمیں بھی شریک رکھنا۔"

(اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

الوداع

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آدمی سے فرماتے جب وہ کسی سفر کا ارادہ کرتا:

"میرے قریب ہوتا کہ میں تجھے الوداع کہوں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں الوداع فرمایا کرتے تھے۔ آپ فرماتے:

"میں تیرے دین، تیری امانت اور تیرے آخری اعمال کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ:

اس میں مسافر کو الوداع کہنے اور، مذکورہ دعائیہ کلمات کے ساتھ اس کے حق میں دعا کرنے کی

تعریف ہے۔ وہ دعا یہ ہے۔ استودع اللہ دینکم، واماناتکم، وخواتیم اعمالکم۔

زادِراہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا سفر کرنے کا ارادہ ہے، آپ مجھے زادِراہ عنایت فرمائیں۔" (یعنی میرے حق میں دعا فرمادیں۔) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ کے توشے سے آراستہ فرمائے۔"

اس نے کہا: "میرے لیے مزید دعا فرمائیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور تیرے گناہ معاف فرمادے۔"

اس نے کہا: "کچھ اور۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تو جہاں کہیں بھی ہو، اللہ تعالیٰ تیرے لیے بھلائی کو آسان کردے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔)

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ مسافر کے لیے بہترین زادِراہ اس کے لیے دعائے خیر ہے۔

استخارہ اور باہم مشورہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور (اہم) معاملے میں ان سے مشورہ کر۔"

(آل عمران۔159)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔" یعنی اس میں وہ ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔ (الشوریٰ۔38)

فائدہ آیات:

پہلی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے، اس میں آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کا حکم ہے اور دوسری آیت میں مسلمانوں کا طرز عمل یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے اپنے کام کرتے ہیں۔ ان دونوں آیتوں سے واضح ہے کہ ایک دوسرے سے مشورہ کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کو حقیر جاننا حرام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم سے استہزا نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے استہزا کریں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور اپنے (مومن بھائیوں) کو عیب مت لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام (رکھنا) اللہ کی حکم عدولی ہے۔ اور جو توبہ نہ کریں، پس وہی لوگ ظالم ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ہر اس شخص کے لیے خرابی ہے جو طعنہ زنی کرنے والا عیب جو اور چغل خور ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔"

ہتھیار اٹھانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے، وہ ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں۔ اور جو ہمیں دھوکا و فریب دے، وہ ہم میں سے نہیں۔" (مسلم)



پچھلے پہر کے سناٹے میں

انشا جی

پچھلے پہر کے سناٹے میں
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے
زور ہوا کا ٹوٹ چکا ہے
کھلے دریچے کی جالی سے
ننھی ننھی بوندیں چھن کر
سب کونوں میں پھیل گئی ہیں
اور مرے اشکوں سے
اُن کے ہاتھ کا تکیہ بھیگ گیا ہے
کتنی ظالم
کتنی گہری تاریکی ہے
کھلا دریچہ تھر تھر تھر کانپ رہا ہے
بھیگی مٹی سوندھی خوشبو چھوڑ رہی ہے
اودے بادل،
کالے انبر کی جھیلوں میں ڈوب گئے ہیں
کس کے رخساروں کی لرزش دیکھ رہا ہوں
کس کی زلفوں کی شکنوں سے کھیل رہا ہوں

چپکے چپکے لیٹے لیٹے سوچ رہا ہوں
پچھلے پہر کا سناٹا ہے
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

گھنے درختوں میں پُروا کی سیٹی گونجی
دود کشوں میں قیدی روحیں چیخ رہی ہیں
کونوں میں دبکے ہوئے جھینگر چلاتے ہیں
محرابوں سے بھوتوں کے سر ٹکراتے ہیں
قلعے کے اک بُرج کے اندر
ایک پری (شیلاٹ کی رانی)
خندق کے اَن دیکھے پانی کی گہرائی
اندیشے کے بالشتوں سے ماپ رہی ہے

ماضی کی ڈیوڑھی کی چلمن
کھلے دریچے کی جالی سے
چھن چھن آئیں
روپ کی جوت، حنا کی لالی، کل کی یادیں

سوندھی خوشبو، ٹھنڈی بوندیں
کل کے باسی آنسو جن سے
فردا کے بالیں کا پردا بھیگ رہا ہے

سحر زدہ محبوس حسینہ
سپنوں کے شیلاٹ کی رانی
آئینوں میں حسن شکستہ دیکھ رہی ہے
کتنے چہرے ٹوٹے ٹوٹے
پہچانے اَن پہچانے سے
آگے پیچھے، آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں
قلعے کے آسیب کی صورت
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

بچھڑے لوگو! پیارے لوگو!
چاہیں بھی تو نام تمہارے جان سکیں گے؟
کیسے مانیں تم کو ہمارے
جی لینے کی مر لینے کی

خوشی ہوئی، افسوس ہوا ہے
تم کیا جانو
کس کے ہاتھ کا تکیہ
کس کے گرم اشکوں سے بھیگ رہا ہے
کھلے دریچے کی جالی سے جھپٹی آنکھوں
اک لمحے کے کوندے میں تم
کن کن اجنبی چیزوں کو پہچان سکو گی
جیون کھیل میں ہارے لوگو
بچھڑے لوگو! پیارے لوگو
برکھا کی لمبی راتوں میں
کمرے کی خاموش فضا میں
پچھلے پہر کے سناٹے میں
روتے روتے جاگنے والے
ہم لوگوں کو سو لینے دو
اور سویرا ہو لینے دو





زرد زمانوں کا سویرا کی مصنفہ

نبیلہ ابر راجہ سے ملاقات

شاہین رشید

ہماری افسانہ نگار اور ناول نگار بہنیں ڈائجسٹ کے حوالے سے تو بہت نامور رہیں۔ اب ڈراما نگاری کے حوالے سے بھی بہت عزت و شہرت کما رہی ہیں اور جب سے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی رائٹرز ڈرامہ نگار بنی ہیں، ڈراموں کا معیار بہت بہتر ہو گیا ہے......اور بہترین ڈرامہ نگار خواتین میں ایک نام ''نبیلہ راجہ'' کا بھی ہے۔

''کیا حال ہیں آپ کے؟''

''جی الحمدللہ ٹھیک ٹھاک۔''

''یہ بتائیے کہ لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے۔ اور کیا کیا لکھا آپ نے؟''

''میں نے 1999ء میں ماہنامہ کرن سے لکھنے کا آغاز کیا۔ ناول، افسانے اور شارٹ اسٹوریز سب پہ قلم آزمائی کی لیکن زیادہ میں نے ناولز لکھے اور ان کی تعداد افسانوں سے زیادہ ہے۔''

''ڈراما لکھنے کی طرف کس نے راغب کیا آپ کو؟''

''یہ 2012ء کی بات ہے، جب میری رامس تنویر احمد سے فیس بک پہ بات ہوئی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ اپنے ناول کا ''ون لائن'' لکھ کر دیں مجھے اس پہ بہت اچھا ڈرامہ بن سکتا ہے۔ اس وقت رامس ''اے اینڈ بی'' میں کام کرتے تھے۔ ان کے کہنے پر میں نے اپنا پہلا سیریل ''میری دلاری'' کے نام سے لکھا یہ سیریل 2013ء میں ''جیو'' ٹی وی سے نشر ہوا، اور بہت پسند کیا گیا۔ اب تقریباً چار سال کے گیپ کے بعد دوبارہ ڈرامہ لکھا......اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں سعودی عرب آ چکی تھی۔ رابطہ سب سے تھا مگر لکھنے کا عمل رک گیا تھا......اور دوسری بار مجھے لکھنے کی طرف میری بہت ہی اچھی دوست صائمہ اکرم چوہدری نے راغب کیا۔ صائمہ نے کہا کہ تم سعودیہ میں ہو اور سارا دن گھر میں فارغ رہتی ہو تو اسکرپٹ رائٹنگ کی طرف سنجیدگی سے آجاؤ اور میں نے جواب لکھا وہ آپ سب دیکھ ہی رہے ہیں۔''

''نبیلہ! آپ خوش قسمت تھیں کہ آپ کو آفر آئی اور آپ ڈرامہ رائٹر بن گئیں۔ مگر لوگوں کو اس فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ مجھے مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، میں بھی مشکلات سے گزری ہوں۔ کیوں کہ اس فیلڈ میں نئے لوگوں یعنی نئے رائٹرز پہ کوئی بھی چینل یا پروڈکشن ہاؤس اتنی آسانی سے اعتماد نہیں کرتا۔ آپ کوئی اسٹوری کسی چینل یا پروڈکشن ہاؤس کے پاس بھیجتے ہیں تو سب سے پہلے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ کے پہلے کتنے ڈرامہ آن ایئر آ چکے ہیں۔ اس کے بعد آپ سے دن لاٹر بانگا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر وہ اپروو ہو جاتا ہے تو پھر لکھنے کا کام شروع ہوتا ہے جو بہت صبر آزما ہوتا ہے اور مشکل بھی۔''

''پہلا سیریل ''میری دلاری'' اور دوسرا ''زرد زمانوں کا سویرا'' اب تیسرا سیریل کب آ رہا ہے؟ اور پہلے دو کے ڈائریکٹر کون تھے؟''

''میرا پہلا ڈرامہ سیریل امین اقبال نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ میرا دوسرا سیریل شہود علوی کے ساتھ ہے اور ''میری دلاری'' میرے ناول سے ماخوذ تھا یہ سیریل بے حد پسند کیا گیا تھا۔ جہاں تک تیسرے پروجیکٹ کی بات ہے۔ تو جیو کے فیصل منظور کے ساتھ میں بچوں کے لیے لکھے گئے ایک ڈرامے پہ کام کر رہی ہوں۔ اس کی کہانی ایک بارہ سال کی بچی کے گرد گھومتی ہے۔ جو ماورائی طاقتوں کی مالک ہے۔ مگر اسے شروع میں اپنی اس طاقت کا علم نہیں ہوتا......اسی طرح میرا ایک اور پروجیکٹ ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ اس پہ کام ہو رہا ہے، آئی ڈریم کے ساتھ ایک ایشو بیڈ (Based) سیریل ہے اور مجھے اپنے اس پروجیکٹ سے بہت امیدیں وابستہ ہیں......اور ''ہم ٹی وی'' کے ساتھ کچھ پروجیکٹس ہیں جن پر مجھے کام کرنا ہے ان شاءاللہ۔''



''ڈرامہ رائٹرز کے حوالے سے آج کل بہت سی باتیں سننے میں آ رہی ہیں کہ آئیڈیاز اور اسکرپٹ چوری ہو جاتے ہیں، کیا آپ کے ساتھ ایسا ہوا؟''

''جی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ یہاں پاکستان میں کاپی رائٹ کا کوئی قانون نہیں ہے۔ جس کا دل چاہتا ہے۔ کسی کی کہانی اٹھا کے اپنے نام سے اسکرپٹ لکھ دیتا ہے۔ اور یہ کام بڑے پیمانے پہ ہو رہا ہے۔''

”یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رائٹر کا تو صرف نام ہوتا ہے، سارے کام تو ڈائریکٹر کرتا ہے وہ اپنی مرضی سے رائٹر سے کام کرواتا ہے۔ ایسا ہے کیا......؟“

”جی بالکل ایسا ہوتا ہے۔ آپ کے لکھے ہوئے اسکرپٹ کو بہت سارے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہت سارے لوگوں کے ہاتھوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ چینل کے کانٹینٹس کو اس پہ جو جو اعتراض ہوتے ہیں، وہ دور کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد اسکرپٹ ڈائریکٹر کے پاس جاتا ہے اور وہ اس میں اپنی مرضی سے تبدیلیاں کرتا ہے، رائٹر اور ڈائریکٹر کا اپنا اپنا وژن اور سوچنے کا انداز ہے۔ دونوں میں جہاں ٹکراؤ ہو جائے تو اسکرپٹ میں لازمی تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والا جو لکھتا ہے۔ ڈائریکٹر اسے جوں کا توں اسکرین پہ پیش نہیں کر سکتا، پھر ہر چینل کی اپنی پالیسی ہوتی ہے۔ لکھنے والے کو اس کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ ویسے میرے خیال سے ڈائریکٹر کبھی کبھی جو تبدیلیاں کرتا ہے وہ رائٹر کے لیے سودمند ہوتی ہیں۔ اس کا اسکرپٹ مزید نکھر جاتا ہے۔ یہ میرا اپنا تجربہ ہے۔“

”اتنی تبدیلیوں کے بعد آپ رائٹرز کی کہانیاں اوریجنل تو نہیں رہتی ہوں گی؟“

”بالکل ...... تبدیلی کے بعد وہ چیز نہیں رہتی، میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ بعض چیزیں جوں کی توں چینل پہ نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے کہانی کو تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ”مین“ آئیڈیا وہی رہتا ہے۔“

”رائٹرز یہ قربانی شاید اس لیے دیتے ہیں کہ پیسہ بھی مل رہا ہے اور نام بھی؟“

”آپ کی دونوں باتیں سچ ہیں، آج کل ڈرامہ رائٹر کو اچھے پیسے بھی مل رہے ہیں اور اچھی شہرت بھی، اس لیے رائٹرز ہنسی خوشی یہ قربانی دے دیتے ہیں۔“

”کیا رائٹرز کے لیے کوئی کیٹگری بھی بنائی گئی ہیں کہ یہ اے کلاس کے رائٹر ہیں اور یہ بی کلاس کے...... اور پے منٹ آپ کی مرضی کی ہوتی ہے یا ڈائریکٹر کی مرضی کی؟“

”جی ...... یہاں رائٹر کے لیے بھی گروپ بندی ہے۔ یہ اے کلاس رائٹر ہے۔ یہ بی کلاس اور یہ سی کلاس اور رائٹر کو اس کی کلاس کے حساب سے اعزازیہ ملتا ہے۔ کچھ رائٹرز کو ایک قسط کا ایک لاکھ ملتا ہے کچھ کو اس سے بھی زیادہ اور کچھ 20 ہزار روپے سیریل کی ایک قسط کا دے رہے ہیں۔ خاص طور پہ نئے لکھنے والوں کے ساتھ بہت ناانصافی ہوتی ہے۔“

”ڈرامے کی تیاری میں رائٹر کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔ رائٹر یا آپ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ لوکیشن اور فنکاروں کے انتخاب میں آپ کی رائے لی جاتی ہے کیا؟“

”دیکھا جائے تو رائٹر کی بنیادی اہمیت ہے۔ لیکن کسی کو بھی اس کی قدر نہیں ہے۔ چند بڑے ناموں کو چھوڑ کر کسی کی نہیں سنی جاتی ...... ہم لکھ دیتے ہیں۔ باقی کام ڈائریکٹر اور چینل کا ہوتا ہے کہ کس کردار کے لیے کس فنکار کو لینا ہے۔ کہاں شوٹ کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ...... رائٹر تو سادہ الفاظ میں دیہاڑی دار مزدور ہے۔“

”ڈرامے میں آپ رائٹرز خواتین و حضرات تمام مسائل بڑی آسانی سے حل کر کے آخری قسط میں پیش کر دیتے ہیں۔ کیا عام زندگی میں بھی آپ اپنے گھر کے مسائل اس طرح حل کر لیتی ہیں؟“

”ٹی وی ڈراموں میں جو کردار دکھائے جاتے ہیں، وہ لکھنے والے کے قلم کے نیچے سانس لے رہے ہوتے ہیں۔ اس کی مرضی ہے وہ اپنے کرداروں سے جو مرضی کروائے، چاہے تو رلاتا رہے۔ چاہے تو ہنساتا رہے، چاہے تو خوش گوار انجام سے دوچار کرے یا روتا دھوتا دکھائے ...... لیکن حقیقی زندگی میں ہم سب اللہ تعالیٰ کے تابع ہوتے ہیں۔ ہم گھر کے مسائل اور مشکلات شاید اس طرح حل نہ کر سکیں جیسے ہم ڈراموں اور فلموں میں دکھاتے ہیں۔ اس لیے کہ حقیقی زندگی میں لوگ اپنی مرضی سے ری ایکٹ کرتے ہیں، لڑتے جھگڑتے ہیں اور صلح کرتے ہیں ...... لیکن سچ بتاؤں، میرے میاں کہتے ہیں کہ اپنی کتابی دنیا سے باہر آ جاؤ اور اس کے مطابق یعنی حقیقی دنیا کے تقاضوں کے مطابق مسائل حل کرو۔“

”ڈراموں کی زندگی اور عام زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”بہت فرق ہے عام زندگی اور اسکرین پہ دکھائی جانے والی زندگی میں۔ لیکن کیا کیا جائے، میں اپنی خیالی دنیا میں رہتے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرتی ہوں۔“

”ڈراموں کے موضوعات میں بہت یکسانیت ہے۔ جس ٹاپک پہ ایک رائٹر لکھے گا، دوسرا اس پہ ضرور لکھے گا...... ایسا کیوں ہے؟“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ٹرینڈ سا بن جاتا ہے کہ فلاں رائٹر نے طلاق کے موضوع پہ لکھا تو ہٹ گیا اگر میں بھی لکھوں گی تو میرا سیریل بھی پسند کیا جائے گا۔ ریٹنگ اچھی آئے گی۔ دراصل ہم سب بھیڑ چال کا شکار ہیں۔ بعض اوقات چینل والے فرمائش کر کے بھی لکھواتے ہیں کہ بالکل فلاں چینل والے ٹاپک پہ ڈرامہ لکھ دیں۔ صرف لکھنے والے کو ہم قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔“

”ڈرامہ نگاری میں سب سے آسانی سے کیا لکھا جاتا ہے۔ سوپ، ٹیلی فلم یا ڈرامہ سیریل؟“

”سوپ ہو، ٹیلی فلم ہو، یا سیریل ...... کچھ بھی لکھنا آسان نہیں۔ تینوں پہ برابر کی محنت کرنی پڑتی ہے۔“

”آپ کے ڈراموں پہ تنقید تو ہوتی ہوگی ...... تو کس چیز پر زیادہ ہوتی ہے۔ فن کاروں کے انتخاب پہ، کہانی پر ...... کس بات پر؟“

”میرے دوسرے سیریل پہ جو تنقید ہو رہی ہے وہ کاسٹ کے حوالے سے ہے کہ جی آپ کے ڈرامے کا ہیرو سبکتگین کے کردار میں بالکل بھی سوٹ

نہیں کر رہا ہے اور کچھ کہہ رہے ہیں کہ ناول پہ آپ کو ڈراما بنانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لوگوں نے ناول پڑھ کر ذہن میں ہر کردار کا ہیولہ تراش لیا ہے۔ جب وہ ان کے تصور پر پورا نہیں اترا تو انہیں برا لگا...... لیکن میں اپنے ڈرامے ”زرد زمانوں کا سویرا“ میں کام کرنے والوں سے مطمئن ہوں۔ کیوں کہ سب نے بہت محنت کی ہے اس پہ...... اور شہود علوی نے بہت دل لگا کر اسے بنایا ہے۔ تنقید کرنے والوں سے میری گزارش ہے اسے دیکھیں۔ آگے بہت سارے ٹوئسٹ آئیں گے، جو بہت دل چسپ ہیں۔“

”گزرے زمانے میں ناظرین کی پسند کو مدنظر رکھ کر ڈرامے کو آگے بڑھایا جاتا تھا، اب پورا ڈراما ریکارڈ کر کے آن ایئر جاتا ہے، تو آپ کے خیال میں اب بہتر ہے یا پہلے بہتر تھا؟“

”پہلے کا دور اچھا تھا۔ جب دو اقساط کا فیڈ بیک ملنے کے بعد مزید قسطوں پہ کام ہوتا تھا۔ اس طرح دیکھنے والوں کے مشورے کے بعد آگے لکھا جاتا تھا۔ بہرحال گزرے دور کے اپنے تقاضے تھے۔“

”ڈراموں کے حوالے سے تو بہت باتیں ہوگئیں۔ اب آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟“

”میں راولپنڈی میں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی۔ امی ابو کا تعلق بھی راولپنڈی سے ہی ہے اور آباؤ اجداد ایران سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ابو زمین دار ہیں اور کچھ عرصہ انہوں نے ملک سے باہر بھی گزارا، چونکہ مٹی سے محبت خون میں رچی بسی تھی۔ اس لیے واپس آگئے۔ امی گریلو خاتون ہیں۔ ہم ”کیانی“ برادری سے ہیں۔ جنہیں عرف عام میں ”گکھڑ“ بھی کہا جاتا ہے۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ تین بہنیں اور پانچ بھائی، میں بہنوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔ مگر ویسے میرا نمبر ”چھٹا“ ہے اور تعلیمی قابلیت ”ایم ایس سی“ ان ماس کمیونیکیشن ......

اور یہ بھی بتاتی چلوں کہ میرا تعلق سخت گیر اور روایت پسند یا پابند فیملی سے ہے۔ جس کے لیے اپنے رسم و رواج کی اہمیت انسانوں سے زیادہ ہے۔“

”شادی؟“

”جی...... مجھے پڑھنے لکھنے کا ہمیشہ سے ہی شوق تھا، لیکن دوران تعلیم ہی میری شادی ہوگئی۔ جو صرف ڈیڑھ سال رہی۔ 2000ء میں میری شادی ہوئی اور 2001ء میں میرے پہلے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایئر فورس میں جاب کرتے تھے۔ ان سے میری ایک بیٹی ”ایمان“ ہے جو اس وقت صرف چار ماہ کی تھی اور اب وہ پری انجینئرنگ فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد میں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔ میری دوسری شادی میرے نصیب میں لکھی تھی۔ 2013ء میں میری دوسری شادی ہوئی۔ میرے میاں کی یہ پہلی شادی ہے اور ان کا نام کاشف محمود ہے۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایک چاہنے والا اور قدردان ہم سفر ملا ہے۔ ہماری ڈیڑھ سال کی ایک بیٹی بھی ہے۔ جس کا نام ”منال“ ہے جو سعودیہ میں پیدا ہوئی۔ میرا گھر، میرا شوہر اور میری بیٹیاں میرا سب کچھ ہیں۔“

”کس وقت لکھتی ہیں اور کیا دوسروں کے ڈرامے اور اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟“

”لکھنے کا سب سے بہترین وقت ”رات“ کا ہے، کیوں کہ مجھے اس وقت فرصت ملتی ہے اور ڈرامے اپنے بھی دیکھتی ہوں اور دوسروں کے بھی۔ ڈراما سیریل ”کیسی ہے تنہائی“ اور ”الف اللہ اور انسان“ بہت شوق سے دیکھا۔ ہماری ڈائجسٹ رائٹر بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔“

”فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟“

”فارغ اوقات اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ گزارتی ہوں۔ ہم سب مل کر باہر چلے جاتے ہیں یا ملک سے باہر جا کر کچھ وقت کے لیے دنیا سے کنارا کر لیتی ہوں۔“

تیزی سے اپنی جگہ بناتا فنکار

علی مرتضیٰ سے باتیں

شاہین رشید



1۔ اصلی نام؟

☆ علی مرتضیٰ

2۔ پیار کا نام؟

☆ علی

3۔ تاریخ پیدائش/شہر؟

☆ 2 اپریل 1992ء/کراچی

4۔ ستارہ؟

☆ حمل

5۔ بہن بھائی/آپ کا نمبر

☆ ہم 3 بھائی ہیں اور ایک بہن ہے۔ میرا نمبر پہلا ہے۔

6۔ تعلیمی قابلیت؟

☆ کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے، ایم بی اے کا طالب علم ہوں۔

7۔ کیا بننے کی خواہش ہے؟

☆ اپنے والد کی طرح آرمی آفیسر بننا چاہتا ہوں۔

8۔ شادی؟

☆ جی ابھی نہیں ہوئی۔ لیکن امی کا اصرار ہے کہ میں شادی کر لوں۔

9۔ شوبز میں آمد؟

☆ بچپن سے ہی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا اور ہر ہفتے کے دن ہم سب سینما جاتے تھے۔ تو بس شوق لے کر آیا اس فیلڈ میں۔

10۔ گھر میں کس نے سپورٹ کیا؟

☆ صرف امی نے۔

11۔ پہلا ڈرما/شہرت کس نے دی؟

☆ مڈل کلاس / ”تصیبوں جلی نرگس“ نے شہرت دی، یہ سوپ تھا اور پہلا ڈرامہ بھی سوپ ہی تھا۔

12۔ پہلی کمائی/کہاں خرچ کی؟

☆ ایک کمرشل کیا تھا جس کے پچیس ہزار ملے تھے۔ اور یہ ساری رقم میں نے اپنی امی کے ہاتھ میں دے دی تھی۔

13۔ شوبز میں کچھ برائی ہے یا بہت برائی ہے؟

☆ میری نظر میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔

14۔ چوبیس گھنٹوں میں کتنے گھنٹے سوتے ہیں؟

☆ عموماً چھ گھنٹے سوتا ہوں۔

15۔ اٹھتے ہی پہلا کام کیا کرنے کو دل

چاہتا ہے؟
☆واک کرنے کو دل چاہتا ہے۔
16۔دنیا میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟
☆یتیموں کے لیے تعلیم مفت کرنا چاہتا ہوں۔
17۔اچھی یا بری خبر گھر میں سب سے پہلے کسے سناتے ہیں؟
☆اپنی امی کو سناتا ہوں۔
18۔اپنے اندر کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟
☆میں دوسروں پر جلدی بھروسہ کرلیتا ہوں اور پھر نقصان اٹھاتا ہوں۔اسے ختم کرنا چاہتا ہے۔
19۔فخر کا کوئی لمحہ؟
☆جب میرے بھائی مصطفیٰ نے ریسلنگ اکیڈمی کھولی۔
20۔بچپن کی ایک بری عادت جواب بھی ہے۔
☆میں دیر تک واش روم میں وقت گزارتا ہوں۔یہ ایک بری عادت ہے۔(ہنستے ہوئے)
21۔طبیعت میں ضد ہے؟
☆نہیں جی بہت کوآپریٹو انسان ہوں۔
22۔زندگی کا ایک ہی دن ہو تو خدا سے کیا دعا مانگیں گے؟
☆"دنیا مجھے میرے نام سے مجھے ہمیشہ یاد رکھے۔
23۔کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟
☆بہت شدید غصہ آتا ہے۔
24۔سات دنوں میں پسندیدہ دن؟
☆ہفتہ اور اتوار۔
25۔پسندیدہ مہینہ؟
☆دسمبر
26۔لڑکیوں میں کیا بات پسند ہے؟
☆لڑکیاں تمیز اور تہذیب والی ہوں۔
27۔کس لمحے نے زندگی بدل دی؟
☆جب والد صاحب کا انتقال ہوا۔
28۔"وقت سے پہلے کیا ملا؟
☆"کچھ بھی نہیں ملا۔جدوجہد جاری ہے۔"
29۔غصہ کب آتا ہے/ردعمل؟
☆کوئی جھوٹ بولے تو بہت غصہ آتا ہے۔ میں خاموش ہوجاتا ہوں اور کسی قسم کے غصے کا اظہار نہیں کرتا۔
30۔آپ اکثر سوچتے ہیں؟
☆کہ میں اپنی فلم انڈسٹری کے لیے کچھ کروں۔
31۔آپ خوف زدہ ہوجاتے ہیں؟
☆ویسے خوف زدہ نہیں ہوتا۔مگر کبھی کبھی اس بات سے خوف زدہ ہوجاتا ہوں کہ کہیں میں زوال پذیر نہ ہوجاؤں۔
32۔بھوک میں آپ کی کیفیت؟
☆سر میں درد ہوجاتا ہے۔
33۔اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو کہاں جانا چاہیں گے؟
☆امریکا......گھومنا چاہتا ہوں۔
34۔اگر کسی امیر آدمی کا بلینک چیک ملے تو؟
☆"تو اتنی رقم لکھوں گا جس سے انٹرنیشنل لیول کا فلم اسٹوڈیو بنالوں۔"
35۔سیاست میں آئے تو کس کو فالو کریں گے؟
☆قائداعظم۔
36۔ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہیں گے؟
☆کہ مجھے فضول قسم کے ایس ایم ایس نہ کیا کریں۔
37۔جھوٹ کب بولتے ہیں؟
☆جب اپنے آپ کو بچانا ہو تو جھوٹ کا سہارا لیتا ہوں۔

38۔دوسروں کی تعریف میں کوئی دو جملے؟
☆دو نہیں بلکہ دل کھول کے تعریف کرتا ہوں۔
39۔شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟
☆اپنے کام سے مخلص ہونا،اور محنت سے کام کرنا۔
41۔کس کے ساتھ رومینٹک سین کرنا چاہیں گے؟
☆جس کے ساتھ میری کیمسٹری مل جائے۔
42۔خواہش ہے کہ ایسی فلم میں کام کروں جو؟
☆جو بہت اصلاحی ہو۔
43۔اپنی کمائی سے کتنے فیصد بچالیتے ہیں؟
☆صرف دس فیصد۔
44۔ایک محبت جو بھول نہیں سکتے؟
☆بچپن کی محبت۔
45۔کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟
☆گھر والوں کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی۔
46۔کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟
☆شوٹ پر۔
47۔گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
☆اپنے کمرے میں۔
48۔کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟
☆تو اس سے قرض مانگ لیں۔
49۔کبھی کلاس میں وقت گزارا؟
☆جی والد کے انتقال کے بعد۔
50۔بی پی ہائی ہوجاتا ہے جب؟
☆جب میری چھوٹی بہن میرے شوٹنگ کے وارڈروب کو ادھر ادھر کردیتی ہے۔
51۔آپ کے والٹ کی تلاشی لی جائے تو؟



☆تو اے ٹی ایم کارڈ،آئی ڈی کارڈ،اور میرا بزنس کارڈ نکلے گا۔
52۔نصیحت جو بری لگتی ہے؟
☆جو بلاوجہ کی جائے۔
53۔کھانے کی میز پر کیا ہونا ضروری ہے؟
☆کھانا ہونا ضروری ہے۔
54۔کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے،ڈائننگ ٹیبل،اپنے بیڈ پر یا چٹائی پر؟
☆ڈائننگ ٹیبل پر۔
55۔انٹرنیٹ،ایف بی اور انسٹاگرم میں آپ کی دل چسپی؟
☆لائف لائن ہے۔
56۔کوئی ایسی تاریخ جو بھول نہیں سکتے؟
☆پاپا کے انتقال کی تاریخ۔
57۔وقت کی پابندی کرتے ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 280

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آنٹے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ 'وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آنٹے کت اور وسامہ 'معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔
کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے 'رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں منو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔
باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنگ مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی



ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے مگر وہ انکار کر کے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی‘ ماموں‘ معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کر لیتا ہے۔ کچھ ردوکد کے بعد آئے کت بھی راضی ہو جاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو وادی کے تمام لوگ نیکی سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر ازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلا پیمانے پر کرواتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

مٹھو بھائی خوش نصیب کو خودکشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صباحت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شامیر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کر دیتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خودکشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شامیر کے جبران سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شامیر ایک زیر تعمیر بنگلے پر اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شامیر خوش نصیب کو کمرے میں بند کر کے چلا جاتا ہے۔

آئے کت کسی بھی آسیب کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے اس کے خیال میں کوئی انہیں ڈرا رہا ہے۔ مگر معاویہ اسے آسیب ہی سمجھتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے وہ نکاح کا انتظام کرتا ہے۔ مگر عین نکاح کے وقت آئے کت پراسرار انداز میں غائب ہو جاتی ہے۔

خوش نصیب تھوڑی کوشش کر کے باہر آجاتی ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں اسے شامیر پیری والے ملنگ بابا کے ساتھ شیطانی عملیات میں مصروف نظر آتا ہے‘ وہیں جبران ہوتا ہے جو اسے دیکھ لیتا ہے۔ جبران خوش نصیب کو وہاں سے نکال دیتا ہے فراڈیے شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ جبران درحقیقت معاویہ ہے جو کسی روح کی تلاش میں شامیر سے ٹکرایا ہے۔

شامیر کے دھمکانے پر خوش نصیب گھر میں کسی کو بھی اس کی اصلیت سے آگاہ نہیں کرتی۔ فضیلہ چچی صیام کا رشتہ شامیر اور کیف کے لیے منہا کا عندیہ دیتی ہیں۔ کیف گھر آتا ہے۔ جہاں خوش نصیب اسے شامیر کے بارے میں بتانا چاہتی ہے مگر صباحت تائی کے آنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

شامیر کو شیطان کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی پیشانی پہ تل ہو۔ خوش نصیب اس کے خیالات اور دھمکیاں سن کر بہت پریشان ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کیف کو بتاتی ہے مگر کیف اس بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

شامیر اور صیام کی منگنی ہوتی ہے تو خوش نصیب کیف کی پسند کا بتاتی ہے یوں صیام کی منگنی شامیر کے بجائے کیف سے ہو جاتی ہے۔ کیف خوب غصہ کرتا ہے مگر خوش نصیب نے یہ سب صیام کو بچانے کے لیے کیا ہے کیوں کہ اس کی پیشانی پہ بھی تل ہے۔

شامیر خوش نصیب کو نئے سرے سے دھمکاتا ہے۔ اپنے والدین کی شادی کی سالگرہ پر منفرا کی اتفاقی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے وہ اسے سب سے ملواتی ہے۔ سب اس کے حسن اور دولت سے متاثر ہوتے ہیں۔

بشام کے جنگل سے ایک عورت کی مسخ لاش ملتی ہے۔ اس کے جسم پر آئے کت کا عروسی جوڑا تھا مگر معاویہ نے اسے آئے کت ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کی تلاش کا ارادہ رکھتا تھا مگر اردشیر ازی نے اس سلسلے میں اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ آئے کت کے تمام اکاؤنٹس خالی پڑے تھے اور اس کا فریب کھل گیا تھا مگر ان سب باتوں کے باوجود معاویہ اس کی تلاش کا ہر ذریعہ اپناتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اس ناکامی نے اسے تلخ اور بدمزاج بنا دیا ہے۔

مونٹوک میں اس کی منفرا اور آدم سے ملاقات رہتی ہے۔

خوش نصیب عرفات ماموں کو شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ کیف کو اس کی باتوں پر ذرا یقین نہیں آتا۔ عرفات ماموں کو فالج ہو جاتا ہے۔

شامیر خوش نصیب کو دھمکاتا ہے کہ ماموں کو یہ سزا اس نے دی ہے اور آئندہ اس کے حمایتیوں کا وہ برا حشر کرے گا۔

ماہ نور شامیر سے محبت کا اعتراف کرتی ہے۔ خوش نصیب اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔

فضیلہ چچی خوش نصیب کو بہو نہیں بنانا چاہتیں مگر شفیق چچا کے سمجھانے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ خوش نصیب طوطے بھائی سے شادی پر معترض ہے مگر روشن امی اسے لفٹ نہیں کراتیں۔ خوش نصیب تمام سچائی عرفات ماموں کو بتاتی ہے انہیں یقین آجاتا ہے۔ کیف بھی سن لیتا ہے مگر شش و پنج کا شکار ہوتا ہے۔

صیام کیف کی بے رخی سے تنگ آکر شامیر کو خود سے شادی کرنے کا عندیہ دیتی ہے۔ شامیر انکار کر دیتا ہے۔

معاویہ منفرا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ بات اپنے والد کو بتاتا ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ شادی فلک بوس میں ہو۔ معاویہ راضی ہو جاتا ہے۔

خوش نصیب ایک شاپنگ مال میں معاویہ سے ٹکراتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کے حق میں اس کے گھر والوں کے سامنے گواہی دے، مگر معاویہ اس کی کسی بھی طرح کی مدد کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ خوش نصیب عرفات ماموں کے دوست مسٹر رضوی کے گھر پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی ہے۔ منفرا کو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسز رضوی کینیڈا شفٹ ہونے والی ہیں لہٰذا وہ منفرا سے خوش نصیب کی سفارش کرتی ہیں۔ منفرا خوش نصیب سے تمام حالات سن کر اس کی مدد کرنے کی خاطر اسے آیا رکھ لیتی ہے۔ معاویہ سخت مخالفت کرتا ہے، مگر بعد میں راضی ہو جاتا ہے۔ عرفات ماموں وفات پا جاتے ہیں۔ کیف ایک فیشن میگزین سے منسلک ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کی دوستی زرگل سے ہو جاتی ہے۔ ایک روز ان کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوتی ہے جس کی بھانجی کو ایک ڈبا پیر نے ہوس کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا تھا۔ وہ انصاف کے لیے ان کے دفتر آتا ہے۔ سب اسے پولیس کے پاس بھیج دیتے ہیں۔

کیف جن بھوتوں کو نہیں مانتا، مگر زرگل ان پر یقین رکھتا ہے۔ دونوں میں بحث چھڑ جاتی ہے اور زرگل کے چیلنج پر کیف، زرگل اور یاسر کے ساتھ قلعہ فلک بوس اور آیو کمتی کا سراغ لگانے بشام جاتا ہے، مگر راستے میں ایک گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔

حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی قلعہ فلک بوس پر فلم بنانے والی ٹیم کو لے جا رہی تھی۔ ان لوگوں کی موت سے زرگل خدشات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر کیف کے اصرار پر یہ لوگ بشام پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سلطان احمد نامی شخص کے گھر

پر قیام کرتے ہیں۔ کیف فلک بوس کی تصویریں بناتا ہے مگر ایک کھائی میں گرنے کی وجہ سے کیمرے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کبیر کا بیٹا پاشا اسے کھائی میں گرنے سے بچالیتا ہے۔

کبیر ان تینوں کو آیوشمتی کے آسیب سے ڈراتا ہے اور انہیں قلعے میں اندر داخل ہونے نہیں دیتا۔ کیف اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ صیام سے شادی سے انکار پر وہ گھر چھوڑ کر آجاتا ہے۔ خوش نصیب اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار کیف کو سمجھتی ہے۔ کیف اسلام آباد میں اس کی تعلیم وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے مگر اس سے ملتا نہیں البتہ عرفات ماموں سے رابطہ رکھتا ہے۔ عرفات ماموں کی وفات کے بعد اسے خوش نصیب کی کچھ خبر نہیں۔ وہ اسے ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

صابر تایا اور شفیق چچا میں کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔ وہ گھر کا بٹوارہ کرلیتے ہیں۔ کیف کے والد اسے معاف کردیتے ہیں۔

خوش نصیب کو معاویہ کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ وہ بچوں منفرا اور خوش نصیب کو لے کر قلعہ فلک بوس کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

کیف کو خبر ملتی ہے کہ قلعے کے اصل مالکان آرہے ہیں تو وہ ان کی آمد سے پہلے قلعے میں گھسنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ زرگل، کیف اور یاسر تینوں قلعے میں داخل ہوجاتے ہیں۔ جہاں یاسر ایک پراسرار وجود کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔

کبیر بابا ان تینوں کو فلک بوس میں دیکھ لیتا ہے اور ان کو سرزنش کرکے چھوڑ دیتا ہے۔ مگر معاویہ کے آنے پر معاویہ کو یہ بات بتادیتا ہے۔ قلعہ فلک بوس کی نگرانی مزید سخت کردی جاتی ہے۔ یاسر اور زرگل واپس چلے جاتے ہیں، مگر کیف، خوش نصیب کو دیکھ کر واپس نہیں جاتا۔ خوش نصیب اس کے ساتھ رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اور کیف کے خدشات پر بالآخر بتاتی ہے کہ معاویہ ہی وہ شخص ہے جو شامیر کی اصلیت اور خوش نصیب کی سچائی کا گواہ ہے۔

معاویہ کو وہاں اپنا بھائی اسامہ اور آئے کت کی بے حد یاد آتی ہے۔ وہ ایبٹ آباد کسی کام سے جاتا ہے۔ خراب موسم کی وجہ سے منفرا کا اس سے رابطہ نہیں ہوپاتا۔ وہ اس کے لیے فکرمند ہوتی ہے اور رات کو اس کی آنکھ کسی اجنبی بچے کے رونے کی آواز سے کھل جاتی ہے۔

پچیسویں قسط

باریک سی...... بالکل باریک سی آواز تھی رونے کی جس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔ اس نے بے بی کاٹ کی طرف دیکھا لیکن آواز وہاں سے نہیں آرہی تھی پھر بھی وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے کاٹ کی طرف آگئی تھی۔

کاٹ کے پاس خاموشی تھی لیکن رونے کی آواز ابھی بھی آرہی تھی۔

اس نے مدھم روشنی میں بچوں کو دیکھنے کی کوشش کی...... اور پھر اسے اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ کاٹ میں صرف ہدیٰ سوئی ہوئی تھی۔ وسامہ وہاں موجود نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ جو خوش نصیب کو منا لینے کے پکے ارادے کے ساتھ فلک بوس کی طرف گیا تھا، منہ لٹکائے سر درد کے ساتھ وادی میں واپس لوٹ آیا۔ مردہ دلی اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ سلمان احمد کے گھر کی طرف جارہا تھا۔ اس کا دماغ اس وقت ہزاروں سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خوش نصیب کو اپنی مدد کے لیے قائل تو کیا کرتا وہ تو اس کا دل اپنی جانب سے صاف بھی نہیں کرپایا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

کیف نے ہاتھ رگڑ کر انہیں گرم کرنے کی کوشش کی اور اپنی جیکٹ کا ہڈ سر پر اس طرح رکھ لیا کہ اس کا آدھا چہرہ بھی ہڈ میں چھپ گیا تھا۔ سر کو جھکائے کہ ٹھوڑی سینے کے ساتھ لگی تھی، وہ گہری سوچ میں گم اس وقت بشام کے بازار میں سے گزر رہا تھا۔

شام تیزی سے رات کی جانب گامزن تھی۔ ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ ٹھنڈک کا احساس بھی قدرے بڑھ گیا تھا۔ موسم کے آثار اچھے نہ تھے۔ کیف نے جھرجھری لی اور تیز تیز چلنے لگا۔

ایسا موسم سیاحوں کے لیے بہت کشش رکھتا ہے سو اس وقت بازار کی گہما گہمی عروج پر تھی۔

وہ اس وقت سلمان احمد کی دکان کے سامنے سے ہی گزر رہا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر دکان کی جانب دیکھا۔ سلمان احمد دکان بند کرنے کی تیاریوں میں تھا۔ اس نے لحہ بھر کو سوچا اور پھر تیزی سے دکان کو عبور کرگیا۔ وہ فی الحال کسی قسم کی گفتگو کے موڈ میں نہیں تھا اور سلمان احمد کے سوال جواب...... اللہ کی پناہ......

"کیف...... ارے بھائی سنو...... کیف......"

کیف نے چپکے سے نکل جانا چاہا تھا مگر ہائے ری قسمت...... سلمان احمد کی زبان کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی تیز تھیں تب ہی اس نے آدھا چہرہ چھپائے کیف کو بھی باآسانی پہچان لیا تھا اور ساتھ ہی آواز دے کر روک بھی لیا تھا۔

کیف ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی جانب مڑ گیا۔

"گھر جارہے ہو یار؟" سلمان احمد نے اس کے پاس آتے ہی پوچھا۔ "ذرا دو منٹ رک جاؤ یار...... میں بھی بس دکان بند کررہا ہوں۔ اکٹھے ہی واپس چلتے ہیں۔"

کیف کو اسی بات کا ڈر تھا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا...... اس نے مرے مرے انداز میں اثبات میں سرہلادیا۔

سلمان احمد نے شٹر گرائے اور تیزی سے تالے لگانے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ دونوں گھر کی طرف جارہے تھے۔

سلمان احمد نے بادلوں سے ڈھکے آسمان پر نظر دوڑائی۔ "لگتا ہے طوفان آئے گا......" اس کی آواز میں تشویش نمایاں تھی۔

کیف نے اس کی نظروں کا پیچھا کیا لیکن کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ سلمان نے کچھ دیر اس کے تبصرے کا انتظار کیا پھر مایوس ہوکر اگلی بات کا آغاز کردیا۔

"آپ ابھی کہاں سے آرہے تھے؟"

کیف نے ابرو اچکا کر اس سوال کا مقصد جانچنا چاہا پھر لاپروائی سے بولا۔ "کچھ خاص نہیں بس ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔"

"آپ نے بتایا نہیں، آپ کے جانے کا پلان کیوں بدل گیا؟"

"میرا جانے کا پلان پہلے بھی نہیں تھا۔ مگر یاسر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے جانا پڑ رہا تھا۔ زرگل نے اسے واپس لے جانے کی ذمہ داری اپنے سر لی تو میں یہاں ہی رک گیا کچھ دنوں کے لیے...... زرگل بھی واپس آئے گا یاسر کو پہنچا کر۔" کیف نے اسے مطمئن کرنے کے لیے تفصیلاً جواب دیا تھا۔

"ارے ہاں...... یاسر کی کوئی خیر خبر......؟ کیسی طبیعت ہے اس کی اب؟"

"ٹھیک ہے۔ بات ہوئی تھی میری صبح زرگل سے...... بتارہا تھا کہ اب بہتر ہے وہ پہلے سے......"

"ویسے ہوا کیا تھا اسے؟ جب آپ لوگ گھر سے نکلے تھے تب تو وہ ٹھیک ٹھاک تھا اور جب اتنی دیر سے واپس آئے تو اس کی حالت خراب تھی؟" سلمان احمد بغور کیف کی شکل دیکھ رہا تھا۔

کیف دل ہی دل میں کھٹک گیا۔ سلمان احمد کو دو تین دن بعد کیوں یاد آئی تھی یاسر کی......اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سلمان کو کیسے ٹالے۔

''ہاں وہ بس......شاید ٹھنڈ لگ گئی تھی اسے......'' کیف نے ٹالنا چاہا۔

''مگر وہ ڈرا ہوا لگ رہا تھا......اور تم لوگ بہت دیر سے گھر آئے تھے......'' سلمان احمد ابھی بھی اس کی شکل تک رہا تھا۔

کیف جھنجلا گیا......اتنے سوال تو گھر لیٹ آنے پر کبھی ابو نے بھی اس سے نہ کیے تھے جتنے سلمان احمد نے کر ڈالے تھے۔

''نہیں ڈرنا کیوں تھا اس نے......بخار کی وجہ سے بس نڈھال تھا تھوڑا......'' اس بار کیف نے ذرا ناک چڑھا کر جواب دیا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے جان چھڑانے والوں کا ہوتا ہے۔

''اور جہاں تک لیٹ ہونے کا تعلق ہے تو بس کچھ اچھی جگہیں مل گئی تھیں۔ تصویریں لیتے ہوئے وقت لگ گیا تھا۔''

سلمان احمد خاموش ہو گیا۔ یہ چند لمحے کی خاموشی کیف پر گراں گزری تھی۔ وہ سلمان احمد کے سوالوں سے چونک گیا تھا اور پھر دل میں چور بھی تھا کہ کہیں اسے فلک بوس والے واقعے کی خبر نہ ہو گئی ہو۔ وہ چاہ رہا تھا کہ کسی بھی طرح آج سلمان کو مطمئن کر ڈالے۔ سلمان احمد کی خاموشی اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ چند لمحے اس کے بولنے کا منتظر رہا اور پھر خود ہی پوچھ بیٹھا۔

''کیا بات ہے سلمان بھائی! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں مجھے......؟'' اس نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

''ہاں......پریشان تو میں ہوں۔''

کیف ٹھٹک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ ''ک......کیا......کیا ہوا ہے؟''

''تم لوگ فلک بوس کیا کرنے گئے تھے؟'' سلمان نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

کیف کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوٹا تھا وہ چند لمحے کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔

''کبیر خان میرے پاس آیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ تم لوگ چوری کی نیت سے فلک بوس میں داخل ہوئے تھے۔''

''کیا......؟'' کیف ہکا بکا رہ گیا اس الزام پر......زرگل کی مذاق میں کہی ہوئی بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔

''خیر، مجھے اس کی بات پر کچھ خاص یقین نہیں آیا۔ وہ ویسے بھی آدھا پاگل ہے اس کی بات پر یقین کون کرے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم لوگوں نے یہ حرکت کیوں کی ہے......اور اگر تم لوگوں نے ایسا نہیں کیا تو کبیر خان کو تم لوگوں سے کیا مسئلہ ہے جو وہ مجھے تمہیں گھر سے نکالنے کا کہہ کر گیا ہے۔''

ایک کے بعد ایک دھماکے کر رہا تھا سلمان احمد......کیف نے دل ہی دل میں کچھ حساب کتاب کیا اور پھر ایک نئی کہانی سنانے کو تیار ہو گیا۔

''سلمان بھائی! ہم وہاں گئے ضرور تھے لیکن چوری کی نیت سے نہیں۔ ہم نے کبیر خان سے اجازت مانگی تھی کہ ہمیں فلک بوس کی کچھ تصویریں لینے دے۔ اس نے ہماری بات نہیں مانی۔ اور تو اور یاسر پر حملہ بھی کیا۔ ہم لوگوں نے بس شرارت میں یہ شرط لگائی تھی کہ فلک بوس میں ایک بار داخل ضرور ہونا ہے۔ غلطی ہماری ہے۔ لیکن چوری کا تو وہ بابا جی الزام لگا کر گئے ہیں۔'' کیف نے بچوں کی طرح منہ بسور لیا۔

''اور یاسر کو کیا ہوا تھا؟'' سلمان احمد کی آواز میں تجسس نمایاں تھا۔ ''کبیر خان کہتا ہے اس پر آئو شمتی نے حملہ کیا تھا؟''

''ارے نہیں یار......اس کا پاؤں سلپ ہوا تھا۔ گرنے سے چوٹ آئی۔ وہ ذرا نازک مزاج بندہ ہے۔ اتنی سی تکلیف سے بیمار پڑ گیا۔'' کیف نے سر جھٹک کر کہا۔

''مگر یار! حرکت تو تم لوگوں نے غلط کی ہے۔ شکر کرو اس بدروح نے تمہیں وہاں سے نکلنے دیا۔ اور کیا معلوم کبیر کی بات ہی سچ ہو۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔'' سلمان نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔

''جی میں خود شرمندہ ہوں؟ میں ان بابا جی سے معافی مانگنے گیا تھا مگر انہوں نے بات ہی نہیں سنی......'' کیف نے پورے اعتماد سے جھوٹ بولا تھا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنا ناراض ہو جائیں گے کہ آپ تک جھوٹی شکایت لے کر آ جائیں گے۔''

''چلو کوئی بات نہیں......مگر تم احتیاط کرنا اب......دوبارہ ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''جی جی بالکل......کیف نے سعادت مندی سے سر ہلایا تھا۔

باتوں باتوں میں وہ دونوں گھر کے نزدیک پہنچ گئے تھے جب ہی وہ دونوں چونک کر رک گئے تھے۔ سلمان احمد کا بیٹا بھاگتا ہوا ان دونوں کی طرف آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ باپ کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے بچے کی طرف بڑھے تھے۔

''کیا بات ہے علی......کیا ہوا ہے؟'' سلمان نے پریشانی سے پوچھا۔

''بابا! گھر میں آگ لگی ہے۔ جلدی چلو۔''

پھولی سانسوں کے ساتھ اس بچے نے جو خبر سنائی تھی وہ سلمان احمد کے سر پر پہاڑ بن کر ٹوٹی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ تینوں بھاگتے ہوئے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

لمحہ بھر میں اس کا دل بدترین خدشات سے بھر گیا تھا۔

وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی دیوار پر لگے سوئچ بورڈ کی طرف گئی تھی اور تیزی سے لائٹ جلائی تھی۔ اسی تیزی سے واپس آ کر اس نے دوبارہ کاٹ میں دیکھا تھا۔

شاید......شاید یہ صرف غلط فہمی ہو لیکن اس کے بدترین خدشات سچ ثابت ہوئے تھے۔ وسامہ واقعی میں وہاں نہیں تھا۔ اسے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''خوش نصیب......خوش نصیب......'' اس نے چیخ چیخ کر پکارا تھا۔

خوش نصیب تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ منفرا کو کیا ہوا ہے۔ وہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ اور تیزی سے کاٹ کے آس پاس کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ خوش نصیب جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی اور اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

''منفرا......کیا ہوا ہے؟'' اس نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''خوش نصیب......خوش نصیب......میرا بچہ؟ میرا وسامہ کہاں ہے؟'' رونے کی شدت سے اس کی آواز بھی پوری طرح حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔

خوش نصیب حیرت سے اسے دیکھنے لگی اور پھر اسے چھوڑ کر تیزی سے کاٹ میں دیکھا تھا۔ وہاں صرف ہدیٰ موجود تھی۔

''منفرا......منفرا......چپ کریں......چپ کر جائیں......ہم ڈھونڈتے ہیں......ڈھونڈتے ہیں وسامہ کو......'' اس نے منفرا کو ساتھ لگاتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں تسلی دی تھی۔

اندر سے وہ خود بھی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ تین چار سال کا بچہ خود سے کہاں جا سکتا ہے۔

تو پھر...... اس کا پہلا دھیان جانے کیوں آیو گشتی والی بات کی جانب چلا گیا تھا۔

''خوش نصیب...... وہ...... وہ رو رہا تھا...... میں نے...... میں نے آواز سنی تھی ابھی......'' منفرا نے اسے بازوؤں سے تھامتے ہوئے کہا تھا۔

''منفرا! آپ چپ کریں...... رونا بند کریں...... وہ رو رہا ہے تو اس کی آواز آئے گی۔'' خوش نصیب نے منفرا کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

منفرا کی آواز بند ہوئی تو خوش نصیب کو بیچ میں ہلکی سی رونے کی آواز سنائی دی تھی۔ ذرا سا غور کرنے پر معلوم ہوگیا تھا کہ آواز کمرے کے باہر سے آرہی تھی۔

''باہر......'' خوش نصیب نے تھوک نگل کر کہا تھا۔ ''ہمیں اسے ڈھونڈنا ہوگا۔'' اپنے خوف کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا تھا۔

خوش نصیب نے تیزی سے مڑ کر ہدیٰ کو بازوؤں میں اٹھایا اور باہر کی جانب بڑھی۔ منفرا ساتھ تھی۔

پھر وہ دونوں آواز کے تعاقب میں آگے بڑھی تھیں جو لمحہ بالمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ وسامہ کی آواز کا مرکز ابھی دوسری منزل تھی۔ خوش نصیب اور منفرا لمحہ بھر کو ٹھٹکی تھیں اور پھر تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے اوپر آگئی تھیں۔

''منفرا! آپ دائیں طرف جائیں...... میں دوسری طرف دیکھتی ہوں۔'' خوش نصیب نے تیزی سے بائیں جانب مڑتے ہوئے کہا تھا۔

پورے فلک بوس میں اس وقت اگر کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ ننھے وسامہ کے رونے اور خوش نصیب اور منفرا کے تیز قدموں کی آوازیں تھیں۔

منفرا تیزی سے دائیں بائیں دیکھتی آگے بڑھتی جاتی تھی۔ ننگے پاؤں کے ساتھ وہ جتنی رفتار سے چل سکتی تھی چل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ وہ آواز کا تعاقب کرتی کتنی ہی راہداریوں سے مڑ گئی تھی۔

وہ یک دم ٹھٹک کر رکی تھی۔

اس وقت وہ ایک ایسی راہداری میں موجود تھی جس کے بائیں سمت میں جھروکے بنے تھے۔ اور جن سے فلک بوس کا درمیانی حصہ جو کہ ایک بڑے سے ہال پر مبنی تھا، دکھائی دیتا تھا۔ اس ہال میں سے کئی دروازے نکلتے تھے اور ایسے ہی ایک دروازے کے سامنے ایک چادر میں لپٹا ہوا وسامہ زمین پر پڑا تھا۔

منفرا چند لمحے پھٹی پھٹی نگاہوں سے وسامہ کو دیکھتی رہی تھی۔ جب اسے اپنی آنکھوں پر یقین آیا تھا تو وہ چیخ چیخ کر خوش نصیب کو آوازیں دینے لگی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اس ہال میں جانے کا راستہ تلاش کرنا شروع کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں خوش نصیب بھی اس کے پاس پہنچ گئی اور اس کے ساتھ تلاش میں شامل ہوگئی تھی۔

اگلے پانچ منٹ میں وہ ہال میں پہنچ چکی تھیں۔

وسامہ کے رونے کی آواز اب سسکیوں میں بدل چکی تھی۔ وہ رو رو کر تھک چکا تھا اور اس کی آواز بھی بیٹھ گئی تھی۔

منفرا نے بھاگ کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور وسامہ کو پیار کر رہی تھی۔

''کمرے میں چلو......'' روتے ہوئے، وحشت زدہ سے لہجے میں اس نے خوش نصیب کہا تھا۔

''منفرا! یہ کمرہ...... چیک کر لینا چاہیے۔'' خوش نصیب خوف زدہ تھی لیکن اس کے حواس برقرار تھے۔

''نہیں...... بس واپس چلو۔''

''منفرا! مجھے لگتا ہے کہ کوئی گھر میں گھسا ہوا ہے۔'' خوش نصیب نے اسے احساس دلانا چاہا تھا۔

''اگر ایسا ہے بھی تو تم اور میں اکیلے کیا کر لیں گے...... چلو یہاں سے پلیز......'' منفرا نے جھنجلا کر کہا۔

خوش نصیب نے آگے بڑھ کر چیک کیا، اس دروازے میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے تیزی سے چابی گھمائی اور دروازہ لاک کر دیا۔ دونوں میں ہی فی الحال اتنی سکت نہیں تھی کہ باہر سے کبیر خان کو بلا لیتیں۔ ویسے بھی ایک بوڑھا آدمی ان کی کیا حفاظت کر سکتا تھا۔ صبح کا انتظار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

کمرے میں آکر منفرا وسامہ کو سینے سے لگائے لگائے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ اس میں کھڑے رہنے کی مزید سکت نہیں تھی۔ کچھ ایسا ہی حال خوش نصیب کا بھی تھا۔ اس نے کانپتی ٹانگوں کے ساتھ کمرہ لاک کیا تھا اور جب اسے لگا کہ وہ گر جائے گی تو وہ وہاں قالین پر ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ دونوں کے پاس ہی کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

جو کچھ ہوا تھا، اسے عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ایک چھوٹا سا بچہ خود سے تو نہیں جا سکتا تھا اتنی دور تو پھر...

اس پھر سے آگے ان دونوں کا ہی ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔

''خوش نصیب! تم صبح ہی کیف کو یہاں بلا لو......'' منفرا نے فیصلہ کر لیا تھا۔ ''شاید وہ ہماری مدد کر سکے واپس جانے میں......''

☆☆☆

وہ دونوں بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی گھر کے آگے لوگوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ شور اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ فائر بریگیڈ کا انتظام تو بشام میں موجود نہ تھا سو لوگ اپنی مدد آپ کے تحت آگ بجھانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

وہ دونوں بھاگتے ہوئے گھر کے سامنے آئے تھے۔ لوگ گھر کے اندر تک پہنچے ہوئے تھے۔ دھواں اٹھ رہا تھا گھر میں سے...... مگر آگ نظر نہیں آرہی تھی۔ وقت ضائع کیے بغیر وہ لوگ اندر داخل ہوگئے تھے۔ آگ گھر کی نچلی منزل پر، کچن میں لگی تھی۔ چار پانچ لڑکے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر آگ قابو میں نہ آرہی تھی۔

سلمان احمد کی بیوی اور بچوں کو وہ لوگ پہلے ہی گھر سے باہر نکال چکے تھے۔

کیف اور سلمان بھی ان کے ساتھ آگ بجھانے میں مصروف ہوگئے تھے۔ کیونکہ گھر کے اندر پانی کا کنکشن کچن میں ہی موجود تھا اور کچن کے اندر جانا ممکن نہ تھا سو پانی باہر سے لانا پڑ رہا تھا۔

وہی کام جو دس پندرہ منٹ میں مکمل ہو جانا چاہیے تھا۔ پانی کی عدم دستیابی کے باعث تقریباً آدھے گھنٹے میں بڑی مشکل سے مکمل ہو پایا تھا اور ان کوششوں میں ہی سلمان احمد کا ہاتھ جل گیا تھا لیکن وہ لوگ کسی بڑے نقصان سے ضرور بچ گئے تھے۔ آگ کو پھیلنے سے پہلے ہی اس پر قابو پا لیا گیا تھا۔ صرف کچن کی ایک دیوار اور کھڑکی کو زیادہ نقصان پہنچا تھا۔

سلمان احمد اپنے ہاتھ کو بھلائے کچن میں داخل ہو گیا تھا۔ کیف نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آگ لگی کیسے؟

سوئی گیس تو ابھی تک اس ایریا میں پہنچ بھی نہ پائی تھی۔ لوگ لکڑیاں جلا کر گزارہ کرتے تھے۔ خال خال سلنڈر سسٹم بھی مل جاتا تھا۔ سلمان احمد کے گھر میں سلنڈر موجود تھا۔ جسے کفایت شعاری سے استعمال میں لایا

جاتا تھا۔ اچھی طرح کچن کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ شاید چولہا غلطی سے جلا رہ گیا ہوگا اور آگ غلطی سے کچن کی کھڑکی تک پہنچ گئی مگر کوئی بھی صحیح وجہ سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔

کیف اور محلے کے لوگوں کے اصرار پر سلمان احمد اپنے ہاتھ کی مرہم پٹی کروانے چلا گیا جب کہ کیف تھکے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں عبور کرتا اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ اس کا ذہن آگ والے واقعے سے ہٹ کر پھر سے فلک بوس اور کبیر کے گرد گھومنے لگا تھا۔ وہ کبیر کی حرکت پر کافی حیران تھا۔ اسے بہر حال کبیر سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ سلمان احمد کو ان لوگوں سے بدگمان کرنے کی کوشش کرے گا۔ دل ہی دل میں وہ تلملا کر رہ گیا تھا اور یہ تلملاہٹ اسے پھر سے فلک بوس کی طرف جانے پر مجبور کر رہی تھی اور اسے یہ کام زرگل کے واپس آنے سے پہلے پہلے مکمل کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے سہارا دیے گھر میں داخل ہوا تھا۔ راستے میں جتنے لوگ ملے وہ آگ لگنے کی وجہ پوچھتے رہے۔ وہ بھلا کیا بتاتا...... اسے تو خود صحیح وجہ کا علم نہیں تھا۔ لوگوں کے ہمدردی بھرے جملوں کا شکریہ ادا کرتا وہ گھر آگیا تھا۔

چند مرلوں کا یہ گھر، جو دو کمروں، باورچی خانے اور ایک باتھ روم پر مشتمل تھا، اور بازار میں ایک چھوٹی سی دکان اس کی کل جائیداد تھی جو اس کے باپ کی مہربانی سے اس کے حصے میں آئی تھی۔ ابھی ایک دو ماہ پہلے ہی اس نے بچت کیے ہوئے پیسوں سے اپنی بیوی کی فرمائش پر گھر کو نہ صرف رنگ کروایا تھا بلکہ چھت پر ایک ہال نما کمرہ اور باتھ روم بھی بنوالیا تھا۔ بشام چونکہ ایک سیاحتی علاقہ تھا سو اس کمرے کو ایک اچھا کمائی کا ذریعہ بنایا جاسکتا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر کچن کی جانب اٹھی تھی۔ افسردہ سی ایک آہ اس کے ہونٹوں سے آزاد ہو کر ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

"ایک نیا خرچا......" اس نے بے چارگی سے سرگوشی کی پھر نظر چرا کر کمرے کی جانب آگیا۔

کمرے میں اس کی بیوی چھوٹے بیٹے کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔

سلمان احمد کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے چند اختتامی تھپکیاں بچے کی کمر پر رسید کیں اور اٹھ کر سلمان کی طرف آگئی جو کمرے میں رکھی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا تھا اور سامنے کی دیوار پر نظر جمائے سوچ میں گم تھا۔

"خان...... تم ٹھیک ہو؟" اس کی بیوی نے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

اس کی آواز سلمان کو اپنی سوچوں سے واپس کھینچ لائی تھی۔

"ہوں؟ ہاں ہاں ٹھیک ہوں میں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سو گیا ہے؟" اس کی نظر چارپائی پر سوئے ہوئے بیٹے کی طرف تھی۔

"ہاں...... وہ تو سو گیا ہے۔ تم کیا سوچ رہے تھے خان؟ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" اس کی بیوی کا انداز خوف زدہ سا تھا۔

"نہیں...... بس یہی سوچ رہا تھا کہ آگ کیسے لگ گئی؟ بیٹھے بٹھائے ایک اور خرچا آگیا سر پر......" سر سے گرم ٹوپی اتارتے ہوئے اس نے پریشانی سے کہا تھا۔

"خیر تم چھوڑو اس کو...... تم بولو کیا بات ہے؟" سلمان احمد نے سر جھٹک کر پوچھا۔

"خان معلوم نہیں تم میری بات کا یقین کرو گے یا نہیں...... مگر یہ لڑکا...... کرائے دار کیف...... مجھے یہ ٹھیک نہیں لگتا خان......" اس کی بیوی نے اٹک اٹک کر بات مکمل کی۔

"اب اس بے چارے نے کیا کر دیا نیک بخت...... آگ اس نے تو نہیں لگائی۔۔۔" سلمان نرمی سے مسکرایا۔

"اس نے نہیں لگائی مگر کہیں ذمہ دار تو وہ ہی ہے اس سب کا۔" اس کی بیوی اب کے چیخ کر بولی تھی۔

"کک...... کیا مطلب؟"

"خان! تمہیں کبیر خان کی بات یاد ہے؟ یہ لڑکے فلک بوس میں داخل ہوئے ہیں...... وہ بھی چوری کی نیت سے...... توبہ توبہ...... اللہ تو شاید انہیں بخش دے مگر آیوشمتی کہاں بخشنے والی ہے...... خان تم مانو نہ مانو آیوشمتی نے ہمارے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے......" اس کی بیوی نے خوف زدہ سے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بات مکمل کی تھی۔

اور سلمان احمد کے سر پر جیسے کوئی بم پھوڑا تھا۔ وہ یک ٹک بیوی کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک اس نہج پر نہیں سوچا تھا۔

"ہم نے ان لوگوں کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے خان! یقیناً یہ بات ایوشمتی کو پسند نہیں آئی۔۔۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ بغیر کسی وجہ کے آگ بھڑک اٹھتی۔ میں نے خود بجھائی تھی آگ......" وہ روہانسے لہجے میں اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھی۔

"مگر...... مگر وہ چوری کی نیت سے نہیں گئے تھے...... جوان خون ہے۔ کبیر خان سے منہ ماری ہوئی، اس لیے اندر گئے تھے...... شرارت کر رہے تھے۔" سلمان احمد پھنسی ہوئی آواز میں بولا۔ انداز ایسا تھا جیسے اپنی بیوی کو نہیں بلکہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ "مجھے خود بتایا ہے کیف نے...... میں نے پوچھا ہے اس سے......"

"جھوٹ بول رہا ہوگا وہ......" اس کی بیوی نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"لو بھلا...... ایسے کیسے......" سلمان برا مان کر بولا۔ "اتنی پرکھ ہے مجھے انسانوں کی...... کہ سچ جھوٹ کا فیصلہ کر سکوں۔"

"خان! تم کو میری بات پر یقین نہیں آرہا...... تو نہ کرو یقین...... لیکن یاد رکھنا کہ ایسا نہ ہو کہ اس سب کے چکر میں کوئی بڑا نقصان اٹھانا پڑے......" اس کی بیوی نے دوٹوک کہا تھا۔

"اچھا...... چلو تم بتاؤ پھر کیا کروں میں؟"

سلمان نے ہار مان لی۔ کہیں نہ کہیں دل میں اسے اپنی بیوی کی بات پر پوری طرح یقین آگیا تھا۔ آیوشمتی کا خوف اس کے بھی دل پر پوری طرح پنجے گاڑ چکا تھا۔

"کرنا کیا ہے...... چلتا کرو اسے یہاں سے...... یہاں سے چلا جائے گا وہ تو مصیبت بھی ٹل جائے گی۔"

"مگر ایسے کیسے چلتا کروں؟ پیسے لیے ہیں ان سے پندرہ دن کے...... اگر ایسے نکالیں گے تو پیسے واپس کرنے پڑیں گے...... اور تمہیں پتا ہے کہ میرا ہاتھ کتنا تنگ چل رہا ہے۔ اور اب یہ نیا خرچا بھی سر پر آگیا ہے......" اس کا اشارہ کچن کی مرمت کی طرف تھا۔

"اگر اسے رکھیں گے تو خدا معلوم اس سے زیادہ بڑے خرچے بھی آپڑیں گے۔"

اس نے اٹھ کر کرسی سلمان کے قریب گھسیٹ لی تھی۔

"میں بتاتی ہوں، کیا کرو تم...... پیسے واپس دینے کی نوبت نہیں آئے گی۔"

وہ آہستہ آہستہ اسے سب سمجھانے لگی۔

سلمان احمد غور سے اپنی بیوی کی بات سن رہا تھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ ہلکے سے کھٹکے سے کھلی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ بلاشبہ اس ہلکی سی آواز نے اسے نیند میں ڈرادیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر کاٹ کی جانب آئی تھی۔ وسامہ اور ہدیٰ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ منفرا نے سکون کا سانس لیا۔

اس نے دیکھا کہ خوش نصیب کمرے میں موجود نہیں تھی۔ وہ شاید باتھ روم میں تھی۔ اسے پھر سے اس کھٹکے کا احساس ہوا جس کی وجہ سے اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ اس کھٹکے کا ماخذ دو گلہریاں تھیں جو کھڑکی کے باہر کی جانب لڑ رہی تھیں اور بار بار کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا رہی تھیں۔ منفرا کے لبوں سے بے ساختہ شکر کا کلمہ ادا ہوا تھا۔

کھڑکی کے ذریعے آسمان پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کاٹ کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ آسمان پر ہلکے سرمئی بادل تھے۔ لیکن رات جیسی شدت نہیں تھی موسم میں۔ رات کے سارے واقعات کسی فلم کی مانند نظروں کے سامنے چل رہے تھے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا، عقل سے ماورا تھا۔ اس کے اپنے علاوہ فلک بوس میں صرف خوش نصیب اور کبیر خان موجود تھے۔ خوش نصیب یہ حرکت کر نہیں سکتی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو خوش نصیب کمرے میں موجود تھی اور گہری نیند میں تھی۔ باقی رہا کبیر خان کا سوال تو وہ کوارٹرز میں تھا اور حویلی کا داخلی دروازہ اس نے خود بند کیا تھا...... تو پھر؟ اس سے آگے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گرالیا۔ وہ دونوں جب کمرے میں واپس آئی تھیں تو دوبارہ سو نہیں پائی تھیں۔ کہیں فجر کے بعد ان کی آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ نیند کی کمی اور ٹینشن کی زیادتی سے سر پھوڑے کی مانند تکلیف دے رہا تھا۔ اس کی نظریں دیوار پر لگے کلاک کی جانب اٹھ گئیں۔ صبح کے دس بجے تھے۔ وہ لوگ بمشکل تین، چار گھنٹے سو پائے تھے۔

اس نے سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد خوش نصیب باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے جنہیں اپنے دوپٹے سے پونچھتی ہوئی وہ خاموشی سے منفرا کے برابر آکر بیٹھ گئی تھی۔

''خوش نصیب...... میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' منفرا بے چارگی سے بولی۔ ''رات جو کچھ ہوا... کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''آپ کو کیا لگتا ہے منفرا! کیا وہ بدروح......؟''

''اونہہ...... نہیں یار...... میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتی...... یہ کوئی اور چکر ہے...... اور مجھے لگتا ہے یہ کبیر خان......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی جیسے خود بھی متذبذب ہو۔

''ایک کام کرو خوش نصیب......! کبیر خان کو دیکھو...... اسے یہاں بلاؤ...... بہتر ہے ایک بار وہ کمرہ چیک کرلے۔'' وہ چند منٹ بعد فیصلہ کن انداز میں بولی تھی۔

''اچھا آئیڈیا ہے۔ میں بلاتی ہوں اسے۔'' خوش نصیب فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے احتیاط سے کمرے کا دروازہ کھولا اور سر باہر نکال کر جائزہ لیا۔ اس کمرے کا دروازہ اسی ہال میں کھلتا تھا جہاں سے ایک راہداری کچن کو جاتی تھی اور فلک بوس سے باہر نکلنے کا دروازہ بھی اسی ہال میں تھا۔ وہ دروازہ ہنوز بند تھا۔ وہ باہر نکل گئی اور اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد کبیر بابا کے ساتھ ہوئی تھی۔

''بی بی! آپ نے مجھے بلایا تھا...'' کبیر بابا نے ادب سے سلام کرنے کے بعد منفرا سے پوچھا تھا۔

''کبیر بابا! آپ نے رات سارے دروازے خود بند کیے تھے؟'' منفرا نے بغور اس کے چہرے کو تکتے ہوئے پوچھا۔

''جی بی بی......! سب دروازے بند تھے۔''

''سب دروازے بند نہیں تھے کبیر بابا......! آپ کو احساس ہے، ذرا سی کوتاہی کتنے بڑے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔'' منفرا درشتی سے بولی۔

کبیر خان ٹھٹک کر منفرا کی شکل دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا ہے بی بی! سب خیریت تو ہے؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

منفرا اسے ساری بات بتانے لگی۔ لیکن اس نے وسامہ کے کمرے سے غائب ہونے کی بات کو دانستہ چھپا لیا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ بات کیوں چھپائی۔ پیچھے کھڑی خوش نصیب نے اس ادھوری معلومات پر حیرانی سے اسے دیکھا تھا کیونکہ اس نے کبیر خان کو بس اتنا ہی بتایا تھا کہ رات فلک بوس میں کوئی موجود تھا۔ جو ان کے کمرے تک آیا تھا۔ ان لوگوں کے جاگ جانے پر اس نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے بھی گئے مگر ایک جگہ پہنچ کر وہ غائب ہوگیا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ایک کمرے میں انہیں اس چور کی موجودگی کا احساس ہوا سو ان دونوں نے وہاں کے دروازے کو لاک لگا دیا۔ طوفان کے باعث وہ لوگ اس وقت کبیر خان کو بلانے سے قاصر رہے۔

کبیر خان جیسے جیسے بات سنتا گیا تھا اس کا چہرہ سرخ ہوتا گیا۔ اسے یاد آیا کہ کیف کل پھر فلک بوس کے ارد گرد موجود تھا اور دل ہی دل میں اسے یقین ہوگیا تھا کہ یہ کیف کی ہی حرکت ہے۔

''بی بی! میں معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے، میں جانتا ہوں کہ اتنی جرات کس نے کی ہے۔ آپ فکر نہ کرو... آپ مجھے اس کمرے کا بتاؤ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں کہ کون ہے وہ۔'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''خوش نصیب! تم ان کے ساتھ جاؤ اور انہیں وہ کمرہ دکھا دو۔ میں بچوں کے پاس رکتی ہوں۔'' منفرا نے خوش نصیب کو اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے...'' خوش نصیب اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے باہر کی جانب چل دی تھی۔

دوسری منزل پر جا کر اسے کمرہ تلاش کرنے میں کافی مشکل پیش آئی تھی۔ فلک بوس ایسی بھول بھلیاں تھی کہ یہاں مستقل رہنے والوں کو بھی راستے بھولنے پر مجبور کردے۔ اس نے تو پھر کل رات پہلی بار یہ جگہ دیکھی تھی اور وہ بھی اتنی فکرمندی کے ساتھ کہ راستے کہاں یاد رہتے۔

کچھ تلاش بسیار کے بعد بالآخر وہ اس راہداری میں پہنچ گئی تھی جہاں سے ان لوگوں نے وسامہ کو نیچے ہال میں پڑا دیکھا تھا۔ اس نے کبیر خان کو اشارے سے اس کمرے کا بتا دیا تھا۔

''بی بی! تم یہاں ہی رکو...... میں اکیلا جا کر دیکھتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔'' کبیر خان نے سنجیدگی سے کہا اور خوش نصیب کا جواب سنے بغیر ہی ہال میں جانے والے راستے کی جانب مڑ گیا تھا۔ چند منٹوں میں وہ ہال میں پہنچ گیا اور بہت احتیاط کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

خوش نصیب کی نظریں دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور خفیف سی کپکپاہٹ جو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر آئی تھی مگر......

کچھ دیر بعد کبیر خان ــ کمرے سے باہر نکلا تھا اور وہاں دروازے پر کھڑے کھڑے اسے کمرہ خالی ہونے کی اطلاع دی تھی۔ خوش نصیب کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ کبیر خان مڑ کر دوبارہ سے کمرے کو لاک کرنے لگا جبکہ خوش نصیب منفرا کو بتانے کے لیے آہستہ آہستہ واپس چل پڑی تھی۔ بلاشبہ خالی کمرے نے اسے مایوس کیا تھا۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ کمرے سے کوئی انسان برآمد ہو جائے تاکہ اس کے ذہن اور دل سے کیف کی بتائی ہوئی کہانی نکل جائے۔ آیو ممتی کے بارے میں بتائی ہوئی باتیں رات سے اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

کچھ ایسا ہی حال منفرا کا بھی تھا۔

منفرا کا خیال آتے کے ساتھ ہی اسے یاد آیا تھا کہ منفرا نے رات اسے کیف کو بلانے کا کہا تھا۔ اور جو حالات ہو گئے تھے، اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

وہ وہاں رک کر کبیر خان کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں کبیر خان لاٹھی ٹیکتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔

''کمرہ بالکل خالی ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ نہ ہی کمرے میں کسی کے داخل ہونے کے آثار ہیں۔'' اس نے بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے بابا! آپ میرا ایک کام کریں۔ بستی جائیں وہاں اس لڑکے کے بارے میں پتا کریں جو کل یہاں آیا تھا۔ اور اسے بلا کر لائیں۔ اس کا نام کیف ہے۔ میرا نام لے دیجیے گا کہ میں نے بلایا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''بی بی! وہ لڑکا۔۔۔ اسے یہاں کیوں بلا رہی ہیں؟ معاویہ بیٹا کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ وہ لڑکے پہلے بھی یہاں گھسنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اور جب آپ لوگوں نے مجھے رات والی بات بتائی تو مجھے یہی لگا کہ یہ اس لڑکے کی ہی حرکت ہو گی۔''

''منفرا بی بی نے بلوایا ہے اسے۔ اگر معاویہ صاحب کو کوئی ایشو ہوا تو وہ خود، ہینڈل کر لیں گی۔ آپ جا کر کیف کو بلا لائیں۔'' خوش نصیب نے اپنی بات پوری کی اور منفرا کے کمرے کی جانب چلی گئی۔

کبیر خان کی پرسوچ نگاہیں دور جاتی خوش نصیب پر جمی تھیں۔

☆☆☆

برف پر جما جما کر پاؤں رکھتا وہ چڑھائی چڑھ کر فلک بوس کی جانب جا رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے کبیر خان اسے ڈھونڈتا ہوا بستی میں آیا تھا اور سیدھا سلمان احمد کی دکان پر پہنچا تھا اور سلمان احمد نے اپنے بیٹے کے ہاتھ کیف کو پیغام بھجوا دیا تھا۔

کیف بے چارے کو جب پیغام ملا تو وہ گھر میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس پیغام پر ہکا بکا رہ گیا۔ یہ خیال ہی بڑا خوش کن تھا کہ خوش نصیب نے اسے خود فلک بوس بلوایا ہے۔ یعنی اس کی ناراضی ختم ہو گئی تھی اور اس کا دل صاف ہو گیا تھا۔

خوشی خوشی کھانا ادھورا چھوڑا اور اٹھ کر فلک بوس کی جانب چل دیا۔

آج اسے کبیر کی شکل دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جب وہ منزل پر پہنچا تو گیٹ سے ہی اس نے دور برآمدے کی سیڑھیوں پر خوش نصیب کو بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اور بازو کو ٹانگوں کے گرد لپیٹے وہ اپنے سامنے کی جانب درختوں کو تک رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔

کیف چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پچھلے تین چار سالوں میں کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ یہ وہ خوش نصیب تو نہیں تھی جسے وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ وہ ضدی، منہ پھٹ، بدتمیز...... سب گھر والوں کا ناک میں دم کر دینے والی خوش نصیب تو کہیں کھو ہی گئی تھی۔ سامنے شال میں لپٹی وہ لڑکی تو کوئی اور ہی تھی۔ کیف جنگلے سے سر ٹکائے محویت سے اسے تکتا رہا۔

خوش نصیب اپنے خیالات سے یکدم چونکی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور لمحہ بھر کے لیے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اس احساس سے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کسی انسان کو تلاش کرنا چاہا۔ جلد ہی پھاٹک پر کھڑا اس کی جانب تکتا کیف اس کی نظروں کے زاویے میں آ گیا تھا۔

سکھ کا سانس لے کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کیف کی جانب بڑھ گئی۔

کیف نے جو اسے اپنی جانب آتے دیکھا، چہرے سے تمام تر نرمی کو غائب کیا اور شدید قسم کے سنجیدہ تاثرات سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

''تم نے بلوایا تھا مجھے؟'' خوش نصیب کے پاس آتے ہی اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا تھا۔

خوش نصیب نے جواب نہیں دیا بلکہ گیٹ کھول کر فلک بوس کے اس آہنی جنگلے کی چار دیواری سے باہر نکل آئی۔

''ہاں بلوایا تھا۔ وہ...... اصل میں......''

خوش نصیب نے بات شروع تو کر لی لیکن مدعا بیان کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ ابھی کل ہی تو اس نے کیف کو دھتکار کر واپس بھیجا تھا اور آج ہی اس سے کام پڑ گیا تھا...... مگر مدد تو مانگنی ہی تھی سو چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد وہ بولی۔

''مجھے تمہاری کچھ مدد چاہیے۔'' اس نے نظر ملائے بغیر آہستہ سے کہا تھا۔ اپنی انا کو مار کر کسی ایسے انسان سے مدد مانگنا جس کی شکل نہ دیکھنے کا دعوا بھی کر رکھا ہو، بڑی تکلیف دیتا ہے۔

''کیا...... کیا کہا...... ذرا دوبارہ بولنا۔'' کیف نے ادائے بے نیازی سے کہا۔ اچھا موقع ملا تھا اسے خوش نصیب کو چڑانے کا۔

خوش نصیب کو پتا تھا کہ کیف اتنی آسانی سے اب نہیں مانے گا مگر کوئی چارہ نہیں تھا۔

''میں نے کہا۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔'' اس بار اس نے بہت اونچی آواز میں کہا۔

''اوہ...... مدد چاہیے آپ کو...... یعنی لوٹ کر بدھو گھر کو آئے۔'' کیف نے مزے سے کہا۔

خوش نصیب نے خود کو پرسکون رہنے کی تلقین کی۔

سنجیدگی سے بولی۔ ''تم کچھ دیر کے لیے سیریس ہو کر میری بات سن سکتے ہو؟''

کیف نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے سے اس کی پریشانی واضح تھی۔ وہ دل میں اسے مزید ستانے کا سوچ رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات نے اسے حقیقتاً سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اچھا بتاؤ۔ کیا مدد چاہیے؟ کیا ہوا ہے جو میری مدد کی ضرورت پڑ گئی؟'' کیف نے سنجیدہ سے انداز میں پوچھا تھا۔

''ایکچوئلی کل رات کو۔'' وہ کیف کو تمام واقعہ تفصیل سے بتاتی چلی گئی تھی۔

کیف بغور اس کی بات سن رہا تھا۔

''کیا یہ پاسیبل ہے کہ تم ہم لوگوں کو واپس بھجوا سکو؟'' خوش نصیب نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ صبح وہ کمرہ خالی ہی تھا؟'' کیف نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... کبیر بابا خود اندر گئے تھے۔ انہوں نے ہی آ کر بتایا کہ کمرہ خالی ہے۔''

"تو تمہارا کیا خیال ہے؟ یہ کیا ہو سکتا ہے؟ کوئی انسان یا آیوشمتی؟" اس نے خوش نصیب کے خیالات جاننا چاہے۔

"نہیں خیر آیوشمتی والی بات پر تو مجھے اتنا یقین نہیں ہے لیکن کل رات کو کچھ ہوا اور پھر کمرہ بھی خالی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چکر ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"مگر تم نے وہ کمرہ اپنی آنکھوں سے تو خالی نہیں دیکھا نا۔" کیف نے کہا۔

"کیا مطلب؟ تمہارا مطلب ہے کبیر بابا جھوٹ بول رہے ہیں؟ مگر وہ ایسا کیوں کریں گے؟" خوش نصیب الجھ سی گئی۔

"مجھے کیا پتا کہ وہ کیا اور کیوں کرے گا۔ تمہارا مسئلہ ہے، خود معلوم کرو۔" کیف یکدم ہی پھر سے سخت ہو گیا۔

خوش نصیب نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔

"کیا مطلب۔ تم۔۔۔ تم ہماری مدد نہیں کرو گے؟"

"کیوں کروں بھلا؟ کس خوشی میں کروں؟ میں تو تمہیں شیشے میں اتار رہا تھا نا کل تک۔۔۔ تو اب کیوں مجھ سے مدد مانگ رہی ہو؟"

خوش نصیب کو غصہ آ گیا۔ اتنی دیر سے وقت ضائع کر رہا تھا اس کا۔ جب مدد نہیں کرنا تھی تو پہلے ہی بول دیتا۔

"تو یہاں آ کر اپنی منحوس شکل دکھائی ہی کیوں؟ آتے ہی نہیں یہاں۔"

"او ہیلو...... میری شکل اتنی منحوس ہے تو پیغام ہی کیوں بھیجا بلوانے کو۔ صاف کہنا کہ یہ منحوس شکل دیکھے بغیر دل نہیں لگ رہا تھا۔" کیف نے اسے چڑایا۔

"تم انتہائی فضول آدمی ہو کیف...... میری غلطی تھی جو میں نے تم سے مدد مانگی۔۔۔ تم لوگ تو بس دوسروں کو تکلیف دینا جانتے ہو۔ کسی کی مدد بھلا کیسے کرو گے؟"

"ارے جاؤ جاؤ۔۔۔ مجھے دوسروں کو بس تکلیف دینا آتا ہے تو تمہیں بھی تو معذرت کرنا نہیں آتا۔ تم نے میری اتنی انسلٹ کی تھی کل۔۔۔ بجائے اس کے کہ بلا ہی لیا تھا تو پہلے سوری کہتیں۔۔۔ ڈائریکٹ "تمہاری مدد چاہیے۔۔۔" کا بم پھوڑ دیا سر پر۔۔۔" کیف نے منہ بنا کر کہا۔ "اور نہیں تو بندہ اندر بلا کر ایک آدھ کپ چائے ہی آفر کر دیتا ہے۔۔۔ اتنی سردی ہے باہر۔۔۔"

"یہ محل میرے ابا میرے نام نہیں لگا کر گئے۔۔۔ کہ ہر ایرے غیرے کو اٹھا کر چائے کی آفر کروں اور اندر لے جاؤں۔۔۔ ملازمہ ہوں میں یہاں کے بچوں کی۔" خوش نصیب نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہونہہ۔۔۔ میں تو اس محل میں بھی کسی کو بلانے کی جرات نہیں کر سکتی تھی جو سچ میں میرے ابا کے نام تھا۔" فوراً طعنہ دے ڈالا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ ایرے غیرے کو چائے کی آفر نہیں کر سکتے۔۔۔ ان سے بس مدد مانگ سکتے ہیں۔" کیف نے اس کی آخری بات کو یکسر نظرانداز کر دیا۔

"اچھا جاؤ معاف کرو، غلطی ہو گئی جو تم سے کچھ اچھی امید رکھ لی۔۔۔ اب جان چھوڑو۔۔۔" خوش نصیب نے دونوں ہاتھ سر پر سے اٹھا کر جوڑے اور واپس جانے کو مڑ گئی۔۔۔

"نہیں تو نہ سہی۔۔۔" کیف مسکراتے ہوئے پلٹا اور سر جھٹک کر واپس وادی کی طرف چل پڑا۔

وہ گنگناتا ہوا تیزی سے وادی کی طرف جا رہا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں سکون ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کی سوچ کا رخ پھر سے فلک بوس، وہاں کے مکینوں اور وہاں ہونے والی سرگرمیوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ اگر مسز معاویہ اس حد تک پریشان اور خوف زدہ ہیں تو اس کا مطلب ہے وہ بھی یہاں ہونے والے سرگرمیوں سے ناواقف

ہیں۔ حالات و واقعات تو معاویہ اردشیرازی کو بھی معصوم ظاہر کر رہے تھے۔ وہ بھلا اپنے بیوی بچوں کو یہاں تنہا چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا اگر وہ خود کسی سرگرمی میں ملوث ہوتا تو۔۔۔ پھر اس کے بیٹے کا ہی کمرے سے غائب ہونا۔۔۔ اتنا آسان نہیں تھا معاویہ اردشیرازی کے بیٹے پر جانتے بوجھتے ہوئے ہاتھ ڈالنا۔

وادی میں آتے ہی وہ سیدھا سلمان احمد کی دکان پر گیا تھا۔ وادی میں ایک سلمان احمد ہی تو تھا جسے شیشے میں اتارنا آسان تھا۔ اس کا پلان تھا کہ وہ سلمان احمد کی مدد سے خوش نصیب اور مسز معاویہ کو لے کر یہاں سے نکل جائے گا لیکن ایسا ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو یقیناً اب تک زرگل ہی یہاں واپس پہنچ جاتا مگر راستے ہی بند ہو گئے تھے۔

سوچتے سوچتے وہ دکان پر جا پہنچا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ سلمان احمد تو کچھ دیر ہوئی گھر پر گیا ہے۔ اس کا بیٹا دکان پر موجود تھا۔ کیف وہاں سے سیدھا گھر کی جانب چل دیا۔

سلمان احمد کے گھر والی گلی کا موڑ مڑتے ہی کیف ٹھٹک کر رکا تھا۔ گھر کے آگے رش تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ ابھی کل رات ہی تو آگ والا واقعہ ہوا تھا۔

"اللہ خیر۔۔۔" کیف تیزی سے آگے بڑھا تھا۔

تھوڑا آگے جاتے ہی اسے گھر کے باہر سر پکڑ کر بیٹھا ہوا سلمان احمد نظر آ گیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

کیف تیز تیز چلتا ہوا اس کی جانب بڑھا لیکن پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ ہکا بکا اپنے سامان کی طرف دیکھ رہا تھا جسے بے دردی سے گھر کے باہر پھینک دیا گیا تھا۔ بیگ کھلا ہوا تھا اور اس کے کپڑے باہر نکلے ہوئے تھے۔ پاس ہی اس کے لیپ ٹاپ کا بیگ بھی پڑا تھا۔ کیف کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں عجیب سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ کچھ غلط ہو چکا تھا۔

اس کے قدموں کی تیزی لمحوں میں سستی میں ڈھل گئی۔ مجمع دو حصوں میں بٹ گیا۔ کیف کو آگے آنے کا راستہ دیا گیا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟" وہ اپنے سامان کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ "میرا سامان باہر کیوں پھینکا ہے؟" اس کے لہجے میں غم و غصہ نمایاں تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ ذمہ دار ہے میرے گھر کی بربادی کا۔" سلمان احمد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر اسے مارنے کو لپکا۔

اس سے پہلے کہ وہ کیف تک پہنچتا۔۔۔ لوگوں نے اسے دبوچ لیا۔

"یہ لوگ فلک بوس میں گھسے تھے۔۔۔ چوری کی نیت سے۔۔۔ آیوشمتی کا سایہ میرے گھر میں لے آئے ایک کے بعد ایک مسئلہ کھڑا ہو رہا ہے۔ راستہ دیکھ لیا ان لوگوں کی وجہ سے اس بدروح نے میرے گھر کا۔۔۔ پہلے آگ لگی اب پیسے چوری ہو گئے۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ یا اللہ میری مدد کر۔۔۔" وہ روتے ہوئے بول رہا تھا اور کیف۔۔۔ وہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ شدید ٹھنڈ میں بھی اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ الزام ہے یہ۔۔۔" کیف ہکلاتے ہوئے بولا۔ ایسی صورت حال کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"اچھا تو کیا تم فلک بوس میں چھپ کر نہیں گھسے تھے؟ ارے تمہارا تو دوست بھی ایوشمتی کے سائے سے بیمار پڑا ہے۔" سلمان چیخ کر بولا۔

کیف کچھ بول نہیں پایا۔

”کبیر خان نے خود ان تینوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔۔۔ یہ تینوں فلک بوس میں گھسے تھے۔ اور اب اس بدروح کا سایہ میرے گھر تک پہنچ گیا ہے۔“ وہ پھر سے رونے لگا۔

مجمع میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ کیف سے یوں دور ہوئے تھے جیسے وہ کوئی کوڑھی ہو۔

”لڑکے! تم جو کوئی بھی ہو اپنا سامان سمیٹو اور نکلو یہاں سے۔۔۔“ مجمع میں سے ایک بزرگ نما آدمی باہر نکلے اور سختی سے کہا۔

”دیکھیں بزرگوار۔۔۔! آپ لوگ جو سمجھ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ الزام ہے مجھ پر۔۔۔“ کیف نے سمجھانا چاہا۔

وہ لوگ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

”تم لوگ فلک بوس میں داخل ہوئے تھے؟“ اس بزرگ نے درشتی سے پوچھا۔

کیف گڑبڑا گیا۔

”جج۔۔۔ جی۔۔۔ وہ۔۔۔“ وہ بری طرح ہکلا رہا تھا۔

”تم لوگ چھپ کر داخل ہوئے تھے؟“ اس بزرگ نے پھر سے سختی سے پوچھا۔

کیف کچھ بول نہیں پایا۔

”دیکھو لڑکے۔۔۔ اب تمہیں ہم یہاں محلے۔۔۔ بلکہ بستی میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔۔۔ تمہاری حرکت سے کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ سامان اٹھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ ایک نوجوان آگے بڑھا اور غصے سے بولا۔

کیف پریشانی سے ان کی شکل دیکھ رہا تھا۔ دو تین اور لمبے چوڑے لڑکے بھی اس بزرگ کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ ان کے تیور اچھے نہیں تھے اور کیف فی الحال اکیلا تھا اور نہتا بھی۔

وہ نیچے جھک کر اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

منٹوں میں سامان سمیٹ کر اس نے بیگ کندھے پر لٹکایا اور ایک نظر سلمان اور اس مجمع پر ڈالنے کے بعد وہ واپس مڑ گیا تھا۔

اس کے قدم ایک بار پھر سے فلک بوس کی جانب بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

خوش نصیب اور منفرا اس وقت بیڈروم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

خوش نصیب نے بچوں کا فیڈر تیار کر کے انہیں دودھ پلایا اور جب وہ دونوں میٹھی نیند سو گئے تو وہ منفرا کے پاس صوفے پر آ بیٹھی جو موبائل ہاتھ میں لیے ایک نئی امید کے ساتھ معاویہ کا نمبر ڈائل کر رہی تھی مگر بے سود۔۔۔ اس کے چہرے پر موجود امید کی کرن جلد ہی دم توڑ گئی۔ ایک سرد آہ بھر کر وہ خوش نصیب کی جانب متوجہ ہوگئی۔

”کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ منفرا نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

اپنے اپنے الجھے ذہنوں کو ایک دوسرے سے چھپائے وہ دونوں مسلسل ایک دوسرے کا دھیان بٹانے کی کوششوں میں تھیں۔

”نیک خیال ہے۔۔۔ بہت زیادہ نیک۔۔۔ میں بنا کر لاتی ہوں۔“ خوش نصیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں۔۔۔ آج تم بیٹھو میں تمہیں کافی پلاتی ہوں۔۔۔ تمہیں کیا پتا‘ میں کتنی اچھی کافی بناتی ہوں۔ زندگی بھر یاد کرو گی۔۔۔“ منفرا نے دعوا کیا تو خوش نصیب ہنس پڑی۔

”تم یہاں ہی رکو۔۔۔ میں آتی ہوں۔“

منفرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان یہ خاموش معاہدہ ہوگیا تھا کہ بچوں کو کسی بھی لمحے اکیلا نہیں چھوڑنا ہے سو خوش نصیب نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ چند لمحے صوفے پر پہلو بدلتی رہی، پھر سامنے ٹیبل پر پڑا اپنا موبائل فون اٹھا لیا۔

آج کیف سے مل کر اسے سب لوگ یاد آنے لگے تھے۔ روشن امی، ماہ نور، نانی۔۔۔ یہاں تک کہ فضل منزل کے تمام مکین۔۔۔

اس نے موبائل کی گیلری میں جا کر ایک فولڈر اوپن کر لیا تھا۔ وہ فضل منزل کے مکینوں کی تصویریں تھیں۔ وہ ایک ایک تصویر کو بغور دیکھتی جا رہی تھی اور یہ کام وہ اکثر کرتی تھی۔ پھر تصویروں کو آگے کرتے کرتے وہ ایک تصویر پر تھم سی گئی تھی۔ اس تصویر میں دو نفوس تھے۔ ان میں سے ایک سے اسے شدید محبت تھی اور دوسرے سے بے تحاشا نفرت۔۔۔ وہ ماہ نور اور شامیر کی تصویر تھی اور ان چند تصویروں میں سے تھی جو ان دونوں کے نکاح کے موقع پر اتاری گئی تھیں۔ ماہ نور کی یہ ایک ہی تصویر اس کے پاس تھی جو عرفات ماموں کی مہربانی سے وہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔

منفرا جب کافی کے دو مگ ٹرے میں سجائے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بے دھیانی سے تصویر کو تکتی چلی جا رہی تھی۔

”خوش نصیب!“ منفرا نے اسے پکارا تھا لیکن اپنے خیالات میں گم اس کے کانوں تک یہ آواز سنی ضرور تھی لیکن دماغ تک اس پکار کی رسائی ممکن نہ ہو سکی تھی۔

منفرا نے جو اسے ایسے اس طرح اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے دیکھا تو تھوڑا آگے ہو کر موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی اور تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ ساکت سی ہوگئی تھی۔

اس نے موبائل خوش نصیب کے ہاتھ سے لے لیا۔ خوش نصیب چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”یہ کون ہے؟“ اس نے پوچھا تھا۔ وہ ابھی بھی تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی۔

”یہ ماہ نور ہے۔۔۔ میری بہن۔۔۔ اور ساتھ اس کا شوہر۔۔۔ شامیر۔۔۔ میں نے بتایا تھا نا آپ کو۔۔۔“ منفرا کو پہلے ہی شک تھا سو وہ یقین میں بدل گیا۔ ہاں یہ وہی شامیر تھا۔

”کیا بات ہے منفرا۔۔۔؟“ خوش نصیب نے اس کے کھوئے کھوئے انداز کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

”یہ بندہ۔۔۔ میں اسے جانتی ہوں۔۔۔“ اس نے جیسے اعتراف جرم کیا تھا۔

خوش نصیب ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”آپ۔۔۔ آپ اسے۔۔۔ مگر کیسے؟“

”ہم لوگوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا ہے۔ یہ اور اس کی ماں ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ایک زمانے میں اچھی دوستی تھی میری اور میرے بھائی کی اس سے۔۔۔“

”پھر۔۔۔؟“ خوش نصیب نے بے چینی سے پوچھا۔

”پھر یہ کچھ الٹے کاموں میں پڑ گیا تھا۔ بلیک میجک وغیرہ میں۔۔۔ جب ہمیں اس بات کے بارے میں پتا چلا تو ہم لوگوں نے اس سے دوستی ختم کر دی۔“ منفرا نے بات مکمل کر کے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں‘ وہ ان سب کاموں میں ملوث ہے۔“ خوش نصیب نے اداسی سے کہا۔ دل ہی دل میں اس نے ماہ نور کی سلامتی کی دعا مانگی تھی۔

”مگر یار! جہاں تک مجھے پتا ہے اس بندے کے ساتھ تو۔۔۔“ منفرا کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ کبیر بابا تھے۔ منفرا کی بات ادھوری رہ گئی۔

”بی بی! باہر وہ لڑکا کیف پھر سے آیا ہے۔“ بابا کبیر نے خوش نصیب کو بتایا۔
”کیف۔۔۔“ خوش نصیب کو حیرت ہوئی۔ ”اچھا۔ میں دیکھتی ہوں۔“
پھر وہ منفرا کی جانب مڑ گئی۔
”منفرا! میں ابھی آرہی ہوں۔“
”ہاں۔ ٹھیک ہے۔“ منفرا نے مسکرا کر اجازت دی۔
وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی تھی۔
”بی بی! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔“ خوش نصیب کے باہر جاتے ہی کبیر نے منفرا کو مخاطب کیا تھا۔
”جی بولیے بابا۔۔۔“ اس نے موبائل اٹھاتے ہوئے کہا۔
”بی بی! وہ لڑکا اپنا سارا سامان بھی ساتھ لے کر آیا ہے۔“ کبیر نے شکایتی لہجے میں کہا۔
منفرا کو یہ بات سن کر بڑا سکون محسوس ہوا تھا۔ اگر کیف سامان ساتھ لایا تھا تو یقیناً وہ خوش نصیب کی بات مان گیا تھا اور اب فلک بوس میں ہی قیام کرے گا۔
”بی بی۔۔۔“ کبیر نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر پھر سے پکارا۔
”ہاں۔۔۔ جی۔۔۔ جی۔۔۔“ وہ اپنے خیال سے چونکی۔ ”تو اچھی بات ہے نا کبیر بابا۔۔۔ وہ فلک بوس میں ہوگا تو کم از کم دوبارہ کوئی اندر گھسنے کی کوشش تو نہیں کرے گا۔“
”مگر بی بی! یہ پہلے بھی فلک بوس میں گھسا ہے ایک بار چوری کرنے کی نیت سے۔۔۔ معاویہ صاحب کو بتایا تھا میں نے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر کل رات فلک بوس میں کوئی گھسا تھا تو وہ اس لڑکے کی ہی حرکت ہے۔“
کبیر کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔
”بابا! وہ خوش نصیب کا کزن ہے۔ اچھے گھر کا لڑکا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ایسی کوئی فضول حرکت کرسکتا ہے۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ منفرا نے اس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی۔
”بی بی! معاویہ صاحب اس بات سے بہت ناراض ہوں گے اگر آپ نے اس لڑکے کو یہاں ٹھہرایا تو۔۔۔“
اس بار کبیر نے معاویہ کا نام لے کر ترپ کا پتا استعمال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن منفرا کو اس کی بات بہت ناگوار گزری۔
”آپ معاویہ کی فکر مت کریں۔۔۔ میرا خیال ہے بابا کہ یہ میرا اور معاویہ کا گھر ہے۔۔۔ یہاں کون رہے گا کون نہیں۔ اس کا فیصلہ آپ ہم پر ہی چھوڑ دیں تو اچھا رہے گا۔“ اب کی بار منفرا کے لہجے میں تلخی تھی۔
کبیر خاموش ہوگیا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ منفرا اس کی بات نہیں سنے گی۔
”آپ جاسکتے ہیں۔۔۔ کوئی کام ہوگا تو میں بلا لوں گی۔“ منفرا نے سنجیدگی سے اسے وہاں سے جانے کو کہا تھا۔
سر جھکائے گہری سوچ میں گم وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

ایک بار پھر سے وہ فلک بوس کے سامنے کھڑا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار وہ خالی ہاتھ نہیں تھا بلکہ سامان بھی ساتھ لایا تھا اور شرمندگی سے تھوڑا سر بھی جھکا ہوا تھا۔
مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئیں کھیت۔۔۔
اس نے دل ہی دل میں خود کو کوسا۔ کیا تھا جو وہ خوش نصیب کے سامنے اپنی زبان کو تھوڑا قابو میں رکھ لیتا تو اب اسے پناہ تو مل ہی جاتی۔۔۔ اب بھلا خوش نصیب کی باتوں سے اسے کون بچا سکتا تھا۔

اس نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اسے کچھ انتظار کرنا پڑا تھا۔ پھر اس نے کبیر خان کو فلک بوس کے داخلی دروازے پر نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ اندر کی جانب سے آرہا تھا۔ کیف کا حلق تک کڑوا ہوگیا تھا اسے دیکھ کر۔۔۔
دوسری جانب وہ بھی کیف کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ اس نے باہر آکر کیف کے منہ لگنے سے بہتر سمجھا کہ اندر سے خوش نصیب کو بلا لے۔ اب تک اسے یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ کیف خوش نصیب کا کزن ہے۔ اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے۔۔۔ کیف اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ دل ہی دل میں خوش نصیب کی جانب سے بھی ٹھٹک گیا تھا۔
کیف نے اسے واپس مڑتے دیکھ لیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ خوش نصیب کو اس کی آمد کی اطلاع دے دے گا۔ سو وہ صبر سے انتظار کرنے لگا۔ دس منٹ بعد خوش نصیب اسے فلک بوس کے داخلی دروازے سے باہر آتی دکھائی دی۔ اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور خود کو ورلڈ وار تھری بہ ہتھیار زبان لڑنے کے لیے تیار کرلیا۔
خوش نصیب پھاٹک پر پہنچ گئی تھی، لیکن اس نے دروازہ کھولنے یا کیف کو اندر بلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیف پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس کی نظریں کیف کے سامان کا جائزہ لینے لگی تھیں۔
”خیریت؟ اب یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“ اس نے مشکوک انداز میں کیف کو گھورتے ہوئے جیسے پتھر مارا تھا۔
”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ بس۔۔۔ مجھے تم پر ترس آگیا۔ سوچا کہ تم نے خود بلا کر مدد مانگی ہے تو تمہیں مایوس نہ کروں۔“ کیف نے بہانہ بنایا۔
خوش نصیب ابھی بھی اسے مشکوک سے انداز میں گھور رہی تھی۔ نظریں اس پر ٹکائے اس نے پھاٹک کھولا تھا اور دو قدم باہر آکر پھاٹک سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی تھی۔
”کاش! میں تمہیں جانتی نہ ہوتی تو ضرور اس بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلیتی۔۔۔“
پھاٹک سے ٹیک لگائے بازو سینے پر باندھے۔ وہ کسی وکیل کی طرح بول رہی تھی اور کیف کو اپنا آپ کٹہرے میں کھڑا محسوس ہوا تھا۔ اور سامنے کھڑی وکیل صاحبہ کو مطمئن کرنا ناممکن۔۔۔
”مم۔۔۔ مطلب کیا ہے تمہارا؟ ایک تو میں تمہاری مدد کرنے کو واپس آیا ہوں اور تم مجھے ہی آنکھیں دکھا رہی ہو۔“
”اچھا۔۔۔ چلو مان لیا تم ہماری مدد کو آئے ہو۔۔۔“ خوش نصیب نے اثبات میں سر ہلایا اور ساتھ ہی اگلا سوال داغا۔ ”یہ سامان۔۔۔ یہ کس خوشی میں سمیٹ لائے ہو؟“
”دیکھو۔۔۔ مجھے لگا تم لوگوں کا یہاں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میں اپنا سامان ساتھ لے آیا تاکہ یہاں تم لوگوں کے ساتھ ہی رہوں جب تک یہاں سے جانے کا کوئی معقول انتظام نہ ہوجائے۔“ اس نے بڑا معتبر سا ہوکر جواب دینے کی کوشش کی۔
”اچھا۔۔۔“ خوش نصیب نے اچھا کو کھینچ کر ادا کیا۔ ”کیف صاحب۔۔۔ کاش تم اتنے ہی اچھے ہوتے یا میں سچ میں تمہیں جانتی نہ ہوتی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ تم میری مدد کو واپس آؤ گے لیکن اتنی جلدی آنے والوں میں سے نہیں ہو تم۔۔۔۔ کم از کم دو دن تو تم مجھے شکل بھی نہ دکھاتے ہاں اس کے بعد آجاتے احسان کرنے کے لیے۔۔۔ مگر یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔۔۔ جناب کیف صاحب! دو دن تو کیا دو گھنٹے بھی صبر نہیں کرپائے اور سامان اٹھائے واپس آگئے۔۔۔“ وہ کیف کو بھگو بھگو کر مار رہی تھی۔
بات ختم کرتے کرتے خوش نصیب کے چہرے پر بے ساختہ سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیف کی نظر اس کی مسکراہٹ پر پڑی اور ... پھر وہ نظر اس مسکراہٹ میں ہی کہیں اٹک گئی۔

"شکر ہے، تمہیں کم از کم اتنا یقین تو تھا کہ میں دیر سے ہی سہی مگر آ جاؤں گا۔" کیف نے کہا۔

خوش نصیب نے اس کی بات پر بے ساختہ اس کی جانب دیکھا اور نظر ہٹا نہیں پائی۔

دونوں ہی ایک دوسرے کو خاموشی سے تکتے چلے گئے۔ گویا وہ پھر سے چار سال پہلے والے کیف اور خوش نصیب بن گئے ہوں۔ وہ اس لمحے کی قید میں تھے، اس میں جی رہے تھے۔ پچھلے تین چار سال تو گویا ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

خوش نصیب کو کیف کی نگاہوں اور اپنی مسکراہٹ کا جیسے ہی ادراک ہوا' وہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کا ساتھ چھوڑ گئی۔

کیف نے بھی جلدی سے اپنی نظر اس کے چہرے سے ہٹا لی تھی مگر اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں سے جدا نہیں کر پایا تھا۔

"زیادہ۔۔۔ فری۔۔۔ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔" وہ کہتے ہوئے جانے کیوں ہکلائی تھی۔ "سچ سچ بتاؤ کیا ہوا ہے جو سامان اٹھا کر یہاں آ گئے ہو؟"

"یار۔۔۔! وہ۔۔۔ یہ سب اس بابا کبیر کی وجہ سے ہوا ہے۔" کیف نے خفگی سے کہا۔

"بابا کبیر کی وجہ سے؟ کیا مطلب؟"

"ہاں۔۔۔ اس نے بستی میں مشہور کر دیا ہے کہ میں فلک بوس میں چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ اور بستی والے میرے اتنا خلاف ہو گئے ہیں کہ بستی سے باہر نکل جانے کا آرڈر پاس کر دیا ہے۔ اگر سامان اٹھا کر وہاں سے نہ نکلتا تو وہ لوگ تو شاید میرے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے پہاڑی کووں کو کھلا چکے ہوتے۔" کیف نے جھرجھری لے کر بچوں کے سے انداز میں منہ پھلائے کہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟ ان لوگوں نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟" خوش نصیب اس کی آخری بات پر ٹھٹکی تھی۔

کیف کو خوش گواری کے احساس نے گھیر لیا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا خوش نصیب کو اپنے لیے فکر مند ہوتے دیکھنا۔

"نہیں۔۔۔ ان لوگوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ ایسا کچھ ہونے سے پہلے ہی میں نکل آیا تھا وہاں سے۔۔۔ ویسے بھی کبیر خان سے ان لوگوں کا ناتا مجھ سے کہیں پرانا ہے۔ میں کوشش کرتا تب بھی وہ لوگ میری بات کا یقین نہ کرتے۔۔۔"

"شکر ہے۔۔۔" خوش نصیب نے پرسکون ہو کر کہا۔ "مگر بابا کبیر ایسا کیوں کریں گے؟ کہیں تم نے سچ میں ایسی کوئی حرکت تو نہیں کی تھی کیف؟" خوش نصیب نے اسے گھور کر دیکھا۔ ساری فکر مندی اس کی خیریت جانتے ہی ہوا ہو گئی۔

"میں سب بتاتا ہوں تمہیں تفصیل سے۔۔۔ میں فلک بوس میں چھپ کر داخل ضرور ہوا تھا لیکن چوری کی نیت سے بالکل نہیں۔۔۔"

"اچھا بتاؤ پھر۔۔۔ کیوں آئے تھے۔۔۔ تمہیں احساس بھی ہے کہ تمہاری یہ حرکت شیرازی خاندان کو میرے بھی خلاف کر سکتی ہے۔" خوش نصیب بھنچی ہوئی آواز میں بولی۔ اسے بہت بری لگ رہی تھی کیف کی یہ حرکت۔۔۔

"بتا دوں گا۔۔۔ لیکن کم از کم مجھے اندر تو آ لینے دو۔۔۔ تمہیں تو احساس بھی نہیں ہے کہ یہاں باہر کتنی سردی ہے۔ صبح سے بھاگ بھاگ کر میرا برا حال ہو گیا ہے اور پھر میں بھوکا بھی ہوں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"ہونہہ۔۔۔ اب معلوم ہو گیا ہو گا کیف صاحب! آپ کو کہ لوٹ کر بدھو گھر کو آئے اصل میں کہتے کسے ہیں۔۔۔" خوش نصیب طعنہ دینے کے سے انداز میں بولی تھی۔

کیف سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

آسمان گہرے سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے جب جسم سے ٹکراتے تو کپکپانے پر مجبور کر دیتے۔ شام میں ہی رات کا سماں بندھ گیا تھا۔

خوش نصیب نے پیچھے ہٹ کر پھاٹک کو وا کر دیا۔ چوں کی وحشت زدہ سی آواز کے ساتھ دروازہ کھلتا چلا گیا۔

"آیئے کیف صاحب! تشریف لایئے۔۔۔"

کیف نے ایک گہری سانس بھری اور فلک بوس کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گیا۔

اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔۔۔ کچھ بہت خاص۔۔۔ کچھ بہت اہم۔۔۔

☆☆☆

"تم یہاں بیٹھو۔۔۔ میں مسز معاویہ کو بلا کر لاتی ہوں۔" خوش نصیب اسے ہال میں رکھے صوفے پر بیٹھنے کا کہتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

کیف نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس ہال کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنا سامان داخلی دروازے کے پاس ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہال کی چھت پر فانوس لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت پینٹنگز لگی تھی۔ اسی ہال سے دوسری منزل پر جاتی ہوئی سیڑھیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ فلک بوس باہر سے جتنا خوبصورت دکھائی دیتا تھا، اندر سے اس سے کئی گنا زیادہ حسین تھا۔ وہ مرعوب سا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

خوش نصیب کی واپسی کچھ دیر بعد منفرا کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے کیف نے بازار میں خوش نصیب کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سلام دعا کے بعد خوش نصیب نے ان لوگوں کا تعارف کروا دیا تھا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی کیف۔۔۔ خوش نصیب سے تمہارے بارے میں کافی سنا ہے میں نے۔۔۔" منفرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیف نے مسکرا کر خوش نصیب کی جانب دیکھا اور پھر شرارت سے بولا۔ "اگر آپ نے میرے بارے میں خوش نصیب سے سنا ہے تو مجھے یقین ہے کہ میرا امیج تو بہت برا ہو گا آپ کی نظر میں۔۔۔"

منفرا ہنس پڑی لیکن اس نے تائید یا تردید کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

"خوش نصیب! تم ایسا کرو' کیف کو اس کا کمرہ دکھا دو۔۔۔ اور کیف آپ فریش ہو لیں۔۔۔ اس کے بعد آپ سے تفصیل سے بات ہو گی۔"

خوش نصیب نے اثبات میں سر ہلایا اور کیف کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"سامان اٹھا لوں میں۔۔۔" وہ مڑ کر دروازے کے قریب گیا پھر خوش نصیب کو آواز دی تھی۔ خوش نصیب کے قریب آتے ہی اس نے اپنا بھاری بھرکم بیگ پیک خوش نصیب کو پکڑا دیا۔

"میں مہمان ہوں۔۔۔ سامان کمرے میں لے کر چلو۔" بات پوری کرتے ہی وہ تیزی سے آگے چل پڑا تھا۔ منفرا ہنس پڑی اور خوش نصیب کچا چبا جانے والی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی اس کے پیچھے آئی تھی۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے پھینکنے والے انداز میں بیگ پیک نیچے رکھا تھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ کیف بھی مسکراتا ہوا پیچھے آ گیا۔ اسے جلدی فریش ہو کر نیچے آنے کی ہدایات دیتی ہوئی وہ واپس چلی گئی تھی۔

اس کی واپسی قریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ نہایا دھویا، فریش سا کیف۔۔۔ خوش نصیب نے نظر بھر کر اس کی جانب دیکھا اور پھر چہرہ موڑ لیا۔

وہ لوگ کھانے کی میز پر آ بیٹھے تھے۔ منفرا نے اچھے میزبان کی طرح کیف کو کھانے کی شروعات کرنے کو کہا۔ کیف نے پلیٹ میں تھوڑے چاول نکال لیے۔ پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی سوال کیا گیا تھا۔

"یہ کھانا۔۔۔ وہ بابا جی بناتے ہیں؟" اس نے نوالہ چباتے ہوئے پوچھا تھا۔

منفرا نے چونک کر اس کے سوال پر اس کی جانب دیکھا۔ "نہیں۔۔۔ وہ نہیں بناتے یہ کھانا تو۔۔۔" کیف نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا۔

"شکر ہے اللہ کا۔۔۔ ورنہ مجھے تو وہ ضرور ہی زہر ڈال کر دیتے کھانے میں۔۔۔" کیف مزے سے بولا۔

"اور وہ ایسا کیوں کرتے؟" منفرا نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے فلک بوس سے ان کی بھینس چوری کر لی تھی، بس اس لیے۔۔۔" کیف کندھے اچکا کر بولا۔

منفرا نے خوش نصیب کی جانب دیکھا۔

"میں خود نہیں جانتی، ثمران کا کہنا ہے کہ کبیر بابا نے پوری بستی میں یہ بات پھیلا دی ہے کہ یہ فلک بوس میں چوری کی نیت سے انٹر ہوئے تھے۔ اور ان کا کہنا ہے کہ یہ الزام ہے۔"

"اور انہوں نے یہ کیوں کیا۔۔۔؟" منفرا نے کیف سے پوچھا۔

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔۔۔ اللہ جانے کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔۔۔ ویسے ان کی حرکتیں بڑی مشکوک سی ہیں۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ فلک بوس کے نام کے ساتھ جس آیو شمتی کا ذکر کیا جاتا ہے۔۔۔ وہ بابا کبیر ہی ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولتا چلا گیا۔

منفرا بغور اس کی بات سن رہی تھی۔ دل ہی دل میں وہ خود بھی بابا کبیر کی طرف سے مشکوک تھی۔

"تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم فلک بوس میں داخل نہیں ہوئے تھے۔۔۔؟" خوش نصیب نے خفگی سے پوچھا۔

"ایکچوئلی داخل تو ہوئے تھے۔۔۔ لیکن چوری کرنے نہیں۔۔۔ میرے دوست ساتھ تھے تو بس ان سے شرط لگ گئی تھی کہ فلک بوس میں داخل ہونا ہے۔۔۔" کیف انہیں تمام تفصیل بتانے لگا۔

اس نے معاویہ اردشیرازی کے بارے میں اپنے خیالات کو چھپا کر باقی تمام معاملات تفصیل کے ساتھ ان کو بتا دیے۔ حتیٰ کہ یاسر کی بے ہوشی اور بیماری کے بارے میں بھی۔

وہ دونوں بغور اس کی بات سن رہی تھیں۔

"مجھے خوش نصیب نے بتایا، رات کو جو بھی آپ کے بیٹے کے ساتھ ہوا۔۔۔ وہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں وہ ٹھیک ہے۔۔۔ مگر میں بہت پریشان ہوں۔۔۔ میں کہنا نہیں چاہتی مگر مجھے خود کبیر خان پر زیادہ بھروسا نہیں ہے۔۔۔ کچھ عجیب سی مشکوک حرکتیں ہیں ان کی۔" منفرا نے سنجیدگی سے کہا۔

"معاویہ واپس آ جائیں تو میں ان سے اس بارے میں ضرور بات کروں گی۔"

"آپ لوگوں نے وہ کمرہ چیک کیا تھا جس کے باہر سے آپ لوگوں کو دسامہ ملا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"خوش نصیب اور کبیر خان ہی گئے تھے چیک کرنے اور وہ کمرہ خالی تھا۔" منفرا مایوسی سے بولی۔

"مگر منفرا! میں کمرے میں نہیں گئی تھی۔ بلکہ میں تو نیچے ہال میں بھی نہیں گئی۔ کبیر بابا نے مجھے وہاں رک کر انتظار کرنے کا کہا اور کمرہ وہ ہی جا کر چیک کر کے آئے تھے۔"

"ماشاءاللہ کس قدر عقل مند ہیں آپ خوش نصیب بی بی! اس نے آ کر کہا کہ کمرہ خالی ہے اور تم نے مان بھی لیا۔ اب ذرا اس جگہ کا نقشہ تو بتاؤ جہاں کمرہ ہے۔"

خوش نصیب اسے تفصیل کے ساتھ اس جگہ کے بارے میں بتانے لگی۔ کیف ابتدائی چند علامات سے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں یاسر بے ہوش ہوا تھا اور جہاں بقول یاسر کے کوئی چیز موجود تھی۔

"خیر تو اب کیا ہو سکتا ہے۔۔۔؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ہمیں معاویہ کا انتظار ہی کرنا ہوگا اور تھوڑا چوکنا رہنا ہوگا۔ تاکہ دوبارہ ایسا کوئی واقعہ نہ ہو۔۔۔" منفرا نے کچھ سوچ کر کہا تھا

"وہ تو ٹھیک ہے مسز معاویہ! لیکن بچے کا یوں کمرے سے غائب ہونا۔۔۔ یہ بڑے خطرے کی بات ہے۔ میں نہیں جانتا، یہ کبیر خان کی حرکت ہے یا سچ میں یہاں کوئی سپر نیچرل پاور ہے لیکن ایک بات جو میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں سچ کو جان کر ہی رہوں گا۔" وہ ایک عزم کے ساتھ بولا تھا۔

"سچ جان ہی نہ جاؤ تم......" خوش نصیب ناک چڑھا کر بولی۔ "اتنے گٹس ہوتے تم میں تو بات ہی کیا تھی۔"

"انڈر اسٹیمیٹ مت کرو مجھے۔۔۔ تم سے کچھ زیادہ ہی گٹس ہیں مجھ میں۔۔۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں خود جا کر اس روم کو چیک کروں گا۔ دیکھتا ہوں کون سی آیو شمتی گھسی بیٹھی ہے اندر۔۔۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

خوش نصیب پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔۔۔

"زیادہ خود کو ہیرو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ٹام کروز نہیں ہو تم۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس کمرے کے پاس دوبارہ جانے کی۔" اس نے خفگی سے کہا تھا۔

کیف کچھ کہنے ہی والا تھا کہ منفرا نے بھی اسے ٹوک دیا۔

"خوش نصیب ٹھیک کہہ رہی ہے کیف! بہتر ہوگا کہ اس موقع پر کوئی بھی کام سوچے سمجھے بغیر نہ کیا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ جیسا آپ لوگ چاہیں۔۔۔" کیف نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

لیکن دل ہی دل میں وہ آج رات ہی اس کمرے میں جانے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔

باتوں کا رخ مڑ گیا۔ کیف اب منفرا کو خوش نصیب کے بچپن کے کارناموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ منفرا ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی جبکہ خوش نصیب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیف کو سامان سمیت فلک بوس سے باہر پھینک دے۔

☆☆☆

کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تھا۔ منفرا بہت دلچسپی سے کیف سے باتیں کر رہی تھی۔ کیف باتوں کے دوران کسی نہ کسی بات پر خوش نصیب کو بھی چھیڑ دیتا۔ کسی بات پر وہ منہ توڑ جواب دیتی اور کچھ باتوں پر بس چپ رہنے کی کوشش کرنے لگتی۔ نو بجے کے قریب وہ لوگ سونے کے لیے اٹھ گئے تھے۔

کیف اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں آ گئی تھیں۔ منفرا نے تو میگزین اٹھا لیا اور خوش نصیب بچوں کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ بچوں کے کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں ابھی تک کیف کی باتیں گونج رہی تھیں اور اس کا دل جلا رہی تھیں۔ دس بجے کے قریب اس نے ہدیٰ کو سلانے کے لیے اس کے کاٹ میں لٹا دیا۔ وہ چاہ کر بھی کیف کو ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔

"بدتمیز۔۔۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"ہممم؟ کچھ کہا تم نے؟" منفرا نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ منفرا! مجھے کیف سے کچھ کام ہے۔۔۔ کچھ بات کرنی ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔" خوش نصیب نے جھجک کر کہا۔

"اوکے۔۔۔" منفرا نے لاپروائی سے اسے اجازت دے دی۔

وہ کمرے سے نکلی اور تیز تیز چلتی ہوئی اس راہداری کے آخری کمرے کی جانب آ گئی۔ جب تک کیف کو تین چار سنا نہ دے لیتی اسے سکون نہیں آنا تھا۔

"کتنی شیخیاں مار رہا تھا منفرا کے سامنے۔۔۔" خوش نصیب نے خفگی سے سوچا۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔۔۔لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد اس نے ذرا زور سے دروازہ بجایا تھا۔۔۔ساتھ ہی کیف کو پکارا بھی تھا۔لیکن جواب ندارد۔۔۔

اس کا دل یکدم کسی نے مٹھی میں جکڑا تھا۔

اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی۔کمرہ بالکل خالی تھا۔ خوش نصیب نے آگے بڑھ کر باتھ روم کا دروازہ بھی چیک کیا لیکن وہ پہلے ہی کھلا تھا۔

"یا اللہ خیر۔۔۔"

وہ حواس باختہ سی منفرا کو بتانے کے لیے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔

☆☆☆

طاقت ور ٹارچ کی روشنی میں وہ تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی جب کہ دوسرے ہاتھ میں اس نے اپنی حفاظت کے لیے ایک تیز دھار چاقو پکڑ رکھا تھا۔

اس نے کمرے میں جانے کے بعد زیادہ وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ٹارچ لے کر کمرے سے نکل کر کچن میں آیا تھا۔ وہاں سے ایک تیز دھار چاقو حاصل کر کے وہ تیزی سے اس راستے پر آگے بڑھا تھا جس راستے سے کبیر خان ان لوگوں کو واپس لایا تھا جب وہ چھپ کر فلک بوس میں داخل ہوئے تھے۔

تھوڑی مشکل پیش آئی لیکن وہ جلد ہی اس ہال میں پہنچ گیا تھا جہاں سے تین راہداریاں نکلتی تھیں،اور ایک دروازہ تھا جو یقیناً کسی کمرے میں کھلتا تھا۔اور مسئلہ اسی کمرے کا تھا۔۔۔

کیف نے چند لمحے رک کر اپنا پھولا ہوا سانس بحال کیا تھا۔ پھر احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا تھا۔اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔اتنی سردی کے باوجود بھی وہ اپنی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کے قطرے ابھرتے محسوس کر سکتا تھا۔

دروازے کے سامنے ایک لمحے کو رک کر اس نے سن گن لینے کی کوشش کی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔

اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا تھا۔

☆☆☆

"منفرا۔۔۔منفرا۔۔۔" خوش نصیب اسے باہر سے ہی پکارتی ہوئی حواس باختہ سی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

منفرا جو بستر پر نیم دراز ہو چکی تھی،خوش نصیب کی اونچی آواز پر تیزی سے اٹھ بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا خوش نصیب۔۔۔؟" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے پریشانی سے خوش نصیب سے پوچھا تھا۔

"منفرا۔۔۔وہ کیف۔۔۔" خوش نصیب اتنی حواس باختہ تھی کہ لفظ اس کے منہ سے ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"کیا ہوا کیف کو؟" منفرا نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔۔۔میں ابھی دیکھ کر آئی ہوں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"خوش نصیب۔۔۔جسٹ ریلیکس۔۔۔کیف بچہ نہیں ہے۔۔۔یہیں کہیں ہی ہوگا۔"

"نہیں منفرا! مجھے یقین ہے کہ وہ اس کمرے کی جانب گیا ہے۔ یا اللہ۔۔۔منفرا! کیف کو کوئی نقصان پہنچا تو میں کبھی خود کو معاف نہیں کر پاؤں گی۔" اس کا ضبط اتنا ہی تھا۔آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر خود ہی اس کے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔

"خوش نصیب! یہاں بیٹھو۔۔۔" منفرا نے اسے کندھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھا دیا۔"اور میری بات غور سے سنو۔۔۔ریلیکس رہو۔۔۔وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ منع کرنے کے باوجود اس کمرے کی جانب جائے۔"

"آپ نہیں جانتیں اسے منفرا۔۔۔وہ اس سے زیادہ بے وقوف ہے۔ جو ٹھان لیتا ہے وہ کر کے ہی چھوڑتا ہے۔" وہ جھنجھلا کر بولی تھی۔"آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہی ہیں۔۔۔اسے خطرہ ہے۔۔۔وہ آیو قسمتی ہو یا کوئی چور۔۔۔وہ نقصان پہنچا سکتا ہے اسے۔۔۔"

منفرا حیران پریشان اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا خوش نصیب! تم اس کے لیے اتنی پریشان کیسے ہو سکتی ہو جس کی کل تک شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھیں۔جس سے تم نفرت کرتی ہو اور اس وقت تم۔۔۔"

خوش نصیب منفرا کی شکل تکتی رہی جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

چند لمحوں کے لیے وہ خاموش رہ گئی تھی۔ پھر بولی تو اس کی آواز میں بے چارگی نمایاں تھی۔

"فیملی کے نام پر صرف ایک ہی رشتہ باقی ہے میرے پاس منفرا۔۔۔اسے کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔" وہ رو دی تھی۔"مزید خود پر،اپنی ذات پر پردہ ڈالنے کی ہمت نہیں۔وہ جو بھی ہے،جیسا بھی ہے۔۔۔مجھے محبت ہے اس سے۔۔۔ابھی سے نہیں،ہمیشہ سے محبت کرتی آئی ہوں میں اس سے۔۔۔"

وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

☆☆☆

اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا تھا۔دروازہ لاک تھا۔وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا تھا کیونکہ کی ہول میں چابی بھی موجود نہیں تھی۔اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ کوئی متبادل راستہ تلاش کیا جاتا۔

وہ دروازے کے ساتھ والی راہداری میں داخل ہو گیا تھا۔راہداری میں چلتے ہوئے اسے کئی دروازے نظر آئے تھے۔وہ اندازے سے ایک ایسے کمرے میں داخل ہوا جو اس کے مطلوبہ کمرے کی پچھلی طرف ہو سکتا تھا۔ کمرہ بھی اصل میں کسی بیڈ روم نہیں بلکہ ایک چھوٹی راہداری میں کھلتا تھا۔اس راہداری میں سے اوپری منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں موجود تھیں۔جب کہ ایک بڑی سی کھڑکی موجود تھی۔

امید واثق تھی کہ یہ کھڑکی اسی کمرے کی تھی۔کھڑکی کے آگے ایک گہرے رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔اس نے کھڑکی کے چوکھٹے پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔۔۔حیران کن طور پر کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔کیف اگلے ہی لمحے کھڑکی پھلانگ کر اندر کود چکا تھا۔اس نے پردہ سامنے سے ہٹاتے ہوئے ٹارچ روشن کرنا چاہی تھی لیکن اس سے پہلے ہی اس کی نظر سامنے کی دیوار پر پڑ گئی تھی۔لمحہ بھر میں اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

☆☆☆

چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ زار زار رو رہی تھی۔ منفرا کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی اُس نے آگے بڑھ کر خوش نصیب کو ساتھ لگا لیا۔

''اچھا اب ایسے روؤ تو مت۔۔۔سنو۔۔۔میری بات سنو۔۔۔'' منفرا نے زبردستی خوش نصیب کے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے تھے۔ ''مجھ سے وعدہ کرو کہ جب کیف مل جائے گا تو تم اسے بھی یہ بات بتاؤ گی۔''

خوش نصیب سوں سوں کرتی اس کی شکل دیکھتی رہی۔۔۔

''بتاؤ گی نا؟'' منفرا نے پیار سے پوچھا تھا۔

خوش نصیب نے اپنے گال صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلو آؤ پھر ڈھونڈتے ہیں تمہارے کیف صاحب کو۔۔۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے منفرا بولی تھی۔

دونوں کمرے سے باہر نکل آئیں۔

منفرا نے سب سے پہلے کیف کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ کمرہ خالی ہی تھا۔ وہ آس پاس کے باقی کمرے چیک کرنے لگی۔ دس پندرہ منٹ میں خوش نصیب جھنجھلا گئی۔

''منفرا یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے یقین ہے وہ اسی کمرے کی طرف گیا ہے۔ بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں میں اسے۔''

''اوکے۔ چلو پھر وہاں جا کر ہی چیک کر لیتے ہیں۔'' منفرا نے حتمی انداز میں کہا۔

کمرے سے چابیوں کا گچھا لے کر تیز تیز چلتی ہوئی وہ دونوں دوسری منزل پر آئی تھیں۔ کیونکہ خوش نصیب دوبارہ اس جگہ آ چکی تھی سو وہاں پہنچنے میں انہیں کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ دس منٹ بعد ہی وہ اس دروازے کے سامنے کھڑی تھیں۔

منفرا نے ٹھنڈی سانس بھر کر خوش نصیب کو دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکے سے خوف کی رمق نمایاں تھی۔

''چلیں؟'' منفرا نے آخری بار پوچھا۔

خوش نصیب بول نہیں پائی تھی سو بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

منفرا نے آگے بڑھ کر لاک میں چابی گھمائی اور ہینڈل پر دباؤ ڈالا۔

دروازہ ایک چوں کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اور اندر کا منظر دیکھ کر وہ دونوں اپنی جگہ خوف سے جم گئی تھیں۔

بالکل سامنے کمرے کے وسط میں ایک کرسی پڑی تھی جس پر کوئی سفید لباس پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے جو اس کے کندھوں' چہرے اور کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے چہرہ اس حد تک جھکا رکھا تھا کہ بکھرے بالوں کے باعث نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی موم بتی تھی جس کی روشنی اس مخلوق کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

موم بتی کی اس مدھم روشنی میں اگلی چیز جو ان کو نظر آئی تھی، وہ کیف تھا۔ جو زمین پر چوکڑی مارے اکڑوں بیٹھا تھا اور ٹکٹکی باندھے موم بتی کو دیکھ رہا تھا۔

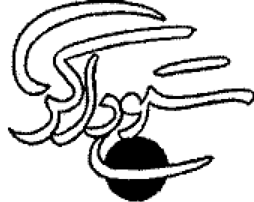
وہ دونوں اپنی جگہ پتھریلی کھڑی رہ گئی تھیں۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



سمیرا حمید



قصہ خوانی جیسے بازاروں' کشمیر کی وادیوں' ان وادیوں کی اونچی نیچی ڈھلانوں پر چڑھتے' پھسلتے' صدائیں لگاتے ہوئے' وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ اتنا بڑا سوداگر بن چکا ہے کہ زرتاش سے اپنی محبت کا سودا اتنی چالاکی سے کر لے گا۔

وہ قالین بیچنے والا تھا.....گل شیر......

بارش اور برف باری کے دنوں میں کبھی کوئی اسے روک کر قہوہ پلانا چاہتا تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا تھا کہ وہ وادی میں رہنے والے لوگوں کی زندگیوں اور گھروں کا ایک حصہ ہے۔ شیر مال کھاتے ہوئے' مقبوضہ کشمیر کے حالات زیر بحث لاتے ہوئے' وہ بھول جاتا تھا کہ وہ قالین

فروش ہے اور اسے اتنی اتنی دیر تک رک کر باتیں نہیں کرنی چاہئیں، ورنہ لوگ اسے بنجارا سمجھنے لگیں گے اور اس سے قالین لینا چھوڑ دیں گے۔ وہ اس سے قصے سننا چاہیں گے اور اسے مجبور کریں گے کہ وہ انہیں کوئی دعا دے کر جائے۔

لوگ اچھے وہ بھی اچھا تھا اور اس کا نصیب بھی اچھا تھا، جب ایک شادی والے گھر کی خواتین نے اسے روک لیا اور میدانی علاقوں سے آئی مہمان خواتین نے اس سے دھڑا دھڑ اکٹھے قالین خرید لیے۔

"کیا کرتے ہو؟" ایک خاتون نے پوچھا

وہ حیران ہوا پھر مسکرا دیا۔ "قالین بیچتا ہوں۔"

"اس کے علاوہ کیا کرتے ہو؟" دوسری نے پوچھا۔

"اس کے علاوہ کیا کروں؟" وہ اس سوال پر بڑا حیران ہوا تھا۔

ویسے بھی سب لڑکیوں اور عورتوں نے اس کے گرد گھیرا بنایا ہوا تھا، اور وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ وہ ٹھیک سے سانس لے رہا تھا اور ابھی تک گونگا نہیں ہوا تھا، یہ بھی کافی تھا۔

"گایا کرو......"

"گایا کروں......؟" اس کے گال ایسے سرخ ہو گئے جیسے اس سے کہا گیا ہو۔ "لڑکیوں کے لیے گایا کرو۔"

جیسے کہا گیا ہو کہ قالین بیچنے کے لیے صدائیں تو لگاتے ہی ہو، دل کے لین دین کے لیے بھی لگا لیا کرو۔

ادل بدل کر لو سودا برا نہیں۔

"ہمارے یہاں جو قالین والا آتا ہے، وہ تو بڑا پیارا گاتا ہے۔"

وہ ہنس دیا۔ اب وہ گانا گائے یا کما کر کھائے۔ یہ امیر عورتیں بھی نا۔ انہیں بس باتیں بنانا آتی ہیں۔

"تھوڑا سا گا دو۔" شاید پردیسی عورت کو قالین والا یاد آ رہا تھا، ورنہ یقیناً اپنا دیس۔

"اب گا بھی دو۔ کتنا شرما رہے ہو۔" تین چار لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں اور چہک کر کہا۔

اس نے جلدی سے اپنا سامان سمیٹا اور جانے لگا۔ وہ جانتا تھا جیسے ہی وہ کچھ بھی گائے گا، وہ سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگیں گی اور پھر ہاتھ سے اشارے کر کر کے کہیں گی۔

"اور گاؤ نا! رک کیوں گئے۔ بہت اچھا گا رہے ہو، بس گاتے رہو۔"

"یہ قالین نئی دلہن کے کمرے میں بچھے گا۔ آؤ ذرا مدد کروا دو۔" گانے کی فرمائش کرنے والی نے اسے روک لیا۔

انہوں نے چار قالین خریدے تھے۔ اسے ان کی مدد کرنا ہی تھی۔ وہ اٹھا اور قالین کندھے پر لاد کر نئی دلہن کے کمرے میں جا کر بچھانے لگا۔

دیواریں سفید تھیں اور قالین سرخ۔ وہ مخمل کے پردے کے قریب کھڑا، جھک کر قالین کا کونا، دیوار کے ساتھ بٹھا رہا تھا، جب اسے دھکا لگا اور وہ قالین پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ سب خواتین اور لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ شادی والے گھر میں ویسے بھی سب کو ہنسنے کا صرف بہانہ ہی تو چاہیے ہوتا ہے۔ اسی چکر میں کسی لڑکی کے ہاتھ سے مہندی کا تھال گر گیا تھا۔

"یا اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ اب دوبارہ کون لائے گا مہندی۔"

نہ اس نے مہندی گرائی تھی، نہ وہ قصوروار تھا، لیکن چونکہ انہوں نے اس کے چار قالین خرید لیے تھے۔ اور گھر کے دوسرے ملازم شادی کے دوسرے کاموں میں مصروف تھے، اس لیے اسے بازار مہندی لانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ دن کو مہندی کے لیے نکلنے والا، دن ڈھلے واپس آیا تو اسے کھانا اور قہوہ دے دیا گیا۔ وہ کھانا کھا چکا، قہوہ پی چکا تو اسے باہر کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا "رات ہو گئی ہے، اب کہاں جاؤ گے، کل صبح صبح نکل جانا۔"

باہر اتنا بھی اندھیرا نہیں ہوا تھا، اور وہ کوئی ایسا بھی ڈرپوک نہیں تھا لیکن شادی کے گھر کا ماحول ایسا

تھا کہ وہ رک گیا۔ چولہے کی راکھ میں دبی شکر قندی کھاتے ہوئے، اوپر سے آتی دف کی تھاپ سنتے ہوئے، اپنے سرد ہاتھ کوئلوں کی تپش پر گرماتے ہوئے اسے اتنی لمبی مشقت بھری زندگی میں پہلی بار فراغت نصیب ہوئی تھی۔ باقی سارے ملازم اوپر ہی تھے۔ وہ اکیلا ہی تہہ خانے میں بنے گودام میں بیٹھا تھا۔

"بہرے ہو کر بیٹھے ہو، کب سے شش شش کر رہی ہوں۔"

اس نے اپنے چاروں طرف لحاف لپیٹا ہوا تھا۔ سر پر اونی ٹوپی تھی جس نے کان بھی ڈھانپ دیے تھے۔ سامنے آگ جل رہی تھی۔ وہ عورتوں کے گانے سن رہا تھا، وہ شش شش کیسے سنتا۔

"کس خیال میں ہو، سنتے کیوں نہیں؟"

اس نے سر اوپر اٹھایا تو وہ سرنگ کی طرح بنی سیڑھیوں کے آخری کنارے پر کھڑی تھی۔ ایک پیر اوپر کی سیڑھی پر تھا، اور ایک نیچے کی سیڑھی پر۔ اس کی مخملی فراک کا دامن، اس کے اگلے پیر کی جوتی کی نوک کو چھو رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے عین سامنے، چولہے کے پاس بیٹھا، شکر قندی سے چھلکا اتار رہا تھا اس کی بات سن کر اس کا ہاتھ وہیں کا وہیں رک گیا تھا اور اب وہ چپ چاپ، سر اٹھا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

پاؤں پٹختے ہوئے وہ نیچے آئی۔ تھوڑی چھن چھن ہوئی۔ کارنس پر سے دوسری لالٹین اٹھا کر اسے روشن کرنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ہاتھ میں پکڑی گرم شکر قندی کھا لے، اپنا سر لحاف میں چھپا لے، یا سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر کی طرف بھاگ جائے۔

"جلدی کرو...... آ بھی جاؤ اب......"

لالٹین ہاتھ میں پکڑ کر، ایک ہاتھ سے فراک کا دامن سمیٹ کر، وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اسے خیال آیا کہ اسے قہوہ دیا گیا تو اس نے پی لیا۔ مہندی لانے کے لیے کہا گیا تو وہ لے آیا۔ تو اب اس نے اسے اٹھنے کے لیے کہا ہے تو وہ اٹھ جائے تو وہ اٹھ گیا۔ وہ آگے چل رہی تھی۔ وہ پیچھے چلنے لگا۔ پھر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ بھی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"اتنی آواز کیوں کر رہے ہو، ذرا دبے پاؤں چلو۔" ایک بار آدھی گردن موڑ کر اس نے کہا۔

تو وہ دبے پاؤں چلنے لگا۔ اتنا کہ اس نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا کہ وہ پیچھے ہے بھی یا کہیں چلا گیا۔

"اب اتنی خاموشی سے بھی نہ آؤ کہ مجھے تم سے ہی ڈر لگنے لگے۔" وہ اس سے ڈرنے والی تھی، جو پہلے سے ہی اس سے ڈر چکا تھا۔

کتنی ہی دیر تک وہ ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری سمت کی سیڑھیاں چڑھتی رہی۔ چھوٹی، بڑی، سرنگ نما سیڑھیاں۔ ایک کوٹھڑی نما کمرے کے باہر رک کر اس نے بڑا سا تالا کھولا اور اندر چلی گئی۔

وہ باہر ہی کھڑا رہا۔ اندر جانے سے ڈر گیا تھا۔

"زنجیریں پڑی ہیں کیا پیروں میں؟ آتے کیوں نہیں؟"

اندر سے وہ چلائی تو وہ بھی چھوٹے سے دروازے سے سر جھکا کر اندر چلا گیا۔ وہاں بڑے بڑے لکڑی کے صندوق ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ ایک بڑے سے صندوق کا ڈھکن کھول کر وہ خم کھا کر جھکی ہوئی اس میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ چیزیں اور کپڑے ادھر ادھر کر رہی تھی۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹا...... پھر دو قدم...... پھر تین قدم......

اس کا جی چاہا کہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس بڑے سے صندوق میں اس کے ساتھ چھپ کر بیٹھ جائے۔ باہر سے تالا لگا دے۔ اور خود اس کے ساتھ کسی دوسری دنیا میں نکل کر کھو جائے۔ ایسی دنیا میں جہاں وہ قالین والا نہ ہو، بلکہ گانے والا ہو۔ وہ اسے سامنے بٹھا لے اور گانا گائے۔ وہ سامنے بیٹھی رہے اور اسے سنتی رہے۔

"اسے نیچے اتارو۔" ایک طرف اشارہ کر کے،

وہ خود کسی دوسرے صندوق کا ڈھکن کھول کر دیکھنے لگی۔

اس نے کتنے ہی صندوق اوپر سے اُتار کر نیچے رکھ دیے۔ اِدھر سے اُدھر کیے۔ اس طرح کیے' اور اتنی بار کیے کہ اب بس وہ سر گھما کر صندوق کی سمت دیکھتی تھی اور وہ اسے اٹھا کر نیچے رکھ دیتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسے اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اب تک جو اس نے قالین بیچنے کا کام کیا تھا' وہ سب صرف خسارے کا سودا تھا۔

وہ سودائی تھا۔ دیوانہ تھا۔

''یہ بھی خالی کر دیا۔ یہ بھی لے لیا۔ ہائے! میری ماں کی چیزیں اس ڈائن کو دے دیں۔''

ہائے ہائے کرتے جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو کسی ایک کا ڈھکن بند کر کے وہ اس پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اپنی آستین سے آنسو پونچھنے لگی۔

اس کی جیب میں ایک رومال تھا' وہ اسے یہ رومال دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے آنسو اس کے رومال کی دسترس میں آ جائیں۔ پھر وہ اس رومال کو سنبھال کر رکھ لے اور ساری زندگی اس ایک رومال کے سہارے گزار دے۔ وہ قالینوں کے ساتھ ساتھ اپنا آپ بھی بیچ دے لیکن صرف ایک اس رومال کے لیے اپنی جان بھی دے دے۔

وہ چپ چاپ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ وہ سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے آج تک عورتوں کو بڑا ہنستے' لڑتے' چیختے چلاتے اور گاتے ہوئے سنا تھا۔ ایسے ایک چھوٹے سے کمرے میں' نیم تاریکی میں صندوق پر بیٹھ کر روتی ہوئی لڑکی اسے پہلی بار ملی تھی۔ پشمینہ شال اوڑھے ہوئے' مخمل کی فراک پہنے ہوئے۔ زیرِ لب چڑیل ڈائن کہتے ہوئے۔

ایک ایک کر کے وہ اپنے سارے قالینوں کے رنگ بھول گیا۔ لکڑی کے دروازے کی زنجیر کی ٹھنڈک اس کی پیٹھ میں اتر رہی تھی۔

اس کے کچھ قیمتی خزانے جو صندوقوں سے چرا لیے گئے تھے وہ اس پر رو رہی تھی۔ اس کی ایک اکلوتی قیمتی چیز جواب اس کے سینے میں بھی موجود نہیں رہی تھی' وہ اس پر خوش ہو رہا تھا۔ باہر اتنی ٹھنڈ تھی' اور اب اندر یہاں کیسا الاؤ جلنے لگا تھا۔ لکڑی کا دروازہ جو بند تھا' اگر قیامت تک ایسے ہی بند رہتا تو وہ ساری عمر اس کے ساتھ ایسے ہی پیٹھ لگا کر کھڑا رہ سکتا تھا۔ اگر وہ ایسے ہی سامنے بیٹھی رہتی۔

''تم نے بھی مجھے نہیں بتایا' وہ چڑیل میری ماں کا سب کچھ لے اُڑی۔'' آنکھیں پونچھ کر اس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ کسی کا سب کچھ تو تم بھی لے اُڑی ہو۔

''کتنی بار تم سے کہا تھا' آنکھیں کھول کر رکھنا۔ مجھے اطلاع بجھوا دینا۔ دیکھو اب لُٹ گئی میں۔''

''دیکھو ذرا لُٹ گیا میں......'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''دیکھو ذرا لُٹ گیا میں۔'' دوسری بار بھی بڑبڑایا۔

''بولتے کیوں نہیں ہو۔ تم بھی غدار نکلے...... میرے باپ نے سب کو خرید لیا ہے۔''

جسم کا ایک ہی لوتھڑا ہمیشہ غدار نکلتا ہے۔ بڑی جلدی بک جاتا ہے۔ نہ کوڑیوں کے بدلے، نہ اشرفیوں کے بھاؤ' فقط ایک لمحے میں اس کے قدموں میں جا گرتا ہے۔

''بہانے سے مجھے بتانے آ نہیں سکتے تھے۔''

نہ بہانا چلا نہ تدبیر...... صدائیں لگانے والا' صدا لگائے بغیر سب کچھ ہار گیا۔

اب وہ اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی تھی اور کچھ اٹھا کر اسے دے مارنا چاہتی تھی۔ اگر وہ اس کا گریبان پکڑ لیتی...... اگر وہ اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیتی...... وہ مر جاتا...... کھڑے کھڑے مر جاتا۔

''میں مار ڈالوں گی اس چڑیل کو۔ ڈائن نے ہمت کیسے کی ان چیزوں کو ہاتھ لگانے کی۔''

وہ جسے مار ڈالنا چاہتی تھی' اسے مار چکی تھی۔ [illegible] سے اس کا گریبان پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے جھنجوڑ رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں کی تپش دل پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک دم سے' گر پڑنے کے انداز سے اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''معافی نہیں ملے گی' دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

پلٹ کر اس نے لالٹین اٹھائی اور جب وہ دہلیز پھلانگ کر جانے لگی تو اس نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں کیا کروں گا اب؟'' اس نے اپنا سر جھکا لیا اور نظریں بھی۔

وہ رکی اور گھور کر اسے دیکھا۔ پھر لالٹین والا ہاتھ اٹھا کر اس کے منہ کے قریب لائی۔ دونوں کے درمیان روشنی کا ہالہ بن گیا۔

''معافی نہ دو لیکن ایسی سزا بھی نہ دو۔''

''کون ہو تم...... ہاتھ چھوڑو میرا......'' وہ چونک گئی۔ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

وہ کیا بتاتا' قالین بیچنے والا' صدائیں لگانے والا۔ پہلے اچھا بھلا تھا، اب ہر اچھے بھلے کو بھلا بیٹھا۔

''بابا نے نیا ملازم رکھا ہے تمہیں؟'' اس نے تھوک نگلا۔ وہ کس کے ساتھ اس بند کوٹھری میں تھی۔

وہ خاموش رہا۔

''میں سمجھی دریا خان ہو۔ اچھا سنو! میں یہاں آئی تھی' کسی کو نہ بتانا۔ اب تم جاؤ۔''

وہ نیچے آ گیا۔ میوے کی مٹھیاں بھر کر منہ میں ٹھونستے ہوئے دریا خان نے دانت نکال کر اسے دیکھا۔

''شادی والا گھر ہے' دو تین دن رک جاؤ' اچھے [illegible] مل جائیں گے۔ گاؤں سے لوگ منگوائے تھے [illegible] تک نہیں آئے۔ کل سے بارات کا کام شروع [illegible]ائے گا۔ بڑے کام ہوں گے۔ کیا کہتے [illegible]بخشش الگ سے ملے گی۔''

[illegible]نے سر ہلا دیا۔

دو دن بارات کے کام کرتا رہا۔ سب اسے قالین والا' قالین والا کہہ کر بلاتے رہے۔ تیسرے دن' بارات آنے سے پہلے وہ نئی دلہن' اس کی سوتیلی ماں کے کمرے کے قریب سے گزرا تو وہاں وہ لڑتی جھگڑتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے گلے کے ہار میں اپنا ہاتھ پھنسا کر اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ پھر ایک مرد آیا اور اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور اسے خاتون سے الگ کیا۔

''میں مر جاؤں گی...... سن لیں...اس سے کہیں واپس کرے میری ماں کی ساری چیزیں۔''

''جاؤ...... اب مر کے دکھا بھی دو......'' تھپڑ مارنے والے نے نفرت سے کہا۔

''ایک کی شادی اور ایک کا جنازہ، مبارک ہو آپ کو۔'' اس نے بھی نفرت سے ہی کہا۔

شادی کا جو سامان کمرے میں رکھا تھا' اور جو کچھ وہ ایک ہاتھ مار کر گرا سکتی تھی' ان سب کو گراتی' پھینکتی' پھلانگتی ہوئی وہ باہر کی طرف بھاگی۔ گھر سے نکل کر دور پہاڑ کی بلندی کی طرف۔

وہ بھاگ رہی تھی تو وہ بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگا اور جوں ہی کود جانا چاہا' اس وقت اس نے اسے پیچھے سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی طرف اس کا پورے کا پورا دل کھنچ گیا۔ وہ جان سے کھیل رہی تھی۔ وہ اس کی جان سے کھیل رہی تھی۔

''تم مرنا چاہتی ہو نا؟''

دو دن میں ہی وہ اس گھر کی ساری کہانی جان گیا تھا۔ وہ گھر کے مالک' دلہن کے باپ کی دوسری بیوی کی اکلوتی اولاد تھی۔ جو اپنے نانا کے گھر میں رہتی تھی۔ وہ اپنے باپ کو اور اس کی نئی نویلی بیوی کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی تھی اور کتنی ہی بار پہاڑوں پر چڑھ کر انہیں مرنے کی دھمکی دے چکی تھی۔

''تو مجھ سے شادی کر لو۔''

وہ قالین بیچنے والا تھا۔ جانتا تھا' خرید و فروخت کیسے کی جاتی ہے۔ وہ جان گیا تھا' جو جان سے جا رہا

ہو باپ کی دوسری بیوی کی ناخلف اولاد ہو گھر میں جس کا درجہ پرانے برتن سے زیادہ نہ ہو ایسے جوہر کو کس دام پر خریدا جاسکتا ہے۔

وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دوپٹا ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ گیلی سرخ آنکھیں باپ سے بدلے کی آگ میں جل رہی تھیں۔ باپ سے سارے حساب بے باق کرنے کا اس سے اچھا موقع اسے کب ملنے والا تھا۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ واپس گھر کی طرف آگئی۔ اور جس وقت دلہن اپنے باپ کے سامنے کھڑی ہو کر اس کی نیک تمنائیں سمیٹ رہی تھی اس وقت اس کا ہاتھ تھام کر وہ بھی اپنے باپ کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی

"مجھے بھی ہمیشہ کے لیے یہاں سے رخصت کر دیں۔ میں شادی کروں گی تو صرف اس سے۔"

کمرے میں کھڑی ساری عورتیں اور دور سے آتی بارات کی شہنائیاں سب ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگئیں۔ اس کی سوتیلی ماں نے اس کی ماں کے ہار پر طنز سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے بوڑھے شوہر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے خدا کے لیے خاموش رہیں۔ بارات دروازے پر کھڑی ہے۔ ورنہ اتنی رسوائی ہوگی کہ مٹائے نہیں مٹے گی۔"

☆☆☆

باپ سے اس کی نفرت کا' قالین والے نے اپنے دل کے ساتھ بروقت سودا کرلیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے کارخانے واپس آگیا تھا۔ جہاں زمین پر لکڑی کے سیدھے تختے پر پرانا قالین بچھا تھا۔ کونے میں کھانے پکانے کا کچھ سامان رکھا تھا۔

قالین والا گل شیر جتنے رنگوں کے قالین بیچتا تھا اس کا کمرا اتنا ہی بے رنگ تھا۔ اسے جس لڑکی سے نیم تاریک کوٹھری میں صندوق کھسکاتے ہوئے محبت ہو چکی تھی وہ لڑکی اس کے ساتھ اس کمرے میں پتھر کا بت بن چکی تھی۔

پھر ایک دم اس نے کھڑے کھڑے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی سرخ فراک کا گھیر پورے کمرے میں پھیل گیا تھا۔ وہ کچھ ایسے دل دوز انداز میں رو رہی تھی کہ وہ سب سمجھ گیا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"باپ سے میری نفرت کا تم نے کتنا فائدہ اٹھایا۔ ذلیل انسان۔"

اس نے فائدہ اٹھایا تھا' لیکن اگر وہ اسے ایسے حاصل نہ کرتا تو کیسے کرتا۔

کون تھا جو اسے یہ یقین دیتا کہ وہ اس کی ہو جائے گی۔ کون تھا جو اس کی ساری زندگی کی غلامی پر بھی اسے اس کا آقا بنا دیتا۔

کمرے کی ٹھنڈ' اور اس کی نفرت کے الاؤ' نے اس پر وہ رات بہت بھاری کر دی تھی۔ وہ ساری رات سسکتی رہی تھی۔ اس نے انگیٹھی جلا کر اس کے قریب کر دی تھی۔ وہ اسے گرم شال اوڑھانے لگا تو اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"میں اپنا باپ پیچھے چھوڑ آئی ہوں' پہاڑ نہیں...... کہیں سے بھی کود جاؤں گی۔"

پہلے وہ باپ کی نفرت میں کود جانے والی تھی' اب قالین بیچنے والے کی محبت سے۔ سات سال کی عمر سے قالین بیچنے والے کو اب معلوم ہوا تھا کہ کچھ سودے سستے ہو کر بھی بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ اسے آج ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ کتنا لالچی تھا۔ اسے جس سے محبت ہوئی' اس سے ایک پل دور رہنا اس نے گوارا نہ کیا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ پشمینہ کی شال اور کھدر کے کرتے کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ وہ ایک یتیم مسکین لڑکا تھا' جو کارخانے میں پل کر بڑا ہوا تھا۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ وہ کتنا شاطر' کتنا چالاک اور کتنا سنگدل تھا۔

وہ اٹھا اور ایک دن کی دلہن' اور چھ دن کی محبت کے قدموں کے قریب بیٹھ گیا۔

"مجھے معاف کر دو زرتاش!" اس نے ہاتھ بھی جوڑ دیے۔

زرتاش نے سر اٹھا کر اسے کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ پر کانپ کر رہ گیا۔

"معاف کیا' اب میرا گلا گھونٹ دو۔"

چھ دن پہلے تک وہ اس کارخانے میں بہت سکون کی نیند سویا کرتا تھا۔ چھ دن پہلے اس کی زندگی تین وقت کی روٹی' اور دن بھر کی دوڑ دھوپ کا نام تھی۔ اگر اسے ایک محبت نہ ہو جاتی تو وہ ویسا ہی بے فکرا ہوتا جیسے پہاڑی نالہ۔

ایسا ہی شفاف ہوتا جیسے ندی کا پانی۔

جیسے آبشار کا دہانہ...... ایک محبت نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

"میرا گلا گھونٹ دو یا زہر دے دو مجھے۔"

پہلے تو وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر وہ کہے بغیر رہ نہیں سکا۔

"میں کل تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔"

"اس گھر میں اب میری لاش بھی نہیں جا سکتی۔" وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں تمہارے بابا کے قدموں میں گر جاؤں گا، کہہ دوں گا کہ میں نے تمہیں بہکا دیا تھا۔ تم بالکل معصوم ہو۔"

☆☆☆

وہ بابا کے قدموں میں گر گیا۔ "آپ کے اس ہیرے کے لیے میرے پاس نہ چاندی کی تھالی ہے نہ سونے کی۔ اب اس ہیرے کو کس طاق پر رکھوں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

کہہ کر وہ چلا گیا۔ ایک ہفتے بعد اسے طلاق لینے کے لیے جانا تھا' لیکن سات دنوں کو اس نے سات صدیاں بنا لینا چاہا۔ آٹھویں دن وہ اس لیے نہیں گیا کہ وہ ایک اور آخری دن اس کا شوہر بن کر رہنا چاہتا تھا۔ نویں دن اس لیے نہیں جا سکا کہ وہ بیمار تھا۔ بیمار کو اتنی چھوٹ تو ہوتی ہے۔ دسویں دن وہ اپنے کارخانے سے دور، بہت دور چلا گیا کہ کہیں زرتاش کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا وہاں نہ آجائے۔

ایک مہینے کے اندر اندر اس نے کشمیر اور اس کی ساری وادیاں بہت دور پیچھے چھوڑ دیں۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے قالینوں کا کام چھوڑ دیا کہ کوئی اسے قالین والے کے نام سے ڈھونڈتا ہوا نہ آجائے اور کہے......

"زرتاش کا باپ تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے' طلاق دو اسے اور جان چھوڑو، ان کی۔"

وہ زرتاش کی جان چھوڑ دیتا لیکن پہلے اسے اپنی جان چھوڑنی پڑتی۔ وہ بے حد ظالم ہو گیا تھا۔ محبت نے اسے کمزور بنا دیا تھا۔ جہاں کوئی سے رک کر سلام کرتا وہ ڈر جاتا کہ اب کوئی اسے پہچان نہ لے۔

کتنے دن' مہینے' موسم وہ خود سے یہی کہتا رہا کہ ایک دن اور، بس ایک اور دن، پھر میں جا کر زرتاش کو طلاق دے دوں گا۔ اسے آزاد کر دوں گا۔ وہ جہاں چاہے گی شادی کرلے گی۔

☆☆☆

"پہلے تو تم کہتی تھیں اس کے بغیر مر جاؤں گی، اب مرتیں کیوں نہیں؟"

جب وہ اسے واپس اس کے باپ کے گھر چھوڑ گیا تو بابا نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ باپ کو نیچا دکھانے کے لیے اس نے جو جھوٹ بولا تھا، باپ اسی کا طعنہ دے رہا تھا۔ وہ کبھی باپ کی محبت نہیں سمیٹ سکی تھی، اگر اس کی ماں جوانی میں ہی نہ مر گئی ہوتی تو وہ اپنے باپ سے اتنی نفرت نہ کرتی۔ گل شیر سے شادی کر کے وہ بابا پر یہ ثابت کرنا چاہتی کہ اس نے ماں کے ایک ایک آنسو کا حساب برابر کرلیا ہے۔

"جواب دو زرتاش! تم اپنی ماں پر گئی ہو، کم عقل اور جذباتی۔"

وہ یک ٹک اپنے باپ کی صورت دیکھ رہی تھی۔

اس کی ماں بھی اسی کی طرح حسین و جمیل تھی، وہ کم

عقل تھی، اسی لیے سامنے کھڑے انسان سے محبت کرنے لگی تھی۔ جذباتی تھی، اسی لیے ایک جھوٹی محبت کے نام پر اندھی ہوگئی تھی اور جیتے جی مرگئی تھی۔ اس کی ماں سمجھتی تھی کہ وہ صرف اس سے محبت کرتا ہے بھلا جو شخص تیسری شادی کررہا ہو وہ پہلی اور آخری بار محبت کیسے کرسکتا ہے۔

"بہت کم عقل ہوں میں۔"

وہ زیر لب بڑبڑائی اور بھاگتے ہوئے گھر سے باہر نکلی۔ وادی میں نکل کر اس نے حلق کے بل "گل شیر" چلانا چاہا۔ وہ اتنی سی بات بہت دیر میں سمجھی تھی کہ اسے اپنے باپ جیسا انسان نہیں چاہیے۔ جو شخص صرف ایک رات میں ہی اس کی سسکیاں سن کر، اس کے قدموں میں آکر بیٹھ جائے اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دے، وہ انسان اس کے باپ کی طرح دل کا کھوٹا کیسے ہوسکتا ہے۔ اللہ نے اسے وہ دل دیا تھا جس دل پر اس کا نام پہلا بھی تھا اور آخری بھی۔

وہ اس پہاڑ پر چڑھ گئی جس سے کود کر وہ اپنی جان دے دینا چاہتی تھی۔ وہاں کھڑی ہوکر وہ زار و زار رو رہی تھی' وہ آخری لمحہ جب وہ ہاتھ جوڑ کر بابا سے معافی مانگ رہا تھا اور ایک آخری بار اسے نظر اٹھا کر دیکھا تھا، وہ اسے یاد آرہا تھا۔ اس ایک نظر میں گل شیر نے اسے پوری طرح سے جکڑ لیا تھا۔ زندگی بھر جینے کے لیے' سانس کے ساتھ سانس لینے کے لیے، وہ ایک نظر اس نے سنبھال کر رکھی تھی۔

وہ جان گئی تھی...... لیکن اسے کھو چکی تھی۔

وہ جان گیا تھا، اگر وہ ایک اور دن زرتاش کو دیکھے بغیر رہا تو مرجائے گا۔ اسے دیکھنے کے بعد مرنے کا فیصلہ کرنے کے لیے وہ واپس اس کی وادی میں پہنچ گیا۔ چھپ کر اس کے گھر کے چکر لگانے لگا۔ ڈھلانوں پر گشت کرتا رہا۔ کبھی کسی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہوکر' کبھی دور اونچائی پر چڑھ کر اس نے زرتاش کی ایک جھلک کا انتظار کیا۔

ایک بار وہ کھڑکی میں تھوڑی دیر کے لیے آئی' دور پہاڑوں کی سمت دیکھا اور پھر کھڑکی بند کر کے چلی گئی۔ وہ دوبارہ پھر کھڑکی میں آئے گی' اس انتظار میں اس نے کتنے ہی دن وادی میں بھٹکتے ہوئے گزار دیے تھے۔ برف باری شروع ہوئی' تو اس کی واپسی کا راستہ بند ہوگیا۔ وہ ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں ایک طرف پڑا رہتا تھا۔

ایک دن اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ ملازم اسے بڑے کمرے میں لے گیا۔ وہاں آتش دان روشن تھا۔ زرتاش کا باپ' کرسی پر جھول رہا تھا۔ اسے ایک نظر دیکھا اور پھنکار کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کہاں غائب ہوگئے تھے۔ جیتے جی اسے مار دیا۔ دیوانہ بنا گئے اسے۔ وہ پاگل بھی ہمیشہ بعد میں ہی سوچتی ہے۔"

وہ چپ چاپ سر جھکا کر کھڑا رہا۔ اسے اوپر سے تیزی سے سیڑھیاں پھلانگنے کی آوازیں آئیں۔ اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ اس کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔ اگر وہ پلٹ کر دیکھ لے گا' تو پتھر کا ہوجائے گا۔

دیوانہ۔ سودائی۔

پھر وہ اسے چھوڑ نہیں سکے گا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے گریبان پر اس کے ٹھنڈے ہاتھ رکے اور وہ اسے جھنجوڑنے لگی۔

"اتنی بڑی سزا...... بولو، اتنی بڑی سزا...... میرا سب کچھ لے گئے اور مجھے یہاں اکیلا چھوڑ گئے۔ تم بے ایمان سوداگر ہو' سارا نفع اپنے پاس رکھ کر' مجھے نقصان سونپ دیا۔" وہ رو رہی تھی۔

"معافی نہ دو لیکن ایسی سزا بھی نہ دو گل شیر! مجھے اپنے ساتھ لے جانا' انتظار کے لیے پیچھے نہ چھوڑ جانا۔"

وہ اس کے سامنے آئی تھی تو روئی کیوں تھی؟

قالین بیچنے والے سوداگر نے اپنے غدار دل' اور غلام جان کے عوض کی گئی اس "محبت" کے آنسو رومال سے پونچھ دیے۔ یہ رومال جسے وہ تعویذ بنا کر رکھے گا۔ یہ زرتاش' جسے وہ جان سے لگا کر رکھے گا۔

☆

سائے دھوپ

واعظہ زیدی

"اچھا اچھا آرہی ہوں، صبر ہی نہیں۔ اب کوئی دروازے پر تو کھڑا نہیں ہوتا کہ گھنٹی بجاتے ہی دروازہ کھل جائے۔"

نسیم آرا ہانپتی کانپتی بڑبڑاتی ہوئی دروازے تک آئی تھیں۔ چند لمحے تو سانس ہی بحال کرتی رہ گئیں۔ دروازہ اتنی سی دیر میں دوبارہ بج گیا۔

جھنجلا کر دروازہ کھولتے ہی کڑے تیور سے نووارد کو گھورا۔ نک سک سے تیار، پتلون کوٹ پہنے گلے میں ٹائی باندھے، وہ پچیس تیس سال کا جوان تھا۔

شائستگی سے جھک کر بولا "آداب" نسیم آرا اتنے ادبی سلام پر بھونچکا سی رہ گئیں

"تسلیم آداب" گڑبڑا کر منہ سے نکلا تھا ان کے۔

"جی یہ ذوالفقار احمد اسیر صاحب کا ہی گھر ہے؟"

دھیمے انداز سے ہی پوچھا گیا۔

"ہاں کیوں؟"

نسیم آرا پر دوبارہ بے زاری طاری ہوئی۔

نووارد نے ایک لفافہ ان کی جانب بڑھایا۔

"جی میرا نام ابراہیم ہے۔ دراصل میں یہ دعوت نامہ پیش کرنے آیا ہوں۔ سہ ملکی ادبی کانفرنس ہے جس میں اسیر صاحب کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ آپ نے حال ہی میں گھر تبدیل کیا ہے تو بالمشافہ۔"

وہ ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ نسیم آرا نے لفافہ ہاتھ سے لے کر حقیقتاً اس کے منہ پر دروازہ بند کردیا۔

"میڈم! بات سنیے پلیز میڈم! آپ نسیم صاحبہ ہیں نا۔" بے چینی سے نووارد نے دروازہ بجایا تھا۔

نسیم آرا کے بڑھتے قدم رک گئے۔
"کیا کہا اس نے؟"
وہ لپک کر مڑیں جھٹ سے دروازہ کھولا۔ ابراہیم مایوس ہو کر واپس پلٹ رہا تھا۔
"سنو، کیا کہا تم نے ابھی؟"
ان کے پکارنے پر اس کے بے جان قدم یک بیک جیسے نئی زندگی پا گئے تھے۔
"آپ نسیم آرا صاحبہ ہیں نا؟ نسیم آرا مہک۔ مشہور شاعرہ۔" نسیم آرا نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔
"آپ نہیں جانتیں، میں آپ کا کتنا بڑا پرستار ہوں۔ آپ کی نظم "مجھتی ہے زندگی" اف مجھے بہت زیادہ پسند ہے آپ کو کیا بتاؤں......"

☆☆☆

"ہم...... م......" اسیر صاحب نے ہنکارہ بھرا۔
دعوت نامہ الٹ پلٹ کر دیکھا پھر لاپروائی سے سرہانے میز پر رکھ دیا۔
"ابھی دن پڑے ہیں مجھے یاد کرا دینا۔"
نسیم آرا ان کے لیے چائے بنا کر لائی تھیں۔
اسیر صاحب کچھ ہی دیر پہلے لوٹے تھے۔ کسی تعلیمی ادارے میں تقریر کر کے آئے تھے بے طرح تھکے ہوئے کھانا تھوڑا سا ہی کھایا پھر آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہوئے۔ ایک نئی کتاب ان کے ہاتھ میں تھی "آثار زیست" کسی نے ان کے نام انتساب کی تھی، پہلا ایڈیشن پہلا نام ایک قیمتی تحفہ۔
"سنتے ہیں جی! مجھے بھی جانتا تھا بہت ادب کا قدردان تھا دیکھتے ہی پہچان گیا۔" نسیم آرا کی آواز فرط مسرت سے کانپ رہی تھی۔
اسیر صاحب نے متوجہ ہو کر ناک پر سے عینک نیچے کی۔ بڑھاپا ان کی نظر کمزور کر گیا تھا۔
"کہہ رہا تھا میری دونوں کتابیں اس کے پاس محفوظ ہیں اور "مجھتی ہے زندگی" کو تو طرز سے گا کر بھی سنایا مجھے۔"
"دروازے پر؟" اسیر صاحب نے ابرو اچکائے۔
"مجھے پہچان کر بہت خوش ہوا تھا۔" وہ اپنی دھن میں بتا رہی تھیں۔
"نہیں نہیں، میں نے اندر بلا کر بٹھایا تھا۔ شربت پلا کر بھیجا میں نے۔"
نسیم آرا کے پاس ابھی بھی بتانے کو بہت کچھ تھا۔
"کہہ رہا تھا' لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ آپ تو بہت اچھا لکھتی تھیں آپ کی شاعری تو زندگی کا پتا دیتی تھی۔"
اسیر صاحب ضبط نہ کر سکے' زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔
"ہاہاہا...... تمہاری شاعری...... ہاہاہا۔"
نسیم آرا چپ ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگیں۔
"کیسی بچکانہ شاعری کرتی تھیں' اوپر سے شوق بھی ہوتا مجھ سے تصحیح کروانے کا، جملے کاٹ کاٹ کر ترتیب کر کر کے ایک طرح سے میں ہی نئی نظم لکھا کرتا تھا۔ کبھی بحر ہی چھوڑ دیتی تھیں نظم کے اختتام تک، کبھی آزاد نظم کہہ کر تحت اللفظ کہانی لکھ ڈالتی تھیں۔
تمہارے ابا پیسے والے نہ ہوتے تو دو کتابیں نہ چھپوا سکتی تھیں۔ شکر ہے شادی کے بعد تم نے چند دفعہ کی کوشش کے بعد توبہ ہی کر لی ورنہ میں کیا بتاتا یہ مشہور ادیب و شاعر ذوالفقار احمد اسیر کی اہلیہ کا حال ہے یعنی چراغ تلے اندھیرا۔"
وہ کہہ کر خود ہی لطف اٹھا رہے تھے۔
نسیم آرا کہنا چاہتی تھیں۔ "ایسا بھی نہیں تھا۔ ادبی حلقوں میں اچھا خاصا نام تھا ان کا' ادبی محفلوں میں خاص دعوت نامے آتے تھے ان کے لیے' ان کے ابا روشن خیال انسان تھے۔ انھیں ہر جگہ لے کر جاتے تھے، شائقین و حاضرین محفل میں سب سے پرجوش داد ان کے ابا کی ہوتی تھی۔ فخر سے بتاتے تھے میری بیٹی شاعرہ ہے۔ یہاں تک کے ایک سے ایک دولت مند گھرانوں کے رشتوں پر اسیر صاحب کے درمیانے درجے کے رہن سہن رکھنے والے گھرانے کو ترجیح دی تھی کہ ان کی بیٹی کے شوق کی قدر کوئی باذوق ہی کرے گا مگر نہ جانے کیوں وہ کبھی اسیر صاحب کے معیار پر پوری نہ اتر سکیں تو کبھی کسی نظم کی بحر ان کے مجازی خدا کو پسند نہ آتی تو کبھی مرکزی خیال پر اعتراض ہوتا۔ شروع شروع میں ایک آدھ نظم ٹھیک کر کے انہوں نے مشاعرے میں پڑھی بھی مگر پسند نہیں کی گئی۔ حق ہا...... شاید اسیر صاحب کا حلقۂ احباب ان کے جیسا ہی اعلیٰ ذوق کا حامل تھا۔
ویسے وہ شاید اتنی بھی بری شاعری نہیں کرتی تھیں کیوں کہ کالج، دانش کدہ ہر جگہ ان کے چرچے ہوا کرتے تھے، بہت زیادہ لوگ نہ سہی مگر ان کے بھی کچھ پرستار تھے۔ اتنے باوفا کے ان کی کتاب کے سرورق پر چھپی ان کی نوعمری کی تصویر سے، اس بڑھاپے کی تخریب کاریوں سے خستہ جھریوں زدہ چہرے سے بھی نقوش کھوج نکالے اور پہچان لیا۔
گھٹنوں پر زور دے کر وہ خالی کپ لینے اٹھیں۔ اسیر صاحب کب کے ہنستے ہنستے خاموش ہو کے کتاب میں مگن تھے۔
"خرافات ہے یہ، ہر ایرا غیرا قلم ہاتھ میں لے بیٹھا ہے۔" بے زار ہو کر انہوں نے کتاب رکھ دی۔
"غیر ضروری منظر کشی طویل جملے سارا حسن ہی ماند پڑ گیا۔ اچھوتا موضوع، بالکل پسند نہیں آئی مجھے مگر مجھے اس پر تبصرہ بھی لکھنا ہے سو پوری پڑھنا مجبوری یا ایسا کرو تم پڑھ کر تبصرہ لکھ دو۔ ماضی کی مشہور شاعرہ ہو آخر۔" وہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں چھیڑ رہے تھے۔
نسیم آرا مسکرا دیں۔
"مجھے کہاں فرصت، گھر کے اتنے جھمیلے ہیں۔"
جواب حسب توقع تھا اسیر صاحب سر ہلا کر بستر سیدھے ہوئے سارے دن کی تکان کے بعد اب نیند مانگ رہا تھا منٹوں میں بے خبر ہوئے۔
نسیم آرا باورچی خانہ سمیٹ کر چپکے سے کمرے میں آئیں، اپنے سرہانے کا لیمپ جلایا۔ اس کے آگے اخبار کھڑا کر کے آڑ کی۔ آنچل میں چھپا کر لائی سودے کی کاپی میں کچھ لفظ گھسیٹنے لگیں۔
ابراہیم، ان کے اکلوتے پرستار کی فرمائش تھی۔ کوئی تازہ نظم ہو جائے۔

☆

مکمل ناول

اقرار کا موسم

ایمل رضا

خزاں رسیدہ درختوں پر برف کے ننھے ننھے گالے گر رہے تھے۔ کھڑکی کے اس طرف بیٹھی زوبیہ منظر دیکھ رہی تھی۔ موسم کی پہلی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ اب ہر چیز جم جائے گی۔ نجانے کتنے مہینوں کے لیے۔

''کھڑکی بند کر دو زوبیہ! سردی اندر آ رہی ہے۔'' دیوار کے ساتھ کمر لگا کر بیٹھی اماں جلدی جلدی سوئیٹر بن رہی تھیں۔

''آپ تو سردی کے اندر آنے کا شکوہ نہ کریں۔ ہمیں تو اس کے بہت ناز اٹھانے پڑتے ہیں۔ ابھی تو یہ آئی ہے' پھر یہ پر پھیلائے گی' پھر اڑان بھرے گی۔'' وہ چڑ کر بولی تو اماں ہنس دیں۔

''تمہیں شدید ٹھنڈ سے شکوہ ہے یا برف باری سے؟''

''یہاں اکیلے پڑے رہنے سے شکوہ ہے۔ ہفتوں گزر جاتے ہیں' کوئی انسان نظر نہیں آتا۔''

''تو میں کیا تمہیں انسان نہیں لگتی؟؟'' نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سے اپنی بنت کے ''گھر'' گننے لگیں۔

''کاش میں برف کی پری ہوتی۔ میرے پر ہوتے اور میں یہاں وہاں اڑتی پھرتی۔''

''اُڑ کر ذرا ادھر آؤ' میں ناپ لوں تمہارا۔''

وہ اٹھ کر اماں کے پاس آئی' اپنا بازو اماں کے سامنے کیا۔ اماں نے ناپ لیا۔ ''تمہارا بازو کتنا لمبا ہے۔ بنتے بنتے میں تو تھک گئی ہوں۔''

''آدھا بازو کاٹ دوں' پھر تو نہیں تھکیں گی



آپ۔'' وہ جل کر بولی۔ اماں ہنسنے لگی تھیں۔

''کتنی آسانی سے آپ ہنس لیتی ہیں۔''

''بیٹا! مسکراہٹ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں مفت بھی ہے اور قیمتی بھی۔ ایسا کرو' تھوڑا سا تم بھی ہنس لو۔ ورنہ ایسا کرو' نیچے جاؤ اور کسی دکان سے تھوڑی سی ہنسی اور زندہ دلی خرید لاؤ۔ شاید تمہارے بس میں نہیں ہے۔ ہمت کر کے ہنس لینا۔''

''میری کوئی فرینڈ بھی نہیں ہے۔ سب شہر میں رہتی ہیں۔ یہاں فون کے سگنلز بھی نہیں آتے کہ بندہ ان سے بات ہی کر لے۔ یا اللہ! کتنی اکیلی ہوں۔ میری مدد کر یا رب۔'' وہ پوری طرح سے ''بے چاری'' بننے کی کوشش کرنے لگی۔

''تم تنہا کب ہو بھئی!'' اماں کام کرتے ہوئے لاپروائی سے بولیں۔ ''یہاں درخت ہیں۔ برف ہے۔ پرندے ہیں۔ اور یہ سیاہ کوے اور چیلیں بھی تو ہیں' جنہیں اتنی ٹھنڈ میں بھی چین نہیں ہے۔ اڑتے پھرتے ہیں یہاں وہاں۔ کوئی سویٹر اور کوٹ بھی نہیں پہنا انہوں نے تو۔ اور نہیں تو جرابیں اور مفلر ہی لے لیں۔ ان سے دوستی کر دناں۔''

اماں اٹھ کر اپنی چیزیں تھیلے میں ڈال رہی تھیں۔ انہیں جانا تھا۔ برف باری شدید ہونے سے پہلے......

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے اماں! کہ آپ میری ماں ہی نہیں ہیں۔ آپ کوئی جادوگرنی ہیں۔ جیسے ایک جادوگرنی نے شہزادی کے لمبے بالوں کی وجہ سے اسے قید کر رکھا تھا ویسے ہی آپ نے مجھے بھی قید کر رکھا ہے۔''

''میں جادوگرنی ہوں' میں یہ بات مان سکتی ہوں۔ مگر تم کوئی شہزادی ہو' یہ بات میں مر کر بھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اس عمر میں یہ سب نہیں ہوگا مجھ سے۔''

''اماں......'' اس نے قالین پر پیر پٹخے اور لاڈ سے چلائی۔ اماں نے اس کے قریب آ کر اس کے گلابی گالوں پر پیار کیا۔

''آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے میری بیٹی! اب یہ سب ڈراما بند کرو۔ اپنے لیے کافی بناؤ' ناول پکڑو اور شروع ہو جاؤ۔ میں جا رہی ہوں۔ زلیخا کی بہو کو ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔ سمجھ رہی ہو ناں۔ گھر میں ہر چیز موجود ہے۔ کھانا پینا' اور یہ سویٹر پہن لینا۔''

''یہ اب میری لاش ہی پہنے گی۔'' ابھی اس کا ڈرامہ ختم نہیں ہوا تھا۔

''مرنے سے پہلے پہن لینا۔ مجھے آنے میں دیر ہو گئی تو تمہاری لاش اکڑ جائے گی۔'' اماں مسکراہٹ دباتے ہوئے بولیں۔

''اگر موسم خراب نہ ہوا تو میں گھر واپس آ جاؤں گی۔ ورنہ ایک دو دن بھی لگ سکتے ہیں۔''

''اور ایک دو دن میں کیا کروں گی؟''

''باہر برف گرے گی' اسے اٹھا کر گھر کے اندر لے آنا، بھالو بنانا۔''

اماں کہتے ہوئے باہر چلی گئیں تو اس نے جھانک کر دور تک دیکھا۔

دھند بہت بڑھ گئی تھی۔ آس پڑوس کے گھر تو ویسے ہی حد نظر سے دور تھے' اب تو ایسے لگ رہا تھا کہ وہ اس سیارہ زمین پر اکیلی مخلوق ہے۔ جیسے چاند پر ایک اکیلا انسان۔

☆☆☆

اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اگر نہ بھی کرتی تو بھی اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔ جہاں ان کا گھر تھا' وہاں بھوت تو آ سکتا تھا لیکن کوئی انسان نہیں۔ لوگ وہاں تب آتے تھے جب راستہ بھول جاتے تھے' اور سردی سے مرنے والے ہو جاتے تھے۔ ایسے بھولے بھٹکے اجنبی لوگ آج سے بارہ سال پہلے ان کے گھر آئے تھے۔ وہ اوپر پہاڑی کی چوٹی کی طرف جا رہے تھے کہ ان کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے وہ ادھر ادھر دھکے کھاتے رہے اور پھر ان کے گھر کے دروازے پر دستک دی تھی۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی، وہ چونک اٹھی۔ اماں سب کچھ تھیلے میں ڈال کر لے گئی تھیں' وہ ہاسٹل سے کوئی چیز لینے واپس نہیں آ سکتے تھے۔ ابو کراچی تھے' حارث ہاسٹل میں تھا' بہت دور دور رہنے والے پڑوسی اس کی طرح اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ تو پھر اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ کوئی بھولا بھٹکا انسان؟ وہ بھی ایسی طوفانی برف باری اور اتنی ٹھنڈ میں؟ کیا واقعی۔ وہ خود مرنے آیا ہے یا اسے مارنے آیا ہے۔ یا یہ وہ ہے جو بازار میں ان کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''السلام علیکم! کون ہے باہر؟'' وہ دروازے کے پاس آ کر بلند آواز سے بولی۔

باہر کسی نے اپنے پیروں کو رگڑا' لمبی سانس لی۔ ''میں ہوں......''

''جو بھی ہے' پہلے سلام کا جواب دیں پھر بات کریں۔''

''جلدی دروازہ کھولو' میں ٹھنڈ سے مرنے والا ہوں۔'' قریب المرگ انسان نے پوری قوت لگا کر چلا کر کہا۔

''مر جاؤ' لیکن پہلے مجھ پر سلامتی بھیجو۔''

''وعلیکم السلام! میڈم! میں حسن ہوں' دروازہ کھول دیں' ورنہ ہم سب مر جائیں گے۔''

زوبیہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ اس نے گرم ہڈ پہنا ہوا تھا' سر پر ٹوپی' ہاتھوں میں دستانے' پھر وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ ٹھنڈ سے مرنے والا ہے۔ وہ حیرت سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی کہ سامنے والا چند لمحے کھڑا نہ رہ سکا اور ٹھک کر کے گر گیا۔ وہ تھوڑی کھجانے لگی۔ یعنی لوگ اتنے نازک مزاج ہیں کہ ذرا سی برف' تھوڑی سی ٹھنڈ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہٹا کٹا لڑکا' اس کے قدموں میں گر گیا تھا۔ اب کیا وہ اسے اٹھائے؟ برف کے اس تودے کو ہاتھ لگائے۔ مگر وہ اتنی زحمت کرے کیوں؟

''کوئی گرم کمبل ہے تو مجھ پر ڈال دو پلیز! میں بہت دور سے آ رہا ہوں۔ اب ایک اور قدم اٹھانے کی ہمت نہیں رہی۔'' منہ کے بل گرے گرے اس نے کہا

''ایکسٹرا کمبل پیچھے اسٹور میں رکھا ہوا ہے' اور میں کیوں جاؤں اسٹور تک؟''

''تو گرم پانی ہی ڈال دو مجھ پر' میں پوری طرح سے جم چکا ہوں۔''

چار قدم اٹھا کر وہ کونے میں رکھے صندوق تک گئی اور اس کے اوپر سے موم بتی لا کر اس کے سامنے کی۔

''ہاتھ سینک لو اس پر۔''

''موم بتی سے گرمائش حاصل کر لوں؟'' وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا۔ ''میں ٹائم مشین میں بیٹھ کر کسی قدیم زمانے میں آ چکا ہوں کیا؟ یہ کون سا سن ہے؟'' اس کی آواز میں تلخی تھی۔

''یہ دو ہزار اٹھارہ کا' ساٹھ سالہ پرانا گھر ہے' جو ایک انگریز نے اپنے ملازم کے لیے بنوایا تھا۔ چاہو تو اپنی ٹائم مشین میں بیٹھو اور واپس چلے جاؤ۔ کیونکہ یہاں سے باہر کی دنیا جتنی ترقی یافتہ ہے' یہ گھر اتنا ہی ''ترقی ترک یافتہ ہے اور ذرا جلدی کرو' مجھے دروازہ بند کرنا ہے' کافی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے اندر۔''

اس نے سر اٹھا کر لڑکی کو دیکھا' اور کچھ دیر تک دیکھتا ہی رہا۔ پھر دروازے سے پورا اندر ہو کر' دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔

''ہیٹر بھی نہیں ہے؟''

''انگیٹھی ہے۔''

''انگیٹھی کیا ہوتی ہے؟''

''دیسی ہیٹر' جو کوئلوں سے جلتی ہے۔''

''اوہ اچھا! کہاں ہے وہ؟''

''وہ سامنے کمرے میں۔''

وہ اٹھ کر کمرے کی سمت جانے لگا تو اس نے اس کے ہڈ میں انگلیاں پھنسا کر اسے پیچھے کی سمت گھسیٹا۔

''جناب! کہاں جا رہے ہیں آپ' یہ میرا گھر

ہے وہ میرا کمرہ ہے۔''
اس نے سر گھما کر آس پاس دیکھا۔
''یہ سارا گھر ہی ایک کمرے کا ہے' تو وہ تمہارا کمرہ کیسے ہوا؟''
''اچھا چلو میں الفاظ درست کر لیتی ہوں۔''
''جناب! کہاں گھسے جا رہے ہیں آپ؟ یہ میرا گھر ہے' اور وہ بھی میرا گھر ہے۔''
لڑکے نے دانت نکال کر اسے دکھائے اور پھر باہر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ ''باقی کے دو اوپر سڑک پر کار میں بیٹھے ہوئے ہیں' تمہارے پاس کوئی وسل ہے؟ کھڑکی سے سر نکال کر ذرا بجا دو' وہ یہاں تک آ جائیں گے۔ میری تو ٹھنڈ نے سیٹی ہی گم کر دی ہے۔''
اس کی اپنی سٹی گم ہو گئی۔ تو یہ تین لوگ ہیں اور تینوں یہاں رہیں گے۔
''وسل ہے تو بجا دو ورنہ کوئی ٹارچ وغیرہ ہے تو اس سے اوپر کی طرف لائٹ مار کر اشارہ کر دو۔''
لڑکی نے خائف نظروں سے اسے دیکھا اور چلتی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی' اور اسے کھول کر سر باہر نکال کر' منہ اوپر سڑک کی طرف کر کے پوری قوت سے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز برف کے ویرانوں میں دور تک گونج اٹھی۔ پہاڑوں کے نیچے رہنے والے نہیں جانتے کہ پہاڑوں کے اوپر رہنے والے یہ سیٹی بجانا جانتے ہیں۔
اس سیٹی کی گونج پر حسن حیران رہ گیا تھا۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس نے موٹے کپڑے کا کوٹ نما کرتا پہنا ہوا تھا۔ جس کے دائیں بائیں بڑی بڑی جیبیں تھیں۔ سر پر موٹی اونی ٹوپی اور پیروں میں دو مختلف رنگوں کی جرابیں...... جرابیں اتنی موٹی تھیں اور ان پر اتنا موٹا موٹا بُر تھا کہ لگ رہا تھا کہ اس نے بکرے کی کھال کو دھونے کی زحمت بھی نہیں کی اور سوئی سے سی کر جرابیں بنا کر پہن لیں۔ گھر ایک کمرے کا تھا۔ دروازہ کمرے میں ہی کھلتا تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں کہیں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ کونے میں بس ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔ دیوار کے دو اطراف کھڑکیاں تھیں۔
اس نے دوسری بار سیٹی بجائی اور پھر سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔
''وہ بہرے ہیں کیا؟ میں ساری رات ایسے ہی سیٹیاں مارتی رہوں گی؟''
''وہ آ رہے ہوں گے۔ راستے میں ہوں گے۔''
''راستہ؟ تمہارا مطلب' وہ کیا چین سے آ رہے ہیں؟''
''چین تک تمہاری سیٹی جاتی ہے؟''
وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ حیرت غصے میں بدل گئی' غصہ طیش میں۔ وہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔
''میرے گھر میں کھڑے ہو کر' تم مجھ پر طنز کر رہے ہو؟ اگر میں نے دھکا دے کر تمہیں نکال باہر کیا تو جانتے ہو کیا ہو گا تمہارا؟''
''پوسٹ مارٹم...... لیکن میں جانتا ہوں' تم ایسا نہیں کرو گی۔ پہاڑوں پر رہنے والے خود سے یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ کبھی کسی مہمان کو' موسم کے یعنی موت کے حوالے نہیں کریں گے۔ ان کے میزبان بنیں گے۔ خود بھوکے رہیں گے لیکن انہیں کھلائیں گے۔''
لڑکی یک ٹک اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔
''تم بھی کسی زمانے میں پہاڑوں پر رہ چکے ہو؟''
''اب رہوں گا نا۔ پلیز ذرا ایک بار اور سیٹی مار دو۔ میرا خیال ہے' ان میں سے کوئی ایک آدھ ٹھنڈ سے مر چکا ہے۔''
''تمہارے یہاں مرنے کو اتنا نارمل لیا جاتا ہے؟ اگر ان میں سے کوئی واقعی مر چکا ہے تو بہتر ہے کہ تم بھی اوپر جاؤ' اس کے کفن دفن کا انتظام کرو۔''

ہیں اور سیٹیاں کس خوشی میں ماروں؟''
''پلیز' ایک بار مار دو۔''
وہ چلتی ہوئی واپس کھڑکی تک گئی' اسے کھولا' اور سیٹی ماری۔ پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ لیکن وہ وہاں دہلیز کے پاس نہیں کھڑا تھا' وہ کونے میں زمین پر بچھے بستر کے اندر گھس چکا تھا اور اس کے لحاف کو گھسیٹ کر اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹ چکا تھا۔

☆☆☆

پتا نہیں لوگ برفانی علاقوں میں آ کر اتنا بوکھلا کیوں جاتے ہیں۔ لڑکی تو جیسے تیسے چلتی ہوئی گھر کے اندر آ گئی تھی لیکن جو لڑکا تھا' وہ بقول اس کے اتنا زیادہ تھک چکا تھا کہ دو قدم اور نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جب وہ گھر سے باہر نکل کر اس کے پاس گئی تو وہ ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا۔ ہوا ابھی بہت تیز چل رہی تھی اور بارش بھی زوروں سے ہو رہی تھی۔ ٹھنڈ بے شک بہت زیادہ تھی لیکن ان تین عدد انسانوں میں نزاکت بھی بہت زیادہ تھی۔ جب وہ سہارا دے کر اس اسکول کے بچے کو گھر کے اندر لائی۔ تو وہ جو بستر میں گھس چکا تھا' وہ کھڑکی کے قریب رکھی اس کی چاکلیٹ کھا چکا تھا اور دوسری اس کا موٹا مفلر اپنے گرد لپیٹ چکی تھی' وہ دوسری تیسری چاکلیٹ کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی۔ اس نے انہیں حیرت سے دیکھا تو دونوں نے بڑے آرام سے کہا
''سنا ہے' چاکلیٹ گرم کرتی ہے۔ بس اس لیے......''
''تھپڑ بھی منہ گرم کر دیتے ہیں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اسٹور تک گئی اور لحاف لا کر تیسرے کے گرد اچھی طرح سے لپیٹ دیا۔
''تمہارے دانت بج رہے ہیں۔ بند کرو انہیں۔'' اس نے اسکول کے بچے سے کہا
''کوئی بٹن تھوڑی ہے جسے میں آف کر دوں۔ نہیں ہو رہے بند۔''
وہ ہنسنے لگی اور کچن میں جا کر ان کے لیے چائے بنانے لگی۔ کچھ بسکٹ رکھے تھے' کچھ رسک تھے وہ لا کر ان کے سامنے رکھے۔
''کھانے سے پہلے میں چائے نہیں پیتا۔'' حسن نے ٹرے پر ایک نظر ڈالی' بسکٹ اٹھا لیے اور چائے وہیں رہنے دی۔
''اور میں چائے ہی نہیں پیتا' ہاٹ چاکلیٹ مل جائے گی؟ ورنہ بلیک کافی؟''
''اور آپ کیا لیں گی محترمہ؟'' اس نے جل کر لڑکی کی طرف دیکھا' جو سو میل گھنٹہ کی رفتار سے کپکپا رہی تھی۔
''میں یہ چائے پی لوں گی' کھانا پھر کھا لوں گی پھر تم مجھے کافی بنا دینا۔''
اس نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں دیا اور پھر ان تینوں کو اطمینان سے دیکھا۔
''آپ کسی ہوٹل میں نہیں بیٹھے ہوئے جہاں

آپ مینو کارڈ پڑھ کر مجھے آرڈر دے رہے ہوں۔ یہ چائے ہے' پی لیں' کھانے کے نام پر کچھ نہیں ہے۔ تھوڑے سے دال چاول رکھے تھے' وہ میں ایک گھنٹہ پہلے کھا چکی ہوں۔ اگر زیادہ بھوک لگی ہے تو نیچے ایک چھوٹی سی دکان ہے' وہاں سے لے آئیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دکان سے لے آؤں گا' کہاں ہے دکان؟" حسن نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن لحاف نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ اس نے بھی زیادہ زور آزمائی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لحاف برا مان سکتا تھا۔

"پہاڑی سے نیچے۔ عام رفتار سے جائیں تو پورے تیس منٹ لگتے ہیں۔" اس نے سکون سے مسکرا کر کہا۔

"عام رفتار سے تمہارا مطلب پیدل ہے نا؟"

"نہیں...... گاڑی سے...... یا ٹیکسی سے۔ ہیلی کاپٹر تو مشکل سے ملتے ہیں یہاں سواری کے لیے۔"

تینوں نے ایک ساتھ ہلکی سی چیخ ماردی۔

"کیا تم لوگ بہت زیادہ غریب ہو؟ تھوڑا سا بھی کھانا نہیں ہے جو ہمیں دے سکو۔ ہم صبح کے ہوٹل سے نکلے ہوئے ہیں۔ دن بھر کچھ کھا نہیں سکے۔ اب تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔" حسن نے اپنی طرف سے بہت تمیز سے کہا۔

"جی۔ ہم لوگ کافی غریب ہیں۔ تھوڑی بہت دالیں رکھی ہیں' لیکن سوکھی لکڑیاں نہیں ہیں' اسٹوو پر یہ چائے آپ کو بنادی ہے۔"

"تو تم لوگ کیا کرتے ہو؟"

"ہم لوگ کافی کچھ کرلیتے ہیں۔ انتظار کرتے ہیں کہ نیچے سے گاڑی آئے گی اور سوکھی لکڑیاں دے جائے گی۔ ورنہ ایک دن بھوکا رہ کر' ہم نیچے دکان سے کچھ لے آتے ہیں۔ تین چار دن ایسے نکل جاتے ہیں۔"

"اوہ! پھر؟"

"پھر یہ کہ میں سب کچھ آپ کو کیوں بتاؤں؟ کہہ دیا ہے کہ یہی چائے اور رسک ہیں تو یہی کھا لیں۔ زیادہ بحث نہ کریں۔ مہمان بن کر رہیں' فرمائشی نہ بنیں۔"

ان تینوں نے زوبیہ کی طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں ترحم تھا۔ تینوں نے خاموشی سے کپ اٹھا لیے اور رسک ڈبو ڈبو کر کھانے لگے۔ زوبیہ زیرلب ہنس دی۔

ہاٹ پاٹ میں بریانی رکھی ہوئی تھی۔ پہاڑی کے دوسری طرف شادی تھی۔ اماں وہاں گئی تھیں۔ جو کھانا بچ گیا تھا' وہ سب مہمانوں کو دے دیا گیا تھا۔ میٹھے چاول بھی تھے اور تھوڑا سا گاجر کا حلوہ بھی تھا۔ جب وہ لوگ اپنی چائے کے آخری گھونٹ پی رہے تھے تو وہ اندر جاکر جلدی جلدی بریانی کھا رہی تھی۔

سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کپکپانے والی ماہا کی رفتار کچھ کم ہوئی' اور چائے نے اسے کچھ نارمل کردیا' تو اس نے زوبیہ کی طرف دیکھ کر اپنا تعارف کروایا۔

"میرا نام ماہا ہے' میں حسن سے چھوٹی ہوں' اور یہ سامنے ہم دونوں کا چھوٹا بھائی ہے' نعمان نام ہے' پیار سے نومی کہتے ہیں۔"

"میرا نام زوبیہ ہے۔" اس نے بڑا اترا کر اپنا نام بتایا۔

"زوبیہ! تم ایسے ہی ہر ایرے غیرے کو گھر میں گھسنے دیتی ہو؟؟" ماہا نے پوچھا

"پہاڑی لوگوں کی ڈکشنری میں "ایرا غیرا" جیسا کوئی لفظ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے گھروں کے دروازے اس لیے بند نہیں رکھتے کہ کوئی آکر ہمیں لوٹ لے گا یا جان سے مار دے گا۔ اتنا ڈر کر رہنے کی عادت نہیں ہے ہمیں۔ ہم لوگوں کو ان کی آواز سے پہچان لیتے ہیں کہ وہ کتنے خطرناک ہیں اور ہمیں کتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

(انسان کو فلسفہ بگھارنے کا موقع مل جائے تو وہ زوبیہ کی طرح ایسے ہی لمبی لمبی چھوڑتا ہے)۔

"یعنی میری آواز سنتے ہی تمہیں معلوم ہوگیا تھا کہ میں بے حد شریف انسان ہوں۔ بالکل بے ضرر۔" حسن نے دانت نکالے۔

"تمہاری آواز سنتے ہی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ تم جتنے بھی برے ہو' میں اس برائی کا مقابلہ کرسکتی ہوں۔"

"اگر میں کوئی گن نکال لیتا؟"

"ٹھنڈ سے جس کی آواز نہیں نکل رہی تھی' وہ گن کیا نکالتا۔" کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ حسن کا چہرہ تپ گیا۔ ماہا نے منہ چھپا پھیر کر اپنی ہنسی چھپائی۔

"تمہاری زبان دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے تم نے اس چھوٹے سے گھر میں نہیں' کسی بڑے شہر میں زندگی گزاری ہے۔" حسن کچھ زیادہ ہی برا مان گیا تھا۔

"چھوٹے شہروں اور چھوٹے گھروں میں رہنے والے عقل مند یا تیز زبان نہیں ہوسکتے؟ یہ بھی کوئی برانڈڈ چیز ہے جسے صرف پیسے والے حاصل کر سکتے ہیں؟" زوبیہ نے تنک کر جواب دیا تھا۔ وہ تو کسی جن بھوت سے نہیں ڈرتی تھی۔ اس انسان سے بھلا کیا ڈرتی۔

اب ماہا کے لیے اپنی ہنسی چھپانا مشکل ہوگیا تھا۔ وہ اور نومی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کھل کر ہنسے۔

"حسن بھائی! ویسے کیا کمال بے عزتی ہوئی ہے آپ کی، واہ!"

حسن نے قریب رکھی کوئی چیز اٹھا کر نومی کو دے ماری۔ جو چیز ماری تھی' وہ چاول کی پنی کا پیکٹ تھا۔ نومی نے منہ پر لگنے والا پیکٹ اٹھا کر اور پھر حیرت سے دیکھا۔ "یہ گول گول گیندیں جیسی کیا ہیں؟"

زوبیہ کے منہ سے اوہ کی آواز نکلی۔ اس نے جھپٹ کر پیکٹ نومی کے ہاتھ سے چھین لیا۔ "یہ ہم لوگ سردیوں میں کھاتے ہیں۔"

"کھانے والی ساری چیزیں ہم بھی کھا لیتے ہیں' لائیں دکھائیں' یہ ہیں کیسی۔"

"یہ ہماری نہیں ہیں' کسی اور کی ہیں' کل انہیں جانی ہیں، امانت ہیں۔" اس نے جلدی سے پیکٹ صندوق میں رکھ دیا۔

تینوں نے للچائی ہوئی نظروں سے صندوق کی طرف دیکھا۔ انہیں اتنی بھوک لگی تھی کہ وہ کچھ بھی کھا سکتے تھے۔

"یار حسن بھائی! بڑی بھوک لگی ہے یار! جاؤ ذرا نیچے دکان تک چلے جاؤ۔"

حسن واقعی میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "اگر میری ناک درست کام کررہی ہے تو مجھے بریانی کی خوشبو آرہی ہے۔"

زوبیہ کانپ اٹھی۔ اس نے حسن کی طرف دیکھا۔ اگر اس کی ناک ایسے ہی کام کرتی رہی تو یہ ناک اسے کچن تک لے جائے گی' پھر ہاٹ پاٹ تک' پھر بریانی تک۔ وہ ان تینوں میں سے کسی کو بھی یہ بریانی کھلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ انہیں بھوکا رکھنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو سمجھتے کیا تھے۔ اٹھارہ سال وہ لوگ' یہاں اکیلے پڑے رہے تھے' اور انہیں اب ان کی یاد آئی تھی۔ اتنے سالوں بعد؟ کتنا تڑپتی رہی تھیں اماں۔ کتنا یاد کرتی تھیں اپنی بہنوں کو۔ اتنے سال سے' ان کے گھر کی طرف سے سڑک کو جاتی پگڈنڈی پکی ہوچکی تھی۔ ہر سال اماں بظاہر بکریوں کے لیے وہ پگڈنڈی پتھر ٹھوک ٹھوک کر پکی کرتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ سب جانتے تھے کہ یہ کن کے لیے پکی کی جارہی ہے۔

"میرے گھر میں ایسے دندناتے ہوئے نہ پھرو، سمجھے۔" جلدی سے اٹھ کر اس نے پیچھے سے اس کے ہڈ میں ہاتھ پھنسا کر اسے روک کر کہا۔

"یہ میری خالہ کا گھر ہے' میرا بھی اس گھر پر پورا حق ہے۔" سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر اس نے اسے اپنی طرف سے چونکا دینا چاہا لیکن اس کی مسکراہٹ پر وہ خود چونک گیا۔

"جب خالہ پر ہی تمہارا حق نہیں ہے' تو خالہ کے گھر پر کیسے ہوگا۔ چپ چاپ واپس جاکر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ' ورنہ میں دھکے دے کر نکال باہر کروں گی۔"

اس نے بھی اپنے سینے پر ہاتھ باندھ لیے۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ غصے سے' کچھ بے بسی سے' زیادہ شکووں سے۔

☆☆☆

میرا نام حسن ہے' اور میں اپنی ماما کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ امریکا میں زندگی گزارتے ہوئے مجھے کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا کہ میری ماں کی ایک اور بہن بھی ہے۔ ایسی بہن جسے وہ بہت پیچھے کہیں بھول آئی ہیں۔ گم کر چکی ہیں۔ میں سولہ سال کا تھا جب پہلی بار ماما کو کمرے میں بیٹھ کر روتے ہوئے دیکھا۔

''ایسے کیوں رو رہی ہیں آپ ماما! کیا ہوا؟''

انہوں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے' اور ہنس دیں۔ ''مجھے تمہاری خالہ یاد آرہی ہے۔''

''تو ان سے فون پر بات کرلیں۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔''

میں نے اپنا فٹ بال ہوا میں اچھالا اور باہر چلا گیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کویت والی رضیہ خالہ کی بات نہیں کر رہی تھیں۔ وہ کسی اور ہی خالہ کو یاد کر رہی تھیں۔ اس خالہ کو جن سے وہ پچھلے بیس سال سے نہیں ملی تھیں۔ جو ان کی تیسری چھوٹی لیکن سوتیلی بہن تھی۔

اپنی اس سوتیلی خالہ کے بارے میں مجھے اس عید پر معلوم ہوا تھا جس عید پر رضیہ خالہ کویت سے ہمارے گھر رہنے آئی تھیں۔ ہم سب کزنز میرے کمرے میں تھے اور ماما' خالہ اور ماموں سب لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں کسی کام سے کچن میں آیا تو ان کی باتیں سن لیں۔ ماما پھر رو رہی تھیں۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھیں۔

''وہ تو بہت معصوم تھی۔ بہت پیار بھی کرتی تھی مجھ سے۔ کاش میں واقعی میں اس کی بڑی بہن بن جاتی۔ کیسی من موہنی صورت تھی اس کی۔ کیسے بھاگ بھاگ کر میرے کام کرتی تھی۔ اب پتا نہیں کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔''

میں نے یہ جملے سنے' اور میں انہیں بھول بھی جاتا اگر دن بدن ماما کا اسٹریس لیول بڑھ نہ رہا ہوتا۔ بار بار ان کی دوائیں تبدیل نہ کی جارہی ہوتیں۔ وہ بہت بے چین رہنے لگی تھیں۔ میں یا ماہا کچھ بھی پوچھتے تو وہ ٹال جاتی تھیں۔ پھر جب وہ بہت زیادہ چپ اور اداس رہنے لگیں تو میں نے اور ماہا نے ان سے سب کچھ معلوم کرنے کی ٹھان لی۔ تب انہوں نے بتایا۔

☆☆☆

''میری امی بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔ ابو نے اپنے دوست کی بیوہ بہن سے شادی کرلی تھی۔ میری سوتیلی ماں بڑی اللہ لوک سی عورت تھیں۔ چپ چاپ سب کام کرتیں' ہم تینوں بہن بھائیوں کا خیال رکھتیں اور ہم سے بہت پیار بھی کرتی تھیں لیکن جیسے ہی وہ ایک بچی کی ماں بنیں۔ مجھے لگا ہم سے ہماری ماں پھر چھن گئی۔ پتا نہیں کیوں' شاید میں بہت حساس تھی۔ میری سوتیلی بہن زینب بہت خوب صورت تھی۔ سب اس سے بہت پیار کرتے تھے' جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی۔ مجھے اس سے عجیب سا خار ہونے لگا تھا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ مجھے آپا کہتی اور ہر وقت میرے آگے پیچھے گھومتی رہتی تھی۔ پیار تو میں بھی اس سے بہت کرتی تھی لیکن میرے اندر سوتیلا پن جاگ جاتا تھا۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی بہت معصوم تھی۔ کبھی ضد نہیں کرتی تھی۔ جو کہو مان لیتی تھی۔ ہم تینوں بہن بھائی سے جو بچ جاتا تھا امی اسے وہ کھانے کے لیے دیتی تھیں۔ ہمارے پرانے کپڑے اسے پہناتی تھیں۔

جب وہ بھی ہمارے ساتھ اسکول جانے لگی تو میں اکثر اس سے اپنا اسکول بیگ اٹھواتی تھی۔ وہ پڑھنے میں تھوڑی نالائق تھی۔ دل نہیں لگتا تھا اس کا پڑھنے میں۔ پھر امی نے اسے گھر ہی بٹھا لیا اور سلائی کڑھائی سکھانے لگیں۔ ہم کالج جاتے تھے اور وہ گھر کے سب کام کرتی رہتی تھی۔ ہمارا بھائی باہر چلا گیا تو امی ابو نے رضیہ کی شادی کردی۔ ہم دونوں گھر میں رہ گئیں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ ہر وقت میرے لیے کچھ نہ کچھ پکاتی رہتی تھی۔ میری سہیلیاں ملنے کے

لیے آتی تھیں تو ان کی بھی بہت آؤ بھگت کیا کرتی تھی۔

میری ایک سہیلی کو زینب بہت پسند تھی۔ وہ اپنے بھائی کے لیے زینب کا رشتہ لے کر آگئی۔ اس کا بھائی آرمی میں تھا۔ پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے حسد نے گھیر لیا۔ میں نے یہ رشتہ تو نہ ہونے دیا لیکن یہ بات نہیں بھولی کہ میرے ہوتے ہوئے میری سہیلی نے زینب کو فوقیت دی تھی۔

اسی دوران میری خالہ نے اپنے بیٹے کے لیے میرا رشتہ مانگ لیا تھا۔ امی نے میرا نکاح پڑھوا دیا تھا۔''

''اور زینب خالہ؟'' میں نے اور ماہا نے بہت بے تاب ہو کر پوچھا تھا۔

''میرے نکاح کے بعد ابو کی ہارٹ اٹیک سے ڈیتھ ہوگئی تھی۔ امی نے یہ غم دل سے لگا لیا اور بیمار رہنے لگیں۔ انہیں ابو کی موت سے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ اب انہیں یہ خوف بھی رہنے لگا تھا کہ اگر اچانک وہ بھی مرگئیں تو زینب کا کیا ہوگا۔

زینب میٹرک پاس بھی نہیں تھی۔ وہ خوب صورت اور سلیقہ مند تو تھی لیکن پھر بھی اس کے لیے بہت معمولی سے رشتے آرہے تھے۔ میری خالہ یعنی میری ساس نے اپنے چھوٹے بیٹے یعنی تمہارے چچا کے لیے زینب کا ہاتھ مانگنا چاہا تو میں نے فساد ڈال دیا۔ زینب کے خلاف ان کے کان بھرے۔ ان کے سامنے زینب کو بہت برا بنا دیا تو خالہ اس رشتے سے پیچھے ہٹ گئیں۔

میری ایک سہیلی نے اپنے کزن کا رشتہ بتایا تھا۔ اس کا کزن گاؤں میں رہتا تھا۔ چند جماعتیں پاس تھا۔ امی کی طبیعت تو خراب رہتی تھی اور پھر وہ کم ہی گھر سے نکلتی تھیں۔ انہوں نے مجھے اور میری بڑی خالہ کو لڑکا دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔

لڑکا تو ٹھیک تھا لیکن ان کا گھر کچا تھا اور لوگ بہت اجڈ اور گنوار سے تھے۔ گاؤں بھی بہت دور تھا۔ خالہ کو تو یہ رشتہ بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا لیکن میں نے گھر آکر اس رشتے کی اتنی تعریفیں کیں کہ امی نے رشتے کے لیے ہاں کہہ دی۔

''یعنی یہ شادی ہوگئی تھی۔ تو ماما! زینب خالہ خوش تھیں؟'' ماہا نے بے تابی سے پوچھا

''ہاں...... شادی ہوگئی تھی۔ زینب خوش تھی یا نہیں' یہ میں نہیں جانتی لیکن وہ بہت چپ رہنے لگی تھی۔ اگر کوئی پوچھتا کہ بتاؤ سسرال کیسا ہے تو وہ بس اتنا ہی کہتی ''جو نصیب میں تھا' مل گیا۔'' ایک دو بار میں نے بھی کریدنے کی کوشش کی تو وہ بس مجھے دیکھ کر رہ جاتی تھی۔

امی کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ رات دن ان کی خدمت کرتی رہتی تھی۔ میری بھی رخصتی ہوچکی تھی۔ اس کی شادی کے ٹھیک پانچ مہینے بعد امی اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ وہ بہت روئی تھی۔ ہماری وہ سوتیلی ماں تھیں لیکن اس کی سگی ماں تھیں۔ اس کا تو پیچھے کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ میرے پاس تو پھر تمہاری رضیہ خالہ اور جمشید ماموں تھے۔

جنازے کے بعد اس نے امی کا سامان سمیٹا۔ کچھ چیزیں اپنے پاس رکھیں اور باقی چیزیں ہم تینوں بہن بھائیوں کے سامنے لاکر ڈھیر کردیں اور بس اتنا کہا کہ

''میں نے چند چیزیں ماں کی نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ لی ہیں' باقی آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ اب میں جارہی ہوں۔ اللہ حافظ۔''

جیسے ہی اس نے اللہ حافظ کہا میرے دل کو پتا نہیں کیا ہوا۔ میں ایک دم سے تڑپ کر اٹھی۔

''تم کہاں جارہی ہو زینب!''

''اپنے گھر جارہی ہوں آپا! اور میرا اب ٹھکانا ہی کون سا ہے۔'' اس کی آواز میں بڑا غم تھا۔

''ایسے اچانک۔ کیا ہوا؟''

''جنازہ اٹھ چکا ہے۔ اب اور یہاں رہ کر کیا کروں گی۔ میرا اپنا یہاں ہے ہی کون۔''

''ہم تمہارے بہن بھائی ہیں۔ میں بڑی بہن ہوں تمہاری زینب! تم تو ہمارے گلے لگ کر روئیں

بھی نہیں۔"

وہ افسوس سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"کون سی بڑی بہن؟ آپ سوتیلی بہن ہیں میری۔ آپ کی اپنی خالہ زاد بہنیں مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ آپ مجھ سے جلتی ہیں لیکن میں نے کبھی ان کا یقین نہیں کیا تھا۔ آپ کی سہیلی نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے بھائی کے لیے میرا رشتہ مانگ رہی تھی لیکن آپ نے یہ رشتہ نہیں ہونے دیا۔ میں نے آپ کی سہیلی سے بات ہی کرنا چھوڑ دی۔ اس سے کہہ دیا کہ آپ میری بڑی بہن ہیں۔ میرا اچھا برا سب سمجھتی ہیں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی تھی۔ میں نے کبھی آپ کو سوتیلی بہن نہیں سمجھا تھا۔ آپ نے میری شادی گاؤں میں کر دی' مجھے اس کا بھی برا نہیں لگا۔ میرا دل اس وقت ٹوٹا جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ تو مجھے اپنی بہن ہی نہیں سمجھتیں۔ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ مجھے خود سے کمتر سمجھتی ہیں۔ شادی تو جہاں ہونی تھی وہاں ہو گئی' لیکن آپ نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔

میری ماں بے شک اللہ لوک تھی لیکن آپ تو دنیا دار تھیں۔ آپ سب سمجھتی تھیں کہ آپ میرے ساتھ کیا کر رہی ہیں۔ مجھے دکھ ہے تو صرف اس بات کا کہ اتنے سال میری ماں نے آپ کی خدمت کی' آپ سب کو مجھ سے زیادہ اہمیت دی' اور آپ نے کیا کیا؟ جب اتنے سالوں میں آپ لوگ میری ماں کے نہیں بنے تو میرے کیا بنیں گے؟

ہم نے کبھی اف نہیں کی۔ میں نے آپ کی اترن پہنی ہے۔ آپ کا بچا ہوا کھانا ہم دونوں ماں بیٹی نے کھایا ہے۔ امی نے ہمیشہ آپ سب کے اچھے نصیب کی دعائیں کی تھیں۔ لیکن میرا نصیب خراب کرنے میں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ہر لڑکی کے کچھ خواب ہوتے ہیں آپا! آپ کی سہیلی کا بھائی مجھے اچھا لگا تھا لیکن آپ نے یہ رشتہ نہیں ہونے دیا تو میں نے بھول کر بھی اس لڑکے کے بارے میں دوبارہ نہیں سوچا تھا۔ آپ کی خالہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ایسی پیار کرنے والی ساس کے لیے ہر لڑکی دعا کرتی ہے۔ لیکن آپ نے یہ بھی نہیں ہونے دیا۔ یہ سب باتیں معمولی ہیں لیکن ان کے نتیجے بہت بھیانک ہیں۔ میرا اس گھر پر اور آپ میں سے کسی پر کوئی حق نہیں ہے۔ میں جا رہی ہوں۔"

وہ یہ کہہ رہی تھی اور میں چپ چاپ سن رہی تھی۔ دو دن تک تو مجھے اس کے الفاظ یاد آتے رہے لیکن پھر میں بھول گئی۔ میں واقعی میں بہت پتھر دل تھی۔ وہ مجھے صاف صاف اتنی باتیں سنا گئی تھی تو میرا دل اس سے کھٹا ہو گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ میں اس سے معافی مانگتی میں اسے بھول گئی۔

امریکا آ کر تو زندگی اور مصروف ہو گئی تھی۔ تین بچوں کی ماں بن گئی تو بالکل ہی دنیا کا ہوش نہیں رہا۔ امریکا آنے سے پہلے میں ایک بار زینب سے ملنے گئی تھی لیکن وہ اپنے میاں کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ نہ میرے پاس اتنا وقت تھا' نہ مجھے زینب سے اتنا پیار تھا کہ میں اس سے ملنے کے لیے کہیں اور جاتی۔

"پھر اب آپ روتی کیوں ہیں؟"

"پتا نہیں کیوں اب رہ رہ کر وہ مجھے یاد آتی ہے۔ ہر وقت اس کا نام ذہن میں کلبلاتا رہتا ہے۔ جیسے وہ اپنی ماں کے مرنے پر رو رہی تھی' وہ روتا یاد آتا ہے پھر وہ اجاڑ گاؤں یاد آتا ہے' جہاں اس کا کچا سا گھر تھا۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا کیا ہوا ہو گا۔ اس نے کیسے کیسے حالات دیکھے ہوں گے۔"

"آپ جا کر ان سے مل لیں۔ ان سے کہیں کہ آپ ان سے شرمندہ ہیں۔"

"سات سال پہلے ایک بار گئی تھی اس سے ملنے۔ جہاں اس کا سسرال تھا' اب وہاں کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔ وہ لوگ وہاں سے بہت پہلے ہی جا چکے تھے۔ گاؤں میں جس عورت سے میں زینب کے بارے میں معلوم کر رہی تھی وہ عورت بار بار مجھ سے ایک ہی سوال کر رہی تھی۔

"آپ زینب کی کون ہیں؟ وہ یہاں پانچ چھ

سال رہی ہے تب تو اس کے پیچھے کوئی نہیں آیا۔ ساری دنیا زینب سے پوچھتی تھی کہ اس کے میکے سے کوئی آتا کیوں نہیں ہے تو وہ بے چاری رو دیتی تھی۔ بڑے طعنے سنے ہیں اس نے سب کے۔"

"آپ کا کوئی رشتہ دار ایسا نہیں ہے جو ان سے ملتا رہا ہو؟"

"چند ایک رشتے داروں سے وہ مل لیتی تھی' پھر شاید وہ اتنی دُور چلی گئی کہ کوئی اس سے مل نہیں سکا پھر میری ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اگر کسی اور نے پوچھ لیا کہ آپ کون ہیں اور زینب کی کیا لگتی ہیں تو کیا جواب دوں گی۔ اگر کہا کہ بہن ہوں تو پوچھیں گے بہن کو اپنی چھوٹی بہن اتنے سالوں بعد یاد آئی ہے۔ اگر یہ بتایا کہ سوتیلی بہن ہوں تو لوگ ہنس کر کہیں گے "ہاں سوتیلی ہی لگتی ہو' سگی ہوتیں تو بہن کی خیر خبر رکھتیں، اس سے ملتی جلتیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما آپ! جیسے آپ رضیہ خالہ کو ہر دوسرے دن فون کرتی ہیں۔ ان کا حال چال پوچھتی ہیں۔ ایسے ہی اگر زینب خالہ آپ کی سگی بہن ہوتیں تو آپ دو دن ان سے بات کیے بغیر نہ رہتیں۔"

ماہا نے کہا۔ ماما نے گہری سانس لی اور اداسی سے ہنس دیں۔

"بس بیٹا! اسی شرمندگی نے مجھے دوبارہ اس کا اتا پتا معلوم کرنے نہیں دیا۔ سوچتی ہوں' وہ مجھ سے ملے گی تو کیا کہے گی۔ اگر کچھ نہ بھی کہا تو بھی میں شرمندگی سے ڈوب مرنے کے قریب ہو جاؤں گی۔ کچھ کہہ دیا تو بھی۔ مجھ جیسا انسان بہت برا ہوتا ہے۔ اس کی سگی ماں جو میری سوتیلی ماں تھی' ہماری تربیت میں انہوں نے کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی۔ ایک میں تھی' جو اس سے حسد کرتی تھی۔ وہ ایک ذرا خوب صورت ہی تو تھی۔ میں نے اپنے حسد میں اس کا کتنا نقصان کر دیا۔ بھولی بھالی سی زینب، مجھے جب جب یاد آتی ہے' دل پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔"

"ماموں کو بھیجیں پاکستان' وہ پتا معلوم کریں ان کا۔"

"تمہارے ماموں اور تمہاری رضیہ خالہ' دونوں کو کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس سے۔ ویسے بھی ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ وہ اسے یاد تو کرتے ہیں لیکن بس اتنا کہ یاد کر لیا اور بس۔ ملنا تو میں اس سے چاہتی ہوں۔"

☆☆☆

ایسا نہیں تھا کہ فلموں کی طرح میں نے فوراً کمر کس لی تھی کہ اب اپنی خالہ کو میں ڈھونڈوں گا۔ ماہا چاہتی تھی کہ ہم یہ ایڈونچر کریں۔ یعنی ہماری ایک عدد خالہ لاپتا ہیں۔ ان خالہ کو ڈھونڈ نکالا جائے۔ کیا پتا' وہ کوئی بہت اہم انسان بن چکی ہوں۔ وہ ہماری ماما اور ہماری رضیہ خالہ سے بھی بہت آگے نکل چکی ہوں۔ ماہا کو عادت تھی بیٹھے بیٹھے کہانیاں بنا لینے کی۔ وہ ہفتوں میرا سر کھاتی رہی تھی۔ پھر وہ مجھے جذباتی بلیک میل کرنے لگی تھی۔

"کیا پتا انہیں ہماری ضرورت ہو۔ وہ بیمار ہوں یا بہت زیادہ برے حالات کا سامنا کر رہی ہوں۔ یا وہ امی کو یاد کر کر کے روتی ہوں۔ ہو سکتا ہے' وہ ہماری راہ دیکھ رہی ہوں کہ ہم کب ان سے ملنے آتے ہیں۔"

ماہا کا یہ آخری تیر کچھ نشانے پر لگا تھا۔ ہم تینوں بہن بھائی سارا سال کچھ پیسے الگ سے جمع کرتے تھے اور پھر سال کے آخر میں انہیں خیرات کر دیتے تھے۔ بچپن سے ہماری یہی عادت تھی اگر کسی دوست وغیرہ کو کالج فیس وغیرہ میں مسئلہ ہوتا تھا وہ بھی ہم ان ہی پیسوں سے حل کرتے تھے۔ اب ماہا نے کہا کہ خالہ کو مالی مسائل ہو سکتے ہیں۔ یا وہ بیمار ہو سکتی ہیں اور کسی اپنے کی مدد کے انتظار میں بھی ہو سکتی ہیں۔ تو میں نے فوراً پاکستان جانے کے بارے میں سوچا۔

یہ ایک لمبی کہانی ہے کہ ہم کیسے خالہ کے سسرال گاؤں گئے۔ وہاں سے بھٹکتے ہوئے ہم کوئی چار چھوٹے اور تین بڑے شہروں تک گئے۔ جو ہمیں جہاں کا بتاتا تھا ہم وہاں چلے جاتے تھے۔ ایک مہینہ

ہم ایسے ہی ادھر ادھر گھومتے رہے تھے۔ ہر جگہ ہم اپنا فون نمبر دے آتے تھے کہ جسے بھی خالہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہو وہ ہمیں بتا دے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو ہم واپس آگئے۔ اب ماما اور شرمندہ رہنے لگی تھیں کہ خالہ پتا نہیں کہاں چلی گئی ہیں۔

چھ مہینے گزرے تو ہمیں کچھ فون کالز آئیں جن کی مدد سے اتنا معلوم ہوا کہ خالہ کسی پہاڑی گاؤں میں شفٹ ہو چکی ہیں۔ چونکہ یونیورسٹی سے چھٹیاں نہیں تھیں اس لیے ہم واپس جا کر خالہ سے نہیں مل سکتے تھے۔ جیسے ہی سمسٹر آف ہوا' تو ہم پاکستان آگئے۔ یہ خالہ کے شوہر کا دور کا رشتے دار تھا۔ جو خالہ کے خاندان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کر چکا تھا۔ خالہ کے شوہر کراچی میں ہوتے تھے۔ خالہ کسی پہاڑی علاقے میں ہوتی تھیں۔

اس بار پھر سے ہمیں ایک سے دوسرے شہر کا سفر کرنا پڑا۔ جس گھر سے خالہ کے گھر کا تھوڑا بہت پتا ملتا تھا' وہاں بھی ایک رات رہے' اور کیسے رہے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ وہ لوگ ہمیں بار بار کہہ رہے تھے کہ

''گرمیوں میں تو اس سے بھی زیادہ مکھیاں ہوتی ہیں' ہم خوش قسمت ہیں جو سردیوں میں وہاں آئے ہیں۔'' پتا نہیں ہم کتنے خوش قسمت تھے کیونکہ جس جگہ کا پتا ہمیں دیا گیا' وہاں دو دن تک بھٹکنے کے بعد بھی ہمیں دور دور تک خالہ سے ملاقات کا امکان نظر نہیں آرہا تھا۔

تیسرا سارا دن بھی گزر گیا اور پھر اکا دکا دکانوں میں سے ایک آدمی نے نکل کر ہماری مدد کی اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر بہت دور ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ ہے وہ گھر جس کی ہمیں تلاش ہے۔ وہ گھر اتنا دور تھا' کہ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ برف باری زور و شور سے ہو رہی تھی۔ میں نے ماہا کی طرف دیکھا۔

''ہو سکتا ہے یہ گھر بھی خالہ کا نہ ہو۔'' پچھلے دو دن سے ہم کافی گھروں کو خالہ کا گھر سمجھ کر دروازہ بجا چکے تھے اور اپنی طرف سے دل ہی دل میں خوش بھی ہو چکے تھے۔

''کہہ تو صحیح رہے ہو۔'' ماہا بھی اتنی دور جانے سے ڈر گئی تھی۔

''چلو' واپس چلتے ہیں۔'' نومی نے کہا۔ ''بڑی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

میں نے کرائے کی گاڑی اسٹارٹ کی' جس کے ہیٹر نے بیچ راستے میں ہی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ابھی کچھ دور تک ہی گیا تھا کہ ماہا نے میرا بازو کھینچا۔ ''اگر یہ خالہ کا گھر ہوا تو؟''

اب میں نے کار روک کر اسے گھورا۔ ''اچھی طرح سے سوچ لو۔ اتنی دور تک پیدل چل کر جانا ہو گا۔ گاڑی صرف سڑک تک جائے گی۔''

''تم ایسا کرو' تم جاؤ اور جا کر پوچھ آؤ' ہم یہیں گاڑی میں بیٹھے رہتے ہیں۔''

''یعنی میں مروں' میں ہی مروں۔ کیوں؟ چلو ایسا کرتے ہیں ابھی واپس چلتے ہیں۔ کل دن میں آجائیں گے۔ ویسے بھی درجہ حرارت بہت گر گیا ہے۔ میں تو فریز ہو رہا ہوں۔'' میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جیسا کہ کہتے ہیں مصیبت بارش' ٹھنڈ' وغیرہ کا لحاظ نہیں کرتی' بس وہ آجاتی ہے۔ تو گاڑی نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اب ہم آگے جا سکتے تھے نہ پیچھے۔ جا سکتے تھے تو اسی گھر میں جو بل کھاتے پہاڑی راستوں پر دور نیچے نظر آرہا تھا۔

''اب کیا کروں؟'' میں جھلا گیا تھا۔ گھور کر دونوں کو دیکھ رہا تھا جیسے گاڑی کو خراب کرنے میں ان کا ہی ہاتھ تھا۔

''اب اگر وہ خالہ کا گھر نہیں بھی ہے تو بھی ہمیں وہیں جانا ہو گا۔ کیونکہ اس طرف کوئی گاڑی یا ٹیکسی نہیں ملے گی۔ اب اٹھ بھی جاؤ حسن! جاؤ جا کر پتا کرو کہ وہ لوگ ہمیں رات رکھتے ہیں یا نہیں۔ پھر ہمیں بھی بلا لینا۔''

''تم لوگ بھی ساتھ چلو۔ یہاں بیٹھ کر کیا کرو گے۔''

''پاگل انسان! پتا نہیں گھر کا ماحول کیسا ہے۔ اپنی خوب صورت جوان بہن کو لے کر جا رہے ہو وہاں۔ کوئی سوچ ہے تم میں یا نہیں؟ بالکل ہی ڈفر ہو تم۔ آج کل حالات ویسے بھی بہت خراب رہتے ہیں یہاں کے۔''

میں نے گھور کر ماہا کو دیکھا۔ اب اسے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ماحول اور گھر کے لوگوں کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ جینز' جوگرز' پہن کر وہ خود کو ٹارزن سمجھتی رہی تھی۔ اب ایک دم سے پھس ہو گئی تھی۔

''وہاں جاؤ ہوشیاری سے دیکھو۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو اشارہ کر دینا۔''

''اشارہ؟ کیسا اشارہ؟''

''او بھائی میرے! کوئی ٹارچ وغیرہ آن کر کے ہماری طرف لائٹ مار دینا' یا سیٹی مار دینا۔ ہم نیچے آجائیں گے۔ اور دیکھو اگر وہاں بہت برے لوگ رہتے ہوں' اور وہ تمہیں اغوا وغیرہ کر چکے ہوں تو تم ایک ہی سانس میں وقفے وقفے سے تین بار سیٹی مارنا' ہمیں پتا چل جائے گا کہ ہمیں نیچے نہیں جانا بلکہ یہاں سے بھاگ جانا ہے۔''

''اوہ! تم بھاگ جاؤ گے اور مجھے اکیلا چھوڑ جاؤ گے۔ میں تو واقعی میں ڈفر ہوں۔'' وہ ایسی ویران جگہ پر پھنس جانے پر تھوڑا پریشان سا تھا۔

''کل آئیں گے نا ہم پولیس کے ساتھ۔ بچا لیں گے تمہیں۔''

''اگر رات ہی رات انہوں نے مجھے قتل کر دیا پھر؟''

''اتنی جلدی میں وہ تمہیں قتل کیوں کریں گے۔ اتنے بے صبرے نہیں ہو سکتے وہ۔'' نومی نے پچھلی سیٹ سے سر آگے کی طرف جھکاتے ہوئے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

وہاں شام کچھ زیادہ ہی اندھیری تھی۔ دور دور تک کسی روشنی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ کوئی انسان بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ سفید برف' اور لمبے درخت نظر آرہے تھے۔ وہ تینوں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی خالہ اس جنگل میں رہتی ہوں گی۔

☆☆☆

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیوار پر لگی ایک تصویر دیکھ لی تھی' اسے پہچاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا کہ وہ تصویر زینب خالہ کی ہے۔ ماما کے پاس جو چند تصویریں تھیں' ان کی مدد سے اس نے انہیں فوراً پہچان لیا تھا۔ جو لڑکی اس کے سامنے کھڑی قینچی جیسی زبان چلا رہی تھی اس میں بھی خالہ کی شباہت موجود تھی۔

''خالہ کہاں ہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ ماہا اپنی جگہ سے اچھل پڑی تھی۔

''یہی ہماری خالہ کا گھر ہے؟ سچی؟ یہ ہماری کزن ہے۔''

زوبیہ نے اپنا رخ موڑ لیا۔ جو بھی تھا' وہ انہیں اپنے آنسو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ وہ ان پر اپنی ماں کے دل کا دکھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ کیسے اماں نے اپنے بہن بھائیوں کا ساری زندگی انتظار کیا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی' تب وہ گاؤں میں تھے۔

وہ پانچ سال کی تھی جب ایک حادثے میں ابو ایک ٹانگ سے معذور ہو گئے تھے۔ اسے آج بھی یاد تھا کہ وہ بہت برے دن تھے۔ اماں کو ایک ایک نوالے کے لیے اس کے چچاؤں کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ وہ اسکول سے واپس آتی تھی تو اماں نے اس کے لیے تھوڑے بہت کھانے کا انتظام کر کے رکھا ہوتا تھا۔ اکثر اماں کئی کئی دن صرف ایک وقت کا کھانا کھاتی تھیں۔ ابو کی دوائیوں کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ ایک ایک کر کے اماں کا سارا زیور بک گیا تھا۔ دو سال ایسے ہی غربت میں گزر گئے تھے۔ لیکن ابو کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی تھی۔

پھر ابو کے ایک دوست انہیں اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ وہاں وہ ایک چائے کے ہوٹل میں کام کرنے لگے تھے۔ دادا کی وفات کے بعد گاؤں کی

زمین سے ابو کو ان کا حصہ ملا تو انہوں نے وہ زمین بیچ کر اپنے دوست کے مشورے سے اپنا چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا تھا۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں تو وہ ایک کھوکھا بھی نہیں کھول سکتے تھے، اس لیے وہ اپنے دوست کے آبائی شہر ٹھنڈیانی آگئے اور وہاں چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا۔

شروع شروع میں انہیں بہت نقصان ہوا تھا۔ وہ لوگ مری میں کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ ہوٹل کے بھی بہت خرچے تھے۔ ان پر قرض چڑھنے لگا تھا۔ پھر ابو انہیں اپنے ساتھ اسی ہوٹل کے قریب لے آئے تھے۔ وہاں ایک پرانا' ٹوٹا پھوٹا سا گھر تھا جو انہوں نے خرید لیا تھا۔

سامنے برآمدہ' پھر کمرا' پیچھے چھوٹا سا کچن اور اسٹور تھا۔ وہ لوگ وہاں رہنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ گھر کی مرمت ہوتی رہی تھی۔ تب تک وہ دس جماعتیں پاس کر چکی تھی۔ وہ کالج جانا چاہتی تھی لیکن امی اکیلی لکڑیوں پر ہوٹل کے لیے کھانا بناتی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرنے لگا تھا' ان کا ہوٹل چلنے لگا تھا۔ ابو نے ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا اور اس کا چھوٹا بھائی بھی ابو کے ساتھ مل کر کام میں مدد کروانے لگا تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی ہوٹل کے اوپر کے کام کرنے لگی تھیں۔ وہ پانی بھرتیں' برتن دھوتیں' لکڑیاں کاٹ کر آگ کرتی تھیں۔

سردیوں میں ہوٹل بند ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی برف باری شروع ہوتی' وہ ہوٹل کو تالا لگا دیتے تھے۔ ابو واپس کراچی چلے جاتے تھے اور سردیوں کے دنوں میں اپنے دوست کے ہوٹل میں کام کرتے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی حارث میٹرک کے بعد کالج جانے لگا تھا۔ وہ مری کے ایک کالج میں پڑھتا تھا' اور وہیں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار چکر لگا لیتا تھا۔

باقی کے دن وہ دونوں ماں بیٹی اکیلی رہتی تھیں۔ اور وہ وہاں اکیلی نہیں تھیں۔ ذرا دور نیچے ایک اور گھر تھا' وہاں بھی پانچ عورتیں رہتی تھیں۔ مرد شہروں میں کام کے لیے چلے جاتے تھے۔ کوئی مہینے میں آتا تھا اور کوئی ہفتے میں آتا تھا۔ انہیں عادت تھی ایسے اکیلے رہنے کی۔ سڑک کی طرف جن لوگوں کی دکانیں تھیں' وہ لوگ سڑک کی طرف آنے جانے والوں پر نظر رکھتے تھے۔ اس سڑک کی طرف گنے چنے لوگ ہی آتے تھے۔ گرمیوں کی اور بات ہوتی تھی۔ تب وہاں گھومنے پھرنے' آنے والوں کا بہت رش ہوتا تھا۔ تب سب مرد بھی گھر پر ہوتے تھے۔

وہ دو دن پہلے گھر کا کچھ ضروری سامان لینے بازار گئی تھی۔ جس دکان سے وہ دالیں وغیرہ لے رہی تھی' اس کے باہر ایک گاڑی آکر رکی تھی' اور اس میں سے حسن نکل کر باہر آیا تھا اور دکاندار سے اماں کے بارے میں پوچھنے لگا تھا۔ اس نے ابو کا نام بھی لیا تھا۔ دکاندار نے گول مول جواب دیا اور کہا کہ وہ معلوم کر کے بتا دیں گے۔ کل آنا۔ جب وہ چلے گئے تو چچا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بیٹا! یہ کون لوگ ہیں؟ تمہارے ابو اور امی کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

اس نے گہرا سانس لیا۔ اگر اس کا اندازہ درست تھا تو یہ اس کی ماں کے گھر والے تھے' جن کا وہ پچھلے کئی سالوں سے انتظار کر رہی تھیں۔

''امی کے گھر والے ہیں شاید! دوبارہ آئیں تو گھر کا پتا بتا دیجیے گا۔''

اس نے ان تینوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ گھر آکر اماں کو بتانا چاہتی تھی لیکن بتا نہیں سکی تھی۔ ہو سکتا ہے اسے غلط فہمی ہوئی ہو' یہ اماں کے میکے والے نہ ہوں۔ وہ اماں کو بتا کر آس میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کئی بار اپنی ماں کو چھپ چھپ کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ انہیں اپنے بچپن کی باتیں سناتیں تو ان باتوں میں دو بہنیں اور ایک بھائی بھی آجاتے تھے۔ وہ پوچھتے کہ اب یہ بہن بھائی کہاں ہیں تو وہ خاموش ہو جاتیں۔ پھر انہوں نے ان کے سوالوں سے تنگ آکر یہ باتیں ہی کرنی بند کر دی تھیں۔

دونوں نے بہت مشقت بھری زندگی گزاری تھی۔ رات دن کام کیا تھا' ایک ایک پیسہ بچایا تھا۔ بہت کم آسائشیں دیکھی تھیں۔ اماں کے پاس گنے چنے کپڑے تھے۔ وہ اتنی خوب صورت تھیں کہ کوئی پرانا سا سوٹ بھی پہن لیتیں تو ان پر سج جاتا۔

اس ایک کمرے کے گھر کو انہوں نے بہت مشقت سے مضبوط کیا تھا۔ سردیوں میں برف کی وجہ سے سب گھروں میں بند ہو جاتے تھے' اس لیے وہ ساری گرمیاں سوکھی لکڑیاں اکٹھی کرتی رہتی تھیں۔ وہ بہت احتیاط سے ہر چیز کا استعمال کرتی تھیں۔ ایک ایک روپیہ بچا کر انہوں نے ان دونوں کو پڑھایا لکھایا تھا۔ انہوں نے ہر چیز پر صبر کیا تھا لیکن کبھی ان کی اسکول کی چیزوں میں کمی نہیں آنے دی تھی۔ کتنا بھی کام ہوتا' اماں اسے امتحان کے دنوں میں کسی بھی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھیں۔

وہ بار بار اس سے ایک ہی بات کہتی تھیں کہ پڑھ لکھ کر میرا فخر بن جاؤ۔ میں ساری زندگی جاہل رہی ہوں۔ میں تمہیں جاہل نہیں رکھنا چاہتی۔''

دونوں بہن بھائیوں نے ہر کلاس میں پوزیشن لی تھی۔ اس نے میٹرک میں ٹاپ کیا تھا۔ حارث کو اسکول سے اسکالرشپ ملا تھا۔ دونوں کو حکومت کی طرف سے لیپ ٹاپ بھی مل چکا تھا۔ مالی طور پر وہ مستحکم نہیں تھے۔ لیکن اتنے غریب بھی نہیں تھے' جتنا اس نے حسن کو بتایا تھا۔ موم بتی اس نے اس لیے جلائی تھی کہ وہ انہیں اندھیرے سے خوف زدہ کرنا چاہتی تھی۔ ٹیوب لائٹ کا تار نکال دیا تھا کیونکہ وہ اپنی ماں کی اداسی کا بدلہ ان سب سے لینا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اس گھر میں انہیں وی آئی پی پروٹوکول نہیں دے سکتی تھی۔

وہ انہیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ اگر وہ لوگ باہر سے آئے ہیں یا اس کی سوتیلی خالہ امیر ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے ان کے آنے کی خوشی تو بس اس لیے کہ اس کی ماں کی اداسی کم ہو جانے کی۔ یہ موقع بہت اچھا تھا کہ اماں گھر پر نہیں تھیں۔ اگر وہ گھر میں ہوتیں تو زمین پر سرخ قالین بچھا چکی ہوتیں۔ ساری دنیا کے اچھے کھانے پکا پکا کر انہیں کھلا چکی ہوتیں۔ جو سویٹر وہ اس کے لیے بن رہی تھیں۔ وہ اب تک ماہا پہن بھی چکی ہوتی۔ اماں گھر پر نہیں تھیں تو ہی وہ ساری بریانی اکیلی چٹ کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔

☆☆☆

منہ دھو کر آنے کے بعد وہ کافی کا مگ لے کر اپنے بستر پر واپس آکر بیٹھ گئی۔ ماہا نے جھانک کر اس کے مگ میں دیکھا۔

''کافی؟ تم تو کہہ رہی تھی کافی نہیں ہے۔'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''تمہارے لیے نہیں تھی' میرے لیے تو ہے۔ میرا گھر ہے، میں جو چاہے کھاؤں پیوں۔''

ماہا نے منہ بنا کر حسن کی طرف دیکھا۔ حسن نے ماہا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر انگیٹھی کی طرف دیکھا۔

''اس میں اور کوئلے ڈال دو' یہ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کمرا بہت سرد ہو رہا ہے۔''

''کوئلے ختم ہو چکے ہیں۔'' جبکہ اسٹور میں پوری ایک بوری کوئلوں کی رکھی ہوئی تھی۔

''ایسے تو ہم ٹھنڈ سے مر جائیں گے۔'' حسن نے لحاف میں سکڑتے ہوئے دہائی دی

''ٹھنڈ سے صرف وہی لوگ مرتے ہیں' جو گلیشیر پر ہوتے ہیں۔ یہ ذرا سی ٹھنڈ کسی کو نہیں مارتی۔''

''ذرا سی ٹھنڈ؟ یہ ذرا سی ٹھنڈ ہے۔ ابھی تک میری کپکپی بند نہیں ہوئی۔ دانت بج رہے ہیں۔ بستر ایسے لگ رہے ہیں جیسے پانی میں بھیگے ہوئے ہوں۔'' ماہا نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

اس نے گھور کر ماہا کو دیکھا۔ ''دیکھو' ہماری غربت کا مذاق نہ اڑاؤ' اگر یہاں نہیں رہنا تو چلے جاؤ، میں نے کوئی زبردستی تھوڑی روکا ہے۔ ویسے بھی اوپر تمہاری گاڑی کھڑی ہے۔ بیٹھو اور جاؤ۔''

''وہ خراب ہو چکی ہے' ورنہ ہم چلے ہی

قربتوں کو فاصلوں میں بدلتی محبت کی کہانی

یہ کہانی بنیادی طور پر نشاء کے گرد گھومتی ہے۔ نشاء کی والدہ کے انتقال کے بعد اس کے والد نے دوسری شادی کر لی اور اپنی نئی بیوی کے ساتھ نشاء کو لے کر بیرون ملک جانے لگے تو نہایت شفیق تائی اور تایا نے مناسب سمجھا کہ سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے بھتیجی کو اپنے پاس رکھ کر پیار سے اُس کی پرورش کریں۔ نشاء کے خود پسند اور لاپروا باپ اور سوتیلی ماں نے تائی کی یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ تائی اور تایا کے دو بیٹے احسن اور محسن ہیں جو نشاء سے بڑے ہیں۔ تینوں بچپن کے ساتھی ہیں ایک دن چھت پر کھیل کے دوران نشاء کی گڑیا واپس دلوانے کے لیے احسن محسن سے چھینا جھپٹی کرتا ہے اور اسکے دھکے سے محسن چھت سے گر کر معذور ہو جاتا ہے۔ اب اُسکی زندگی وہیل چیئر کی محتاج ہے۔ تینوں جوان ہوتے ہیں۔ نشاء اپنی سادگی، معصومیت اور پیاری عادتوں کی وجہ سے گھر بھر کی چہیتی ہے۔ وہ محسن کا بے حد خیال رکھتی ہے۔ سایہ بن کر ساتھ رہتی ہے۔ محسن اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور مستقبل کی امید اور اپنے وجود کا لازمی حصہ سمجھنے لگا ہے۔ وہ یکطرفہ طور پر نشاء سے محبت کرتا ہے [illegible]

[illegible]

کر جائیداد میں اُس کا حصہ اُس کے حوالے کیا جائے۔ یہی خواہش نشاء کے ماموں کو کراچی لے آتی ہے۔ اُن کی بیوی اور بیٹا سمیر نشاء تک ورثہ پہنچانے کے سخت مخالف ہیں۔ سمیر کی نشاء سے پہلی ملاقات ایک ناخوشگوار حادثے کی صورت میں ہوتی ہے جہاں نشاء سمیر کی بدتمیزی اور اکڑ پر اُس کی بُری طرح بے عزتی کر دیتی ہے۔ سرکش سمیر اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتا ہے اور نشاء کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا تہیہ کر کے سازشوں کے جال بننے لگتا ہے۔ کہانی میں اُس وقت اہم موڑ آتا ہے جب احسن اتفاقاً اپنے والدین کی گفتگو سن لیتا ہے جس میں اُس کے والد جلال احمد اپنی بیوی علیہ سے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں کہ نشاء کی شادی محسن سے ہوگی کیونکہ احسن کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں صرف نشاء ہی محسن کی بچپن کی ساتھی ہے۔ اُسے اچھی طرح سمجھتی ہے اور اُس کا بے حد خیال رکھتی ہے۔ اس موقع پر بیوی کے احتجاج کو وہ بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ احسن جو خود کو محسن کی معذوری کا ذمہ دار سمجھتا ہے، یہ جاننے کے بعد کہ محسن بھی نشاء سے محبت کرتا ہے اور اُسے اپنی دلہن بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے احسن پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ وہ بھائی کی خاطر قربانی دینے کا فیصلہ کرتا ہے [illegible]

[illegible]

Monday **8:00**pm

#TvOnePK

TV ONE

#TvOnePK



کاسٹ: دانیال راحیل، عاصم محمود، سحر افضل، حارث وحید، نتالیہ اویس، عذرا محی الدین، نعیم طاہر، تارہ محمود، اورنگ زیب لغاری، بینا چوہدری اور خالد بن شاہین

تحریر: جہاں زیب قمر | کونٹینٹ ہیڈ: خلیل اللہ فاروقی | ڈائریکٹر: اصغر مرزا

پروڈیوسر: گولڈ برج میڈیا | ایگزیکٹو پروڈیوسر: سیما طاہر خان

جاتے۔" حسن نے تلخی سے کہا۔ یہ کزن اسے بہت بد تمیز لگی تھی

"تو کس نے کہا تھا یہاں آنے کے لیے؟" وہ طنز کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

ماہا نے حسن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ نومی سو چکا تھا اور کافی بلند آواز سے خراٹے لے رہا تھا۔

"کوئی اور کمبل ہے تو وہی دے دو' میں اپنے لحاف کو ڈبل کر لیتی ہوں۔"

ماہا نے بڑی مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ پھر بھی زوبیہ کو ترس نہیں آیا اور اس نے ناں میں سر ہلا دیا۔ ان لوگوں کے گھر زیادہ مہمان نہیں آتے تھے لیکن پھر بھی اس کی سلیقہ مند ماں نے زائد بستر بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ اسٹور میں رکھے بڑے صندوق میں تین نئی مخمل کی رضائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اماں بار بار زوبیہ کو یاد دلاتی رہتی تھیں کہ جب کبھی کوئی بھی مہمان آئے تو اسے وہیں سے صاف اور نئی رضائی نکال کر دی جائے۔ پہاڑی لوگ مہمان صرف اپنے رشتے داروں کو ہی نہیں کہتے' وہ ہر اس انسان کو مہمان سمجھتے ہیں جو ان کے دروازے پر دستک دے اور کسی طرح کی مدد مانگے۔

انگیٹھی پوری طرح سے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ٹھنڈ سے ماہا کے دانت بجنے لگے تھے۔ وہ اٹھی' نئی رضائی نکالی اور اسے اپنے لحاف کے اوپر ڈال لیا۔ اس میں سر گھسا کر سونے کی تیاری کرنے لگی۔

"تم نے کہا تھا کہ کوئی اور کمبل نہیں ہے۔ اب یہ لحاف کہاں سے آیا؟" ماہا کو بڑا دکھ ہوا تھا۔

"تمہارے لیے نہیں ہے۔ میرے لیے تو ہے' کیونکہ یہ میرا گھر ہے۔" وہ پوری طرح سے ڈھیٹ پن دکھا رہی تھی۔

ماہا اور حسن ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ ان دونوں کو گمان بھی نہیں تھا کہ پاکستان میں ان کے ساتھ یہ سلوک ہوگا۔ وہ بھی ان کی خالہ کے گھر میں۔ وہ اس پر چلا بھی نہیں سکتے تھے۔ ضد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نہ باہر موسم ایسا تھا کہ وہ اس سے لڑتے اور گھر چھوڑ کر چلے جاتے۔ نہ ان سب میں اتنی دوستی تھی کہ وہ لاڈ سے مہمان نوازی کرواتے۔

"کتنی پتھر دل ہے یہ' خالہ بھی ایسی ہی ہوں گی؟" ماہا نے سرگوشی کی جو زوبیہ نے سن لی اور وہ تلخی سے ہنس دی۔

اس کی ماں جیسی بھولی بھالی عورت' ساری دنیا میں شاید ہی کہیں ہوگی۔ جس صبر سے اس نے زندگی کی مشکلوں کا مقابلہ کیا تھا' کوئی اور عورت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے کبھی اپنی تکلیفوں پر واویلا نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ صابر شاکر رہی تھی۔

گرمیوں میں' گھر کی طرف آنے والی پگڈنڈی پر دور سے پتھر لا لا کر جماتی رہتی تھی۔ پھر وہ ان پر مٹی سے لیپ کر دیتی تھی۔

پہاڑی گھروں کو پکی پگڈنڈیوں کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ زیادہ وقت تو وہ برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ پھر ان کے گھروں میں آتا ہی کون تھا۔ کچا راستہ خود بخود پکا سا ہو جاتا تھا۔

لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں اتنی مشقت کیوں کرتی ہے۔ وہ شہر کے ان لوگوں کے لیے راستہ بنا رہی ہے' جنہیں اونچے نیچے راستوں پر چلنے کی عادت نہیں ہوگی۔ جو کبھی پہاڑی گھر کی طرف اترائی میں نہیں اترے ہوں گے۔

ٹھنڈے موسم میں کھڑکی کے کنارے بیٹھ کر جو عورت ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے' وہ عورت اپنے دل میں کیسے کیسے دکھ چھپا کر بیٹھی ہے' یہ وہ کبھی پوری طرح تو نہیں سمجھ سکی تھی لیکن کافی حد تک جان چکی تھی۔ ایسی عورت جس کے میکے سے کبھی کوئی ملنے نہ آیا ہو' وہ عورت کیسی ہوگی۔ جس عورت کی عیدیں راہ دیکھتے دیکھتے گزر چکی ہوں' وہ عورت کتنی صابر ہوگی' یہ صرف وہی جانتی تھی۔

جو لوگ آج ان کے گھر میں بیٹھے تھے، وہ اسے اتنی سی بات پر ظالم کہہ رہے تھے' وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی ماں نے اس کی ماں پر کتنے ظلم ڈھائے ہیں۔ وہ لوگ اگر اب اسے ڈھونڈ ہی چکے ہیں تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے اس کی ماں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ احسان تو اس کی ماں نے کیا کہ کبھی وہ نہیں کیا۔ جو کچھ معلوم ہوا' انہیں ابو سے ہی معلوم ہوا تھا' اماں نے کبھی اپنے میکے اور بہنوں کی برائی نہیں کی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ماں کے دل کا ہر دکھ جان گئی تھی۔ اسی لیے انہوں نے جی جان لگا کر پڑھائی کی تھی کہ ماں کو اپنے سوتیلے رشتوں کے سامنے کبھی بھی شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

☆☆☆

ٹھنڈ سے ٹھٹھرتے ہوئے حسن تو سو گیا تھا لیکن ماہا نہیں سو سکی تھی۔ کچھ وقت تک وہ سونے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ پھر اٹھ کر زوبیہ کے بستر میں آگئی اور اس سے لپٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ زوبیہ کی کوئی بہن نہیں تھی۔ جیسے ہی ماہا نے اپنے بازو اس کے گرد لپیٹے، زوبیہ کی آنکھیں فوراً نم ہو گئیں۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس کی ماں نے اس لمس کے لیے کتنا انتظار کیا ہوگا۔ اس کی ماں کیسے کیسے تڑپی ہوگی۔ وہ مڑ کر ماہا کو خود سے دور کر دینا چاہتی تھی لیکن نہیں کر سکی تھی۔ بلکہ الٹا اسے اور اچھی طرح سے لحاف اوڑھا دیا تھا۔ کمرا بہت ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ لیکن محبت کا احساس اس کے دل کو آنچ دینے لگا تھا۔ رشتوں میں کتنی بھی دوری آجائے' ایک ذرا سی قربت سے یہ دوری مٹ جاتی ہے۔

☆☆☆

صبح اٹھ کر وہ واش روم گئے تو اس نے برف جیسا ٹھنڈا پانی انہیں دیا۔ عام دنوں میں معمول تھا کہ اماں صبح اٹھ کر انگیٹھی پر پانی کا ٹین رکھ دیتی تھیں۔ وہ اٹھ کر اس سے منہ ہاتھ دھو لیتی تھی۔ لیکن اب اس نے یہ زحمت نہیں کی تھی۔ نومی نے جب پانی میں ہاتھ ڈالا تو اس کی چیخ سے پورا پہاڑ گونج اٹھا تھا۔

"ابھی دو دن پہلے تم فخر سے اپنے نہانے کی داستان بتا رہے تھے کہ آج تک تمہاری زندگی میں ایسا کوئی دن نہیں آیا جب تم نے غسل نہ کیا ہو۔" حسن نے طنز کیا۔

"اگر آج اس برفیلے پانی سے غسل کر لیا تو بھائی پھر آج ہی آخری غسل کی باری آجائے گی۔"

پانی میں ہاتھ بھگو کر اس نے منہ پر پھیر لیے۔

ماہا نے بھی کم و بیش یہی کیا لیکن حسن نے زیادہ ہمت دکھاتے ہوئے کہنیوں تک بازو اور پورا منہ اچھی طرح سے دھویا تھا۔ جب تک وہ کمرے میں واپس آئے' وہ چائے اور پاپے' کا ناشتہ لگا چکی تھی۔ تھوڑا بہت کھانے پینے کا سامان جو نظر آجانے کا خطرہ تھا' وہ اس نے چھپا دیا تھا۔

"پھر سے پاپے؟؟ پراٹھے ہی بنا لو؟" ماہا نے بے تکلفی سے کہا۔

"آٹا نہیں ہے......" اس نے بے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

"جاؤ حسن! جا کر دکان سے آٹا وغیرہ لے آؤ۔"

"باہر بارش ہو رہی ہے۔ میں تو نہیں جاؤں گا۔" حسن لحاف میں گھس کر بیٹھ گیا۔

"چھتری لے لو زوبیہ سے۔ زوبیہ چھتری تو ہے نا گھر میں؟"

زوبیہ نے چھتری نکال کر دے دی۔ پتا نہیں کس خوش فہمی میں حسن نے وہ چھتری بھی پکڑ لی۔

"یعنی تمہارے پاس چھتری ہے لیکن آٹا نہیں۔" ٹھوڑی کھجاتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں......جاؤ اور جا کر آٹا لے آؤ۔" منہ پھیر کر وہ مسکرا رہی تھی۔ (نکلو ذرا باہر' دیکھو کیا حال ہوتا ہے تمہارا)

نومی کا ہاتھ پکڑ کر وہ آٹا لینے کے لیے چلا گیا۔ ایک تو بارش' اوپر سے پھسلن پھر دکان بہت دور تھی۔ وہ دوپہر تک بھی واپس آگیا تو خوش قسمت ہوگا۔

وہ بہت بدقسمت تھا۔ وہ دوپہر کے بعد شام کو واپس آیا تھا۔ کیونکہ پھسلن کی وجہ سے وہ جاتے ہوئے پھسل گیا تھا۔ اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی۔ آٹا لینے کے بعد اس نے مرہم پٹی کروائی اور لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہوئے اوپر آیا۔ اس کا خیال تھا اسے کوئی ٹیکسی مل

جائے گی لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ شہر نہیں تھا جہاں سڑکوں پر ٹیکسی لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ وہاں ایسا کوئی ماحول نہیں تھا۔ ان لوگوں کو خود جب ایسے وقت میں کہیں آنا جانا ہوتا تھا تو وہ لوگ پہلے سے انتظام کر کے رکھتے تھے۔

جس وقت وہ آٹا لایا' ماہا تین بار چائے کے ساتھ پاپے کھا چکی تھی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ وہ دونوں چھتری کو قابو میں نہیں رکھ سکے تھے اور وہ اُڑ چکی تھی۔ وہ بارش میں پوری طرح سے بھیگ چکے تھے۔ ٹھنڈ سے ان کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ ان کا سامان ہوٹل میں تھا۔

اس نے حسن کو ابو کا اور نومی کو حارث کا شلوار سوٹ دیا تھا۔ ابو اور حارث تو ان کپڑوں میں بہت اچھے لگتے تھے لیکن وہ دونوں بہت عجیب لگ رہے تھے۔ ماہا کوئی دس منٹ تک ہنستی رہی تھی۔ حسن نے ابو کا ہی سویٹر پہن لیا تھا۔ یہ سویٹر کم سے کم پندرہ سال پرانا تھا' امی نے اپنے ہاتھوں سے بنا تھا۔ امی بھولی بھالی سی تھیں' سویٹر گہرے شوخ رنگ کا تھا۔ جو ٹوپی اس نے پہنی تھی' وہ بھی امی کے ہاتھوں سے ہی بنی تھی' اور وہ گہرے سرخ رنگ کی تھی۔ جرابیں بھی ابو کی ہی پہنی تھیں۔ نومی تو ٹھیک لگ رہا تھا' لیکن اصل عجوبہ تو حسن تھا۔ وہ بھی ماہا کے ساتھ دیر تک ہنستی رہی۔

کوئلے نکال کر اس نے انگیٹھی میں ڈال دیے۔

''تم نے تو کہا تھا' کوئلے نہیں ہیں۔'' حسن نے ان کی ہنسی کا غصہ ایسے بھڑک کر نکالا۔

''کل کے لیے اتنے ہی تھے' یہ آج کے لیے ہیں۔''

''اگر ہم کل رات ہی مر جاتے تو تم آج کے کوئلوں کا کیا کرتیں؟''

''آج کے کوئلوں سے تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے انگیٹھی گرم کرتی۔'' سر کو دائیں بائیں ادا سے ہلا کر اس نے حسن کو بتایا۔

''خالہ نہیں آئیں ابھی تک؟؟'' ماہا کو خالہ ایسے یاد آرہی تھیں جیسے وہ ہی ان سب کو زوبیہ جیسی جلاد سے بچا سکتی ہوں۔

''وہ ایک دو دن میں آئیں گی۔''

''اگر ہم نہ ہوتے تو تم اکیلی رہتیں۔ ڈرتی رہتیں۔ دیکھو' کتنے اچھے ہیں ہم' تمہارے ساتھ رہنے کے لیے آگئے ہیں۔''

ان کی ماں بائیس سال اکیلی رہی تھی۔ انہیں اس کے ایک رات اکیلے رہنے کی فکر تھی۔

''پاکستان اور خاص طور پر یہ علاقہ اتنا بھی غیر محفوظ نہیں ہے جتنا تم سب سوچ رہے ہو۔ آپ بھی اپنے گھروں میں اکیلے نہیں رہے؟''

وہ لاجواب ہوگئے۔

''رات کو کیا کھائیں گے؟'' نومی نے کہا۔

اپنی طرف سے وہ حسن کے ساتھ نیچے دکانوں سے کچھ کھانے کے لیے گیا تھا۔ لیکن یہ شہر کی دکانیں نہیں تھیں جہاں برگر' پیزا مل جاتا۔ وہاں چند ٹافیاں وغیرہ رکھی تھیں پلاسٹک کے کچھ پیکٹ بسکٹ وہ لے آیا تھا' اور اب تک کھا بھی چکا تھا۔ دکان میں جو پاپوں کے پیکٹ رکھے تھے' انہیں ہاتھ لگانا تو کیا دیکھنا بھی انہوں نے گناہ سمجھا۔ ویسے ہی کل رات سے انہیں یہی نصیب ہو رہے تھے۔

رات کو اس نے آٹا گوندھ کر پراٹھے پکا لیے اور چائے کے ایک ایک کپ کے ساتھ ایک ایک پراٹھا دے دیا۔

''رات کو ناشتا؟'' حسن نے ماہا کا منہ دیکھا اور پھر نومی کا۔ تینوں ہکا بکا رہ گئے تھے۔ (یہ لڑکی آخر کر کیا رہی ہے)

''ناشتا سمجھ کر کھالو یا رات کا کھانا' یہ تمہاری مرضی ہے۔ ہمارے یہاں تو سردیوں کی راتوں کو پراٹھا کھانا کسی ٹریٹ سے کم نہیں ہوتا۔ ایسے پراٹھے کے لقمے توڑ' اسے چائے میں ڈبو اور کھاتے جاؤ۔'' اس نے باقاعدہ کر کے دکھایا۔

وہ بے چارے اس کے رحم و کرم پر تھے' باہر بارش ہو رہی تھی' ان کی خالہ ابھی تک گھر نہیں آئی تھیں۔ خالہ کی سگی بیٹی' ان کی سوتیلی کزن' کسی طرح بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

چائے کا ایک کپ' اور ایک پراٹھا اٹھا کر حسن کمرے کی دو کھڑکیوں میں سے ایک کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ یہی کام ماہا اور نومی نے بھی کیا اور خاموشی سے چائے میں ڈبو ڈبو کر پراٹھا کھانے لگے۔ پراٹھے خستہ اور مزے دار تھے۔ ان کا پیٹ بھر گیا تھا۔ خود اس نے کچن میں کوفتے گرم کر کے کھائے تھے۔ تین دن پہلے انہوں نے کوفتے بنائے تھے' جسے اس نے پلاسٹک کے ڈبے میں بند کر کے برف میں دبایا ہوا تھا۔ اب اس میں سے تھوڑا سا سالن نکال کر اس نے کچن میں ہی کھا لیا تھا۔ بارش میں پراٹھا اور چائے کھانے کا اس کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ پھر وہ یہاں کئی سالوں سے رہ رہے تھے۔ وہ کافی بار یہ ٹریٹ کھا چکی تھی۔

لائٹ کے تار اس نے جوڑ دیے تھے اور کمرے میں روشنی ہو چکی تھی۔ سب کو ایک دوسرے کی شکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''یہاں زندگی کافی مشکل ہے۔ ایک ایک دن ایک سال کے برابر لگ رہا ہے۔'' ماہا نے بے چاری زوبیہ کو دیکھ کر کہا۔

''اگر چیزیں زندگی آسان کرتی ہیں تو شاید واقعی یہاں زندگی مشکل ہے۔ لیکن میرا خیال ہے رویے زندگی کو مشکل بناتے ہیں۔ میری اماں کی زندگی بھی برے رویوں نے مشکل بنا دی تھی۔'' اس نے اداس ہو کر کہا۔

دونوں بہن بھائیوں نے نظریں چرا لیں۔

''یہاں فون کے سگنلز کام نہیں کر رہے ورنہ ہم اپنی ماما سے تمہاری بات کروا دیتے۔ وہ بہت خوش ہوں گی تم سے بات کر کے۔'' حسن نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔

جس عورت نے اس کی ماں کو ناخوش رکھا تھا' اس سے بات کر کے وہ کیسے خوش ہو سکتی ہے۔

''تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔'' ماہا نے اس کی خاموش کو محسوس کر لیا تھا۔

''کل ہم پہاڑی کی چوٹی پر چلیں گے۔ وہاں ہمارا ہوٹل ہے۔ دیکھو گے وہ؟'' اس نے بات ٹال دی تھی۔

تینوں نے خوش ہو کر اسے دیکھا۔ ''کل تک بارش رُک جائے گی؟ دھوپ نکل آئے گی؟''

''ہاں ان شاء اللہ رک جائے گی اور دھوپ بھی نکل آئے گی۔'' اس نے دانت پیسے۔ (تم سب کی سانسیں بھی رُک جائیں گی)۔

☆☆☆

اگلے دن صبح اس نے ان تینوں کے لیے انڈا پراٹھا بنا دیا تھا۔ ہوٹل جانے کے لیے چھ کپ چائے بنا کر اس نے تھرماس میں ڈال لی تھی۔ کچھ پاپے' مونگ پھلی' اور تھوڑے سے مکئی کے دانے بھی تھیلے میں رکھ لیے تھے۔ ایک برساتی ماہا کو دے دی تھی' ایک خود پہن لی تھی۔ حسن اور نومی کو مشترکہ طور پر ایک چھتری دے دی تھی۔

''یہ چھتری تیز ہوا میں اُڑ جاتی ہے۔ ہمیں بھی برساتی دے دو۔'' نومی نے کہا۔

حسن نے کچھ نہیں کہا تھا' البتہ اس نے اس کا تیار کیا تھیلا پکڑ لیا تھا۔ وہ صبح سے ہی چپ چپ سا تھا۔ شاید وہ اس کے سلوک سے دل برداشتہ تھا۔ زوبیہ اس کی خاموشی کو نوٹ کر رہی تھی۔

بارش رک چکی تھی' وہ تینوں یہ جانتے تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ کچھ دیر بعد پھر سے بارش شروع ہونے والی ہے اور یہ صرف وہ جانتی تھی۔ اس کا سالوں کا تجربہ تھا۔ اس نے گھر کا دروازہ بند کیا اور ان چاروں کا مارچ' اوپر کی طرف شروع ہوگیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر ان کا ہوٹل تھا۔ گرمیوں میں وہاں کافی رونق رہتی تھی۔ زیادہ تر وہاں ذاتی گاڑیوں والے ہی جاتے تھے کیونکہ اس جگہ تک ٹیکسی وغیرہ نہیں جاتی تھی۔ اگر جاتی تھی تو انہیں پہلے سے بک کروایا جاتا تھا۔ پیدل جانے میں پورے دو ڈھائی گھنٹے لگ جاتے تھے۔

ہر پندرہ منٹ بعد جب ان میں سے کوئی پوچھتا تھا کہ ''اور کتنی دور ہے ہوٹل تو'' وہ ہاتھ کا اشارہ کر کے کہہ دیتی تھی کہ وہ دیکھو، سامنے ہی تو ہے۔ وہ سامنے انہیں نظر تو آ رہا تھا' لیکن وہ سامنے کی جگہ ان کے قدموں کے نیچے نہیں آ رہی تھی۔ پہاڑوں پر جو چیز جتنی قریب نظر آ رہی ہوتی ہے' وہ دراصل اتنی ہی دور ہوتی ہے۔ پہاڑ دھوکا نہیں دیتے' وہ بس ذرا مذاق کرتے ہیں۔ تھوڑے شرارتی ہوتے ہیں۔

ہر طرف برف تھی' اگر وہ کہیں بیٹھ جاتے تو اور ٹھنڈ لگتی۔ کہیں بھی بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ سب چلتے چلتے تھک گئے تھے پھر راستہ بھی چڑھائی کا تھا۔ ان کا سانس پھول رہا تھا۔

حسن نے دو تین بار گھور کر اسے دیکھا تھا پھر وہ بھنا کر بولا۔

''یہ سب کیا تماشا ہے زوبیہ بی بی؟ تم ہمیں کہاں لے کر جا رہی ہو؟''

''اپنا ہوٹل دکھانے...... بتایا تو تھا صبح۔''

''تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اتنی دور ہے۔ پورا ایک گھنٹہ ہو گیا ہے ہمیں چلتے ہوئے۔ تم نے کیا سمجھا ہوا ہے ہمیں؟ ہم فوجی نہیں ہیں جو اتنی دور تک پیدل مارچ کریں۔''

''میں اور اماں' صبح اور شام' کبھی کبھی دن میں تین بار بھی' روز گھر سے یہاں تک آیا کرتے ہیں۔ ہم دونوں بھی فوجی نہیں ہیں۔ پھر ہم نے سامان بھی اٹھا رکھا ہوتا ہے۔''

''تم لوگوں کو عادت ہے۔'' حسن شرمندہ تو ہوا تھا لیکن وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

''سال چھ مہینے تم بھی یہاں ہمارے ساتھ رہ لو' تمہیں بھی عادت ہو جائے گی۔ تم لوگ باہر سے آئے ہو۔ شاید تمہاری امی کی قسمت بہت اچھی تھی جو انہیں اتنی آرام دہ زندگی ملی۔ میری اماں کو یہ سب کرنا پڑتا ہے' ان کے ساتھ مجھے بھی۔''

حسن اور ماہا نے نظریں چرائیں۔ نومی البتہ انجوائے کر رہا تھا۔ وہ کوئی انگلش گانا گا رہا تھا' اور اپنی ہی دھن میں چلتا جا رہا تھا۔ ماہا نے اس بحث اور شرمندگی سے خود کو بچانے کے لیے جلدی سے نومی کا سہارا لیا اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ دونوں ان سے چند قدم پیچھے کھڑے رہ گئے تھے۔

'' آئی ایم سوری زوبیہ! تم لوگوں نے واقعی ایک مشکل زندگی گزاری ہے۔'' حسن نے شرمندگی سے معافی مانگی۔

''ہم نے ایک اچھی زندگی گزاری ہے۔ اگر اچھی زندگی تھوڑی سی مشکل بھی ہو تو اتنا تو چلتا ہے۔ ہم فطرت کے ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ ہرے بھرے درختوں' ٹھنڈی اور تازہ ہوا میں۔ سادہ لوگوں کی دوستی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی ہے۔ ہمارے پاس رہنے کے لیے ایک گھر ہے۔ پینے کے لیے صاف پانی ہے۔

ہماری زندگی ان سب سے مشکل نہیں ہوئی۔ ہماری زندگی جس وجہ سے مشکل ہوئی تھی' وہ میری ماں کا دکھ ہے۔ جو وہ آج تک کسی سے کہہ نہیں سکیں۔ لیکن پھر بھی وہ اللہ کی شکر گزار ہیں۔ اس وقت ایک بیمار کی تیمارداری میں مصروف ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ کیونکہ ہمارے اپنے یہاں ہوتے نہیں ہیں یا ہم سے بہت دُور ہوتے ہیں۔''

حسن نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تم تقریر اچھی کر لیتی ہو۔''

ایسے بولتی ہوئی وہ اسے اچھی لگ رہی تھی۔

''میں درگت بھی اچھی بنا لیتی ہوں۔'' کہہ کر وہ اس سے دو قدم آگے ہو کر چلنے لگی۔ پیچھے حسن کا قہقہہ سنائی دیا تو ماہا اور نومی نے گردنیں موڑ کر پیچھے دیکھا۔

''شکر ہے' تم بھی ہنسے۔'' ماہا نے چلا کر کہا

''مجھے یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تمہارا شکریہ زوبیہ! صبح کے پراٹھوں کے لیے بھی۔'' نومی ان تینوں کی نسبت کافی خوش باش تھا۔

''باجی بھی کہو۔ کیا زوبیہ زوبیہ لگا رکھی ہے۔'' زوبیہ نے پیچھے سے جا کر اس کے سر پر چپت لگائی۔ تو وہ دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

''باجی' آپا وغیرہ میری زبان پر نہیں چڑھتا۔ اس لیے سوری۔ بہت پیاری جگہ ہے یہ زوبیہ! برف' دھند' اور گیلی سڑک۔''

''واقعی بہت خوب صورت جگہ ہے۔'' ماہا نے سر گھما کر آس پاس نظر دوڑائی۔

وہ لوگ چڑھائی چڑھ رہے تھے اور دور بہت نیچے انہیں زوبیہ کا گھر نظر آ رہا تھا۔ پتلی سڑک' اور دور دور تک پھیلے ہوئے پہاڑ اور درخت۔ ہر چیز سفید تھی' لیکن پھر بھی وہاں زندگی تھی۔

ٹھنڈ سے تینوں کے دانت بج رہے تھے۔ جب وہ پوری طرح سے تھک گئے تو انہوں نے رک کر تھرماس سے چائے پینی شروع کر دی تھی۔ کپ ایک تھا تو اس لیے باری باری پینے میں کافی وقت لگ رہا تھا۔ پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ پورے دو گھنٹے اور بیس منٹ بعد وہ مطلوبہ مقام پر پہنچے۔ لکڑی کے دروازے کو کھول کر اس نے انہیں اندر کیا۔

چھوٹا سا لکڑی کا ہوٹل تھا۔ اندر کرسیاں' اور باقی کا سامان اوپر نیچے رکھا ہوا تھا۔ کہیں کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس نے ڈھونڈ کر بیٹری لائٹ آن کی۔ پھر ہوٹل کے اسٹور میں سے انگیٹھی لے آئی اور اس میں کوئلے ڈال کر اسے سلگایا۔ ہوٹل کے کوکنگ کاؤنٹر کے پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا' وہاں ابو اور حارث سویا کرتے تھے۔ گھر کی طرح یہاں بھی زمین پر ایک قالین بچھا ہوا تھا۔ بستر ایک طرف تہ کر کے رکھے تھے۔ وہ اور اماں مہینے میں ایک بار آ کر اس جگہ کی صفائی کر جاتے تھے اور جائزہ بھی لے جاتے تھے۔

ایک ہفتہ پہلے ہی وہ اماں کے ساتھ یہاں آئی تھی اور صفائی کر گئی تھی۔ یہاں بجلی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جب ہوٹل کھلتا تو جنریٹر سے ہی کام چلایا جاتا تھا۔ ان سب کے لیے لحاف کھول کر اس نے پھیلا دیے اور انگیٹھی درمیان میں رکھ دی۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔

''اب ایک ایک کر کے کہانی سنانا شروع کر دو۔''

''کیا مطلب؟'' ماہا ہنسی۔ ''کہانی اور میں...... اور وہ بھی یہاں؟''

''ہاں کہانی اور وہ بھی یہاں۔ کیونکہ اگر کہانی نہیں سنائی تو وقت کیسے کٹے گا۔ یہ جگہ بہت سست ہے۔ یہاں وقت دنیا میں سب سے زیادہ سست رفتاری سے گزرتا ہے۔ ایک گھنٹہ ایک دن کے برابر ہو جاتا ہے۔''

''ایک دو گھنٹے سے زیادہ یہاں رکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہارا ہوٹل دیکھ لیا۔ آس پاس تو سب جگہ برف ہی ہے۔ کچھ دیر بیٹھتے ہیں اور پھر چلتے ہیں۔'' حسن نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

''تم لوگ دو ڈھائی گھنٹے پھر سے چل لو گے؟؟ دن کے بارہ بجے ہیں' ایک گھنٹے بعد دن ڈھل جائے گا' راستے میں ہی شام ہو جائے گی' سڑک پر کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے ہم یہاں' اس ویران جگہ پر سارا دن گزاریں گے۔ اکیلے؟ اس جنگل میں؟''

''دن بھی اور رات بھی......'' وہ بہت اطمینان سے ان کا چین سکون سب چھین رہی تھی۔

حسن اور ماہا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کچھ سہم سے گئے تھے۔

''دیکھو! ہمارے ساتھ یہ سب نہ کرو۔ تھوڑی دیر آرام کر لو اور چلو یہاں سے۔ ہمیں اس ٹھنڈی جگہ نہیں رہنا۔ پھر ہم کھائیں گے کیا؟''

''تھرماس میں چائے ہے نا تھوڑی سی' ایک ایک پاپا ڈبو کر کھا لیں گے۔''

''دوپہر کا کھانا' رات کا کھانا' پھر اگلے دن صبح کا کھانا' وہ یہ ایک ایک گھونٹ چائے اور ایک ایک پاپا؟ تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ ہمیں مارنا ہے؟''

''یہاں ایسے رہ کر ہم تو کبھی نہیں مرے؟ دیکھ لو زندہ ہوں میں۔''

ماہا ایک دم سے ڈر سی گئی۔ وہ خوف سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''دیکھو آس پاس کتنا اندھیرا ہے، مجھے بہت ڈر

لگ رہا ہے۔"

وہ مسکرادی۔ "پتا نہیں تم لوگوں کو کس بات سے ڈر لگ رہا ہے۔ کیوں ڈر رہے ہو اتنا۔ یہاں ہمارے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اتنی ٹھنڈ میں یہاں کوئی کیوں آئے گا۔ صرف مقامی لوگ ہی اس طرف آتے ہیں۔ کسی سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بے فکر رہو۔"

"تم نے پہلے بتایا کیوں نہیں۔ ہم یہاں آتے ہی نا۔"

ماہا کو واقعی میں ڈر لگ رہا تھا۔ حسن بس اسے گھور رہا تھا۔

زوبیہ نے دانت پیسے۔ وہ پہلے بتا دیتی تو ان کا کچومر کیسے بناتی۔

☆☆☆

وہ تینوں کافی دیر تک اسے منانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ لحاف میں منہ دے کر لیٹ گئی۔ تینوں نے اپنے طور پر گھر جانے کی کوشش کی۔ پندرہ منٹ تک چل کر بھی گئے' لیکن پھر واپس آ گئے۔ بارش تیز ہو چکی تھی۔ دھند کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ناچار بے چاروں نے ایک کپ چائے میں باری باری پاپے ڈبو کر کھا لیے اور چپ کر کے بیٹھ گئے۔

"میں نے کہا تھا کہ کہانی سنانی شروع کر دو۔ لیکن کوئی نہیں مانا۔" لحاف میں سے سر نکال کر اس نے کہا۔

بھوک سے بے چاروں سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ڈھائی گھنٹے پیدل چلتے رہے تھے۔ ان کی تو آنتیں خشک ہو چکی تھی۔ رات تک بے چارے جب بالکل ہی گونگے ہو گئے اور منہ لٹکا کر بیٹھ گئے تو زوبیہ کو تھوڑا سا ترس آیا۔ اسے یہ خوف بھی تھا کہ ان میں سے کوئی مر ہی نہ جائے۔ وہ اٹھی اور سلنڈر کا چولہا جلایا اور دیسی انڈے ابالنے لگی۔ جولڑ کا گرمیوں میں ابو کے ساتھ ہوٹل دیکھتا تھا' وہ لڑکا ہفتے میں ایک یا دو بار ہوٹل کا جائزہ لینے کے لیے آتا تھا۔ خاص طور پر بارش کے بعد۔ دھوپ نکلتی تو وہ ہوٹل کو کھول دیتا تھا تاکہ ہوٹل کے اندر کی نمی خشک ہو جائے۔ سیلن کی بو نہ آئے۔ کبھی کبھی اسے یہاں رات بھی رکنا پڑ جاتا تھا۔ اسی لیے ہوٹل کے کچن میں کچھ نہ کچھ رکھا ہوتا تھا۔

اس نے دیکھا۔ چھ دیسی انڈے رکھے تھے۔ اور بھی کچھ کھانے کا سامان موجود تھا۔ جس وقت وہ ان سب کے لیے انڈے لے کر گئی وہ حیرت سے منہ کھولے بغیر نہیں رہ سکے۔

" یہ انڈے کہاں سے آئے؟" ماہا نے ندیدے پن سے کہا

دو ہی دنوں میں وہ ان بے چاروں کو اس حال پر لے آئی تھی کہ انہیں انڈے بھی بڑی نعمت لگ رہے تھے۔

"تم کھانے سے مطلب رکھو۔" انہیں انڈے دے کر اس نے کچن میں واپس جا کر مکئی کے دانوں سے پاپ کارن بنائے۔ جب وہ ڈونگا بھر کر اندر پاپ کارن لائی تو ماہا اور حسن نے اسے متاثر کن نظروں سے دیکھا۔

"تمہیں پاپ کارن بنانے آتے ہیں؟" وہ پتا نہیں کیوں اتنا حیران ہو رہے تھے۔

"مجھے سب کچھ آتا ہے۔" وہ ادا سے اترائی۔ اپنے ساتھ لائی مونگ پھلی بھی ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ بے چارے اتنے پر ہی بہت زیادہ خوش ہو گئے۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور اسے اپنے گھر کی باتیں بتانے لگے۔

ویرانے میں بنا' اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکتا ان کا ہوٹل' ان کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ زوبیہ کے دل کا غصہ' طیش آہستہ آہستہ جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا تھا۔ وہ جو انہیں کسی پہاڑی سے دھکا دے کر مار ڈالنا چاہتی تھی اب' وہ انہیں رسہ پھینک کر' گرتے ہوئے' پہاڑوں سے اُوپر لے آنا چاہتی تھی۔

ماہا بہت پیاری تھی۔ وہ ذرا غصے میں بات کرتی تھی تو ڈر جاتی تھی۔ نومی بھی اچھا تھا۔ اور حسن......وہ......وہ تو کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ دراز قد'

اور ہینڈسم۔

☆☆☆

ایک ایک کر کے ماہا اور نومی دونوں سو گئے تھے۔ صرف وہ دونوں جاگ رہے تھے۔

"جو بھی ہے' تم نے ہمیں ایک نئی زندگی سے ملوایا ہے۔ اچھا لگا یہاں آ کر۔ اب خالہ کا انتظار ہے' وہ آئیں' ہم ان سے ملیں اور......"

"اور واپس چلے جائیں؟؟" وہ اداس سی ہو گئی۔

"بالکل! واپس تو جانا ہے۔ میری یونیورسٹی ہوتی ہے۔ ایگزامز ہونے والے ہیں۔ ویسے خالہ بھی تم جیسی ہیں؟"

"ویسے میں کس جیسی ہوں؟" اس نے تنک کر پوچھا۔

"تم......تم بہت تیز ہو۔ چالاک اور مکار۔ تم نے پورا پورا پلان کیا ہوا تھا کہ تم ہمیں جان سے مار ڈالو گی۔ تمہارے گھر میں سب کچھ تھا لیکن تم نے ہمیں کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا۔ کوئلے بھی تھے' آٹا بھی' دودھ' گھی سب۔ لیکن تم ہمیں بھوکا رکھنا چاہتی تھیں۔ آج تم ہمیں ٹھنڈ میں نمونیہ کروانے کے لیے لے کر آئی تھیں۔ پھر یہاں ویرانے میں لے آئیں۔ تمہارا خیال تھا کہ ہم اس ویرانے سے' جنگل اور اندھیرے سے ڈر جائیں گے۔ خاص کر ماہا اور نومی۔"

وہ ہکا بکا حسن کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"جس پہلی رات ہم تمہارے گھر آئے تھے' میں نے صبح اٹھ کر ہر چیز کا جائزہ لے لیا تھا۔ دراصل اس چیز نے مجھے رات بھر بے چین رکھا تھا کہ میری خالہ اتنی زیادہ غریب ہیں کہ ان کے گھر کھانے کے لیے مناسب سامان بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن تمہاری چھپائی ہوئی چیزیں دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ میری خالہ بھوکی نہیں سوتی ہوں گی۔"

"ایسے بات نہ کرو جیسے تمہیں میری اماں کی بہت فکر ہے۔ ہونہہ......"

"مجھے واقعی میں فکر ہے زوبیہ! جو کچھ ہمارے بڑوں نے اپنے ماضی میں کیا' کم سے کم ہمیں وہ نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں مجھ سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ ماہا تمہیں واقعی اپنی بہن سمجھتی ہے۔ ہم سب تمہیں دھوکا نہیں دے رہے۔ تم چاہو تو ہمیں کسی پہاڑ پر لے جا کر دھکا دے سکتی ہو۔ یا کسی گہری کھائی میں پھینک سکتی ہو۔ شاید ایسے تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔"

وہ چپ چاپ حسن کو سنتی رہی۔ وہ بولتے ہوئے اچھا لگ رہا تھا۔

"اور......اور بولو......" اپنے خیالوں میں گم وہ اس سے کہنے لگی۔ وہ زیر لب مسکرا دیا تو وہ گڑبڑا گئی اور پانی پینے کے بہانے اٹھ کر جانے لگی۔ اس نے ایک دم سے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"سنو......" وہ کچھ کہتے کہتے رکا...... رک زوبیہ بھی گئی تھی۔ بات کرتے ہوئے بھی اور جاتے جاتے بھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی رک گئی تھی۔ لمحے بھر کے لیے......

"مجھے ایک کپ چائے بنا دو گی۔"

زوبیہ کا منہ بن گیا۔ ایسے ہاتھ پکڑ کر کوئی چائے بنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ پاؤں پٹخ کر وہ کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔

خیالوں میں گم جب وہ واپس ہوئی تو حسن سو رہا تھا۔ اس نے چائے کا کپ اس کے پاس رکھا تھا جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ سوتے ہوئے وہ کس قدر دلکش لگ رہا تھا۔

چائے کا کپ اٹھا کر وہ اپنی جگہ پر جانے لگی تو حسن نے کسمسا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچی پکی نیند میں تھا۔

"زوبیہ! صبح ہو گئی؟ گھر چلیں؟"

زوبیہ نے بمشکل اپنا قہقہہ ضبط کیا۔ "سو جاؤ' ابھی صبح ہونے میں دیر ہے۔"

اپنی سوئی سوئی آنکھوں سے' نیم اندھیرے کمرے میں حسن نے اسے اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ اسے اچھی لگی تھی۔ بہت اچھی۔

"تمہارا شکریہ زوبیہ!" حسن نے زیر لب کہا جو اس نے سن لیا۔

☆☆☆

صبح ناشتے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر واپس گھر کی طرف آنے لگی۔ کل کی نسبت آج وہ فریش تھے۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف تھی۔ دھوپ تو نہیں نکلی تھی' لیکن دن کافی نکھرا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ اب نیچے جانا تھا تو سفر آسان تھا۔ ماہا اور نومی تو تھوڑے پیچھے تھے۔ حسن اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ وسل پر گنگنا رہا تھا۔ وہ ہاتھ جھلاتے ہوئے چل رہی تھی۔

''دل بھر گیا تمہارا یا ابھی ہمیں اور مزا چکھانا ہے؟'' تھوڑا سا قریب ہو کر حسن نے اس کے کان میں سرگوشی کی

اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ''دل تو نہیں بھرا......'' وہ حسن کے اتنے قریب آنے پر گھبرا گئی تھی

''میرا خیال ہے' ہم سب کی گردنیں دبا کر تمہارا دل بھرے گا۔ کیا خیال ہے' گلا دباؤ گی ہمارا؟''

وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ حسن نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تمہارے اونی دستانے بہت پیارے ہیں۔'' وہ شرارت سے کہنے لگا۔ اس نے ہاتھ جھٹکے سے آزاد کروالیا۔

''ہاتھوں پر دستانے ہی کیوں نہ چڑھے ہوں' لڑکی کا ہاتھ پکڑنے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیے۔ مجھے ڈفر سمجھا ہے۔''

''نہیں ہٹلر......'' کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ ماہا بھاگ کر اس کے قریب آئی اور اس کے شانے پر اپنا سر ٹکا کر مسکرانے لگی۔

''لگتا ہے' تم دونوں کزنز میں دوستی ہو رہی ہے۔ ویسے ڈیر کزن زوبیہ! تم جلاد کی پوسٹ کے لیے اپلائی کر دو۔ بہت ظالم اور خوں خوار لڑکی ہو تم۔''

وہ سب ایک ساتھ ہنسے۔ بل کھاتی' سڑک برف سے ڈھکی ہوئی تھی' وہ پاؤں جما جما کر چل رہے تھے۔ آگے پیچھے چار کی قطار میں۔ نومی سب سے آگے آگر چلنے لگا تھا۔ درمیان میں ماہا اور پھر زوبیہ تھی۔ پیچھے حسن تھا۔ جیسے آسمان پر پرندوں کی قطار ہوتی ہے' ویسے ہی وہ چاروں قطار بنا کر چل رہے تھے۔ نومی نے بلند آواز سے گانا گانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے' اور اب قدم سے قدم ملا کر ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ حسن اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے گردن موڑ کر پیچھے اسے دیکھا تو وہ برف بن جائے گی۔ ان کی نظریں ملیں گی اور ایک نئی کہانی شروع ہو جائے گی۔

☆☆☆

دن کے کھانے کے لیے اس نے بہت کچھ بنایا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔

''پہلے ہمیں بھوکا مارتی رہیں' اب اتنا کچھ بنا لیا۔ کیوں ہماری عادتیں خراب کر رہی ہو۔'' ماہا نے ہنس کر کہا۔

اس نے دسترخوان لگایا۔ ابھی سب کھانے کا پہلا نوالہ لے ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ دن نکھر چکا تھا' یہ اماں کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ اس نے سب کو اشارہ کیا کہ چھپ جاؤ۔ وہ سب جلدی سے اسٹور میں چھپ گئے۔

''کھول دو دروازہ زوبیہ! مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' اماں کی آواز آئی۔ آواز سے وہ بیمار لگ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

''سو رہی تھیں کیا۔ اتنی دیر لگی دروازہ کھولنے میں؟'' وہ اسے پیچھے کرتی ہوئی اندر آئیں اور چھتری کونے میں رکھ دی۔ ایک نظر انہوں نے دسترخوان پر ڈالی۔ اس نے ان تینوں کو تو چھپا دیا تھا لیکن وہ اتنا لمبا دسترخوان نہیں چھپا سکی تھی۔

''یہ تم نے اپنے اکیلی کے لیے اتنا کچھ بنایا ہے؟ زوبیہ بیٹا! سردیوں کے دن ہیں' نیچے سے راشن لانا بھی ایک مسئلہ ہے۔''

وہ چپ کھڑی رہی۔ اماں بیٹھنے ہی والی تھیں کہ وہ تینوں اسٹور سے نکل کر ایک دم سے ان کے سامنے آگئے اور یک زبان کہا۔

''السلام علیکم زینب خالہ!''

خالہ تو جہاں کھڑی تھیں وہیں کھڑی رہ گئیں۔ شاید سالوں انہوں نے ایسی آوازوں اور ایسے منظر کے خواب دیکھے تھے۔ جب وہ خواب پورے نہیں ہوئے تو انہوں نے یہ خواب دیکھنے ہی چھوڑ دیے تھے۔

ماہا آگے بڑھ کر اپنی خالہ سے بے تکلفی سے لپٹ گئی۔

''ماما ٹھیک کہتی ہیں' آپ بہت خوب صورت ہیں۔''

اماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جن لوگوں کی راہ انہوں نے گھر کی کھڑکی میں بیٹھ کر' پگڈنڈیوں پر کھڑے ہو کر' پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھی تھی' وہ لوگ گھر کے اندر موجود تھے۔ ان کے دسترخوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

''یہ سب لوگ کون ہیں زوبیہ!'' انہیں یہی لگا کہ ان کے کان ٹھیک کام نہیں کر رہے یا پھر یہ لوگ وہ نہیں ہیں جو وہ سمجھ رہی ہیں۔

''یہ سب وہی ہیں جن کا انتظار آپ نے سالوں کیا ہے۔ آپ کی نرگس آپا کے بچے۔''

زوبیہ نے اماں کو پیار سے گلے سے لگا کر کہا۔ اماں کی آنکھیں اتنی تیزی سے بھیگیں کہ حسن اور ماہا دونوں کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ وہ دونوں اس عورت کو دیکھ رہے تھے' جس نے ان کی ماں کے دل کا عناد جھیلا تھا۔ جس نے تن تنہا' بہن بھائیوں کے انتظار میں زندگی گزار دی تھی۔ ایک ایسی عورت جو ان کی ماں کے لیے سوتیلی تھی لیکن ان دے سگوں سے بڑھ کر پیار کرتی تھی۔

☆☆☆

زوبیہ نے انہیں پیٹ بھر کھانا نہیں کھلایا تھا اور اماں نے کوئی ایسا طریقہ نہیں چھوڑا تھا جس سے وہ انہیں وہ سب کھلا سکیں جو وہ کھانا چاہتے تھے۔ کچھ دیر رونے' انہیں اچھی طرح سے پیار کرنے' ایک ایک کا حال چال پوچھنے کے بعد وہ گھر سے باہر چلی گئی تھیں۔ دو گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تھیں تو ان کے ساتھ ایک لڑکا تھا' جس کے ہاتھوں میں پتا نہیں کیا کیا کچھ تھا۔ رات کے کھانے کے لیے دسترخوان پر اتنا کچھ لگا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے سے آنکھیں چرانے لگے تھے۔

''تم نے انہیں پرانے لحاف کیوں دیے؟'' اسٹور سے نئے بستر نکالتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھیں۔ زوبیہ زیر لب ہنس رہی تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ ان کے ساتھ کیا کیا کرتی رہی ہے۔

اگلے دن وہ انہیں مری سیر کے لیے لے گئی تھیں۔ وہ خالہ کو روکتے ہی رہ گئے لیکن خالہ تو کسی کی سن ہی نہیں رہی تھیں۔ مری میں ہی انہوں نے ماما سے ان کی ویڈیو کال کے ذریعے بات کروادی تھی۔ دونوں بہنیں گھنٹوں باتیں کرتی رہی تھیں۔ رو رو کر زینب خالہ کا برا حال ہو گیا تھا۔

ماہا کا ہاتھ پکڑ کر وہ مال روڈ پر چہل قدمی کرتی رہیں۔ انہیں شاپنگ کروائی۔ وہ تینوں بہن بھائی ان کی محبت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ان کی سگی خالہ رضیہ نے بھی کبھی ایسی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حارث بھی ہوسٹل سے آگیا تھا۔ وہ چھ کے چھ لوگ ٹھنڈ میں آس پاس کے سب علاقے گھومتے رہے تھے۔ خالہ کا ایک کمرے کا گھر' ان کے لیے کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے بڑھ کر ہو گیا تھا۔ قالین پر بچھے بستر' اور شوخ رنگوں کے لحاف اوڑھ کر' کبھی بجلی کے بلب میں اور کبھی ٹارچ کی روشنی میں' انگیٹھی پر ہاتھ تاپتے ہوئے وہ لوگ امریکا سے زیادہ خوش تھے۔

خوشی چیزوں سے نہیں رویوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی خالہ اتنی معصوم اور بھولی تھیں کہ انہوں نے ایک بار بھی یہ شکوہ نہیں کیا کہ وہ لوگ اتنے سال تک انہیں بھولے بیٹھے رہے تھے۔ بس وہ بار بار یہی کہتی رہیں کہ ''اللہ کا شکر ہے' تم لوگ مجھے مل گئے۔''

مٹی کے چولہے پر زوبیہ ان کے لیے کھانے بناتی تھی۔ وہاں انہیں ہر طرح کے مسئلوں کا سامنا تھا۔ وہاں وافر پانی نہیں تھا، ایندھن نہیں تھا۔ خریداری کے لیے بہت دور جانا پڑتا تھا لیکن پھر بھی وہ انہیں کسی چیز کا احساس نہیں دلا رہے تھے۔ بڑھ

چڑھ کر ان کی میزبانی کر رہے تھے۔

"تمہارا شکریہ زوبیہ! تم لوگ بہت اچھے ہو۔"

وہ کھانا بنا چکی تھی' اور راکھ سمیٹ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس چولہے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"ہاں! واقعی میں' ہم بہت اچھے لوگ ہیں۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

وہ زوبیہ سے متاثر تھا' وہ خالہ سے بھی متاثر تھا۔ ان کی زندگی آسان نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ لوگ مطمئن تھے۔ گھر چھوٹا تھا لیکن دل بڑا تھا۔ کھانے کے لیے کم تھا لیکن دینے کے لیے بہت کچھ تھا۔ موسم کی سختی نے ان کے دل سخت نہیں کیے تھے۔ وہ لوگ نرم مزاج' اور مہمان نواز تھے۔

"تم نے مجھے بہت حیران کیا ہے۔ تم بدتمیز' زبان دراز اور چالاک تو ہو لیکن محنتی بھی بہت ہو۔ صبح صبح اٹھ کر نیچے سے پانی بھر کر لاتی ہو۔ پھر اسے ہمارے لیے گرم کرتی ہو۔ پھر لکڑیاں کاٹتی ہو' چولہا گرم کرتی ہو' کھانا پکاتی ہو۔ میں امریکا میں تمہیں مس کروں گا۔"

وہ لوگ کل جا رہے تھے۔ آج سے ہی اس سے ٹھیک سے کام نہیں ہو رہا تھا۔ جب وہ لوگ رات کو اپنے اپنے لحافوں میں دبک کر بیٹھ جاتے تو وہ حسن سے نظریں ملاتے ہوئے ڈرتی تھی۔

"تم مجھے مس کرو گی؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سالوں بعد ان کے گھر مہمان آ کر رہے تھے۔ ایسے مہمان جن کی وہ جان لے لینا چاہتی تھی۔ لیکن اب یہ ایک مہمان جا رہا تھا تو اس کی جان جا رہی تھی۔ جن لوگوں کے بارے میں سوچ کر اسے غصہ آتا تھا جن سے وہ نفرت کرتی تھی۔ وہ لوگ اب اسے اتنی شدت سے یاد آنے والے تھے کہ اماں کی طرح انہیں یاد کرتے کرتے وہ بھی رو دیا کرے گی۔

"کرو گی مجھے یاد؟" اس نے دوبارہ پوچھا

"ہاں......اب یہی ایک کام تو رہ جائے گا۔" اس نے زیر لب کہا۔ "جو آتے ہیں' انہیں جانا ہی ہوتا ہے۔"

حسن نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ آج اس ہاتھ میں اونی دستانے نہیں تھے۔ اس کا ہاتھ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"مجھے بھولنے کی غلطی بھی نہ کرنا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈرتی تھی' لیکن وہ نہیں ڈر رہا تھا۔

☆☆☆

جس دن وہ لوگ واپس گئے' اس دن اماں تو کھل کر روتی رہیں لیکن وہ چھپ چھپ کر روتی رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد دنوں ان کے گھر میں اداسی رہی تھی۔ ان کے یہاں سگنلز کا مسئلہ تھا' ورنہ وہ روز بات کر لیا کرتے جب وہ نیچے جاتے' تو ان سے بات کرتے۔

ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ نرگس خالہ بھی آ گئیں۔ وہ ان کے ساتھ رہنے کے لیے آئی تھیں لیکن ایک دن سے زیادہ نہیں رہ سکیں۔ وہ ہوٹل میں رہ رہی تھیں۔ دن میں آ جاتی تھیں اور شام ہونے سے پہلے چلی جاتی تھیں۔ دن بھر دونوں بہنیں بیٹھ کر باتیں کرتی رہتی تھیں۔ اماں نے شکوے شکایتیں نہیں کی تھیں۔ نرگس خالہ نے ایسی محبت کا اظہار کیا تھا کہ پرانی باتیں دہرانا اماں کو برا لگا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں اور زوبیہ انہیں خوش دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھی۔

"تم بالکل ویسی کی ویسی ہو زینب! لگتا ہی نہیں کہ جوان بچوں کی ماں ہو۔ تم سے مل کر ایسا لگا جیسے دل کو سکون آ گیا ہو۔ بہت بے وقوف تھی میں جو تم جیسی پیاری لڑکی سے حسد کرتی تھی۔ بس انسان شاید اپنے ہر جذبے کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔"

موسم بدل چکا تھا۔ وہ لوگ باہر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ دور اُوپر سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے ان کے درمیان اتنے سالوں کی جدائی آئی ہی نہیں تھی۔ وہ امریکا سے ان کے لیے بہت سے گفٹ لائی تھیں۔ زوبیہ کے لیے تو بہت ہی زیادہ لائی تھیں۔ وہ زوبیہ سے پیار بھی بہت کرتی تھیں۔ انہیں اس کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند تھے۔ اپنے پاس بٹھا کر گھنٹوں اس سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔

ان کے گھر میں مناسب گرمائش کا انتظام نہیں تھا۔ ہیٹر بھی نہیں تھا اور گیزر بھی نہیں تھا۔ اماں نے ان کے لیے ایک بیڈ منگوا لیا تھا لیکن وہ وہاں سو نہیں سکی تھیں۔ پھر ان کا واش روم' باتھ روم بھی ایک مسئلہ تھا۔ اسی لیے وہ ہوٹل میں رہنے لگی تھیں۔

"بچے یہاں سے گئے تو تم سب کی بہت تعریفیں کر رہے تھے۔ خاص طور پر حسن۔ کتنے ہی دن ماہا کا دل ہی نہیں لگا تھا۔ بار بار زوبیہ کو یاد کرتی تھی۔ اب تو بچوں کی ہر بات میں بس زوبیہ کا ہی ذکر ہوتا ہے۔"

"ہم بھی انہیں بہت یاد کرتے ہیں آپا! اپنوں کی یہی تو بات ہوتی ہے' پاس نہ بھی رہیں تو دل میں ہر پل رہتے ہیں۔"

"برا نہ ماننا زینب! لیکن مجھے یہ جگہ کچھ پسند نہیں آئی۔ تم شہر میں بھی تو رہ سکتی ہو۔"

"آپا! شہر میں رہیں گے تو ہوٹل سے بہت دور ہو جائیں گے۔ زوبیہ کے ابو اکیلے کام نہیں دیکھ سکتے۔ یہ گھر ہوٹل سے قریب ہے۔ ہم سب مل کر ان کی مدد کروا دیتے ہیں۔"

"ہوٹل کون سا فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ چھوڑ دو اسے بھی۔"

زینب ہنس دیں۔ "آپا! ہمارا رزق ہے وہ ہوٹل۔ سردیوں میں بند رہتا ہے۔ گرمیوں میں بہت رش ہوتا ہے وہاں۔ جو گرمیوں میں کماتے ہیں وہ سردیوں میں بھی کھاتے ہیں۔ ہم بہت خوش ہیں۔ زوبیہ کے ابو بھی بہت مطمئن ہیں۔"

"عجیب عورت ہو ویسے تم۔ بالکل امی پر گئی ہو۔ وہ بھی ایسی ہی صابر شاکر تھیں۔" نرگس چڑ سی گئیں۔

زینب پھر مسکرانے لگیں۔ ان کی بڑی بہن بالکل نہیں بدلی تھیں۔ وہ آسائشوں بھری زندگی چاہتی تھیں' انہیں وہی زندگی ملی تھی۔ زینب خود زندگی میں سکون اور دل کا اطمینان چاہتی تھیں' انہیں وہی ملا تھا۔ بچے پڑھ لکھ رہے تھے۔ لائق تھے۔ انہیں زندگی سے اور کیا چاہیے تھا۔ حارث کہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن گیا تو اس چھوٹے سے گھر کو بڑا کر دے گا۔ اچھی تعمیر کروائے گا۔ ہوٹل کو بھی بہت جدید انداز میں بنائے گا۔ دونوں بچوں کو اپنے ماں باپ پر فخر تھا۔ انہیں پوری طرح سے یہ احساس تھا کہ ان کے ماں باپ نے ان کے لیے کتنی جدوجہد کی تھی۔ آج نہیں تو کل انہیں اس کا پھل ملنے والا تھا۔

"مجھے دیکھو' یہاں پاکستان میں چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ لیکن حسن کے ابو کو میں نے امریکا بھیج دیا۔ پھر ہم سب وہیں چلے گئے۔ بہت بڑا گھر ہے وہاں ہمارا۔ رضیہ بھی کویت میں بہت خوش ہے۔ پاکستان میں تو کوئی رہا ہی نہیں' اس لیے ہم یہاں آتے بھی نہیں۔ ایسا کرو' حارث کو باہر بھیج دو۔ میں تمہاری مدد کر دوں گی۔"

"حارث یہیں رہ کر پڑھنا چاہتا ہے۔ کہہ رہا تھا' ڈاکٹر بن کر یہاں چھوٹا سا ہاسپٹل کھولوں گا۔ لوگوں کی خدمت کروں گا۔ وہ یہاں نیچے پہاڑی میں ایک عورت کو رات کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ وقت پر ہاسپٹل نہیں پہنچ سکی تھی۔ راستے میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ تب حارث نے کہا کہ وہ یہاں پریکٹس کرے گا۔"

"یہاں کرے گا پریکٹس؟؟ یہاں کیا کمائے گا وہ؟؟ پاگل ہو گیا ہے۔ سمجھاؤ اسے۔"

"رزق تو اللہ کے ہاتھ میں ہے آپا! جتنا نصیب میں ہو گا' مل جائے گا۔ لیکن انسانیت کی خدمت کا موقع تو نصیب والوں کو ملتا ہے۔"

"لو کر لو بات' ایسی ہی باتیں کر کر کے تم نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ باہر نہیں جاتا تو شہر چلا جائے۔ کسی اچھی سی جگہ پریکٹس کرے۔"

زینب نے بہن سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ بہن ایسی حساس باتیں کہاں سمجھتی تھی۔ پندرہ دن ان کے ساتھ رہ کر وہ چلی گئیں۔ جاتے ہوئے کہہ گئی تھیں۔

"میں حسن کی شادی کروں گی تو تم دونوں کو امریکا آنا ہوگا۔ میں کوئی بہانا نہیں سنوں گی۔"

زینب تو ہنس دیں لیکن زوبیہ کی ہنسی غائب ہو گئی۔ اس کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ اس کی ماں کی یہ بڑی بہن جو سوتیلی تھی' اسٹیٹس میں ان سے کہیں گنا زیادہ بڑی تھیں۔ پندرہ دن وہ ایک بڑے ہوٹل میں رہتی رہی تھیں۔ ان کے کپڑے' ان کی جیولری' ان کا اٹھنا' بیٹھنا سب اس بات کا گواہ تھا کہ وہ عام عورت نہیں ہیں۔ اس کی ماں بے شک بہت خوبصورت تھی لیکن صرف خوبصورتی سے کیا ہوتا ہے۔ شہر سے دور' ایک گمنام پہاڑی کے کنارے ان کا گھر تھا۔ جہاں تک آنے کے لیے سڑک سے اتر کر بہت دیر تک چلنا پڑتا تھا۔ پگڈنڈی کتنی بھی پکی تھی' تھی تو پگڈنڈی نا۔ وہ مین روڈ کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی۔

ان کا ایک کمرے کا گھر' چھوٹا سا کچن اور پیچھے بنا اسٹور جس میں اناج اور لکڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ ان کے گھر میں تو ایک عدد صوفہ یا کرسی بھی نہیں تھی۔ ایک قالین اور کونے میں لگے چند بستر۔ وہ اب تک اپنی زندگی سے بہت خوش تھی۔ وہ بی ایس سی کر چکی تھی' ایم ایس سی کرنے کے لیے اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس کا ارادہ اسلام آباد جانے کا تھا' لیکن ابھی ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے۔ حارث میڈیکل میں جانا چاہتا تھا۔ اگلے سال اس کا ایڈمیشن ہونا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ چلا جائے' اور وہ پیچھے ہوٹل میں ابو کے ساتھ مدد کروا دیا کرے۔ یا حارث پڑھ سکتا تھا یا وہ۔

ایک رات اس نے سوچنے میں گزار دی تھی۔ پھر اگلے دن وہ یہ طے کر کے اٹھی تھی کہ وہ حسن کے بارے میں کچھ نہیں سوچے گی۔

یہ اس کی بے وقوفی تھی کہ وہ ایسے انسان کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کی پہنچ سے ہی دور تھا۔ وہ ایک بڑی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اس کا مستقبل بہت روشن تھا۔ خالہ نرگس بہت محبت سے ملی تھیں لیکن وہ جان گئی تھی کہ یہ محبت اپنی سوتیلی بہن کے لیے ہے۔ جہاں حسن اور زوبیہ کی بات آئی' وہ پھر سے پرانی والی بہن بن جائیں گی۔ اس کی ماں بہت عرصے بعد اتنی خوش ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو پھر سے اداس نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

ہمارے ماں باپ ہمیں بہت پیارے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں بہت عظیم لگتے ہیں۔ ماں باپ بھی غلط نہیں ہوتے کیونکہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ کبھی کچھ برا نہیں کرتے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہمارے ماں باپ ہوتے تو انسان ہی ہیں۔ میری ماما جنہیں میں نے زینب خالہ کو یاد کرتے ہوئے' اداس ہوتے ہوئے' روتے ہوئے دیکھا تھا' وہ ماما ابھی بھی کچھ زیادہ نہیں بدلی تھیں۔ شاید وہ اپنی سوتیلی بہن کو ہمیشہ خود سے نیچے یا پیچھے دیکھنا چاہتی تھیں۔ تھوڑا بہت غلطی کا احساس جو انہیں ماضی میں ہوتا رہا تھا' وہ احساس ان سے ملنے کے بعد مٹ گیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زینب خالہ کو اس چھوٹے سے گھر میں دیکھ کر خوش ہوئی تھیں۔

ان سے ملنے کے بعد جب وہ امریکا واپس آئی تو انہوں نے آتے ہی کہا۔

"توبہ! لگتا ہے ایک جنگ لڑ کر آئی ہوں۔ بہت تھکا دینے والا سفر تھا۔ کہاں دنیا سے کٹ کر پہاڑوں میں پڑی ہے۔ اللہ معاف کرے' کیسا عجیب سا' چھوٹا سا گھر ہے۔ میرا تو دم گھٹتا تھا۔ وہاں پندرہ دن گزارنے کے خیال سے ہی میری جان جاتی تھی۔"

میں اور ماہا حیرت سے ماما کو دیکھ کر رہ گئے۔ کیونکہ جس گھر میں ان کا دم گھٹتا رہا تھا' اس گھر میں ہمارا بہت دل لگ گیا تھا۔ ہمیں امریکا واپس آنے کے بعد بھی خالہ کا وہ پیارا سا' چھوٹا سا گھر یاد آتا تھا۔ ان کے گھر کے اوپر سے جاتی بل کھاتی سڑک' اور دور نیچے تک نظر آتے درخت اور پہاڑ۔

"میری توبہ جو اب میں دوبارہ وہاں جاؤں۔ نہ ڈھنگ کا واش روم ہے نہ باتھ روم۔ پتا نہیں کیسے رہتے ہیں وہاں۔ میں نے کہا کچھ پیسے مجھ سے لے لو' کسی اچھی سی جگہ گھر لے لو' یہاں سے نکلو' پر وہ ہنس کر

ٹال گئی۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔

"ماما! ان کی ہمت کی داد دیں کہ وہ اتنے کم وسائل میں بھی وہاں خوش ہیں۔"

مجھے ماما کی باتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔ ماما کی شرمندگی بہت جلدی مٹ گئی تھی۔ وہ جلد ہی ماضی کو بھول گئی تھیں۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے انہیں یاد نہیں تھا کہ یہ وہی تھیں جن کی وجہ سے خالہ کی شادی خالو سے ہوئی تھی۔ ان کی وجہ سے انہیں یہ مشکل زندگی ملی تھی۔ اگر ماما خالہ کی شادی' اپنے دیور سے ہونے دیتیں تو آج زینب خالہ بھی یہاں امریکا میں ہمارے ساتھ رہ رہی ہوتیں۔ زوبیہ اور حارث ہماری طرح ایک آرام دہ زندگی گزار رہے ہوتے۔ اچھے کالج جاتے۔ پڑھتے لکھتے اور ترقی کرتے۔

جو بھی تھا' مجھے ماما کے رویے سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ ہفتے میں ایک بار ان کی زینب خالہ سے فون پر بات ہو جاتی تھی۔ انہوں نے انہیں پیسے بھجوانے کی پیش کش بھی کی تھی لیکن انہوں نے قبول نہیں کی۔ زوبیہ جو اکثر فون پر بات کر لیا کرتی تھی' اب وہ ہاتھ ہی نہیں آتی تھی۔ میں نے جتنی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی' ناکامی ہی ہوئی۔ میرا خیال تھا یہ وہاں کا ماحول تھا جس کے زیر اثر آ کر میں زوبیہ کی طرف کھنچ رہا تھا۔ امریکا آؤں گا تو اسے بھول جاؤں گا۔ لیکن امریکا آ کر وہ مجھے اور یاد آنے لگی تھی۔ جب میں اپنے پر آسائش گھر میں لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا تو مجھے وہ بغیر ٹی وی کا گھر یاد آ جاتا تھا۔

"تمہارے گھر ٹی وی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ ایک تو یہاں بجلی بہت کم آتی ہے۔ پھر ہم سب کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ٹی وی دیکھیں۔ بکس ہیں' وہی پڑھ کر وقت گزار لیتے ہیں۔"

"کوئی تفریح نہیں ہے۔ بور نہیں ہوتے؟"

"تفریح صرف ٹی وی دیکھنا ہی تو نہیں۔ میں اور حارث اکثر مری چلے جاتے ہیں۔ دن بھر وہاں ٹہلتے رہتے ہیں۔ شام تک واپس آ جاتے ہیں۔ سردیوں میں ہم گھر کے باہر سنو مین بناتے ہیں۔ گرمیوں میں یہیں کرکٹ کھیل لیتے ہیں۔ بہار میں ابو کے ہوٹل میں بہت کام ہوتا ہے۔ ہم مل کر ساری جگہ کی صفائی کرتے ہیں۔ دور سڑک تک کی صفائی کرتے ہیں تاکہ آنے والوں کو گندگی نہ ملے۔ ہوٹل کی مرمت ہوتی ہے۔ میز اور کرسیاں نئے سرے سے چمکائی جاتی ہیں۔ یہ سب تفریح ہی تو ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یونیورسٹی جاتا تو اسے زوبیہ کا اوپر پہاڑی کی چوٹی پر ہوٹل کی طرف پیدل جانا یاد آ جاتا تھا۔ اس کے اپنے کمرے میں اتنا سامان موجود تھا جو ان کے پورے گھر میں موجود نہیں تھا۔ پھر بھی وہ لوگ اس سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ان کے دل بڑے تھے۔ وہ زوبیہ کو یاد کر رہا تھا۔ پتا نہیں وہ اسے یاد کرتی تھی یا بھول گئی تھی۔ اس نے زوبیہ کو کال کرنے کی کوشش کی۔ اس کی قسمت اچھی تھی جو کال مل بھی گئی۔

"پورے پندرہ دن ہو گئے ہیں زوبیہ! تم سے بات نہیں ہوئی' کہاں ہو تم؟؟" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

زوبیہ نے گہرا سانس لیا۔ "ہم سب ٹھیک ہیں۔ تم سب کیسے ہو؟"

اسے زوبیہ کا لہجہ اجنبی لگا۔ "کیا بات ہے' تم مجھ سے ناراض ہو؟"

"میں کیوں ناراض ہوں گی؟ خالہ کیسی ہیں؟

"میرا حال تو پوچھا ہی نہیں۔"

"آواز سے ٹھیک لگ رہے ہو' ٹھیک ہی ہو گے۔"

"ضرور کچھ ہوا ہے۔ تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ کیا ہوا ہے، بتاؤ مجھے۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہے۔ ہمارے لیے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی زندگی میں بہت خوش باش ہیں۔ جب تم لوگ ہم سے دور تھے' ہم تب بھی ٹھیک تھے اور اب بھی۔ ہمیشہ ٹھیک ہی رہیں گے۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے اس کے رویے پر حیرت تھی کہ کیا وہ پھر سے مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ لیکن اب تو سب

ٹھیک ہو چکا تھا۔ ماما اور زینب خالہ کے درمیان کی برف پگھل گئی تھی۔ میں کافی دنوں تک زوبیہ کے رویے کے بارے میں سوچتا رہا۔ دوبارہ فون نہیں ملا۔ اس سے بات ہونا بہت مشکل تھی۔ ابھی میں پاکستان بھی نہیں جا سکتا تھا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے بہت اداس رہنے لگے ہو؟" ماہا شرارت سے پوچھ رہی تھی۔ "کوئی یاد آ رہا ہے؟"

"شاید۔" وہ دو گھنٹے سے کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کچھ پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ زوبیہ کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس کا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔

"جنہیں یاد کر رہے ہیں، ان سے فون پر بات کر لیں۔ ورنہ ایسا کریں۔ ماما سے بات کر لیں۔ وہ خالہ سے بات کر لیں گی۔"

ماہا کا آئیڈیا اچھا تھا لیکن ماما نے جو باتیں امریکا واپس آ کر کی تھیں' اس نے اس کے دل پر بوجھ ڈال دیا تھا۔ ماما کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ان سے ایسی بات کرنے کی جرات بھی نہ کرے۔

"شاید ماما صرف زینب خالہ سے معافی مانگ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھیں۔ اس سے زیادہ انہیں خالہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔" اس نے افسوس سے کہا۔

ماہا نے سر ہلایا۔ اسے بھی کچھ کچھ اندازہ تھا۔

"آج نہیں تو کل آپ کو ان سے بات کرنا ہی پڑے گی۔ اچھا ایسا کریں' ماما کو صرف یہ بتا دیں کہ آپ زوبیہ کو پسند کرتے ہیں۔ پھر میں اور نومی بھی ماما کو منانے کی کوشش کریں گے۔"

ماہا کی بات پر اس نے تائید میں سر ہلایا۔ اسے یہ ہی کرنا چاہیے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ماما کیا جواب دیں گی۔ صاف انکار کر دیں گی یا تھوڑی سی بحث سے مان جائیں گی۔

ابھی اس نے اپنی بات بھی نہیں کی تھی کہ دو دن بعد رضیہ خالہ اپنے بچوں سمیت کویت سے امریکا آ گئیں۔ وہ بھی اچانک۔ ماہا نے حسن کی طرف ذو معنی انداز سے دیکھا۔ کچھ کچھ اسے بھی عجیب لگ رہا تھا۔

رضیہ خالہ تین یا چار سال بعد آتی تھیں وہ بھی باقاعدہ پلان کر کے۔ سردیوں کی چھٹیوں میں۔

ماما ان کے آنے سے پہلے بہت اہتمام کرتی تھیں۔ کمرے تیار کرواتی تھیں۔ کھانے پکانے کا سامان لا لا کر رکھتی تھیں۔ اس بار ماما نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ رضیہ خالہ آ رہی ہیں۔

مہک کے انداز بھی بدلے ہوئے تھے۔ رضیہ خالہ حسن کو بہت اہمیت دے رہی تھیں۔ اسے اپنے پاس بٹھا لیتی تھیں۔ اس کے لیے بہت تحائف لے کر آئی تھیں۔

"تمہاری خیر نہیں ہے حسن! خطرے کی ساری گھنٹیاں بج رہی ہیں۔"

حسن خود بھی پریشان ہو چکا تھا۔ وہ ساری صورت حال کے واضح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ماما نے ابھی اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ ماما کے کمرے میں گیا کہ اس سے پہلے ماما ایسا ویسا کچھ کہیں۔ وہ ہی ماما کو بتا دے کہ وہ زوبیہ کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

"ماما! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔"

ماما نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "مجھے بھی تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ باتیں ہوتی رہیں گی' جمعے کو تمہارا اور مہک کا نکاح ہے' تم تیاری کر لو۔ شادی تمہارے ایگزامز کے بعد ہو گی۔ بے فکر رہو' تمہاری زینب خالہ بھی آئیں گی۔ میں نے تمہارے نکاح کی اطلاع بھجوا دی ہے انہیں۔ انہوں نے بہت مبارک باد دی ہے تمہیں۔"

وہ ہکا بکا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اسی لیے زوبیہ کا رویہ بدل گیا تھا۔ وہ بجھ کر رہ گئی تھی۔

"ماما! یہ سب آپ کیا کر رہی ہیں۔ کس سے پوچھ کر آپ میرا نکاح مہک سے کر رہی ہیں۔ وہ بھی ایسے اچانک؟"

"اچانک نہیں بیٹے۔ میں نے اور رضیہ نے

بہت پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ ہم تم دونوں کا رشتہ کریں گے۔ اب جاؤ اور جو شاپنگ کرنی ہے، وہ کر لو۔" وہ اطمینان سے بولیں۔

ماں کے اطمینان پر وہ حیران تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے لاعلم کیوں رکھا گیا تھا۔ جب وہ واپس امریکا آیا تھا تو اس نے زوبیہ کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ شاید ماما بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔ ماہا اور نومی بھی زوبیہ' زوبیہ کرتے رہتے تھے۔ اکثر وہ اپنی اور زوبیہ کی تصویریں نکال کر دیکھتا رہتا تھا۔ باقاعدگی سے اسے فون کرتا تھا۔

جب وہ پاکستان ان سے ملنے جا رہی تھیں تو اس نے انہیں کچھ الیکٹرانک کی چیزیں بھجوائی تھیں جو وہاں ان کے بہت کام آ سکتی تھیں۔ خاص طور پر ایک بہت اچھی والی بیٹری لائٹ' جو ان کا پورا گھر روشن کر سکتی تھی اور زیادہ دیر تک کام کر سکتی تھی۔ جو ہوٹل میں بھی کام آ سکتی تھی۔ ماہا نے گرم کوٹ بھجوایا تھا۔ نومی نے کتابیں بھیجی تھیں۔ یہ سب تحائف انہوں نے اتنے شوق سے لیے کہ ماما نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"بہت دوستی ہو گئی ہے تمہاری اس سے۔ ایسی کیا خاص بات ہے اس میں۔"

"بس ماما! وہ بہت الگ ہے۔ عام لڑکیوں جیسی نہیں ہے۔ بہت مزے کی ہے۔" ماہا نے چہک کر کہا۔ ماما نے ایک گہری نظر حسن پر ڈالی۔

"تمہیں کیسی لگی وہ حسن؟؟"

حسن زیر لب ہنس دیا۔ "چڑیل۔" اس نے کہا تو نومی اور ماہا ہنس دیے۔ ان کی ہنسی ایسی تھی کہ ماما سب کچھ سمجھ گئیں۔

"چڑیل کے لیے اتنی مہنگی چیزیں لی ہیں تم نے۔ اپنی ساری سیونگ لگا دی ہے۔"

ماما کے انداز میں طنز تھا جو وہ اس وقت محسوس نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اب اسے ہر بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ ماما زینب خالہ کو گلے لگا سکتی ہیں لیکن اپنا دل بڑا نہیں کر سکتیں۔ ماضی میں وہ ان کے لیے اپنی سہیلی کے بھائی کا رشتہ آنے کی وجہ سے حسد کا شکار ہو گئی تھیں' اسی حسد کی وجہ سے اپنے دیور سے انہوں نے زینب خالہ کی شادی نہیں ہونے دی تھی۔ اب وہ اپنے بیٹے کو ان کا داماد کیسے بنا سکتی تھیں۔ وہ اس چھوٹے سے گھر کی لڑکی کو اپنا ہونہار بیٹا کیسے سونپ سکتی تھیں۔

"میں مہک سے نکاح نہیں کروں گا ماما! آئی ایم سوری۔ میں زوبیہ کو پسند کرتا ہوں۔ شادی بھی اسی سے کروں گا۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"زوبیہ؟؟ تم اسے مہک پر فوقیت دے رہے ہو؟ میں تمہیں یہ اجازت کبھی نہیں دوں گی۔" وہ تنفر سے بولیں۔

"آپ زینب خالہ کو آج بھی اپنی سوتیلی بہن ہی سمجھتی ہیں۔ جبکہ وہ بہت اچھی ہیں۔ ہم سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

"میں بھی زینب سے محبت کرتی ہوں۔ وہ میری بہن ہے۔ لیکن تمہاری شادی میں رضیہ کی بیٹی مہک سے ہی کروں گی۔ مجھے مہک پسند ہے۔ بس۔"

"لیکن مجھے زوبیہ پسند ہے۔ بہت زیادہ پسند ہے۔ ماما شادی میری ہونا ہے۔"

ماما نے ناپسندیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت بدتمیز اور بے شرم ہو گئے ہو۔ ماں سے ایسے بات کرتے ہیں۔"

وہ شرمندہ ہوا۔ محبت سے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

"ماما پلیز! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ مجھے زوبیہ سے محبت ہے۔ وہ پڑھی لکھی' سمجھ دار ہے۔ خوب صورت بھی ہے۔ آپ کو وہ اچھی کیوں نہیں لگی؟"

"وہ بہت اچھی ہے لیکن میں اسے بہو نہیں بناؤں گی، بس۔"

اس نے اپنی ضدی ماں کو دیکھا۔ ان کا انداز بہت سخت تھا۔ وہ جان گیا کہ ماما اپنا فیصلہ نہیں بدلیں گی۔ شاید آج بھی ان میں وہ پرانی نرگس زندہ تھی' جو اپنی بہن کو خود سے کمتر سمجھتی تھی جو اپنی بہن کو کوئی اچھی چیز ملتے ہوئے دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

گھر کے ماحول میں بہت تناؤ آ چکا تھا۔ ماما کو

منانے کے بعد بھی جب وہ نہیں مانیں تو اس نے رضیہ خالہ سے بات کر کے انہیں انکار کر دیا تھا۔ پھر مہک سے بات کی۔ مہک تو سمجھ گئی لیکن رضیہ خالہ ناراض ہو گئیں۔

"تمہیں وہ سوتیلی خالہ اپنی سگی خالہ سے زیادہ پیاری ہے؟" وہ بھڑک گئی تھیں۔

وہ بے بسی سے خالہ کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس معاملے میں دونوں بہنیں ایک جیسے ردعمل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ وہ بار بار زینب خالہ کو سوتیلی سوتیلی کہہ رہی تھیں۔ ماہا، نومی اور اسے بہت افسوس ہوا۔

"وہ میری خالہ ہیں، سگی یا سوتیلی اس کے بارے میں، میں نے نہیں سوچا۔"

"بات تو ایک ہی ہوتی نا۔ اس معمولی سی لڑکی کے لیے تم میری مہک کو انکار کر رہے ہو؟"

"وہ معمولی لڑکی نہیں ہے خالہ! بہت اچھی ہے۔ آپ اس سے ایک بار ملیں گی تو آپ بھی اس سے پیار کرنے لگیں گی۔" اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ خالہ طیش میں آ گئیں۔ ماما پر طنز کرنے لگیں۔

"تمہیں بہت شوق تھا زینب کو ڈھونڈنے کا۔ اب ہو گیا شوق پورا۔ اس کی بیٹی نے تمہارا بیٹا ہی ہتھیا لیا۔ بدلہ لیا ہے اس نے اپنی ماں کا تم سے۔"

اسے خالہ کے جملوں پر بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خالہ یہ سب کچھ سوچ سکتی ہیں۔ مہک نے بھی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ غصے میں ان کے گھر سے ہی چلی گئیں اور ماموں کے گھر جا کر رہنے لگیں۔

"تم نے میری بہن کو ناراض کر دیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، ایسے تم زوبیہ کو حاصل کر لو گے؟"

وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔ صورت حال بہت خراب ہو چکی تھی۔ سب ایک دوسرے سے ناراض ہو چکے تھے۔ اس نے فون پر زوبیہ سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے چھوٹتے ہی اسے نکاح کی مبارک باد دی اور پھر فون بند کر دیا۔ وہ فون کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

حسن کے نکاح کی خبر اس پر دکھ کی تیز آندھی کی طرح چلی تھی۔ وہ بہت اداس رہنے لگی تھی۔ جس دن اس کا نکاح تھا اس دن اس کا فون آیا تھا، اس نے مبارک باد دی اور فون بند کر دیا۔ وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ دونوں کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ اسے کیا یاد دلاتی، یا کون سی بات جتاتی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا اور اب ہاتھوں کی طرح دل بھی خالی رہنے لگا تھا۔

چھ مہینے گزر گئے تھے۔ خالہ نے بھی فون کرنا بند کر دیا تھا۔ اماں خالہ کو یاد کرتیں، انہیں فون ملانے کی کوشش کرتیں تو کبھی کال ہی نہ ملتی۔ بیل جاتی تو کال پک نہ کی جاتی۔ یا فون بزی ہوتا۔ اگر کبھی بات ہو بھی جاتی تو نومی یا ماہا سے ہو جاتی، خالہ سے بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سب دیکھ رہی تھی۔ سب سمجھ سکتی تھی۔ وہ اب ان سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اماں اٹھتے بیٹھتے ان کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتی رہتی تھیں۔ شاید وہ بھی سمجھ چکی تھیں کہ بہن کا دل باتوں سے بھر گیا ہے۔ جتنی محبت تھی، وہ ایک ہی ملاقات میں پوری ہو چکی ہے۔ کبھی کبھی وہ آہ بھرتیں اور ایسے ہی کہہ دیتیں۔

"آپا پھر سے مجھے بھول گئیں۔"

حسن فون کرتا تو وہ فون نہیں اٹھاتی تھی۔ وہ اس سے بات کر کے اب کیا کہے گی۔ اچھا ہے کہ وہ اپنی نئی زندگی میں ہی خوش رہے۔

☆☆☆

پرانا موسم لوٹ آیا تھا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ وہ ان سب کو بہت بہت یاد کرنے لگی تھی۔ یہ ہی موسم تھا، اسی موسم میں حسن نے دروازے پر دستک دی تھی۔ پھر اس نے اس کے دل پر دستک دی تھی اور بغیر اجازت کے اس کے دل میں آ گیا تھا۔ اس نے ان سب کو بہت تنگ کیا تھا۔ وہ ان سے نفرت بھی تو بہت کرتی تھی۔ شاید یہ قانون قدرت

ہے کہ جس سے نفرت کی جائے اس سے ہی محبت ہو جاتی ہے۔ وہی انسان دل کے قریب آ جاتا ہے۔

اماں سو چکی تھیں اور وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی، رات کے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ گرمیوں میں انہوں نے گھر کی کچھ مرمت کروائی تھی۔ رنگ و روغن کروایا تھا۔ چھوٹی سی کھانے کی میز اور چار کرسیاں بھی لائے تھے جو اب کونے میں لگی ہوئی تھیں۔ نیا قالین آ گیا تھا۔ کچن میں بھی کافی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ حسن کی بھیجی بیٹری لائٹ ان کے بہت کام آتی تھی۔ ماہا کا بھیجا گرم کوٹ وہ اکثر پہنتی تھی اور محبت سے اس پر ہاتھ پھیرتی تھی۔

اس نے حسن کا انتظار کیا تھا، لیکن جب خالہ نے اس کے نکاح کی خبر دی تو اس کا انتظار اپنی موت آپ مر گیا۔ جو تھوڑی بہت آس تھی، وہ بھی مٹ گئی۔ اب کتابوں میں دل لگتا تھا، نہ سنو مین بنانے میں۔ گرمیوں میں ابو کے ہوٹل میں کام کرتے ہوئے بھی وہ بہت چپ چپ تھی۔ اماں اور حارث نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس نے ایک دو جگہ جاب کے لیے اپلائی کیا تھا لیکن کوئی بات نہیں بنی تھی۔ اماں اسے دیکھتیں تو گہری سانس بھرتیں۔

"بیٹا! وہ چار دن کے لیے آئے تھے، روز روز امریکا سے ملنے کے لیے نہیں آ سکتے۔" انہوں نے دبے دبے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اداسی سے مسکرا دی تھی۔

"وہ آئیں یا نہ آئیں۔ مجھے اس سے کیا۔ میں انہیں یاد نہیں کرتی۔"

اماں اداس ہو گئیں۔ بچے کتنا بھی جھوٹ بولیں، مائیں سب جان جاتی ہیں۔ وہ اسے کیسے سمجھاتیں کہ ان کی بہن کا مزاج ان کے مزاج سے بہت الگ ہے۔ ایک ہی گھر میں پل کر بڑے ہونے پر بھی وہ ان کے لیے اپنا دل بڑا نہیں کر سکی تھیں۔ جو اپنی بہن سے حسد کرتی تھیں۔ وہ ان کی بیٹی کو کیسے قبول کر سکتی ہیں۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کا دل دھو کر صاف کر دیتیں۔ لیکن وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکی تھیں۔

وہ خیالوں سے بری طرح چونکی۔ جس کھڑکی میں وہ بیٹھی ہوئی تھی، اس کھڑکی پر کسی نے برف کا گولا بنا کر مارا تھا۔ اسے غصہ آیا۔ یہ اس وقت کون ہے۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ ایک اور گولا آ کر عین اس کے منہ پر لگا۔ وہ غصے سے سرخ ہو گئی۔

"کون بدتمیز ہے وہاں؟" وہ چلائی۔ اماں نے نیند میں جھلا کر بولیں۔

"سو جاؤ زوبیہ! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کیوں چلا رہی ہو۔"

"باہر کوئی ہے اماں!"

"اس وقت کون ہو گا۔ تم بھی تو اتنی دیر تک جاگتی رہتی ہو۔ سو جاؤ میرا بیٹا۔"

وہ چپکے سے اٹھی، دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلی، ایک اور گولہ اس کے منہ پر آ کر لگا۔ اب تو اس کا غصے سے برا حال ہو چکا تھا۔ وہ جلدی سے اندر گئی اور حسن کی بھیجی لائٹ اٹھا کر لائی اور دور دور تک اندھیرے میں مارنے لگی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تو کیا یہ سب اس کا وہم تھا۔

کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ اندر جانے ہی لگی تھی کہ کسی نے اسے پیچھے سے شانے سے تھام لیا اور گھما کر اپنی طرف سیدھا کیا۔

"وہاں کھڑکی میں بیٹھ کر تم میرا ہی انتظار کر رہی تھیں نا؟" حسن پوچھ رہا تھا

وہ آنکھیں جھپکائے بغیر اُسے دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ کوئی خواب ہے؟؟ حسن اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ اسے سن سکتی ہے۔

"جواب دو زوبیہ! میں سچ کہہ رہا ہوں ناں؟"

"ہاں، اس نے بھی سچ سچ کہہ دیا۔ حسن ہٹا کر وہ اس سے دُور ہوئی ہی تھی کہ اس نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بہت جلدی ہے جانے کی۔ تھوڑی دیر رکو۔"

وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت اچانک کہاں سے آیا تھا۔ اس کی بیوی کہاں تھی۔ وہ

اس سے ایسے بے تکلف ہو کر کیوں بات کر رہا تھا۔

"مجھے ایسے ہی دیکھتی رہو۔ میں بھی تمہیں ایسے ہی دیکھتا رہوں گا۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"تمہاری بیوی؟" اس نے جھجک کر پوچھا تھا، ساتھ ہی دل میں ٹیس بھی اٹھی۔

☆☆☆

ایسا صرف فلموں میں ہی ہوتا ہے کہ لڑکا یا لڑکی نے عین شادی کے وقت شادی سے انکار کر دیا ہو اور پھر کچھ ہی دیر بعد سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہو۔ سب ہنسی خوشی رہنے لگے ہوں۔ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ ظالم سماج' اتنی جلدی رحم دل نہیں بنتا۔ ہماری دیسی مائیں بدیسی ہی کیوں نہ ہو جائیں' وہ اپنی اولاد کے لیے کبھی نہ کبھی آزمائش کا باعث بن ہی جاتی ہیں۔ سچ یہ تھا کہ میری جان جیسے کسی شکنجے میں آچکی تھی۔

خالہ نے بہت برا مانا تھا۔ ماموں کے گھر جا کر بہت ہنگامہ کیا تھا۔ رونا دھونا' شکوے شکایتیں سب چلتا رہا تھا۔ ماموں بھی خالہ کی سائیڈ پر تھے۔ ماما ایک دم سے اکیلی ہو گئی تھیں۔

"تم نے میری ناک کٹوادی ہے۔ تمہاری وجہ سے میرے بہن بھائی ناراض ہو گئے ہیں۔" وہ مجھ پر بھڑکنے لگی تھیں

صرف چند دنوں کی جدائی سے ماما پریشان تھیں۔ ایک زینب خالہ تھیں' جنہوں نے ساری عمر ہی بہن بھائیوں کے بغیر گزار دی تھی۔ ان پر کیا گزری ہو گی جب انہوں نے دیکھا ہو گا کہ کسی بہن بھائی نے پلٹ کر ان کی خبر نہیں لی۔ ان پر کیسا کیسا کڑا وقت آیا لیکن مدد کے لیے ان کے پاس کوئی نہیں تھا۔ جیسے جیسے میں یہ سب حالات دیکھ رہا تھا' میں دل سے زینب خالہ کی قدر کرنے لگا تھا۔ ماہا اور نومی بھی بار بار یہی کہتے تھے کہ میں اپنی بات سے نہ ہٹوں اور زوبیہ سے ہی شادی کروں۔

"چلو، میری تو بات الگ ہے' لیکن تم دونوں کو زوبیہ اتنی اچھی کیوں لگی؟" میں نے ماہا اور نومی سے پوچھا۔

"ایک تو وہ چڑیل ہے اس لیے' دوسرا جب وہ غصے سے بولتی ہے تو مجھے بہت کیوٹ لگتی ہے۔" نومی نے دانت نکال کر کہا۔

"چڑیل کو بھابھی بنانا چاہتے ہو؟"

"تم بھی تو بیوی بنا رہے ہو...... ہاہاہا۔"

وہ منہ کھول کر ہنسا۔ میں نے حسرت سے نومی کی ہنسی کو دیکھا۔ ایک میری ہنسی تھی' گم ہی ہو گئی تھی۔ اب مجھے پتا چلا تھا کہ محبت کرنا کتنا آسان اور محبت کو پالینا کتنا مشکل ہے۔

"مجھے تو وہ سین نہیں بھولتا' جب زوبیہ خوں خوار بلی بنی ہمیں پاپے پر پاپے کھلا رہی تھی۔ اس نے ہمارا ذرا لحاظ نہیں کیا تھا۔"

"یہ تم دونوں اس کی ساری برائیاں ہی بتا رہے ہو۔ اس بے چاری میں کچھ اچھا بھی ہے یا نہیں؟" مجھے غصہ آگیا۔

"یہ جو اس کی برائیاں ہیں' یہی تو اس کی اچھائیاں ہیں۔ اس نے ہمیں مکھن نہیں لگایا۔ ہماری خوشامد نہیں کی۔ وہ جیسی تھی' بالکل ویسی ہی ہمارے سامنے رہی۔ کوئی منافقت نہیں ہے اس میں۔ ویسے بے چاری نے ہماری خدمت بھی بہت کی تھی۔ لکڑیوں پر پکا پکا کر ہمیں کھلاتی رہی تھی۔ اتنی دور سے پانی بھی بھر کر لاتی تھی۔"

مجھے زوبیہ پھر سے یاد آگئی۔ دل چاہا اڑ کر اس کے پاس چلا جاؤں۔ ایک ماما تھیں جو روز ماموں کے گھر جا رہی تھیں۔ اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دن ماموں نے مجھے گھر بلایا اور مہک سے شادی نہ کرنے کی وجہ پوچھی۔

"مہک بہت اچھی لڑکی ہے ماموں! لیکن مجھے زوبیہ پسند ہے۔"

ماموں طنز سے ہنسے۔ "کہاں ہماری مہک' کہاں وہ لڑکی...... پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں حسن۔"

مجھے کم سے کم ماموں سے اس رویے کی امید نہیں تھی۔ مہک کی طرح زوبیہ ان کی بھی بھانجی ہی تھی۔

"زوبیہ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی ہے' با اخلاق ہے اور مجھے کیا چاہیے۔"

"خاندان بھی کوئی چیز ہوتا ہے بیٹا جی! لوگوں کو کیا بتاؤ گے کہ تمہارا سسر کیا کرتا ہے۔ کراچی میں ایک ڈھابے پر نوکری کرتا ہے یا ایک گندے سے ٹوٹے پھوٹے ہوٹل کا مالک ہے؟"

میں حیرت سے ماموں کو دیکھنے لگا۔ پھر ماما کی طرف دیکھا۔ انہوں نے زینب خالہ کے مالی حالات اس تفصیل سے ماموں کو بتائے تھے کہ وہ ایسے طنز کر رہے تھے۔

"ماموں! آپ زینب خالہ کے مالی حالات پر سوال اٹھا رہے ہیں؟ نانا ابو کی طرف سے وہ آپ کی سگی بہن لگتی ہیں۔ ایک ہی خون ہے آپ سب کا۔ آپ نے ان کے لیے کیا کیا؟ اگر نانا ابو زندہ ہوتے تو وہ ان کی شادی بھی کسی اچھی جگہ کرتے۔ اونچے اور بڑے خاندان میں۔ پھر آپ راضی ہو جاتے میری اور زوبیہ کی شادی کے لیے؟"

ماموں نے نظریں چرائیں۔ "بیٹا حسن! مہک میں کیا برائی ہے۔ دونوں بہنیں اپنے دل کے ارمان پورے کرنا چاہتی ہیں۔ کرنے دو۔ یہ پسند وسند کیا چیز ہوتی ہے بھئی؟ جس سے نکاح ہو جائے' وہ پسند بھی آجاتی ہے۔"

"زینب خالہ بھی تو ماما کی بہن ہی ہیں۔ ان سے رشتہ داری میں کیا برائی ہے۔"

ماموں نے غصے سے مجھے دیکھا۔ "او پاگل! بات کو سمجھ نہیں رہے' الٹا بحث کیے جا رہے ہو۔ بہت بدتمیز ہو گئے ہو۔"

ماما کی طرح ماموں بھی مجھ سے ناراض ہو چکے تھے۔ میں بہت زیادہ دباؤ میں آچکا تھا۔ سب کو یہ لگتا تھا کہ میرا فیصلہ سراسر جذباتی ہے۔ کہاں میں ہینڈسم' پڑھا لکھا' امریکا میں رہنے والا بڑے گھر کا لڑکا۔ کہاں پہاڑوں پر ایک کمرے کے گھر میں رہنے والی معمولی سی زوبیہ۔ جو لڑکی صبح اور شام دو گھنٹے لگا کر پہاڑ پر چڑھ کر اوپر ہوٹل کی طرف جاتی ہے' گندے برتن دھوتی ہے' لکڑیاں کاٹتی ہے' وہ لڑکی میرے قابل کیسے ہو سکتی ہے۔ اجڈ گنوار غریب لڑکی۔

"بھاگ کر شادی کر لو بھائی! سچ۔" نومی مجھے مشورہ دے رہا تھا۔

"میں تو بھاگ کر پاکستان چلا جاؤں گا لیکن زوبیہ نہیں مانے گی۔"

"یہاں ماما بھی کون سا مان رہی ہیں۔ منت وغیرہ کر کے زوبیہ کو ہی منا لینا۔ وہ مان جائے تو ہمیں بلا لینا۔ سچ یار! برف باری کے وہ دن بہت یاد آتے ہیں۔ ٹھنڈ تو یہاں امریکا میں بھی پڑتی ہے' پر جو ٹھنڈ وہاں لگی تھی ناں' مزا چکھا دیا تھا ہمیں۔ سب نانیاں' دادیاں یاد آگئی تھیں۔ مجھے ایسے لگتا تھا کہ میں یہاں سے زندہ نہیں جاؤں گا۔ یا مر کر جاؤں گا یا فریز ہو کر جاؤں گا۔"

مجھے بھی وہ دن یاد آگئے' جب پیشانی پر بل ڈال کر' زوبیہ ہمیں چنے منے سے کپوں میں دو دو گھونٹ چائے دے رہی تھی۔

"اب یہ نہ کہنا کہ تم لوگ اتنی زیادہ چائے نہیں پیتے۔ اماں کہتی ہیں، رزق ضائع کرنا بری بات ہوتی ہے۔"

ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ "اتنی زیادہ" چائے ہم نے ایک ہی گھونٹ میں سڑک کر لی تھی۔ جب تک وہ خالی ٹرے رکھ کر پلٹی تھی' ہم خالی کپ اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔ وہ حیرت سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"سچی پورے جنگلی ہو تم لوگ۔ کبھی اچھی چائے نہیں پی؟"

ہم نے اچھی چائے تو بہت پی تھی لیکن "اتنی زیادہ" چائے کبھی نہیں پی تھی۔

"دو گھونٹ چائے اور مل جائے گی...... میرا مطلب "ایک پورا کپ" چائے؟" نومی باز نہیں آیا تھا۔ زوبیہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تو یہ ابھی کیا پیا ہے؟"

"ابھی ٹیسٹ ٹیوب پیالہ" نوش فرمایا ہے۔ اب اگر آپ کو برا نہ لگے تو "اصل چائے کا پیالہ" دے دیں۔ باہر بہت سردی ہے۔ مجھے تو زندگی میں

کبھی چائے کی اتنی قدر نہیں ہوئی' جتنی آج ہو رہی ہے۔ گھر واپس جاؤں گا تو چائے کی پتی کو عقیدت سے آنکھوں سے لگاؤں گا۔ آتے جاتے روز اسے سلام کیا کروں گا۔"

"فی الحال یہاں چائے کو خدا حافظ کہہ دو۔" اس نے مسکرا کر نومی کو دیکھا۔ حسن اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ ماما البتہ کھل کر ہنس رہی تھی۔

"تم ہی اتنی کنجوس ہو یا خالہ بھی ہیں۔" میں نے اسے چڑانا چاہا۔

"شاہ خرچ ہونے کے لیے پیسے والا ہونا ضروری ہے۔ ہم پیسے والے نہیں ہیں۔" وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

"بچپن سے لے کر اب تک تمہیں جن جن لوگوں پر غصہ ہوگا، وہ سب تم نے ہم پر نکال دیا ہے۔ اکثر میں نیند میں جاگ کر آس پاس دیکھتا ہوں۔ مجھے یہ خوف ہوتا ہے کہ تم ہم سے کسی کا گلا نہ دبا دو۔"

"گلا دبانے کی زحمت کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی' ایک بالٹی ٹھنڈا پانی کام تمام کرنے کے لیے کافی تھا۔" اس نے دانت نکالے۔

وہ کتنی بھی بری باتیں کرتی تھی' پھر بھی بری نہیں لگتی تھی۔ میں یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے گلابی گال' میرے دل میں کی سرزمین پر دہک رہے تھے۔

☆☆☆

عاجز آکر میں نے ماما سے ہی بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

"ماما! جب تک زینب خالہ نہیں ملی تھیں' آپ انہیں یاد کر کے اداس ہوتی رہتی تھیں۔ آپ کو پچھتاوا تھا کہ آپ نے ان کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا۔ وہ کہانی آپ پھر سے دہرا رہی ہیں۔ اب آپ زوبیہ اور اپنے بیٹے کے ساتھ ٹھیک نہیں کر رہیں۔"

"تم اتنے حمایتی کیوں بن رہے ہو ان کے؟ یہ ہی حرکتیں زینب کی مجھے زہر لگتی تھیں۔ میری سہیلیوں کو اپنا گرویدہ کر لیتی تھی۔ ہر سہیلی اسے اپنی بھابھی بنانا چاہتی تھی۔"

"آپ کی ہر سہیلی انہیں اس لیے اپنی بھابھی بنانا چاہتی تھی کیونکہ زینب خالہ دل کی بہت اچھی ہیں۔ ماما! آپ کو اپنی ہی بہن کی خوبیاں دکھائی نہیں دے رہیں۔ جب ہم ان سے ملے تھے تو ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ چاند ستارے توڑ کر ہمارے آگے ڈھیر کر دیں۔ وہ اتنی نیک اور بے ضرر ہیں کہ میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔"

"ایسے ہی جال پھینکتی ہے وہ۔" انہوں نے منہ بنا کر کہا۔

"ماضی کی طرح آپ آج بھی ان سے خائف رہتی ہیں۔ آپ ان کو خود سے آگے نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ آپ کی طرح امیر نہیں ہیں' لیکن وہ آپ سے زیادہ مطمئن ہیں۔ ان کا دل سکون سے بھرا ہوا ہے۔ انہیں آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ کتنی محبت سے وہ آپ کا ذکر کرتی رہی تھیں۔ کتنا لگاؤ ہے انہیں آپ سے۔ لیکن آپ اپنا دل بڑا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔"

"تو پھر تم زوبیہ کو بھول جاؤ۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ماما! کبھی نہیں۔"

ہر جوان اولاد کی طرح میں نے بھی ماما کو دھمکی دی تھی کہ اگر زوبیہ سے شادی نہیں ہوئی تو میں شادی ہی نہیں کروں گا۔ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ زوبیہ کے پاس چلا جاؤں گا' خالہ سے کہوں گا میری شادی زوبیہ سے کر دیں۔ لیکن ماما پر کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ الٹا وہ مجھے بلیک میل کرنے لگی تھیں۔ ان کا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا۔ فکر اور پریشانی سے انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ وہ آئے دن ڈاکٹر کے پاس جاتی تھیں۔ مجھے سب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں مہک سے شادی کے لیے ہاں کہہ دوں، بس۔

"آپ کو لگتا ہے کہ میں مہک کے ساتھ خوش رہوں گا۔" میں نے پھر سے ماما سے دوٹوک بات کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں...... بہت خوش رہو گے تم دونوں۔" ماما خوش ہو گئیں۔

"آپ مجھے لکھ کر دیں گی کہ میں ہمیشہ خوش رہوں گا۔ آپ نے زینب خالہ کے ساتھ بہت کچھ برا کیا۔ سچ بتائیے گا ماما! کیا آپ کبھی خوش رہیں؟ کبھی آپ کا دل بے چین نہیں ہوا؟ آپ کو نیند کی گولیاں نہیں کھانی پڑیں؟؟"

ماما چپ چاپ میری شکل دیکھ رہی تھیں۔

"ماما! آپ بس زینب خالہ کو ہرانا چاہتی ہیں۔ جب آپ جوان تھیں تب بھی آپ نے یہی کیا تھا۔ آپ کو لگتا ہے کہ اگر زوبیہ اس گھر کی بہو بن کر آ گئی تو آپ ہار جائیں گی۔ آپ کو معلوم ہی نہیں کہ تب ہی تو آپ کی جیت ہوگی۔ آپ اپنے اندر کے منفی جذبے کو مات دے دیں گی۔"

جب انسان کو ایک فیصد بھی کامیابی کی امید نہ ہو تب ہی جانے کیوں' انسان سو فیصد کامیاب ہو جاتا ہے۔ میرا یہ چھوٹا سا لیکچر نہ جانے کیسے میری ماں کے دل کو چھو گیا کہ وہ کچھ نرم پڑ گئیں۔

"مجھے زینب سے نفرت نہیں ہے حسن! کبھی نفرت' کبھی محبت' کبھی حسد' کبھی دوستی' ہمارے درمیان یہ سب چلتا رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ ہمارا سگا سوتیلا ہونا ہے۔"

"زینب خالہ نے کبھی آپ کو سوتیلا نہیں سمجھا، پھر آپ کیوں سمجھتی ہیں؟"

"وہ اپنی ماں پر گئی ہے۔ ہمیشہ راضی بہ رضا رہتی ہے۔ دوسروں کے لیے زندگی گزار دینے والی۔"

"اگر آپ کو اپنی سوتیلی ماں سے کوئی شکایت نہیں تھی تو پھر زینب خالہ سے کیوں تھی؟"

وہ بہت دیر تک خاموش رہیں۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے بحث نہیں کی۔ غصہ بھی نہیں ہوئیں۔ دو تین دن تک وہ ایسے ہی چپ چپ رہیں۔ گھر کے ماحول میں جو بہت دنوں سے تناؤ تھا، وہ بھی کچھ کم ہو گیا۔ پھر ایک دن انہوں نے ہم سب کو بٹھا کر بس اتنا کہا۔

"پاکستان چلیں؟"

نومی نے "یاہو" کا ایک زوردار نعرہ لگایا۔ میں تو بت ہی بن گیا تھا۔ کوئی مجھے چھو کر انسان بنا دے پھر سے۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔

☆☆☆

"اور تمہاری وائف؟" اس نے پھر سے پوچھا۔

"میری فیوچر وائف اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس فیوچر وائف کی ہونے والی ساس' دیور اور نند مری کے ہوٹل میں ہیں۔ وہ کل دن میں آئیں گے۔ ساتھ مٹھائی بھی لائیں گے اور خالہ سے آ کر کہیں گے' یہ ہٹلر نما لڑکی ہمیں دے دیں۔ ہم اس کا بہت خیال رکھیں گے۔"

اسے حسن کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "تمہارا نکاح نہیں ہوا؟"

وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ "نہیں۔ میں نے ہونے نہیں دیا تھا۔ صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ جو تم نے اتنا انتظار کیا ہے' میں نے بھی اتنا ہی انتظار کیا ہے۔ ماما کو منانے میں بہت وقت لگا۔ انہیں یہ سمجھانے میں کہ جو غلطی وہ زینب خالہ کے ساتھ کر چکی ہیں' تمہارے ساتھ نہ کریں۔ کیونکہ پہلے وہ صرف اکیلی بے چین رہی تھیں۔ اب ان کا بیٹا بھی بے چین رہے گا۔ وہ زوبیہ کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔"

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ حسن بہت خوش تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ ٹھنڈی سرد راتوں میں دیکھے گئے خواب سچ ہو گئے تھے۔ کیا وہ اسے مل چکا تھا۔

"ہاں...... میں تمہیں مل چکا ہوں۔"

اس نے اس کے دل کی آواز بھی سن لی تھی اور جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔

مٹھی میں جگنو

سحر ملک

رات کی ٹھٹھرتی ہوئی خنکی اب صبح کی لو دیتی ہوئی تپش کو گھیر لائی تھی ایک اور صبح طلوع ہوئی تھی چرند پرند اپنے اپنے گھونسلوں سے نکل کر رب تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد رزق کی تلاش میں سرگرداں محو پرواز تھے۔
کھڑکی کی درزوں سے روشنی اندر آرہی تھی۔
مگر فری ابھی تک بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ سمیر نے ایک خفگی بھری نگاہ گہری نیند سوئی ہوئی فری پر ڈالی اور تیزی سے واش روم کی طرف لپکا تھا اسے آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ وقت مقررہ پر آفس پہنچنا بے حد ضروری تھا —— دروازے کے کھٹکے سے فری کی آنکھ کھلی تھی۔

وہ آنکھوں کو مسلتی ہوئی تیزی سے اٹھ کر کچن کی طرف گئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو پونی کی شکل میں سمیٹا تھا۔ فریج کھولنے پر اندازہ ہوا تھا کہ آٹا تو گوندھا ہی نہیں تھا اور سنک میں گندے برتنوں کا ایک ڈھیر پڑا منہ چڑا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آملیٹ اور بریڈ کا ناشتہ بنانے کا فیصلہ کیا اور پھر اس پر فوری عمل بھی کر ڈالا تھا۔

"فری فری میری شرٹ کدھر ہے...... اُبلیو۔"

سمیر کی آواز پر اس کو یاد آیا تھا کہ کل سمیر نے بطور خاص اسے وہ شرٹ استری کرنے کے لیے کہا تھا مگر وہ بھول گئی تھی اب سوائے افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا وہ جھکی نظروں کے ساتھ سامنے کھڑی تھی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس کا چہرہ اس کے اندرونی خلفشار کی چغلی کھا رہا تھا۔ سمیر ایک ملامت بھری بھرپور نگاہ اس پر ڈال کر الماری سے کوئی اور شرٹ پہن چکا تھا۔

"ناشتہ کرلیں آکر۔" فری نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ سمیر بالوں میں برش پھیر کر باہر لاؤنج میں آگیا تھا۔

"یہ کیا بریڈ! تم کو معلوم بھی ہے کہ مجھے ناشتے میں پراٹھا پسند ہے۔ ہم نے بچپن سے لے کر اب تک اپنی امی کے ہاتھ کے پراٹھے ہی کھائے ہیں یہ الا بلا نہیں۔" فری نے بری طرح سے جز بز ہوئی تھی۔

"یہ سب اماں جان کی ہی کرامات ہیں۔ عادتیں خراب کر رکھی ہیں لاڈلے کی۔" شکر کہ یہ سب فری نے محض دل میں ہی سوچا تھا۔ ورنہ یہاں جھگڑا شروع ہو جاتا۔

"اب کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو جاؤ جا کر چائے ہی لا دو۔" سمیر واقعی زچ ہو چکا تھا۔

"چائے تو میں نے بنائی ہی نہیں۔" فری نے بے چارگی سے کہا تھا۔

"یہ ناشتہ بھی تم ہی کر لو نکمی، پھوہڑ عورت۔" سمیر نے طیش میں آکر کہا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔

سمیر کے جانے کے بعد اس نے وہی ناشتہ زہر مار کیا تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ رات کو اس نے پوری طرح دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ علی الصبح جاگ کر سارے کام نبٹا لے گی۔ مگر برا ہو اس نیند کا جس کی وجہ سے وہ ایک کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر پائی تھی۔ وہ بخوبی واقف تھی کہ سمیر زیادہ عرصہ اس سے خفا نہیں رہ سکے گا کیونکہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ یہ محبت کا ہی اعجاز تھا کہ آج وہ مسز سمیر تھی۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ سمیر کالج میں کس طرح اس کی اک نگاہ التفات کا منتظر رہا کرتا تھا، وہ سمیر جس کی ایک دنیا دیوانی تھی۔ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ وہ تعلیمی لحاظ سے بھی سب کا پسندیدہ تھا پھر اسے سی آر کا بھی عہدہ دے دیا گیا تھا۔ سب لڑکیاں اس کی شخصیت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اس کی شائستگی اور کردار کی پختگی سب کے لیے ستائش کا باعث بن چکی تھی۔ کوئی لڑکی کسی مسئلے سے دوچار ہوتی تو اس کے حل کے لیے بلا جھجک سمیر کے پاس آجایا کرتی تھی۔ ایسے ہی کچھ دن طبیعت کی ناسازی کے سبب فری یونیورسٹی نہیں جا سکی تھی اس کی تعلیم کا بہت حرج ہو چکا تھا۔ اس کے پاس مطلوبہ نوٹس بھی موجود نہیں تھے ایسے میں اس نے سارہ سے مدد مانگی تھی۔

"تم ایسا کرو سمیر سے لے لو نوٹس۔ تم تو جانتی



ہو مجھے خود بھی اپنا لکھا ہوا بعد میں سمجھ میں نہیں آتا۔“

سارہ نے اپنے تئیں مسئلہ ہی حل کر دیا تھا مگر اس کے لیے مزید الجھن بڑھ گئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ سمیر کی نگاہیں ہمہ وقت اس کے چہرے کا طواف کرتی رہتی ہیں۔ مجبوراً اس نے سمیر سے بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ جب سر حماد کی کلاس کے بعد وہ باہر نکلی تو کوریڈور میں ہی سمیر اپنے دوست کے ساتھ کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فری کو کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ وہ محو حیرت تھا۔

"السلام علیکم! کیا مجھے آپ کے نوٹس مل سکتے ہیں۔ میں کافی دنوں بعد آج آئی ہوں تو سارے لیکچر مس ہو گئے ہیں۔" وہ وضاحتی انداز میں بولی تھی۔ اس کا دوست فری کو رکتے ہوئے دیکھ کر فوراً وہاں سے جا چکا تھا۔

"جی۔ میں جانتا ہوں۔ بہت پریشان تھا کہ کس سے آپ کی خیریت دریافت کروں۔" بے ساختہ ہی سمیر کے منہ سے نکلا تھا' بعد میں وہ پچھتایا تھا۔

"جی؟" وہ حیرت سے بولی تھی پھر سمیر نے اس کو نوٹس خود بنا کر دیے تھے۔ صاف لکھائی سے لکھے نوٹس اس کی محنت کا ثبوت تھے۔

"ہر انسان محبت کا تمنائی ہوا کرتا ہے۔ انسان نفرت کو تو بھلا سکتا ہے۔ مگر محبت سے بھرپور ایک لمحہ نہیں بھول سکتا ہے۔ دکھ میں' اذیت میں وہی اک لمحہ حاصل زیست بن جاتا ہے۔"

فری تو یوں بھی ایک خود پسند لڑکی تھی۔ اس ستائش کو اس نے اپنا حق سمجھتے ہوئے وصول کیا تھا۔ پھر یہ انسیت جلد ہی چاہت میں بدل گئی تھی۔ سمیر نے اس کو شادی کی پیشکش میں لمحہ نہیں لگایا تھا یوں باہمی رضا مندی سے ان دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔ جس میں دونوں خاندانوں کی خوشنودی بھی شامل تھی۔

ساجدہ بیگم نے فری کو دیکھتے ہی پسند کر لیا تھا کامنی سی فری نے پہلی نظر میں ہی ساس کا دل موہ لیا تھا مگر کہتے ہیں نا کہ اصل پرکھ شادی کے بعد ہوا کرتی ہے۔ اور فری نے شادی کے بعد اپنا اصل دکھا دیا تھا وہ صرف شوپیس بن کر اس گھر میں رہنا چاہتی تھی مگر پورے استحقاق کے ساتھ۔ گھر والوں نے اس کے بہت ناز اٹھائے تھے۔ صرف اماں ہی تھیں جو اٹھتے بیٹھتے اسے اگلے گھر جانے کے طعنے دے کر اس کو کام کاج کرنے کو کہا کرتی تھیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی۔ کچھ پڑھائی کا بہانہ پاتی وہ جب گھر لوٹتی تھی تو دوپہر ڈھل رہی ہوتی تھی۔ گھر کے بیشتر کام تو بھابھی نپٹا چکی ہوتی تھیں کیونکہ وہ اس گھر میں رچ بس چکی تھیں۔ اس گھر کی ذمہ داری کو بار نہیں سمجھتی تھیں۔

جبکہ شادی کے بعد فری اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر پا رہی تھی۔ سمیر کی ایک آپا بیاہی ہوئی تھیں ایک بڑے بھائی اور بھابھی تھیں۔ عدیل اور ثمینہ بھابھی۔ ثمینہ نے گھر کی ذمہ داری قبول کی تھی مگر جب ساجدہ نے ذمہ داری دونوں بہوؤں میں بانٹ دی تو مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ ثمینہ تو اپنے حصے کے تمام کام بروقت کر لیا کرتی تھی مگر جس دن فری کی ڈیوٹی ہوتی سارے کام ادھورے رہ جاتے تھے۔ عجیب سی ہڑبونگ مچ جاتی تھی۔ اس لیے اکثر ساجدہ بیگم بہو کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔ مگر اس پر بڑی بہو کا شکوہ بھی بجا تھا کہ یہ سراسر ناانصافی ہے۔ پھر جب سمیر کی پوسٹنگ دوسرے شہر میں ہوئی تھی تو فری بھی ساتھ آ گئی تھی۔ مگر زندگی کسی طرح سیٹ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ آئے دن کے جھگڑے ہونے لگے تھے۔

☆☆☆

شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب سمیر گھر لوٹا تھا۔ اس نے آج سمیر کو خوش کرنے کے لیے اس کا پسندیدہ کھانا بنایا تھا۔ اب اتنے عرصے کے بعد اس نے تھوڑا بہت پکانا سیکھ لیا تھا بس وہ نیند کی ماری تھی۔ پہروں سوتی تھی اِسے صبح سویرے جاگنے میں بھی دقت ہوتی تھی اس لیے وہ سارے کام

وقت پر نہیں کر پاتی تھی۔

سمیر واش روم سے فریش ہو کر باہر نکلا تو اس کی نگاہ باہر ہی بیٹھی فری پر پڑی تھی۔

"کھانا لگا دوں کیا۔" فری نے اس سے پوچھا تھا۔

"آ گیا خیال مجازی خدا کا۔ کمال ہے۔" سمیر نے طنزیہ انداز میں کہا تو فری کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"ایک تو میں صبح سے بھوکی ہوں اتنی کالز کیں میرا فون بھی نہیں اٹھایا۔ کیا تھا جو رزق کی بے حرمتی نہ کرتے جو تھا کھا لیتے۔ میں نے سوچا تھا کہ پراٹھا بنا دوں مگر آٹا ہی نہیں گوندھا تھا' وقت بھی اتنا ہو گیا تھا۔ اور رات آپ کے ساتھ مووی دیکھتے ہوئے شرٹ پریس کرنا میرے ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ سارا قصور میرا ہی سہی' تھوڑا سا درگزر سے کام تو آپ کو بھی لینا چاہیے تھا۔" وہ منہ بسور کر روٹھے پن سے بولی تھی۔

"اچھا اب بھی کیا صبح کی طرح خالی بحث سے میرا پیٹ بھرو گی یا کچھ کھانے کو بھی لاؤ گی؟" سمیر کو واقعی بھوک لگ رہی تھی۔

اس نے آفس میں دو سلائس ہی لیے تھے چائے کے ساتھ۔ وہاں کوئی اس کے لیے پراٹھے بنا کر نہیں بیٹھا تھا۔

"آپ بیٹھیں' میں لاتی ہوں۔" فری جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس نے کھانا ٹیبل پر لگا کر سمیر کو مطلع کیا تھا جو صوفے پر نیم دراز سا ٹی وی چینل ریموٹ کے ذریعے بدل بدل کر چیک کر رہا تھا۔ بے حد لذیذ قورمہ تھا۔ ساتھ فری گرما گرم تازہ چپاتی لاتی جا رہی تھی۔

کچھ بھوک کی شدت اس قدر تھی کہ اسے قورمہ واقعی لذیذ لگ رہا تھا۔ وہ کھانا زیادہ ہی کھا گیا تھا۔

"ارے تم بھی کھاؤ نا۔ بیٹھو۔" اچانک ہی سمیر کی نگاہ فری کے اترے ہوئے چہرے پر پڑی تھی اِس نے محبت سے اس کی کلائی تھام لی تھی اور اسے اپنے عین سامنے بٹھا لیا تھا۔

"چلو شکر ہے بیوی کا بھی خیال آ گیا آپ کو۔" وہ روٹھے پن سے بولی تھی پھر سمیر نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر کھانا کھلایا تھا۔ وہ دونوں ایک بے حد بے زار سے دن کے اختتام پر خوشگوار موڈ میں تھے۔

"اچھا۔ اب میں سونے جا رہا ہوں صبح مجھے کچھ جلدی جانا ہے۔ ایک بہت اہم میٹنگ ہے۔ پلیز جب سو جاؤں تو پکارنا مت۔" اور سمیر اتنی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا کہ لیٹتے کے ساتھ ہی سو گیا تھا۔

☆☆☆

زیست میں جہاں دکھ ہوتے ہیں وہاں خوشیوں کے حسین پل بھی ایک بار ضرور دستک دیتے ہیں۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ ان سنہری پلوں کو کس طرح سے یادگار بنا کر اس کی تلاش میں سرگرداں و کوشاں رہتا ہے کیونکہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے۔ یا پھر وہ اپنی کم عقلی سے ان خوشیوں کو کھو دیتا ہے۔ سمیر نے فری کو پورے دل سے بیوی کا مکمل مقام و مرتبہ دیا تھا۔ اپنی چاہت کے وہ نرالے رنگ بھی اس کی نذر کیے تھے جو ایک مرد اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں رکھتا ہے۔ مگر فری ان چاہتوں اور محبتوں کو سمیٹنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ بسا اوقات اپنی کم عقلی اور کاہلی کی وجہ سے سمیر کو خود سے دور کر رہی تھی۔ سمیر کی آرزو تھی کہ اس کی بیوی سلیقہ شعار ہو' ویل ڈریسڈ رہے۔ شادی سے پہلے سمیر نے دیکھا تھا کہ اس کے دوستوں کی بیگمات کس طرح سے نک سک سے تیار رہا کرتی تھیں صرف یہی نہیں گھر گرہستی میں بھی طاق تھیں کھانا پکانے میں ماہر تھیں۔ کس طرح اپنے گھر کو وہ جنت نظیر بنائے ہوئے تھیں۔ وہ بھی اسی بات کا تمنائی تھا مگر فری خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ کچھ افسانوی سی۔ حقیقت سے قطع نظر وہ اپنی سوچوں میں غلطاں رہتی تھی۔ اب

کچھ عرصہ سے اسے خود بھی ادراک ہوا تھا مگر تب تک حالات عجیب سا رخ اختیار کر گئے تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ سمیر اب اس کا محبوب ہی نہیں اس کا شوہر بھی ہے۔

☆☆☆

سمیر نے فری کو دو دن پہلے ہی بتا دیا تھا کہ فری کے اعزاز میں اس کے دوست نے گھر میں ایک فنکشن رکھا ہے کہ بھابھی سے بھی ملاقات ہو جائے گی — اس لیے فری کا اس تقریب میں شریک ہونا بہت ضروری ہے پھر عین اس دن صبح جاتے ہوئے بھی وہ تاکید کرنا نہیں بھولا تھا کہ شام میں تیار رہنا۔ مگر جب شام کو سمیر وقت سے کچھ پہلے آیا تو فری کو ملگجے سے حلیہ میں لیٹا دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

"سر درد ہے تو ایسا کرو سر درد کی گولی کھا لو مگر میرے ساتھ چلو یہ پارٹی ہی تمہارے لیے ہے اگر طبیعت خراب ہی تھی تو کم از کم مجھے فون پر ہی بتا دیتیں اب میری کتنی سبکی ہو گی ان سب کے سامنے۔" وہ تاسف زدہ لہجے میں بولا تھا۔

"تو کیا میں نے کہا تھا کہ میرے لیے کسی تقریب کا اہتمام کریں اور ویسے بھی مجھے بوریت ہوتی ہے ایک مرتبہ میں گئی تھی وہ ساری بیگمات اپنے ہی قصیدے پڑھ رہی تھیں — بات فون پر بتانے کی تو کوشش کی تھی مگر آپ کا فون ہی آف تھا حسب معمول آپ کے موڈ کی طرح۔" آخری جملہ نادانستگی میں اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔

"بوریت ہوتی ہے اس لیے کہ لوگ تمہارا پھوہڑ پن نہ جان لیں؟" سمیر کو بھی سخت طیش آ چکا تھا۔

"پھوہڑ پن کون سا پھوہڑ پن ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔" فری سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی سراسر لڑنے والا انداز تھا۔

"تم سے کون بحث کرے جاہل عورت۔" اس وقت سمیر کو واقعی شدید چڑ محسوس ہو رہی تھی۔

"جاہل تھی تو شادی ہی کیوں کی تھی۔؟" فری نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر دو بدو جواب دیا تھا۔

"بس قسمت ہی پھوٹی تھی جو تم پر نظر انتخاب ٹھہری' پچھتا رہا ہوں اسی ایک لمحے کو۔" سمیر کے الفاظ سن کر فری کے گلے میں درد کا ریلا سا جیسے اٹک گیا تھا۔ وہ چپ سی ہو گئی تھی۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ سمیر کا موڈ آف تھا اس وقت تو فری اسے سخت زہر لگ رہی تھی۔

وہ روتی رہی اور سمیر نے لاونج میں آ کر دوست کو میسج کر دیا کہ کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ نہیں آ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے فون ہی آف کر دیا تھا۔ سمیر اس وقت غصے میں تھا' سرتاپا سلگ رہا تھا جبکہ اندر فری ایک تواتر سے آنسو بہا رہی تھی۔

☆☆☆

دونوں میں سے اس مرتبہ کوئی بھی دوسرے کو منانے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ سمیر کو لگتا تھا کہ وہ حق بر تھا اس نے محبت سے اور پوری ذمہ داری سے اسے دو دن پہلے ہی تقریب میں شرکت کے لیے کہہ دیا تھا اور یہی نہیں عین اس دن بھی یاد دہانی کروانا نہیں بھولا تھا۔ اس کے دوست نے شدید ناراضی کا اظہار کیا تھا وہ اپنی جگہ واقعی حق بہ جانب تھا کیونکہ سارا اہتمام ہوا تھا اور یہ لوگ اس تقریب میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے ان کی دل آزاری ہوئی تھی۔ انتظار کی کوفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جبکہ فری کو سمیر کے غصے میں ادا کیے الفاظ نے اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ درد کی لہر اٹھتی تھی جب سمیر کے لفظوں کی بازگشت کانوں میں گونجتی تھی۔ کیا وہ واقعی اس سے شادی کر کے پچھتاوے کی زد میں تھا۔ اب اسے اس بات پر افسوس تھا کہ فری اس کی جیون ساتھی تھی وہ اس سے شدید نفرت کرنے لگا تھا اس کی تکلیف سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اب اس کا دل کرتا تھا کہ کوئی یہ چپ توڑ دے۔ اور جب رات گئے سمیر گھر لوٹتا تو اس سے بات کرنا تو درکنار اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک عورت تھی گوشت پوست کی۔ ایک نازک دل رکھنے والی۔ بالآخر انا کی دیوار اس نے ہی توڑ ڈالی تھی۔

اس شام وہ بے حد چاؤ سے تیار ہوئی وہ آج سمیر کو منا لینا چاہتی تھی اس کو اپنی محبت کی لپیٹ میں لے لینا چاہتی تھی اس نے سمیر کا پسندیدہ لباس زیب تن کیا تھا۔ خوب اہتمام سے تیار ہو کر اس نے ایک ناقدانہ نگاہ اپنے عکس پر ڈالی تھی۔ قد آدم آئینہ اس کی خوبصورتی کا شاہد تھا۔ آج چونکہ وہ دل سے تیار ہوئی تھی تو ایک حجاب بھی مانع آ رہا تھا۔ کبھی کبھار کسی کا شدت سے انتظار جاں گسل بن جاتا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی لمحوں کی زد میں تھی۔ نظر بار بار گھڑی کی سوئیوں میں الجھنے لگتی تھی۔ اس نے کھانا نہیں بنایا تھا بلکہ دوپہر کو بھی صرف بسکٹ اور چائے پی تھی۔ اس کی نیت تھی کہ وہ اور سمیر آج کی شام کو یادگار بنانے کے لیے باہر جائیں گے۔ اسے یادگار بنائیں گے۔ پرفسوں لمحات کی بارش میں از سر نو اظہار محبت کریں گے۔ اس نے ایک کارڈ لکھا تھا اور سائڈ ٹیبل پر رکھا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سمیر یہیں اپنا فون رکھتا تھا اور واش روم میں جا کر فریش ہوتا تھا۔ اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ اس کو ضرور پڑھ لے گا۔

چلو اب مان جاؤ تم
ہوئی جو بھول ہے ہم سے
تو بھرپائی بھی کرتے ہیں
مانگ کر معافی دونوں ہاتھ باندھ کر اپنے
کہ اپنا حق ہی سمجھا تھا جو تم کو کہا تھا کچھ
جواب کی بار ہم روٹھے
تو خود سے روٹھ جائیں گے
بکھر جائے گی یہ ہستی

تب ہی ڈور بیل ہوئی تھی' اس نے لپک کر دروازہ کھولا تھا۔

سامنے بینا آپی تھیں ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی اور ان کے بچے۔ عقب میں سمیر بھی تھا۔

"کیا بات ہے' کیوں راستہ روکے کھڑی ہو۔ ہم پہلے ہی بہت تھکان محسوس کر رہے ہیں۔" بینا آپی کی بات پر وہ خرد کی دنیا میں جیسے لوٹی تھی۔

فوراً ایک جانب ہو کر اس نے راستہ چھوڑا تھا۔

"کیا بات ہے بڑی تک سک سے تیار ہوئی ہو۔ کیا کہیں جا رہے تھے سمیر تم لوگ۔" بینا آپی نے کہا تو سمیر بھی جو حیرت سے فری کی حشر سامانیوں کو ملاحظہ کر رہا تھا بری طرح سے چونکا تھا۔

"نہیں آپا! ایسا کچھ بھی نہیں ہے بلکہ یہاں تو کسی تقریب میں شرکت کا بھی کہا جائے تو سر درد شروع ہو جاتا ہے اپنے موڈ کی مالکہ ہے فری۔" اس کے طنز پر ایک مسکراہٹ سی آ گئی تھی بینا کے لبوں پر۔

"بھئی میں تو کبھی اتنے بھاری بھرکم لباس نہیں پہنتی باسط کی آمد پر۔ ویسے بھی اچھا نہیں لگتا وہ کیا ہے نا کہ یہی تو بات ہے جوائنٹ فیملی سسٹم کی۔ رکھ رکھاؤ لحاظ مروت۔ برا نہ ماننا ہم تو جب تک ہیں تم ذرا لحاظ ہی رکھنا ہمارا۔ اب کھڑی کیا ہو جلدی سے پہلے چائے پلاؤ پھر ہم کھانا کھائیں گے۔" وہ لبوں پر قفل لگائے بینا آپا کی کڑوی کسیلی باتیں سن رہی تھی چونکہ وہ سمیر کے ساتھ ہی یہاں آ گئی تھی تو جب بھی سسرالی رشتہ داروں کو موقع ملا کرتا تھا وہ طنزیہ گفتگو سے سارے عرصے کا کوٹا پورا کر دیا کرتے تھے۔ کہیں کوئی کمی بیشی نہ رہ جائے۔

اس نے جلدی سے سب سے پہلے اپنا لباس تبدیل کیا تھا سادہ سے کپڑے پہنے وہ بظاہر مسکان لبوں پر سجائے باہر آ گئی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی اور سمیر کی آپسی چپقلش کا کسی کو بھی احساس ہو۔ اس لے ضروری تھا کہ وہ بینا آپا کی کڑوی کسیلی باتوں کو ہنس کر برداشت کر لے۔

اس نے سب سے پہلے چائے لا کر دی تھی جب وہ چائے لا رہی تھی تو بینا آپا سمیر سے زوبی کا تعارف کروا رہی تھیں کہ زوبی ہاسٹل میں رہنا چاہتی

تھی مگر بینا آپا کی محبت میں یہاں رہنے کے لیے مان گئی ہے' کسی جوان بچی کے لیے دوسرے شہر میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اسی لیے زوبی کو ساتھ لے کر یہاں آئی تھیں۔ وہ بار بار زوبی کو بچی کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں جیسے وہ واقعی دودھ پیتی بچی ہو اور جس کو بچی کہہ کر مخاطب کیا جا رہا تھا وہ اپنے بالوں کی لٹ میں اپنی انگلی پھنسائے کھیلتے ہوئے سمیر کو گہری نگاہ سے دیکھ رہی تھی' خود سمیر بھی کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ فری کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لرز سی گئی تھی۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا اندر کا منظر فوراً بدل سا گیا تھا۔

سمیر نے اپنی نظریں چرالی تھیں جبکہ زوبی بھی سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ چائے کی ٹرے رکھ کر فوراً واپس مڑ گئی تھی۔

کھانا بنتے ہی اس نے اطلاع دی تھی تو صرف پلاؤ دیکھ کر بینا آپا نے ناک بھوں چڑھائی تھی۔

"کوئی ذائقہ نہیں ہے تمھاری بیوی کے ہاتھوں میں۔ خیر یہ اپنی زوبی آ گئی ہے اب سارے کام وقت مقررہ پر ہی ہوں گے۔" بینا آپا کا طنز وہ بخوبی سمجھ رہی تھی مگر خاموش رہی تھی۔

"تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ آپا کی آمد پر ڈھنگ کا کوئی سالن ہی بنا لیتیں۔" سمیر نے سرد لہجے میں کہا تھا وہ صرف اتنا بولی۔

"آپا اطلاع دے کر نہیں آئی ہیں ورنہ ضرور بنا لیتی۔" اس کا جواب کسی کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔

"اب کیا آپا تم سے پوچھ کر' اجازت لے کر آئیں گی۔ یہ ان کے بھائی کا گھر ہے جب مرضی آئیں۔"

جواب دینا فضول ہی تھا۔ وہ رات گئے گھر کے کام نبٹاتی رہی تھی کسی نے جھوٹے منہ بھی اسے باہر آنے کو نہیں کہا تھا۔ باہر سے قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جب رات کو وہ کمرے میں آئی تو سمیر کے ہاتھوں میں اپنا کارڈ دیکھ کر وہ رک سی گئی تھی۔ سمیر نے اسے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا تب ہی نفرت سے کارڈ زمین پر پھینک دیا تھا۔ وہ خاموشی سے آ کر بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ آنسو اس کا تکیہ بھگوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

"حد ہو گئی بھئی آٹھ بج رہے ہیں ابھی تک محترمہ سو رہی ہیں۔ بچی صبح سے کچن میں اکیلی لگی ہلکان ہو رہی ہے۔"

بینا آپا کی آواز پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا سی گئی تھی۔ رات روتے روتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور اسی وجہ سے وہ صبح دیر تک سوتی رہی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو زوبی ٹیبل پر خستہ پراٹھے پیش کر رہی تھی اور سمیر مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔

بینا آپا کی نظر اس پر پڑی تو جتانے والے لہجے میں بولی تھیں۔

"لو جی' میزبان بھی آ گئے ہیں۔ چلو اب تو الٹا ہی حساب ہو گیا ہے مہمانوں کو خود ہی پکا کر کھانا پڑتا ہے۔"

وہ کوئی جواب دیے بنا سیدھا کچن میں آ گئی تھی اس نے دیکھا' زوبی سمیر کے لیے کپ میں چائے ڈال چکی تھی اس سے نظروں کا تصادم ہوا تو زوبی جتاتی نظروں سے دیکھ کر کچن سے باہر نکل گئی تھی۔

فری کو یہ لڑکی بہت ہی چالاک لگ رہی تھی۔ عام حالات میں وہ سمیر کو اس کے ہاتھ کے بنے ناشتے سے منع کر دیتی مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ ان کی ناراضی چل رہی تھی۔ وہ سمیر پر کوئی حق نہیں جتا سکتی تھی۔

پھر آپا تو دو دن کے بعد چلی گئی تھیں کہ ان کو اپنا گھر بار بھی سنبھالنا تھا وہ اتنی دور صرف زوبی کو ہی یہاں چھوڑنے آئی تھیں اصل کہانی صرف اتنی سی نہ تھی کہ زوبی کو ہاسٹل میں نہیں رہنا تھا بلکہ سب گھر والے بظاہر تو فری کو اپنا چکے تھے مگر دل ہی دل میں وہ سب سمیر سے شاکی تھے' بینا آپا نے تو سمیر کی شادی سے قبل ہی اشارے کنایے میں زوبی کے والدین سے سمیر کے حوالے سے بات چیت کر لی تھی مگر جب اچانک سمیر نے فری کا نام لیا تو سب گھر والے ششدر رہ گئے تھے۔ وہ سب سمیر کی عادت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اسے جب کسی بات کی ضد ہو جاتی تھی تو پھر وہ کر کے ہی چھوڑتا تھا اس معاملے میں بھی ایسا ہی تھا سب نے اسے نرمی سے سمجھا بجھا کر دیکھ لیا تھا مگر وہ فری کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا عزم کر چکا تھا۔ اس لیے وقتی طور پر سب اہل خانہ نے مصلحت پسندی کی چادر اوڑھ لی تھی۔

سب سے زیادہ دل شکنی تو بینا آپا کی ہوئی تھی۔

جب ان کو معلوم ہوا کہ سمیر کے شہر میں ہی زوبی کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا ہے تب بینا آپا نے دل ہی دل میں اس کو رب کا اشارا سمجھا تھا اس لیے انہوں نے زوبی کے ساتھ آنے کی زحمت کی تھی۔ وہ ابھی بھی مایوس نہیں تھیں۔

ان کے جانے کے بعد فری کو اس لڑکی سے الجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

زوبی صبح سویرے جاگنے کی عادی تھی۔ اس کے جاگنے سے پہلے سمیر کا ناشتہ بنا کر ٹیبل پر لگا دیتی تھی۔ کمرے پر زوردار دستک دے کر سمیر کو جگاتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر یونیورسٹی جاتی تھی۔ یہ سب فری کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ لحظہ لحظہ خود کو دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

واپسی پر زوبی بس پر آ جاتی تھی۔ سمیر کی آمد کے وقت بڑے انداز سے تیار ہو کر گیٹ تک کے چکر لگتے رہتے تھے۔ فری سب دیکھ رہی تھی اور اسے سب سے زیادہ غصہ تب آتا تھا جب کسی بیوی کی طرح بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ سمیر گیٹ پر ملتی تھی اور وہ جب تک پہنچتی تب تک دیر ہو چکی ہوتی تھی۔ اس کی پہلے ہی سمیر سے لڑائی چل رہی تھی ورنہ اس نے کئی بار سوچا تھا کہ وہ زوبی کو کھری کھری سنا ڈالے۔ مگر ہر بار اس کی ازلی انا آڑے آ جاتی تھی اور وہ مہر بہ لب رہ جاتی تھی۔

آہستہ آہستہ جیسے زوبی' سمیر کو اپنا عادی بنا رہی تھی اور سمیر بھی اس سے چائے کے دوران دن بھر کی روداد سامنے بیٹھ کر اس طرح سے سنتا تھا جیسے وہ کوئی دودھ پیتی بچی ہے جس کی ذمہ داری اس پر بینا آپا نے ڈال دی تھی۔ جسے وہ کچھ زیادہ ہی تندہی سے نبھا رہا تھا۔

"میں نے آج آپ کے لیے پکوڑے بنائے ہیں' یہ کھا کر دیکھیں اور ذرا بتائیں کیسے ہیں۔" وہ لگاوٹ بھرے انداز سے کہتی تھی۔ فری کا دل جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔

"بہت مزے دار' سچ بہت ذائقہ ہے تمھارے ہاتھ میں۔" سمیر تعریف تو اس کے کھانے کی کر رہا ہوتا تھا مگر اس کی نظر زوبی کے دلکش چہرے پر بھٹک رہی ہوتی تھی۔ کیونکہ زوبی اگرچہ دلکش تو تھی ہی مگر اسے خود کو سنوارنے نکھارنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ فری کے لیے یہ سب اذیت ناک تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی سمیر ہے جس نے سب سے لڑ کر اسے اپنایا تھا۔ اسے اپنا نام دیا تھا۔ محبت دی تھی۔

اگر دو فریقین باہمی مشاورت سے اپنے مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہوں تو تب ہی معاملات حل ہوتے ہیں مگر یہاں تو صرف فری ہی جیسے دیوار سے اپنا سر ٹکرا رہی تھی۔

☆☆☆

میرا عشق ہو۔۔۔

تری ذات ہو۔۔۔

پھر جس دن عشق کی بات ہو۔۔۔

کبھی میں ملوں۔۔۔

کبھی تو ملے۔۔۔

کبھی ہم ملیں ملاقات ہو۔۔۔

کوئی ذکر ہو کوئی بات ہو۔۔۔

اس دن ویک اینڈ پر فری نے سمیر کا من پسند کھانا تیار کیا تھا۔ جب کچن میں آ کر زوبی نے

جھانک کر پوچھا۔
"کیا بنا رہی ہیں فری جی؟"
فری کا دل کرتا تھا کہ اس سے پوچھے کہ وہ اسے بھابھی کیوں نہیں بلاتی۔ مگر وہ اکثر دل کی باتیں دل میں ہی دبا لیا کرتی تھی۔ بامروت انسان مروت میں مارا جاتا ہے جبکہ بداخلاقی ہر طرح کی اقدار کی باڑ گرا دیتی ہے۔
"میں سمیر کے لیے کھانا بنا رہی ہوں جیسا کہ ہر بیوی بناتی ہے۔" فری نے جل کر اسے جواب دیا تھا۔ جس پر زوبی کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اور وہ سر ہلاتی باہر آگئی۔
ڈور بیل کی آواز پر فری، زوبی سے پہلے دروازے پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے لپک کر دروازہ کھولا تھا۔
"کیا بات ہے؟ زوبی نظر نہیں آ رہی اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" سمیر نے لاؤنج میں بھی زوبی کو نہ پا کر متفکر لہجے میں پوچھا تھا۔
فری کو لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ ایک دم ہی شدید گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔
اتنے دنوں کے بعد سمیر نے اپنی چپ توڑی بھی تھی تو فقط زوبی کے لیے۔
جیسے ہی زوبی آئی ایک چمک سی سمیر کے چہرے پر آگئی تھی۔
فری کھانا لگا کر کمرے میں بند ہو گئی۔ سیل رواں تھا آنسوؤں کا اور وہ تھی۔
فری کی ساری ذمہ داریاں رفتہ رفتہ زوبی نے سنبھال لی تھیں۔ فری اور سمیر کے درمیان حائل نامحسوس خلیج کو دونوں فریقین میں سے کوئی بھی کم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ فری کی امید کا دھاگا ٹوٹنے لگا تھا کہ سمیر اب اس سے شاید پہلی سی محبت نہیں کرتا مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔
محبت کا رنگ تتلیوں کو زور سے دبوچنے سے جیسے اڑنے لگتا ہے بالکل اسی طرح زیست میں جب مرد شوہر کی مسند سنبھال لیتا ہے تو اس کی محبت کے نرم گرم جذبات ایک سخت گیر حاکم میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسے بھی ایک پرسکون گھر میں ایک ایسی بیوی کی ضرورت تھی جو اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے میں منہمک، اپنی محبت کی مہر ثبت کر دے۔ لفاظی کی حد تک اعتراف محبت سہل ہے مگر جب عملاً ایک دوسرے کے احساسات و جذبات کا خیال رکھنے کی بات آتی ہے تو سیاہ و سفید میں امتیاز ازخود وقت کے چابک سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔
فری دلگرفتہ سی تھی۔ وہ کھانا بناتی تو سمیر بنا لحاظ رکھے کہہ دیا کرتا تھا۔
"زوبی! جب تک آپ یہاں ہیں، کم از کم میرے لیے تو آپ ہی کھانا بنا دیا کریں۔ ایک وقت گھر میں کھانا کھاتا ہوں وہ بھی ڈھنگ کا نہیں ملتا۔" افسوس کا تاثر لیے وہ ایسے کہتا تھا کہ فری کے دل میں سوراخ ہو جاتے تھے۔
آہستہ آہستہ فری نے خاموشی کی چادر اوڑھ لی زوبی کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دینے والی وہ خود ہی تھی۔ اس کا ایک مطمع نظر تھا کہ محبت، زور زبردستی سے نہیں حاصل کی جا سکتی، اگر بالفرض ایسی کوئی جہد مسلسل کامیابی سے ہمکنار ہو بھی جائے تو دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔
جب زوبی کھانا بناتی تو سمیر کھاتے ہوئے زوبی کے ہاتھوں کی خوب تعریف کرتا تھا۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ فرط جذبات سے سمیر نے کہا۔ "کھانا اتنا لذیذ ہے کہ دل کرتا ہے بنانے والے کے ہاتھوں کو چوم لوں۔" یہ سنتے ہی فری کا وہاں بیٹھنا محال ہو گیا وہ اپنے آنسو دباتی کمرے میں آگئی تھی اور زار وقطار رونے لگی۔
وہ گھر کے کام سمیٹ رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت نہ تو زوبی گھر پر تھی نہ سمیر۔ زوبی یونیورسٹی گئی تھی اور سمیر جاب پر۔
اس نے جلدی سے گیلے کپڑے الگنی پر ڈالے اور داخلی دروازے پر دیکھا۔ سامنے فرح بھابھی اور عدیل بھائی کھڑے تھے۔ اس نے ادب سے سلام پیش کیا۔ عدیل بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تھی۔ فرح کو دیکھ کر اس کا دل رونے کو بے قرار سا ہونے لگا تھا۔
"میں آتا ہوں گھنٹے تک۔" عدیل بھائی باہر چلے گئے تھے۔
"کیا حال کر لیا ہے تم نے اپنا لگ ہی نہیں رہا ہے کہ تم وہی فری ہو۔ ملگجا حلیہ، سلوٹ زدہ لباس، بکھرے بال، متورم آنکھیں۔ اف" فرح نے اس کو دیکھ کر تعجب سے کہا تھا۔ فرح کو واقعی اسے دیکھ کر سخت صدمہ ہوا تھا پھر بہتے آنسوؤں کے درمیان وہ کھوئے کھوئے لہجے میں ایک تواتر سے بولتی چلی گئی تھی۔ چہرے پر بکھرا شدید کھنچاؤ اس کے اندرونی خلفشار کا ترجمان تھا۔
"میں یہ سب جانتی ہوں مگر تم ایک بات نہیں جانتیں کہ بینا آپا نے اماں کو زوبی کو بہو بنانے کے لیے آمادہ کر لیا ہے۔ ہم بہ ظاہر جٹھانی دیورانی کے نازک رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ مگر میرا دل یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ کل کلاں یہی حالات میرے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔ عدیل کو گھنٹے بھر کے لیے کام تھا یہاں، میں نے اصرار کیا کہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ دو دن رہ کر لوٹ آؤں گی۔
جانتی ہو میرا دل بے قرار تھا، اب بھی وقت ہے، تم اور سمیر بھائی سنبھل جاؤ ورنہ سوائے پچھتاوے کے کچھ باقی نہیں رہے گا۔ آشیانہ تنکا تنکا کر کے بنتا ہے اور اس کو ریزہ ریزہ ہونے کے لیے محض ایک پل درکار ہوتا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ کرب ناک پل تمہاری زندگی میں آجائے؟"
فرح بھابھی کی بات پر اس نے گھبرا کر اپنا ہی دل تھاما تھا۔
"اللہ نہ کرے بھابھی۔" وہ دل گیر لہجے میں بولی تھی۔
"دیکھو میں جانتی ہوں کہ ساری غلطی تمہاری نہیں ہے۔ اس میں سمیر کا بھی اتنا ہی قصور ہے مگر تمہیں بھی اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے، اس میں قدم قدم پر عورت مرد کی محتاج ہے کہیں باپ کی صورت، کہیں بھائی کی صورت، اور کبھی خاوند کی صورت میں۔ ایک تنہا عورت اس معاشرے میں سوالیہ نشان بن کر رہ جاتی ہے جسے قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر اب بھی تم نے اپنے رویّے میں لچک پیدا نہ کی تو پھر تم جانتی ہو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟" فرح بھابھی کی بات پر وہ اپنی جگہ جزبز ہوئی تھی۔
"آخر ایک عورت ہی کو کیوں ہر بار جھکنا پڑتا ہے جبکہ غلطی بھی اس کی نہیں۔" وہ اچانک کسی باغی سرکش پرندے کی مانند پھڑپھڑانے لگی تھی جسے آشیانہ بھی قفس لگتا ہے۔
"کیا تم قصوروار نہیں یا تم جیسی ہر لڑکی جو شوہر کی بے التفاتی کو بے حسی کا لبادہ اوڑھے انتقامی کاروائی پر منتج کر لیتی ہے۔ سمجھداری سے کام لے کر مرد کی خواہش کے مطابق خود کو نہیں ڈھالتی بلکہ اسے کسی تر نوالے کی مانند دوسری عورت کی تھالی میں پیش کر دیتی ہے۔
تم نے آج تک کیا کیا ہے سمیر یا اس کے گھر والوں کے لیے۔ جانتی ہو مجھے ایسے کسی خوف کا سامنا نہیں ہے کیونکہ میں نے صرف عدیل کو ہی نہیں ان کے گھر والوں کو بھی دل سے اپنا لیا ہے۔ عدیل کیا کھانا پسند کرتے ہیں، ان کو کیا کیا پسند ہے۔ ان کی ترجیحات میں خود کو ڈھالتی چلی گئی۔ اس سے میں بونی نہیں ہوئی بلکہ میں نے اس راہ الفت میں عدیل کو تسخیر کر لیا ہے۔ تم بھی کسی دوسری عورت کو موقع نہ دو کہ وہ تمہاری گھر گرہستی لے اڑے۔ عورت کبھی بھی کمزور نہیں ہوتی، اس کی خود اعتمادی اس کا ہتھیار ہوا کرتی ہے۔" فرح بھابھی کی ساری باتیں اس کے دل میں قطرہ قطرہ جذب ہوتی چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

شام کو جب سمیر گھر لوٹا تو لاؤنج میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ داخلی گیٹ بھی کھلا ہوا تھا جہاں سے وہ داخل ہوا سامنے کا منظر اس کے لیے حیران کن تھا۔

عدیل بھائی اور فرح بھابھی کے درمیان فری مکمل تیاری کے ساتھ بے حد جاذب نظر لگ رہی تھی' نگاہ اس سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔

"آپ لوگ کب آئے۔" وہ محو حیرت تھا۔

"ہم تو صبح ہی آ گئے تھے۔ بھئی آج میرے بھائی کی من پسند شادی کو ایک سال مکمل ہو گیا ہے۔ سوچا جا کر کیک کھایا جائے' دعوت اڑائی جائے مگر یہاں تو کوئی آثار ہی نظر نہیں آ رہے۔" فرح بھابھی نے ہنس کر کہا تو وہ کچھ خجل سا ہو گیا تھا کیونکہ واقعی آج کا خاص دن اس کے دماغ سے نکل گیا تھا۔

فری کی ناراض نگاہیں اس کے دل کے آر پار اتر رہی تھیں۔

وہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے خجالت سے مسکرایا تھا۔

"چلیں میں فریش ہو کر آتا ہوں پھر سب ہوٹل چلتے ہیں۔" وہ جواباً بولا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آج سارا کھانا بے حد دل لگا کر فری نے تمہاری پسند کے مطابق تیار کیا ہے۔ تم فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھاتے ہیں سب مل کر۔" فرح بھابھی مسکرائی تھیں۔

پھر جب تک وہ فریش ہو کر آیا سب میز پر موجود تھے بشمول زوبی کے۔ آج زوبی بہت چپ چاپ بیٹھی تھی۔ چہرے پر سخت تناؤ تھا' فری کی دلکش مسکان اور سمیر کا والہانہ انداز میں بار بار فری کو دیکھنا' کچھ بھی تو اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔ اب جبکہ وہ مطمئن سی ہونے لگی تھی کہ بہت جلد سمیر اس سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے شادی کی آفر کر دے گا سب کچھ الٹ گیا تھا۔

کھانا بے حد خاموشی سے کھایا گیا۔

"زوبی! کیا تمہیں معلوم ہے' سمیر تو بری طرح سے فری پر لٹو ہو گیا تھا۔ شادی کرے گا تو بس فری سے۔ یاد ہے نا سمیر۔" زوبی کے گلے میں جیسے لقمہ ہی اٹک گیا تھا۔ کھانسی کا دورہ سا اٹھا تھا۔

"لو سمیر! اپنی بہن کو پانی کا گلاس دو۔" آگے زوبی نے دیکھا کہ فری کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ زوبی سے وہاں بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔

"جی ضرورت نہیں۔ میں کمرے میں جا رہی ہوں' میرے سر میں درد ہے۔" زوبی کو یقین تھا کہ سمیر بے چینی سے اس کی فکر میں کچھ بولے گا مگر وہ بالکل اطمینان سے سر جھکائے بریانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

زوبی پاؤں پٹختی وہاں سے اپنے کمرے میں چل دی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کل ہی یہاں سے ہاسٹل شفٹ ہو جائے گی سمیر کوئی آخری شکار تو نہ تھا جس کے لیے دل کا روگ لے لیتی۔

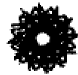
رات گئے کاموں سے فراغت کے بعد جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سمیر اسی کا منتظر تھا' جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی' اس نے فری کی کلائی تھام لی۔

"بہت ظالم لگ رہی ہو اس حسین روپ میں۔ کب سے انتظار کر رہا تھا۔" سمیر نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا جی۔ میں سمجھی کہ زوبی کے خیالات میں غرق ہوں گے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ ہونٹوں سے پھسل گیا تھا۔

"کہو تو اسے بلا لوں۔" سمیر نے اسے جلانے کی خاطر کہا جواباً فری نے زوردار مکا اس کے کندھے پر رسید کیا تھا۔

پھر دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا جہاں دونوں کے عکس جھلملا رہے تھے۔



ناولٹ

قسمت سے فرار

میمونہ صدف

وہ ہفتے بھر کا سوا سلف خرید کر اب بھرے ہوئے تھیلے لیے خراماں خراماں فٹ پاتھ پہ چلتی چلی جا رہی تھی۔ وزن اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ اس نے ضرورت کی چند اشیاء ہی تو خریدی تھیں لیکن اس کی گرتی ہوئی صحت اور ذہنی پسماندگی نے اس چند کلوگرام وزن کو منوں ٹنوں سے ضرب دے دیا تھا۔ گروسری اسٹور اس کے ڈربے نما نیم شکستہ لکڑی کے ہٹ سے کوئی دس منٹ کے فاصلے پہ ہوگا لیکن وہ بمشکل دس قدم چلتی اور پھر سستانے بیٹھ جاتی۔۔ سڑک کے دورویہ سنگی بینچ نصب تھے۔ ہر بینچ کا دوسرے سے فاصلہ اتنا تھا کہ تیز چلنے پہ تین اور اس کی طرح آہستہ چلنے پہ کوئی سات منٹ میں طے ہوتا۔ سو ہر سات منٹ بعد بے حد سست رفتار سے چلتے ہوئے وہ اگلے بینچ تک پہنچتی، سامان ایک طرف رکھ کر بیٹھ جاتی اور گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔ یوں سات منٹ چلنے اور سات منٹ سوچنے کے بعد وہ پھر سے سامان اٹھا کر اپنا سفر شروع کرتی اور دس منٹ کا فاصلہ گھنٹے میں تبدیل ہو جاتا۔

وہ آتے جاتے لوگوں پہ بہت کم دھیان دیتی تھی کیونکہ اس کے آنے جانے کا سارا رستہ اس کے ماضی کے سفر میں کٹتا تھا، ایک یہی وہ وقت ہوتا تھا۔ جب وہ اپنے گھر جا پہنچتی اور اپنی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ وقت گزارتی لیکن آج وہ نجانے کیوں ایک عجیب سے احساس سے دوچار تھی۔ وہ جب سے گروسری اسٹور سے نکلی تھی اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اس پہ نظر رکھے ہوئے ہے، جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ آج ماضی میں سفر کرنے کے بجائے بہت بار چونک کر اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن اسے ایسا کوئی نہیں دکھا تھا جو اس پہ نظر رکھے ہوئے تھا۔ ہزاروں کے آتے جاتے مجمع میں کوئی ایک چہرہ بھی شناسا نہ تھا۔ اور اگر وہ یہ بات عفیف کو بتا دیتی تو وہ اس پہ کتنا ہنستا، گھنٹوں نہیں دنوں اس کا مذاق اڑاتا کہ اس دیس میں بھلا کون اس کنگلی پہ نظر رکھے گا جو ہفتے بھر محنت کرنے کے بعد بمشکل اتنا جمع کر پاتی ہے کہ اگلے ہفتے کا راشن لا سکے، اس کی دوائیاں خرید سکے اور مہینے بعد چند ضروری واجبات ادا کر سکے۔ پھر وہ خاموش ہو جائے گی تو وہ اس کا کسی اور پہلو سے مذاق اڑانے لگے گا مگر وہ کیا کرتی کہ اسے شدت سے کسی کے خود پہ نظر رکھے جانے کا احساس تھا۔ پھر اس نے خود ہی اس خیال کو جھٹک ڈالا۔

"یہاں بھلا کون مجھ پہ نظر رکھے گا۔ شاید مجھے وہم جیسی بری بیماری ہو چلی ہے۔ یقیناً میں عمر سے پہلے ہی سٹھیا گئی ہوں۔"

گھر پہنچ کر اس نے سارا سامان اپنی جگہ پر رکھا، ایک بڑے پتیلے میں ڈھیروں پانی ڈال کر دال چڑھائی، اپنے باورچی خانے نما بڑے سے کمرے کے دیسی تنور میں صبح کے گوندھے میدے سے باقر خانیاں، ڈبل روٹی، کیک رس اور پاپے بنا بنا کر رکھے۔ اس سارے کے کام دوران بھی اسے یہی خیال ستاتا رہا کہ کوئی تو ہے جو اسے دیکھ رہا ہے۔

پھر وہ گرم شوربہ نما سبزیوں کا ملغوبہ، جو اس نے صبح ہی بنایا تھا، نئے سرے سے گرم کیا اور ایک پیالے میں بھر کر اپنے کمرے میں لے آئی جہاں عفیف اپنی وہیل چیئر پہ بیٹھا ہوا سامنے کھڑکی سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ کو دیکھ رہا تھا۔ سرد موسموں کے دیس میں ایسی دھوپ کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتی تھی۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا عفیف اس کھڑکی سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

''آج تم نے بہت دیر نہیں لگا دی، اسٹور اتنی دور تو نہیں ہے؟'' وہ ہر بار اس کے سودا سلف لے کر واپس آنے پہ یہی سوال کرتا تھا۔

''تمہیں کیا لگا تھا کہ میں کہیں بھاگ گئی ہوں؟ کسی کے ساتھ چلی گئی ہوں۔؟'' وہ اس سوال سے زچ ہو چلی تھی۔

ہر بار گروسری اسٹور یا بیکری سے لوٹنے پہ وہ یہی سوال دہراتا اور وہ اسی قسم کا جواب دے کر اس کا دل جلاتی۔ اس کا دل چاہتا کہ کبھی تو وہ اس کی تھکن کا احساس کرے اس سے ہمدردی جتائے کہ وہ اس عمر اور صحت کے ساتھ دو لوگوں کا کام کرتی ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عفیف کو لفظ ''ہمدردی'' سے ہی نفرت تھی خواہ وہ اس کی ذات کے لیے ہوتی یا کسی اور کی ذات کے لیے۔

''اس عمر اور حلیے میں اب کون تمہیں اپنے ساتھ لے جانا پسند کرے گا۔؟ یہاں لوگ کتا بھی نسل دیکھ کر رکھتے ہیں اور تم جیسی عورت......'' وہ اس کی بات سے محظوظ ہوا تھا، اس نے اپنے طور پہ اس سے مذاق کیا تھا لیکن جوہرہ کو اس کا یہ مذاق چابک کی طرح لگا تھا۔

''پھر تو تم بھی اعلا نسل کا کتا پال لیتے تو وہ تمہارے حق میں بہتر ہوتا۔''

''یہ خیال بڑی دیر سے آیا، اتنا کہ پھر بہت دیر ہو گئی۔'' وہ اسے ستانے کو بولا۔

جوہرہ نے غصے سے پیالہ پاس پڑی تپائی پہ رکھا تو عفیف نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جوہرہ کا سارا غصہ اس ایک لمس سے ختم ہو گیا تھا۔ یہ ان میاں بیوی کی معمول کی نوک جھونک تھی جو پچھلے کئی سال سے اسی طرح چلی آ رہی تھی اور جس کا انجام کسی ایسے ہی لمس یا محبت بھری بات پہ ہوتا تھا۔

''اب مجھ سے تیز نہیں چلا جاتا۔'' وہ جواب دیتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''تمہیں اتنی جلدی بوڑھا نہیں ہونا چاہیے جوہرہ۔''

وہ چمچے کی مدد سے ملغوبہ اسے پلانے لگی تھی جسے پینے کا وہ پچھلے تین سال سے عادی ہو چلا تھا۔ سبزیوں کی اقسام ہر بار مختلف ہوتیں لیکن پھر بھی وہ ملغوبہ جسے جوہرہ سوپ کا نام دیتی تھی، بدمزہ ہی رہتا کہ اس میں گوشت ــــــ ڈالنے کی اس کی اوقات نہیں تھی اور یہ بات وہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔

''جانتی ہوں۔ جن کے کاندھوں پہ بہت سا بوجھ ہو، وہ بوڑھے ہو کر بھی بوڑھے نہیں ہو پاتے۔ نہ کسی خوشی پہ ان کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ ہی انھیں سکون ملتا ہے۔'' ایک زخمی سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔ عفیف نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کس بوجھ کی بات کر رہی تھی وہ جانتا تھا۔

اس کے چہرے پہ وقت سے بہت پہلے جھریاں پڑ چکی تھیں اور ہاتھوں کی جلد بسکٹ، ڈبل روٹی اور پائے بنا بنا کر جگہ جگہ سے جلی اور کھردری ہو کر پھٹ چکی تھی۔ سر پہ گھنے بالوں کی جگہ روکھے اور گنتی کے چند بال رہ گئے تھے جنھیں وہ ایک رومال سے لپیٹ کر رکھتی تھی۔ اس کا بڑا سا گاؤن نما پاؤں تک چھوتا لباس ڈھل ڈھل کر اپنا رنگ کھو چکا تھا۔ اسے ایک بار پھر سے تاسف نے گھیر لیا ــــ کیا تھی جب وہ اسے وہاں لایا تھا اور کیا ہو گئی تھی۔

ایسی زندگی گزارنے تو وہ وہاں نہیں آئے تھے۔ یہ سب اس کی معذوری کے سبب ہوا تھا، اگر وہ اس طرح بستر پہ نہ پڑا ہوتا تو حالات یقیناً مختلف ہوتے۔ ان کا سارا جمع خرچ یوں ہوا برد نہ ہوا ہوتا۔ ان کی زندگی میں بہت نہ سہی لیکن کچھ تو خوش حالی ہوتی۔ یہ اسے لگتا تھا لیکن جوہرہ کو یہ نہیں لگتا تھا۔ اسے لگتا کہ اگر وہ حادثے کا شکار نہ بھی ہوا ہوتا تو بھی زندگی اس سے کچھ خاص مختلف نہ ہوتی۔ پہلے بھی مال میں ایسی ہی بے برکتی، دل میں مایوسی اور گھر میں بے سکونی تھی جیسی کہ اب۔ اسے پہلے کی اور اب کی زندگی میں کچھ خاص فرق نہیں لگتا تھا۔

''مجھے آج لگا عافی کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ جیسے کوئی مجھے چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ میری جاسوسی کر رہا ہے۔'' وہ بالآخر اسے بتائے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ اس سے باتیں چھپانے کی عادی نہیں تھی۔ اس دنیا میں ایک واحد وہی بچا تھا جس سے وہ سب کہہ دیا کرتی تھی۔ اس کی دنیا کا واحد رشتہ۔

''یہ تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں۔'' اس نے جوہرہ کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا تو اس کا مذاق بھی نہیں اڑایا تھا اور یہ اس کے لیے حوصلہ افزا بات تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں عافی! میں کسی کی نظروں کو مسلسل خود پہ محسوس کیے ہوئے تھی۔ میں نے بہت کھوجا لیکن وہاں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے میں جانتی یا پہچانتی ہوں۔ پھر بھی مجھے لگا کہ کوئی مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ پہنچا ہے۔ جیسے کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے، بات کرنا چاہتا ہے۔'' وہ ایک ایک چمچ اس کے منہ میں ڈال رہی تھی اور وہ برے برے منہ بناتا روز کی طرح اسے پی رہا تھا۔

''تو تمہیں کیا لگتا ہے کہ کوئی تم جیسی کنگلی کو اغوا برائے تاوان کے ارادے سے اٹھانا چاہتا ہے یا تمہیں یہ لگتا ہے کہ کوئی پاکستان سے تمہیں ڈھونڈنے اتنے سالوں بعد یہاں آیا ہے پرانے رشتے جوڑنے یا پرانے بدلے لینے؟ یہ دونوں باتیں اتنی ہی ناممکن ہیں جوہرہ جتنا کہ میرا اب پھر سے پیروں پہ کھڑے ہو کر چلنا یا تمہارا اس عمر میں جڑواں بچے پیدا کرنا۔'' وہ اب کی بار اپنی بات پہ ہی محظوظ ہوتا، زور کا ہنسا تھا۔ ملغوبہ ختم ہو چکا تھا اور جوہرہ نے ناگواری سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے وہاں سے اٹھ جانا بہتر جانا۔ وہ خود کا پیچھا کیے جانے پہ ہرگز خوفزدہ نہیں تھی بلکہ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید اس کے لیے یہ ایک خوش قسمتی کی علامت ہوتا۔

''وہ ٹھیک کہتا ہے یہ سب اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ۔'' اس نے تنور سے اٹھتی مہک کو اندر اتارتے ہوئے آنکھوں میں در آتی نمی کو صاف کر ڈالا۔ اب وہ تنور سے بیک کر تیار ہوئی چیزیں نکال کر بڑی ٹوکریوں میں بند کر رہی تھی۔ کچھ دیر میں ہی بیکری کی گاڑی آنے والی تھی مال اٹھانے اور اسے ان کے آنے سے قبل کام مکمل کرنا تھا سو وہ ماضی میں جانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

تین سال قبل عفیف کے سڑک پہ ہونے والے حادثے کے سبب اس کی دائیں ٹانگ اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ عفیف دوبارہ نہیں چل پائے گا یہ ڈاکٹرز نے اسے پہلے سے بتا دیا تھا لیکن پھر بھی وہ اسے اس چھوٹے قصبے سے نکال کر برمنگھم علاج کی غرض سے لے گئی تھی۔ اس کی اور عفیف کی ساری زندگی کی کمائی اس کے علاج اور برمنگھم میں رہائش پہ خرچ ہو گئی تھی لیکن نتیجہ وہی رہا تھا، عفیف پھر سے اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے نچلے دھڑ کا اوپر والے دھڑ سے حسیاتی رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ علاج سے بس اتنا ممکن ہو پایا تھا کہ وہ سہارا لے کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اپنی ساری رقم لگ جانے کے بعد اس نے عفیف کی بیکری سے کچھ رقم بطور قرض بھی لے لی تھی لیکن نتیجہ وہی رہا، وہ مزید رقم بھی ادھار لے لیتی اگر ایک رات تنگ آ کر خود عفیف چلا نہ پڑتا۔

''اپنے آپ کو مزید بوجھ تلے مت دباؤ۔ میں اپاہج ہو چکا ہوں اس حقیقت کو جتنی جلدی ہم دونوں سمجھ لیں گے اتنا جلدی ہمارے لیے آگے بڑھنا آسان ہو گا۔''

''میں ہار نہیں مانوں گی۔'' اندر سے ہار مان لینے کے باوجود بھی وہ باہر سے مضبوط دکھنا چاہتی تھی۔

''ہار تم مان چکی ہو، بس مان نہیں رہیں۔'' وہ عجیب طریقے سے ہنسا تھا۔ وہ فوراً اس سے لپٹ گئی تھی۔

''ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا عافی؟ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟'' اس کی آواز بھرا گئی تھی مگر وہ تو رو بھی نہیں سکا تھا۔

''کیا ہمیں کسی سے بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ اور ہم کسی کا کیا بگاڑ چکے ہیں؟''

جوہرہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''ہم کسی کا نہیں اپنا ہی سب بگاڑ چکے ہیں، اجاڑ چکے ہیں۔''

وہ کیا کہہ رہا تھا، کیا یاد دلا رہا تھا، وہ سب جانتی تھی، شاید وقتی طور پہ بھول گئی تھی۔

عفیف مکمل طور سے وہیل چیئر پہ آگیا تھا، پھر بھی جوہرہ اسے اکیلے گھر میں چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھی۔ اسے کسی بھی وقت کسی بھی شے کی ضرورت پڑ سکتی تھی اور کل وقتی ملازم رکھنے کی اس کی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے اپنی لیدر فیکٹری کی پیکنگ کی نوکری چھوڑ کر عفیف کی بیکری کا کام سنبھال لیا تھا۔ پیکنگ میں اسے بیکری کی نسبت کم معاوضہ مل رہا تھا۔ اور یوں بھی عفیف کی بیکری کے مالک نے خاص رعایت کرتے ہوئے اسے اجازت دی تھی کہ وہ گھر بیٹھ کر بیکری کی اشیاء بنا کر بھیج سکتی ہے۔ سو اس نے کچھ رقم ادھار لے کر گھر میں ہی بڑا دیسی تنور، مختلف سانچے اور دیگر بیکنگ ٹولز خرید کر رکھ لیے تھے۔

اس کے ہاتھ میں عفیف کی نسبت کہیں گنا ذائقہ تھا۔ وہ ماضی میں بطور مددگار عفیف کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس کام سے بخوبی واقف تھی۔ اس کے بنائے کیک رس، باقر خانیاں، ڈبل روٹی، بٹر کو کیز اور پاپوں جیسا ذائقہ کسی بھی بڑی اور مشہور بیکری سے بڑھ کر تھا۔ اشیاء کی مانگ پہلے کی نسبت زیادہ ہو چکی تھی۔ بیکری کے مالک نے دوسرے قصبے کی شاخ کے لیے بھی اسے ہی آرڈر دینے شروع کر دیے تھے۔ کام پہلے سے دوگنا ہو گیا تھا لیکن وہ سارا دن محنت کر کے اسے اکیلے ہی مکمل کر لیتی تھی، کسی بھی مددگار کے بغیر۔ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ پچھلے بہت سے سالوں میں وہ دونوں میاں بیوی محنت کرنے کے عادی ہو چکے تھے بالکل ویسے ہی جیسے وہ اذیت سہنے کے عادی ہو گئے تھے۔

پہلے سال اس نے ہر دن مطلوبہ ہدف پہ کام مکمل کر لیا تھا اور اسی لیے وہ خود پہ چڑھے ادھار کو اتارنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن دوسرے سال کے شروع میں ہی اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے جسم میں پہلے سی جان نہیں رہی، وہ جلد جسمانی تھکن کا شکار ہو جاتی تھی اب اسے کام میں مشکل پیش آنے لگی تھی۔

اسے بیٹھے بٹھائے چیزیں بھولنے لگی تھیں۔ کس اشیاء کو کتنی مقدار میں ملانا ہے، اکثر اس سے یہ حساب غلط ہو جایا کرتا تھا جس کی وجہ سے اسے آرڈر خراب ہو جانے کی صورت میں بھاری جرمانہ بھرنا پڑتا۔ اگرچہ ایسا ایک دو بار ہی ہوا تھا لیکن اس غلطی نے اس کی اور بیکری کی ساکھ کو نقصان پہنچایا تھا۔ اس کے کام کی رفتار بھی پہلے سے کہیں کم ہو گئی تھی۔ وقت ختم ہو جاتا تھا لیکن کام ختم نہیں ہو پاتا تھا۔ لہٰذا اس سے بیکری کی دوسری شاخ کا کام واپس لے لیا گیا تھا۔

تیسرے سال کے آخر تک وہ بمشکل ایک بیکری کا کام ہی مکمل کر پاتی تھی۔ بیکری کا مالک اس کے کام سے مطمئن نہیں تھا لیکن گاہک اسی کے ہاتھ کا ذائقہ پسند کرتے تھے اس لیے مالک نے یہ کام اس سے لینے کے بجائے اس کے آرڈر کو پہلے سے آدھا کر دیا تھا۔

''مادام! آپ کے بنائے بٹر کو کیز، باقر خانی، رسک اور ڈبل روٹی جیسے شاید ہی اس قصبے میں تو کیا، اردگرد کے قصبوں میں کوئی بنا پاتا ہو۔ لیکن ہمارا کام گاہک کو ذائقے کے ساتھ ساتھ وقت پہ معیاری اشیاء بھی دینا ہے۔ کوئی اس لیے دو دن آپ کے بنائے ڈبل روٹی اور رسک کا انتظار نہیں کرے گا کہ آپ جیسا کوئی نہیں بنا سکتا اور چاہے آپ دو دن بعد ہی بنا کر دیں وہ آپ کا ہی انتظار کرے گا۔ بلکہ وہ ضرورت پوری نہ ہونے پہ کسی اور بیکری سے رجوع کرے گا۔

میں آپ کے کام کی قدر کرتا ہوں لیکن آپ اب کمزور اور بوڑھی ہو چکی ہیں اس لیے میں آپ کو اتنا کام ہی دینا چاہتا ہوں جتنا کہ آپ باآسانی کر سکتی ہیں۔ ہمارے کام میں غلطی کی کوئی گنجائش نہ ہونے کے باوجود بھی میں آپ کو موقع دے رہا ہوں اور اس کی واحد وجہ عفیف ہے، ہمارا پرانا ورکر۔ ورنہ کسی بھی دوسرے ورکر سے ایسی غلطی کی صورت میں اسے نکال دیا جاتا۔''

دوسرے لفظوں میں اس بات کی آگہی تھی کہ وہ جلد ہی اس کام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی اگر اس نے کام میں تاخیر یا مزید کوئی غلطی کی تو۔ سو اس نے اپنی نیند کی قربانی دیتے ہوئے فجر سے پہلے ہی اٹھنا شروع کر دیا تا کہ وہ ساری اشیاء صبح تک تیار کر دیا کرے۔ عفیف نے بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کرنا شروع کر دی تھی۔

وہ ایک زمانے میں ماہر بیکر رہا تھا۔ کون سے اجزاء کس تناسب سے شامل کرنے ہیں، کس شے کی تیاری میں کتنی آنچ رکھنی ہے۔ اتنا تو وہ بخوبی جانتا تھا۔ جسم مفلوج ہوا تھا، دماغ ابھی توانا تھا۔ سو وہ اپنی وہیل چیئر گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ جاتا اور اسے ضروری ہدایات دیتا رہتا۔ جو کچھ وہ بھول جاتی وہ اسے یاد کرا دیتا۔ یوں جوہرہ نے اس کی جسمانی اور عفیف نے جوہرہ کی دماغی کمی کو پورا تھا۔ تیسرے سال میں کم آرڈرز ہی سہی لیکن وہ انھیں پورا کرنے کے قابل ہو گئی تھی وہ بھی بغیر کسی بھی قسم کی کمی بیشی اور کوتاہی کے۔

☆☆☆

اگلے روز وہ عفیف کی ادویات لینے قریبی اسٹور تک گئی تھی جب اسے پھر سے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس روز بھی وہ ماضی میں کھونے کے بجائے سارا رستہ اس شخص کو ڈھونڈتی رہی جو اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہاں بہت سے لوگ اپنے کام کے لیے کھڑے تھے، آجا رہے تھے، اپنا کام بنٹا رہے تھے لیکن کوئی بھی اسے اتنا فارغ نظر نہیں آیا تھا جو اسے دیکھ رہا ہو، خاص اس سے بات کرنے، اسے ڈھونڈنے وہاں آیا ہو یا اس سے بات کرنے کے لیے مرا جا رہا ہو۔ یہ اس کی خوش فہمی تھی جسے وہ خوش قسمتی گمان کر رہی تھی۔

''عافی ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا سوائے اللہ کے۔'' وہ ادویات لے کر چل دی تھی۔

''کاش کہ کوئی سچ میں میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آگیا ہوتا۔'' گھر کا رخ کرتے ہوئے اس کی واحد سوچ یہی تھی جسے بعد میں اس نے خود ہی جھٹک دیا تھا۔

☆☆☆

تیسرے روز وہ کہیں نہیں گئی تھی۔ اس سے ایک رات قبل وہ ٹھیک سے سوئی نہیں تھی تو اس نے جلدی اٹھ کر اپنا آرڈر مکمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اسی لیے اس نے اپنا کام وقت سے پہلے ختم کر لیا تھا، بیکری کی گاڑی آکر مال لے گئی تھی اور اگلے روز کے آرڈر کی تیاری کے لیے مزید سامان دے گئی تھی۔

گھر کی صفائی کرنے کا اس کا دل نہیں چاہ رہا



تھا۔ نہ وہ اپنے لیے کچھ پکانا چاہتی تھی اور نہ ہی عفیف کے گندے کپڑے دھونا۔ اور اب وہ خاموشی سے اپنے گھر کے سامنے لگی باڑھ کے برابر لگے لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے بینچ پہ آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ذہن پہ زور ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ کتنے عرصے بعد وہ اس طرح فراغت سے وہاں آکر بیٹھی تھی۔ وہ فراغت جو اسے حاصل نہیں تھی لیکن اس نے بہت سے کاموں کو ٹال کر اسے خود اپنے لیے حاصل کرلیا تھا۔ ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا کہ اس کا زندگی گزارنے کے بجائے جینے کا من کرتا تھا۔

"ہیلو آنٹی۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" لمبے کالے کوٹ میں ملبوس، جینز کی پینٹ پہنے اس لڑکی نے سر کے گرد اسکارف کو اسی کے انداز میں باندھ رکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔ جوہرہ نے سر ہلاتے ایک جانب ہو کر اسے بیٹھنے کی جگہ دی۔

اپنے نقوش سے وہ لڑکی ایشین لگتی تھی حالانکہ اس کا شستہ انگریزی لب و لہجہ اسے وہیں کا مکین بتا رہا تھا لیکن جوہرہ کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا کہ وہ اس لڑکی سے پہلے بھی کہیں مل چکی ہے۔ نجانے اس کی صورت اتنی مانوس سی کیوں تھی؟

"کیا یہ ہماری پہلی ملاقات ہے؟" وہ بغور اسے دیکھتے پوچھ رہی تھی۔

"جی بالکل یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔" اس بار اس نے جواب اردو میں دیا تھا۔ جوہرہ کو خوشی ہوئی تھی کہ بہت وقت بعد اسے کوئی اپنی زبان بولنے والا ملا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہاں ایشین نہیں تھے، وہ خود ہی کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اور دوسرا وقت کی کمی تھی جو اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

"کہاں سے ہو......؟ پاکستان سے......؟"

اسے یقین تھا کہ وہ اسی کے ملک سے ہوگی۔ لڑکی نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔ جوہرہ کو ایک انجان سی خوشی ہوئی تھی اتنے وقت بعد کسی ہم وطن سے مل کر۔

لڑکی کچھ عرصہ قبل ہی یہاں قریبی قصبے میں منتقل ہوئی تھی۔ وہ سال بھر پہلے پڑھائی کے سلسلے میں وہاں آئی تھی، پھر پڑھائی مکمل کر کے وہیں نوکری کی غرض سے رک گئی تھی۔ اب نسبتاً کسی سستے رہائشی علاقے کی تلاش میں تھی حالانکہ جوہرہ کے نزدیک اس کی رہائش ایک سستے علاقے میں ہی تھی لیکن اس کے لیے وہ بھی مہنگا تھا۔ اس کے والدین میں سے والد ہی حیات تھے جو اس کے ساتھ وہیں مقیم تھے۔ پاکستان میں اس کا پورا خاندان تھا جس کے متعلق وہ بغیر پوچھے ہی بتانے لگی۔ جبکہ جوہرہ کو اسے بتانے کے لیے سوائے عفیف اور اس کی اپنی ذات کے اور کچھ نہ تھا۔

"مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟" ذہن پہ زور ڈال کر بالآخر جب وہ تھک گئی تو اس نے لڑکی سے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے کہ میرے جیسے کسی اور چہرے سے آپ کبھی ملی ہوں، لیکن اب آپ کو یادداشت کی کمی کے سبب یاد نہ رہا ہو۔"

جوہرہ کا بھی یہی خیال تھا۔ لڑکی کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بہت سا وقت وہاں گزارا تھا۔ اب اسے گھر جا کر ان تمام کاموں کو بنٹانا تھا جو اس کے منتظر تھے۔ عفیف بھی نجانے کتنی ضرورتوں کے لیے اب تک اسے پکار چکا ہوگا سو اسے واپس جانا تھا۔

"تمہارا پیارا نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔" وہ جاتے جاتے مڑی۔

"نحل۔" وہ مسکرائی تھی اور اس کی مانوس سی مسکراہٹ کے جواب میں وہ بھی مسکرا دی۔ اگر اس کی بیٹی ہوتی تو وہ بھی اسی کی عمر کی ہوتی۔ جسم کے بائیں طرف ایک درد سا اٹھا تھا اور آنکھوں میں نمی در آئی جسے جھٹک کر وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

اس شام وہ عفیف سے نحل کی باتیں کرتی بے حد خوش تھی۔ بات بات پہ ہنس رہی تھی۔ وہ اکیلے میں بھی اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ عفیف نے ایک عرصے کے بعد اسے اس طرح سے خوش ہوتے اور کسی موضوع پہ اس طرح ہنستے، بات کرتے سنا تھا ورنہ وہ پہلے کی نسبت بہت خاموش ہوگئی تھی۔ حادثہ اس کے ساتھ ہوا تھا لیکن اثر جوہرہ نے اس سے کہیں زیادہ لیا تھا۔

"تم اولاد کی کمی کو محسوس کرتی ہو نا؟" وہ بہت عرصے بعد اس موضوع کو یوں زیر بحث لایا تھا۔ جوہرہ جواباً خاموش رہی تھی۔ اس موضوع پہ وہ عفیف سے بھی کسی قسم کی بحث کرنے سے اجتناب کرتی تھی۔

"ہماری اولاد ہونا ہمارے لیے ایک اور طرح کی سزا ہوتی، نہ ہونا دوسری قسم کی سزا ہے۔ دونوں صورتوں میں سزا تو ہمیں ملنا ہی تھی۔"

وہ گود میں دھری سلائیوں سے عفیف کا سویٹر بن رہی تھی۔ شدید سردیوں کے آغاز سے پہلے ہی اسے اس سویٹر کو مکمل کرنا تھا لیکن بُنائی کے ابتدائی مرحلے کے دوران ہی وہ جان گئی تھی کہ وہ بُنائی بھول چکی ہے۔ اتنے دنوں سے وہ جتنا بھی بُن پائی تھی رات تک اسے ادھیڑ کر رکھ دیتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ، وہ نہیں بن پا رہا تھا جو وہ چاہتی تھی بلکہ وہ کچھ بھی نہیں بن پا رہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی بنتی تھی، کچھ بھی ہوسکتا تھا سوائے سویٹر کے۔

"ہوسکتا ہے کہ ایسا نہ ہوتا، ہوسکتا ہے کہ رب ہمیں نواز دیتا۔ ہم پہ ترس کھا لیتا۔" بُنائی کرتے اس کے ہاتھ رکے تھے اور اس نے سر اٹھا کر اپنے شوہر کو دیکھا تھا۔

"کیا ہم نے ترس کھایا تھا جو ہم پہ ترس کھایا جاتا۔ جو فصل ہم بو کر آئے تھے، وہ کانٹوں کی تھی، پھر تم ان سے اناج اُگنے کی امید کیسے کرسکتے ہو؟"

"پھر بھی...... اللہ جانتا ہے کہ ہم کتنا پچھتاتے ہیں۔"

"اگر ہم پچھتاتے ہوتے تو اس کا مداوا کرتے۔ یہاں چھپ کر بیٹھے نہ رہتے۔"

"ہم کوشش تو کرسکتے تھے۔"

"جس کے لیے کوشش کی اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے، کیا تم مزید کسی کوشش کے بارے میں سوچ بھی سکتے ہو؟"

"وہ نصیب تھا۔"

"پھر یہ بھی نصیب ہے۔" وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ اب وہ مزید اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب وہ ساری رات اسی بارے میں سوچ سوچ کر روتی رہے گی۔ پچھلے اٹھارہ سال سے ایسا ہی تو ہوتا رہا۔ وہ ایسی کسی بھی رات میں سو نہیں پائی تھی۔ وہ اب بھی نہیں سو پائے گی وہ جانتا تھا۔

☆☆☆

اگلے بہت سے دن نہ تو اسے کسی کے پیچھا کرنے کا احساس ہوا تھا اور نہ ہی نحل اس سے ملنے آئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ زندگی پھر سے ایک بند، سیلن زدہ کمرے کی سی ہوگئی تھی جہاں سے ہوا کا گزر نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا اور جب اسے ایک بار پھر سے اس جمود کی عادت ہو چلی تھی تو نحل ایک روز اس سے ملنے اس کے گھر چلی آئی۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا اور نحل کو سامنے پا کر وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

"تم اتنے دن کہاں رہیں؟"

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا آنٹی کہ میں جاب کرتی ہوں، ویک اینڈ کے علاوہ میں نہیں آسکتی۔ لیکن آپ رو کیوں رہی ہیں؟" وہ اب جوہرہ کے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"مجھے لگا اب تم نہیں آؤ گی۔" وہ اپنی بے خودی پہ خود ہی ہنس دی تھی۔

نحل کو لے کر وہ اندر چلی آئی تھی۔ عفیف سو رہا تھا ورنہ وہ ضرور نحل کو اس سے ملواتی۔ نحل نے گھر کا سرسری سا جائزہ لیا تھا۔ گھر میں ایک ہی کمرہ تھا جس سے باہر ایک چھوٹا سٹنگ ایریا تھا جس میں دو کرسیاں اور ایک میز دھری تھی۔ باورچی خانہ اتنا ہی بڑا تھا جتنا کہ باقی گھر۔ لیکن سارے گھر میں ایک عجیب سی گھٹن اور بدبو بسی تھی جیسے ایک عرصے سے وہاں سے تازہ ہوا کا گزر نہ ہوا ہو۔ جوہرہ اسے لیے باورچی خانے میں آگئی تھی جہاں بہت سا پھیلاوا پا کر وہ کچھ خجل سی ہو کر چائے رکھنے لگی تھی۔

"بیکری کا کام مکمل کرنے کے بعد ہمت نہیں

رہتی کہ روز یہ سب پھیلا واسمیٹ سکوں ۔ اگلے دن پھر یہی سب درکار ہوتا ہے تو میں جو جیسا ہے کی بنیاد پہ سب ویسا ہی رہنے دیتی ہوں۔" وہ نحل کو وضاحت دیتی جلدی جلدی سب سمیٹ رہی تھی۔ نحل بھی اس کام میں اس کی مدد کروا رہی تھی۔

"تم رہنے دو۔"

"مجھے مہمان نہ سمجھیں، بیٹی سمجھیں۔" اس کی اس بات پہ جوہرہ کا دل بھر آیا تھا لیکن سیکنڈ کے دسویں حصے میں وہ خود پہ قابو پا چکی تھی۔

دونوں نے مل کر سارا باورچی خانہ سمیٹا اور چائے لے کر باہر باڑھ کے پاس بنے بینچ تک آ گئی تھیں۔ ایک پلیٹ میں جوہرہ دو دن پہلے کے بنے بٹر کوکیز بھی اٹھا لائی تھی۔

اندر کی گھٹن کی نسبت باہر بہتر محسوس ہو رہا تھا۔ وہاں اردگرد پرانی طرز کے بنے لکڑی کے چند ہی ہٹ تھے جن کے باہر ایسی خاموشی تھی گویا وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔

"آپ کے گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟ کیا آپ کا دم نہیں گھٹتا؟" وہ اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"مجھے یہ گھر کم، گورستان زیادہ لگتا ہے اور وہاں تو خاموشی ہی پائی جاتی ہے۔ دم بھی نہیں گھٹتا کیونکہ وہ تو پہلے سے گھٹ چکا ہوتا ہے۔" چائے کی پیالی ایک طرف رکھ کر وہ کھوئے کھوئے انداز میں دور اپنے گھر کو دیکھتے ہوئے تمسخر سے مسکرائی تھی۔

"آپ اس زندگی سے خوش نہیں ہیں یا انکل عفیف کے ساتھ خوش نہیں ہیں؟" وہ اس کے چہرے کو پڑھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

جوہرہ اپنے خیالات سے چونکی۔

"شاید دونوں باتیں ہیں یا پھر کوئی بھی نہیں۔ ہمیں بددعا ہے کہ ہم ان اٹھارہ سالوں میں کبھی خوش نہیں رہ سکے۔ شروع میں کتنے گھر بدلے، جگہیں بدلیں، ماحول بدلا، دوست بدلے مگر ضرورت نصیب بدلنے کی تھی جو ہم نہ بدل سکے۔"

"اگر یہاں آپ خوش نہیں تھیں تو واپس لوٹ جاتیں۔"

"ہم کتنوں کو ناخوش کر کے اور کتنوں کو مار کر آئے تھے۔ واپسی کا کوئی رستہ نہیں تھا ہمارے پاس۔" اس نے گہری آہ بھری۔

"واپسی کا رستہ مشکل ہو پر ہوتا ضرور ہے۔ جانے بغیر دعوے اور سوچے بغیر فیصلے کرنا حماقت ہے۔" نحل کی بات پہ اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

"تم اپنے بابا کو لے آتیں، شاید عفیف اور ان کی اچھی دوستی ہو جاتی تو ان کا وقت اچھا کٹ جاتا۔" وہ بات ٹال گئی تھی، یہ نحل جان گئی تھی۔

"ضرور لاؤں گی کبھی نہ کبھی مگر ابھی نہیں۔ چائے اور کوکیز کا شکریہ۔ اب میں چلتی ہوں۔"

"مجھے انتظار رہے گا۔" اس نے جاتی ہوئی نحل کو پیچھے سے پکارتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مڑ کر ایک نظر اسے دیکھتی، مسکراتی، واپس مڑ گئی تھی۔

"نجانے کیوں یہ لڑکی مجھے دیکھی دیکھی لگتی ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

☆☆☆

اگلی بار جب وہ اس سے ملنے آئی تھی تو جوہرہ نے اسے عفیف سے بھی ملوایا تھا۔ وہ ان دونوں کو وہیں کمرے میں چھوڑ کر چائے بنا کر واپس لوٹی تھی تو دونوں کسی بات پہ بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ عفیف بہت کم کھل کے یوں ہنسا کرتا تھا۔ اس کا ہنسنا عموماً اذیت بھرا احساس لیے ہوتا تھا یا وہ تب دل سے ہنستا جب اسے جوہرہ کا مذاق بنانا ہوتا۔ وہ دروازے پہ کھڑی ایک بار پھر سے سوچ رہی تھی کی کاش نحل اس کی بیٹی ہوتی۔

"دیکھو نحل نے مجھے کتنا ہنسایا ہے پچھلے دس منٹ میں کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔" اور یہ تو وہ دیکھ ہی چکی تھی۔

چائے پینے کے ساتھ عفیف اسے چیس کھیلنا سکھاتا رہا تھا جبکہ جوہرہ عفیف کا اونی سویٹر بنتی رہی۔ اس وقت وہ تینوں ایک مکمل فیملی لگ رہے تھے، ایک دوسرے کو مکمل کرتے۔ نحل کے جانے کے بعد کتنی دیر وہ دونوں خاموش رہے اور پھر یہ ان دونوں کا معمول بن گیا تھا کہ وہ پورا ہفتہ نحل کے انتظار میں گزارتے، اس کی باتیں کرتے اور اتوار کو اس کے ساتھ مل کر جیسے پورا ہفتہ جی لیتے۔

"تم اپنے بابا کو کیوں نہیں لاتیں؟"

"لاؤں گی، بہت جلد۔" اپنے باپ کے ذکر پہ نجانے کیوں اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ ایسے میں جوہرہ اسے بغور دیکھا کرتی۔ اسے لگتا جیسے نحل اپنے باپ کا ذکر نہیں کرنا چاہتی۔ شاید وہ اپنے باپ کو ناپسند کرتی تھی۔

نحل کو اگلے ویک اینڈ پہ ان سے ملنے آنا تھا اور ویک اینڈ آنے میں ابھی پانچ دن باقی تھے کہ ایک دن وہ اس سے صبح سویرے ملنے چلی آئی۔ گھر میں اندر آنے کے بجائے اس نے وہیں لکڑی کے دروازے پہ ہی کھڑے کھڑے جوہرہ کا ہاتھ تھاما اور اسے سامنے بنے لکڑی کے بینچ تک لے آئی۔ جوہرہ کو وہ کچھ پریشان لگی تھی۔

"میں آپ سے ایک مدد مانگنے آئی ہوں آنٹی۔ آپ مجھے بیٹی کہتی ہیں تو میری ماں بن کر ایلس کے فادر سے مل لیں۔" جوہرہ حیرت سے اسے تکنے لگی۔ بات اس کی سمجھ میں آ بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔

"ہم دونوں اکٹھے کام کرتے ہیں، ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن بابا کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ ہمارا ہم مذہب نہیں ہے اور بابا میری شادی اپنے بھتیجے سے کرنا چاہتے ہیں جسے میں سخت ناپسند کرتی ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے جلدی جلدی بتا رہی تھی۔

"تم اپنے بابا کو بتا کر تو دیکھو۔ کیا پتا وہ مان جائیں۔" جوہرہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے سمجھانا چاہا۔

"وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ ایک اصول پرست انسان ہیں۔ وہ میرے یہاں آ کر پڑھنے کے حق میں

بھی نہیں تھے، اسی لیے میرے ساتھ خود یہاں آئے۔ میری پڑھائی ختم ہو جانے کے بعد وہ کسی طور میرے یہاں رکنے کے حق میں بھی نہیں تھے لیکن یہ میں ہی تھی جس نے انھیں کچھ عرصے کے لیے منا لیا، یہ کہہ کر کہ میں واپس جا کر ان کی پسند کے لڑکے سے ہی شادی کروں گی۔ لیکن انھوں نے میرے لیے سیف کو چنا جو پڑھا لکھا جاہل ہے۔ اگر انھیں پتا چلا تو وہ فوراً مجھے پاکستان لے جائیں گے اور کسی بھی تاخیر کے بغیر میری شادی سیف سے کر دیں گے۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" جوہرہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"آپ ایلس کے فادر سے مل کر انھیں بتائیں کہ آپ میری مدر ہیں اور میری شادی خوشی اور مرضی سے ایلس سے کروانا چاہتی ہیں۔ ایک بار شادی ہو گئی تو ایلس اپنے فادر سے خود نبٹ لے گا اور میں بھی بابا کو منا لوں گی۔ کیا آپ میرے لیے ایسا کر سکتی ہیں؟" وہ منّت بھرے انداز میں اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

"یہ تو تمہارے بابا کو دھوکا دینا ہوا۔"

"میں بھاگ تو نہیں رہی گھر سے شادی کرتے ہی انھیں سب بتا دوں گی۔"

"اس شادی اور بھاگنے میں فرق ہی کتنا ہے؟"

"پسند کی شادی میرا حق ہے۔"

"باپ کو دھوکا دینا تمہارا حق نہیں ہے۔" اس نے نحل کے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر التجائیہ انداز میں کہا۔ "تم اپنے باپ کو جیتے جی مار دو گی، بیٹیاں جب ایسے قدم اٹھائیں تو والدین زندہ نہیں رہ پاتے۔ کیا یہ گنتی کے دن پچھلے سارے سالوں کو کھا گئے ہیں؟ اپنے بوڑھے باپ کو باپ ہونے کی ایسی بُری سزا مت دو۔ یہ سب کر کے تم اپنے ہاتھوں آگ لگا رہی ہو۔ اپنا سب کچھ جھونک کر جا رہی ہو۔ واپسی پہ تمہیں راکھ کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

"میں اس کے بغیر خوش نہیں رہ سکوں گی۔" اس نے جوہرہ کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"تم اس کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکو گی۔"

"آپ سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ میں کس مشکل میں ہوں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"میں سمجھتی ہوں کہ تم اس سے بڑی مشکل میں خود کو ڈالنے جا رہی ہو اسی لیے روک رہی ہوں۔"

"میں نے یہ قدم نہ اٹھایا تو میں مر جاؤں گی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو دی تھی۔

"اور تم نے یہ سب کر ڈالا تو تمہارے بابا مر جائیں گے۔"

"آپ نہیں سمجھ پائیں گی، مجھے آپ سے مدد نہیں مانگنا چاہیے تھی۔ مجھے سیدھا بھاگ جانا چاہیے تھا ایلس کے ساتھ۔ میں کورٹ میں شادی کر لوں گی تو بابا بھی مان ہی جائیں گے۔ وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ وہ مجھے معاف کر دیں گے کیونکہ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ کب تک مجھ سے ناراض رہ سکتے ہیں؟" اس نے چہرے سے آنسوؤں کو سختی سے رگڑ ڈالا اور تہیہ کرتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہ معاف کر بھی دیں گے تو جی نہیں پائیں گے اور پھر تم جی نہیں پاؤ گی۔"

وہ جاتی ہوئی نحل کے پیچھے لپکی تھی۔ وہ کسی بھی صورت اسے اس غلطی سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ اسے اس کنویں میں چھلانگ لگانے سے بچانا چاہتی تھی جس میں کودنے کا اسے شوق چڑھا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ تیز چل رہی تھی اور جوہرہ ہانپتے ہوئے اس تک پہنچنے کی کوشش میں تھی۔

"جو ہوگا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہوگا۔"

"آپ مجھے ضرورت سے زیادہ ڈرا رہی ہیں آنٹی! کیونکہ آپ خود ڈر گئی ہیں۔" وہ چلائی تھی۔

"ہاں میں ڈر گئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم بھی ڈرو۔"

"میں ڈر گئی تو کچھ نہیں کر پاؤں گی اور مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔" وہ پھر سے چلانے کے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"جو کچھ تم نے کرنا ہے اس کے بعد تم ایسی ڈرو گی کہ پھر کبھی کچھ کر ہی نہیں پاؤ گی۔"

"آپ کے مشورے کا شکریہ لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اب۔" رفتار بڑھاتے اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

"رک جاؤ نحل۔ یہ سب مت کرو۔ یہ گناہ ہے۔ وہ گناہ جس کی سزا میں پچھلے اٹھارہ سال سے بھگت رہی ہوں۔" وہ بھی جواباً چلا اٹھی تھی۔ نحل وہیں جامد ہو گئی تھی اور جوہرہ اس طرح چلانے پہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ نحل اس کی طرف بڑھتے ہوئے، سہارا دیتے پوچھ رہی تھی۔

"وہ کیا گناہ تھا آنٹی؟"

☆☆☆

"ویسے تو یہ ظہیر کی خواہش ہے لیکن آپ اس سے پوچھ تو لیں آپا۔ کیا پتا اسے کوئی اعتراض ہو۔؟" یہ بڑی ممانی تھیں جو ان کے ہاں آئی بیٹھی تھیں جب وہ کالج سے گھر پہنچی تھی۔

"میں جانتی ہوں میری بیٹی کتنی فرمانبردار ہے۔ وہ کبھی اس رشتے سے انکار نہیں کرے گی۔ اور پھر ظہیر جیسے بچے کو کون انکار کر سکتا ہے۔؟" اماں بڑے وثوق سے کہتے چائے کی چسکی بھرتیں اس کا دل جلا گئی تھیں۔

اس کے رشتے کی بات اس سے پوچھے بغیر چلائی جا رہی تھی، نہ صرف چلائی جا رہی تھی بلکہ طے کی جا رہی تھی۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ خالا تمنا کسی خاتون کو ساتھ لگائے ان کے ہاں آئی تھیں اور اماں نے ہنگامی بنیادوں پہ اسے تیار ہو کر ان کے سامنے جانے کے لیے کہا تھا۔ دیکھنے میں خاتون کسی کم حیثیت خاندان کی لگتی تھیں۔ نجانے اماں کو ان میں کیا دکھا تھا۔ اس نے صاف اماں سے شکوہ کیا تو وہ بھی حقیقت اس کے منہ پہ مار کر چلتی بنی تھیں۔

"پچھلے تین سال سے تمہارے رشتے کے لیے ہر آئے گئے کے سامنے رو رہی ہوں۔ ابھی تک کہیں بات نہیں بنی تو کیا اب اعلیٰ خاندان کے رشتے کی آس میں تمہاری شادی کی صحیح عمر گنوا دوں؟ مجھے یسری کو بھی بیاہنا ہے۔ تمہاری وجہ سے میں کب تک اسے بٹھا کر رکھوں گی۔" پچھلے تین سال سے وہ اٹھتے بیٹھتے اماں کی ایسی باتیں ہی سن رہی تھی۔ اماں کی ان باتوں نے اسے عفیف کی جانب مائل کیا تھا۔ عفیف سے اس کی پہلی ملاقات ندا کے ہاں ہوئی تھی۔ وہ ندا کے ہاں اس کے بھائی کی مہندی پہ گئی تھی جب وہاں سے واپسی پہ اس کا کزن اسے چھوڑنے گھر تک آیا تھا۔ وہ باتونی لگتا تھا جبھی اس قدر جلد بے تکلف ہو گیا تھا۔ تیس منٹ کے رستے میں وہ اس کا نام، کالج، مضامین کے علاوہ دیگر معلومات بھی جان چکا تھا اور وہ مروت میں یہ سوچ کر بتائے چلی گئی کہ ندا کا کزن ہی تو ہے، کیا فرق پڑ گیا جو ایسی بے ضرر سی معلومات اسے دے دیں تو۔ اور یہ پہلا رستہ تھا جو اس نے ایک اجنبی کے لیے کھولا تھا اور اسی پہلے رستے نے آگے کے سارے رستوں کو کھولنا تھا یہ وہ بھول گئی تھی۔

عفیف دو سال قبل ہی نوکری ملنے پہ قطر گیا تھا اور اب دو سال بعد اس لیے لوٹا تھا کہ اس کی امی اس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی بہن کا رشتہ طے ہو چکا تھا اور امی چاہتی تھیں کہ بیٹی کو رخصت کریں اور بہو گھر لے آئیں۔ اس نے کوکنگ، بیکنگ کے مختلف کورسز کر رکھے تھے اور وہ قطر میں کسی ہوٹل میں بطور کُک نوکری کر رہا تھا۔ یہ تمام باتیں اسے ندا سے معلوم ہوئی تھیں تب جب عفیف نے ندا کے ذریعے اس سے دوستی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جسے اس نے صاف رد کر ڈالا تھا کہ وہ کسی لڑکے سے دوستی کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

"تمہاری ظہیر بھائی سے بھی تو دوستی ہے۔ پھر عفیف سے دوستی کرنے میں کیا حرج ہے۔ وہ میرا کزن ہے اور اس بات کی گارنٹی میں تمہیں دیتی ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ وقت گزاری نہیں کرے گا۔" ندا کی بات نے اسے سوچنے پہ مجبور کیا تھا۔ ظہیر بھائی اس کے ماموں کے بیٹے تھے اور بچپن سے وہ ان سے خاصی بے تکلف رہی تھی۔ وہ اپنے سارے مسائل

ان ہی کے ذریعے حل کرواتی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس دوستی میں اسے اپنا ہی مفاد عزیز تھا۔

"تمہیں اس سے بات کرکے پوچھنا چاہیے کہ وہ تم سے کیوں دوستی کرنا چاہتا ہے پھر سوچنا اس بارے میں۔"

"وقت گزاری نہیں کرنا چاہتا تو پھر کیا کرنا چاہتا ہے۔" وہ ایک موہوم سی امید پہ ہی خوش ہو چلی تھی اور یہ اگلے رستے کی جانب پہلا قدم تھا جس نے پھر اسے خوار کرنا تھا۔

اور اسی رات وہ عفیف سے فون پہ بات کر رہی تھی جب اماں، یسریٰ اور منیب سو چکے تھے۔

"جب کوئی اچھا لگنے لگے تو اسے جاننے کا خود بخود دل کرتا ہے۔ کیا میں آپ کو اس قابل بھی نہیں لگ سکا کہ میرے بارے میں کچھ بھی جانیں۔"

وہ اس کی اس بات پہ اور اس جیسی دوسری باتوں سے سحر زدہ ہوئی تھی۔ یہ کسی بھی مرد کی اس سے، اس قسم کی، کی جانے والی پہلی گفتگو تھی جسے وہ بظاہر ناپسند کرتے ہوئے بھی کہیں اندر سے پسند کر رہی تھی۔ اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا کہ وہ گھر والوں سے چھپ کر روزانہ اس سے فون پہ بات کیا کرتی تھی حالانکہ وہ یہ بات جانتی تھی کہ جو بات گھر والوں سے چھپائی جائے، بھی صحیح نہیں ہوتی لیکن اس کے پاس خود کو دینے کی ہزار دلیلیں تھیں۔

"اماں میرے رشتوں کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں، اچھا نہیں ہے کہ میں نے خود ہی اپنا نصیب چن لیا ہے۔"

"اس گھر میں مجھ سے پیار ہی کون کرتا ہے۔ یہ عفیف ہی ہے جس نے مجھے پہلی بار احساس دلایا ہے کہ میں کس قدر محبت کیے جانے کے قابل ہوں۔"

"جتنا وہ مجھے چاہتا ہے کوئی نہیں چاہ سکتا۔"

اس نے یہ بات ندا سے بھی چھپائی تھی کہ وہ اور عفیف ایک دوسرے کو اتنا اور اس حد تک پسند کرنے لگے ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ ظہیر بھائی کو اس راز میں شریک کرلے لیکن اس سے پہلے ہی ممانی کی آمد ہو گئی۔

"تو ظہیر بھائی اس لیے اتنا ہمارے گھر کے چکر لگاتے تھے، میرے لیے اتنا کچھ لاتے تھے، میرے ہر کام کے لیے ایسے بھاگے پھرتے تھے جیسے اس کام کے سوا تو انھیں کوئی کام ہی نہیں ہے۔" وہ اپنے کمرے میں موجود چیزوں کو بلاوجہ اٹھا اٹھا کر پٹخنے لگی۔

"اب تمہیں کیا بتائیں کہ ہم یہاں کیوں روز چلے آتے ہیں۔" ایک روز مذاق میں انھوں نے ذومعنی لہجے میں — کہا تب تو اس نے ان کی بات کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب وہ ان کی بات کے سارے مطلب سمجھ رہی تھی۔

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ پہلے — تو اس کا دل چاہا کہ وہ ظہیر بھائی کو فون کرکے خوب سنائے لیکن اس نے خود کو روک لیا کہ اس سے معاملہ بگڑ سکتا تھا۔

"تمہیں ظہیر بھائی کے رشتے کا پتا چلا؟" رات یسریٰ نے اس سے پوچھا تو اس کا دل کیا کہ وہ یسریٰ کا ہی سر کھول کر رکھ دے۔

"بہت اچھی طرح پتا ہے۔ میرا بس چلے تو ان کا منہ توڑ دوں۔ اس لیے آتے تھے ہمارے ہاں؟ شرم تو نہ آئی۔ اپنا بھینگا پن ہی دیکھ لیتے۔ انھیں تو اپنے جیسی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہیے جو ان کی طرح یا تو توتلی ہو یا لنگڑی۔" وہ چلائی۔

"مجھے پہلے سے پتا تھا، وہ مجھے بتا چکے تھے ممانی کو ہمارے ہاں بھیجنے سے پہلے" یسریٰ نے سر جھکا لیا تھا یوں جیسے اس سے بڑا جرم ہوا ہو اور جرم تو اس سے ہوا تھا کہ اس نے جوہرہ کو یہ بات بتا دی تھی پھر سارا وقت جوہرہ ظہیر بھائی کے بارے میں الٹا سیدھا بولتی رہی تھی اور بیچ بیچ میں یسریٰ کو بھی ڈانٹ دیتی۔ یسریٰ اپنے کام نبٹاتی اس کی ساری باتوں کو کان لپیٹے سنتی رہی۔

اسی رات اس نے عفیف کو اپنی مشکل بتاتے ہوئے، اپنے والدین کو اس کے ہاں بھیجنے کا کہا تھا لیکن وہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ مشکل میں تھا۔ اس کی امی نے لڑکی پسند کرتے ہوئے اس کی بات قریباً طے کر ڈالی تھی۔

"لیکن تم تو کہتے تھے کہ وہ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گی۔"

"تم سے ملنے سے پہلے میں انھیں اپنی مرضی بتا چکا تھا کہ میری کہیں بھی کوئی مرضی نہیں ہے سو انھوں نے اپنے طور پہ کہیں بات چلا لی۔"

"تمہیں میرے بارے میں انھیں بتانا چاہیے تھا۔"

"ٹھیک ہے، پہلے تم اپنی اماں کو میرے بارے میں بتاؤ پھر میں تمہارے بارے میں امی کو بتاتا ہوں۔"

اگلے دن جب وہ ہمت کرکے اماں کو عفیف کے بارے میں بتانے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی کہ اماں اسے ایک تصویر دے گئیں کہ اس کی بات پکی کر دی گئی ہے۔ سو وہ ہمت کرنے کے باوجود اماں کو عفیف کے بارے میں نہیں بتا سکی اور ظہیر بھائی کی تصویر اس نے غصے سے دراز میں ڈال دی۔ بھلا سو بار کے دیکھے، بھینگے ظہیر بھائی کو دیکھ کر اسے کرنا ہی کیا تھا۔

"میں نے امی سے بات کی ہے لیکن وہ کہتی ہیں کہ خاندانی لوگ ایک جگہ بات پکی ہونے پہ اس سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب تو ابا بھی نہیں مانیں گے۔ میں ان کی عزت کا تماشا نہ بناؤں تو بہتر ہے۔ وہ کسی طور اب میرا کہیں اور رشتہ لے جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کہو تو میں خود اپنا رشتہ لے کر حاضر ہو جاتا ہوں۔" وہ رات کو اسے فون پہ بتا رہا تھا۔

"اماں بھی کبھی نہیں مانیں گی۔ ایک انجان لڑکے کے مقابلے میں وہ اپنے بھتیجے کو ہی ترجیح دیں گی۔ اور پھر میں انھیں بتاؤں بھی تو کیا کہ میں نے اپنے لیے ایک لڑکا خود پسند کر لیا ہے۔ اور وہ بھی جب اس لڑکے کے گھر والے بھی اس رشتے پہ راضی نہیں ہیں اور وہ خود اپنا رشتہ لے کر آ رہا ہے۔ منیب تو میری ہڈیاں توڑ دے گا یہ سب سن کر۔"

"تم اپنے چھوٹے بھائی سے ڈرتی ہو؟"

"بھائی بھائی ہوتا ہے چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔"

"اب کیا کرنا ہے؟ رہ لوگی میرے بغیر؟" اور اس کے پوچھنے کی دیر تھی کہ وہ رونے لگ گئی۔ وہ اسے کتنی دیر تسلیاں دیتا رہا تھا، اپنے ساتھ کی یقین دہانی کراتا رہا تھا اور پھر اس نے خود کو کہتا پایا۔

"ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔" اسے یہی واحد حل ملا تھا۔ جوہرہ ساکت رہ گئی تھی۔ اتنا بڑا قدم وہ کیسے اٹھا سکتی تھی۔

"سمجھنے کی کوشش کرو جوہرہ اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ تمہاری اماں تمہاری شادی اپنے بھتیجے سے کر رہی ہیں اور میری بھی ایک جگہ بات پکی ہے۔ ایک بار یہ شادی ہو جائے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس وقت تم میری بیوی ہوگی تو میں بہتر طور سے اپنا اور تمہارا مقدمہ ہر کسی کے سامنے لڑ سکوں گا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ ہم مل کر سب کو منا لیں گے۔"

جوہرہ نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ اور دو دن سوچنے کے بعد وہ اسی نتیجے پہ پہنچی تھی کہ اسے وہی کرنا ہے جو عفیف اسے کرنے کو کہہ رہا ہے۔

"جب اس گھر میں میرے ہی رشتے میں میری مرضی نہیں پوچھی گئی تو اور میری حیثیت ہی کیا ہے؟ اماں ساری زندگی مجھے ایک بوجھ کی طرح اٹھائے پھرتی رہی ہیں جسے اب ظہیر بھائی کی صورت اتارنے کا انھیں موقع مل گیا ہے۔ وہ کانے اور بھینگے جنھیں دوست تو بنایا جا سکتا ہے مگر جیون ساتھی نہیں۔ سوتیلوں سا سلوک کیا ہے اماں نے مجھ سے تو مجھے بھی کیا ضرورت ہے زیادہ سگا بننے کی۔ میں اپنے آنے والے روشن مستقبل کے بارے میں کیوں نہ سوچوں۔"

اور اسی رات اس نے عفیف کے ہمراہ کورٹ میرج کرنے کے لیے حامی بھر لی تھی۔

رات کی تاریکی میں ہی چادر اوڑھے اس کے

ہمراہ دہلیز پار کر گئی تھی اور جانے سے پہلے یسریٰ کے پہلو میں تحریر چھوڑ گئی تھی کہ اسے ظہیر بھائی کسی صورت قبول نہیں ہیں۔ وہ جسے چاہتی ہے اسی کے ساتھ جا رہی ہے سو اسے تلاش نہ کیا جائے۔ جاتے ہوئے وہ اپنے سارے کاغذات ساتھ لے کر گئی تھی اور وہ زیور بھی جو اس کے جہیز کی پیٹی میں اماں نے بنوا کر کب کا رکھا ہوا تھا تاکہ باہر جانے میں اسے کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔

اگلے سورج کے طلوع ہونے پہ دونوں نے کورٹ میرج کر لی تھی۔ ہفتہ وہ عفیف کے اس دوست کے ہاں رہے تھے جس نے کورٹ میرج کرنے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ تب تک عفیف اس کو باہر لے جانے کے لیے اپنے تعلقات لڑا تا رہا تھا، اس نے اپنے ہوٹل میں بھی مزید چھٹی کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔ پھر مہینے بھر کے لیے اس نے ایک مکان کرائے پہ لے لیا تھا۔ جب تک وہ جوہرہ کے باہر جانے کا بندوبست نہیں کر لیتا انھیں یہیں رہنا تھا۔

"ہم گھر والوں سے کب رابطہ کریں گے۔؟"

"جب تک معاملہ گرم ہے، ہمیں مڑ کر نہیں دیکھنا۔"

اور جلد ہی جوہرہ کے باہر جانے کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ جانے سے پہلے اس نے جوہرہ کی ایک قریبی پی سی او سے گھر بات کروائی تھی۔

"میں جوہرہ......" دوسری طرف سے منیب کی آواز سن کر وہ بمشکل بول پائی تھی۔ اور اسے احساس ہو گیا تھا کہ بھاگنا آسان، سامنا کس قدر مشکل تھا۔

"کون جوہرہ......؟ وہ جو رات کی تاریکی میں خود۔ بھاگتے ہوئے ماں کی موت کے لیے فرشتوں کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی۔" ریسیور اس کے ہاتھ سے گرا اور چیخیں اس کے حلق سے بلند ہوئیں۔

"تم کہتے تھے ناکہ ہم مل کر سب کو منا لیں گے، اب بتاؤ کیسے مناؤ گے میری ماں کو۔ اب لگاؤ وہ عدالت جس میں تم نے بطور شوہر میرا مقدمہ لڑنا تھا۔ کون سنے گا اب تمہارا مقدمہ، نہ گواہ رہے نہ قاضی۔

میری ماں چلی گئی۔ میں نے اسے مٹی تلے پہنچا دیا۔"

عفیف اسے بڑی مشکل سے سنبھال پایا تھا۔

اس کے اپنے گھر سے بھاگنے اور ایک لڑکی کو بھگا لے جانے پہ اس کی بہن کا رشتہ ختم ہو گیا تھا۔ امی کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کے ابو نے اسے عاق کر ڈالا تھا۔ یہ سب اسے ایک دوست سے معلوم ہوا تھا۔ بعد میں قطر جا کر اس نے گھر فون بھی کیا تھا لیکن اس کی آواز سنتے ہی فون رکھ دیا جاتا۔ اس کی یہ خوش فہمی کہ وہ ماں باپ کو منا لے گا، جلد ہی دور ہو گئی تھی۔

قطر ہوٹل سے اسے طویل غیر حاضری کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ اب نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تب ہی اسے ایک دوست کے توسط سے دبئی کسی ہوٹل کی جانب سے نوکری کی پیشکش ہوئی تھی۔ ہوٹل بے حد معمولی درجے کا تھا لیکن اسے کہیں سے تو پھر سے شروع کرنا ہی تھا سو وہ دونوں وہاں چلے گئے تھے۔ اور وہاں سے انڈونیشیا اور پھر انگلینڈ۔ لیکن جس زندگی کے وہ خواب دیکھ کر نکلے تھے وہ تو کہیں نہیں تھی۔ ان کی زندگی میں بہت سی کمیاں، بہت سی تنگیاں تھیں۔ سکون، دولت، صحت، اولاد اس سب سے ہی وہ دونوں محروم تھے۔

"ہم سے غلطی ہو گئی ہے عافی۔"

"مت سوچو۔ بھول جاؤ۔"

"میں نے اپنی ماں کی جان لے لی میں یہ کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"ہماری زندگی کے بارے میں سوچو۔ آنے والے دنوں کے بارے میں۔"

"وہی سوچتی ہوں کہ یہ زندگی اور آنے والے دن اس سے بھی بدتر ہوں گے۔"

"تم اچھا نہیں سوچ سکتیں کیا؟" وہ چڑ کر چلایا۔

"میری سوچ اچھی ہوتی تو میں اچھا عمل کرتی۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔

"تو کر لیتیں اس بھینگے سے شادی۔"

"وہ بھینگا تھا لیکن میں تو اندھی تھی۔"

"تمہاری اسی سوچ کے سبب تم بیمار رہنے لگی ہو۔"

"اور تم کس سوچ کے سبب بیمار رہتے ہو؟" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھتے پوچھا تو وہ کچھ بول نہیں پایا۔

"میں بہت بے سکونی محسوس کرتا ہوں جوہرہ۔ نجانے کیوں؟" وہ سر پکڑ کر وہیں زینے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"تم جانتے ہو بس مانتے نہیں ہو۔ تم کسی کا سکون چھین کر یہاں بیٹھے سکون کی خواہش بھی کیسے کر سکتے ہو عافی؟"

"میں پہلے ہی نوکری کے سبب پریشان ہوں، مجھے مزید پریشان مت کرو۔"

"تم اسی طرح پریشان رہو گے کیونکہ جو برکت رزق میں ہوتی ہے وہ خدا دیتا ہے اور خدا اب بھی ہمیں رزق میں برکت نہیں دے گا اور نہ ہی اولاد۔ اس نے ہم سے نعمتوں کا حق چھین لیا ہے۔ میں نے ایک ہی رشتہ بڑے دل سے مانگا تھا اس سے۔ اس نے بھی ایک ہی رشتہ دیا پھر تمہارا۔ اور بدلے میں سب چھین لیا۔" وہ بری طرح قنوطیت کا شکار ہو چکی تھی۔ پھر ایسے دورے اسے روز پڑنے لگے تھے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کرنے لگ گئی تھی۔

"ہم جیسی اولادوں کی اولاد نہیں ہوا کرتی۔" علاج کے ذکر پہ ہی وہ صاف کہہ دیتی تھی۔ عفیف بھی اب تھکنے لگا تھا اس کی حالت دیکھ دیکھ کر۔ وہ دیر سے گھر لوٹنے لگا تو وہ اس سے پوچھتی۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ کسی روز تم گھر لوٹو تو میں رات کی تاریکی میں کسی کے ساتھ نکل چکی ہوں۔ تم کیسے اتنا پُریقین ہو کہ ایک بار بھاگنے کے بعد میں پھر سے نہیں بھاگوں گی۔؟ میرے جیسی عورت پہ اتنا اعتبار کرنے کا تمہارا دل بھی کیسے کرتا ہے۔؟"

"اب تم ساری زندگی بس خود سے بھاگو گی، کسی کے ساتھ نہیں۔" وہ پُریقین سا جواب دیتا جو خود بھی اسی عذاب کا شکار تھا۔

اسے چپ لگ گئی۔ جو پہلے بولتی ہی چلی جاتی تھی اب بالکل نہیں بولتی تھی۔ وہ ہزاروں باتیں کرتا مگر وہ ایک کا بھی جواب نہ دیتی۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا اگر ایک روز اسے وہ خبر نہ ملتی۔

"یسریٰ مر گئی ہے جوہرہ۔"

"کب؟" اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

"اس اٹھائیس کو۔" اور یہ وہ تاریخ تھی جب وہ دس سال پہلے گھر سے نکلی تھی۔ وہ اس روز رونے کے بجائے قہقہے لگا کر ہنسی تھی اور عفیف اسے ہنستے ہوئے تاسف سے دیکھتا رہا تھا۔ اسے لگا کہ وہ بالکل پاگل ہو چکی ہے۔

"میرے خاندان کے ہر فرد کی موت اسی تاریک تاریخ کو لکھی گئی ہے۔ میری، میری ماں کی اور میری بہن کی۔ دیکھنا منیب بھی اسی تاریخ کو مرے گا۔" اس رات وہ سوئی نہیں تھی لیکن روئی بھی نہیں تھی۔

یسریٰ کی موت کے بعد وہ نارمل ہو گئی تھی۔ نہ بہت بولتی تھی، نہ خاموش رہتی تھی۔ بس یکسانیت کا شکار، جذبات سے عاری ہو چکی تھی۔

☆☆☆

نحل سر جھکائے اسے سن رہی تھی جب اس نے گہری سانس بھرتے اس کی طرف دیکھا۔

"والدین اولاد کو باہر نکلنے کی آزادی دیتے ہیں، باہر نکل کر بھاگ جانے کی آزادی نہیں۔ اب بھی کیا تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں بھاگ کر ایلیس سے شادی کرنا چاہیے اور تم بعد میں اپنے باپ کو منا لو گی۔ اگر وہ بھی تمہارے لوٹنے سے پہلے ہی میری ماں کی طرح روٹھ گیا تو پھر کیسے مناؤ گی تم۔؟"

"میں اب نہیں بھاگوں گی، اس لیے نہیں کہ میں آپ کی سنائی اس کہانی سے ڈر گئی ہوں، اس لیے کہ میں کبھی بھاگنا ہی نہیں چاہتی تھی۔" اس نے حیرت سے نحل کی جانب دیکھا۔ وہ اپنی بھوری آنکھوں سے سامنے درختوں کے گرے پتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کی بلی جیسی ناک رونے کے سبب سرخ پڑ رہی تھی۔

"آپ میرے چہرے میں کسے تلاش کرتی ہیں آپ کو تو یہ تک یاد نہیں لیکن میں تو اتنے برسوں سے

آپ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہوں۔ صرف اپنی ماں کی خواہش پوری کرنے۔" آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے اور وہ ہتھیلی کی پشت سے انھیں صاف کر رہی تھی۔

جوہرہ کو لگا تھا وہ کبھی ہل نہیں سکے گی۔ اور اسی لمحے اس پہ ادراک ہوا تھا کہ وہ اس کے چہرے میں کیے کھوجتی تھی، وہ اسے کیوں دیکھی دیکھی سی لگتی تھی، کیوں اس سے مل کر ایک مانوسیت اور اپنائیت بھرا احساس ہوتا تھا۔

"وہ جو آپ مڑ مڑ کر دیکھتی، چونکتی تھیں نا کہ کوئی آپ کا پیچھا کر رہا ہے، وہ میں ہی تھی۔ میں، نحل ظہیر۔ یسریٰ اور ظہیر کی بیٹی۔" جوہرہ کو لگا اس کے جسم کا ایک ایک عضو مفلوج ہو چکا ہے۔

"امی نے مرنے سے پہلے مجھ سے کہا تھا کہ میں بابا کے ساتھ مل کر آپ کو ڈھونڈوں کیونکہ وہ آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی تھیں۔ اور جب مجھے لگا کہ اب میں بھی آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھکنے لگی ہوں تو ٹھیک اسی وقت آپ مجھے مل گئیں۔"

"یسریٰ نے ظہیر بھائی سے شادی کر لی۔ میری وجہ سے۔ یہ اس نے کیا کیا؟" آواز ٹوٹ ٹوٹ کر لبوں سے نکل رہی تھی اور آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر آنکھوں سے۔

"آپ کی وجہ سے نہیں، بابا کی وجہ سے۔ بابا انھیں پسند کرتے تھے۔"

"لیکن ظہیر بھائی کا رشتہ تو میرے لیے۔"

"آپ غلط سمجھی تھیں۔ آپ کے لیے تو بابا کا رشتہ کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ وہ رشتہ ان کے لیے آیا تھا، آپ کے لیے کوئی اور رشتہ آیا تھا۔ نانی آپ دونوں کی اکٹھے شادی کرنا چاہتی تھیں تبھی انھیں جلدی تھی لیکن ان سے کہیں زیادہ جلدی تو آپ کو تھی۔" اس نے اماں اور یسریٰ کی سنی ہی کہاں تھی اس وقت، وہ تو اپنی ہی بولے گئی تھی۔ اپنی ہی طرف سے عقل لڑالی تھی، بات بنالی تھی۔

"آپ کے گھر سے چلے جانے کے بعد نانی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ دادی کی تمام تر مزاحمت کے باوجود امی کی شادی بابا سے ہوئی تھی اور ماموں وہ محلہ چھوڑ کر چلے گئے تھے کیونکہ وہ مزید بدنامی نہیں سہہ سکتے تھے۔ امی نے آپ کا ہر جگہ پتا کروایا۔ جہاں جہاں ممکن تھا آپ کو ڈھونڈا۔ آپ کی دوست ندا سے عفیف انکل اور آپ کی دوستی کا انھیں پتا چلا تو عفیف انکل کے گھر کے کتنے چکر لگا ڈالے لیکن ان لوگوں کو بھی آپ دونوں کے بارے میں زیادہ نہیں پتا تھا۔ جو پتہ انھوں نے دیا تھا وہ قطر کا تھا اور اس نوکری سے نکالے جانے کے بعد آپ دونوں کہاں گئے تھے، ہوٹل والوں کو بھی نہیں معلوم تھا۔ امی کے دیے جانے کون کون سے پتے، کون کون سے واقف کاروں سے ملتے ملاتے آج میں اس قابل ہوئی ہوں کہ آپ کو ڈھونڈ نکالا۔ نجانے وہ کیوں چاہتی تھیں کہ میں آپ سے ملوں۔ شاید انھیں اور بابا کو آپ کی اذیت کا ادراک تھا یا شاید وہ آپ کو اس دھوکے کی بابت بتانا چاہتی تھیں جو آپ اپنے طور پہ قسمت کو دے کر نکلی تھیں لیکن دراصل وہ آپ خود کو دے کر نکلی تھیں۔ مگر آپ نے تو مڑ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا۔"

"میں نے فون کیا تھا لیکن منیب نے کہا کہ۔ اوہ خدا! کاش کہ میں ایک بار یسریٰ سے مل لیتی، بات کر لیتی۔"

"افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ آپ نے ان سے رابطہ کیوں نہیں کیا، یا آپ ان سے ملنے کیوں نہ آئیں، یا آپ نے بابا کے رشتے کو اپنے لیے سمجھا، افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ گھر سے بغیر کچھ جانے نکل کھڑی ہوئیں۔"

"اگر میں جان جاتی کہ ظہیر بھائی کا رشتہ میرے لیے نہیں بلکہ یسریٰ کے لیے تھا تو بھی شاید میں یہ قدم ہی اٹھاتی کیونکہ جس کا میرے لیے رشتہ آیا تھا، وہ مجھے نامنظور ہوتا، وہ کیا عفیف کے مقابلے میں کوئی بھی نامنظور ہوتا۔"

نحل اس کی بات سن کر کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اور پھر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے زور سے ہنس

دی۔

"آپ کو قسمت پہ یقین نہیں تھا نا اس لیے آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ کی قسمت میں عفیف انکل ہی تھے تو وہی آپ کو ملتے لیکن آپ نے سب اپنے ہاتھ میں لے لیا، کچھ خدا پہ بھی چھوڑا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"ایسا نہیں تھا کہ مجھے قسمت پہ یقین نہیں تھا لیکن۔"

"جب بات "لیکن" پہ آ گئی تو پھر یقین تو متزلزل ہوا۔"

"مجھے عفیف چاہیے تھا اس وقت اور ایک یہی رستہ تھا اسے پانے کا۔"

"رستہ اور بھی ہوگا، بس آپ کو نہیں دکھا۔"

"شاید۔"

"امی آپ کو یاد کرتے ہوئے جب روتیں تو ایک قصہ سنایا کرتی تھیں کہ ایک نیک دل انسان نے اپنی سونے کی مٹکی ایک شخص کے پاس امانت رکھوائی اور خود کہیں چلا گیا۔ اس شخص کی نیت خراب ہوئی تو اس نے وہ مٹکی پانچ درہم کے بدلے بیچ ڈالی۔ جب وہ نیک دل انسان لوٹا تو نہ وہ شخص تھا، نہ مٹکی۔ وہ بازار گیا تو ایک دکان پہ اسے وہی مٹکی پڑی ملی۔ اس نے دکاندار سے پوچھا کہ اس نے وہ مٹکی کتنے کی خریدی ہے، معلوم ہوا پانچ درہم کی۔" اس نے جوہرہ کی جانب دیکھا۔

"جانتی ہیں اس شخص نے کیا کہا کہ وہ اتنے ہی درہم اس شخص کو بطور انعام دینے والا تھا۔ وہ درہم اس کی قسمت میں لکھے تھے مگر افسوس کہ اس نے انھیں غلط طریقے سے کمالیا۔"

جوہرہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نحل نے اسے بولنے سے منع کر دیا۔ اس کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"آپ کو اگر یقین ہوتا کہ خدا نے وہی شخص آپ کی قسمت میں لکھا ہے تو آپ اسے پانے کے لیے ایسا چور رستہ نہ اپناتیں۔ ساری زندگی یہ سزا نہ کاٹتیں۔ جو شے ہمارے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے، وہ ہمارے چاہنے، نہ چاہنے کے باوجود ہمیں دے دی جاتی ہے۔"

جوہرہ اب کی بار کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

"اب وقت آ گیا ہے کہ میں بابا کو ملانے لے آؤں، سو میں اپنا وعدہ ضرور نبھاؤں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور جانے سے پہلے اس نے اپنا بڑا جستی بیگ کھولتے ہوئے اس میں سے ایک لفافہ نکالا اور جوہرہ کے برابر رکھ دیا تھا۔

"جس دکھ میں میری ماں گرفتار رہی، وہ اس لفافے میں بند ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو آپ کے لیے آیا تھا تب جب بابا کا رشتہ امی کے لیے آیا تھا۔ چلتی ہوں۔ پھر آؤں گی، بابا کو لے کر۔"

وہ سامنے گرے خشک پتوں کو روندتے ہوئے جا رہی تھی اور جوہرہ اس لفافے کو کھول کر اس میں سے تصویر نکال کر دیکھ رہی تھی جو عفیف کی تھی۔ وہ شخص جو اس کا شوہر تھا، وہ شخص جسے اُسی کا شوہر ہونا تھا۔



قانتہ رابعہ

لفظ بے ضرر لگتے ہیں

کتنے شوق سے دانیہ کالج سے آتے ہوئے رسالے خرید کے لائی تھی، آتے ہی یونیفارم بدلا، ناک کی سیدھ میں باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ بیگ ایک طرف لڑھکایا اور رسالہ ہاتھوں میں لے کے لیٹ گئی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کے وہ ان میں شائع افسانے اور ناولوں کی قسطیں پڑھا کرتی تھی۔

لڑکیاں بتاتیں کہ ہم نمکو، پاپڑ، چپس، پان مسالے پاس رکھ لیتے ہیں اور مطالعے کے ساتھ ساتھ کھانے کا شغل بھی جاری رکھتے ہیں مگر دانیہ سے ایسا نہ ہوتا۔ وہ بس پڑھنے کے دوران کان، منہ بند کرلیتی، کسی کی پکار سنائی دیتی نہ کسی اور سرگرمی کا ہوش رہتا۔ بس ہنسنے والی باتوں پر پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستی، ہنس ہنس کر دوہری ہوجاتی۔ رونے والی باتوں پر بن بلائے مہمان کی طرح آنسو اس کی آنکھوں سے نکل بھاگنے کو بے تاب ہوتے۔ من ہی من میں سسکیاں بھرتی، روتی، منا سا دل دکھی ہوجاتا۔

دانیہ کو ٹی وی کا شوق تھا نہ سہیلیاں بنانے کا، یہی رسالے اس کا ٹی وی تھے، سہیلیاں، پہیلیاں تھے۔ سارے کردار اس کے اردگرد بستے، زندگی کے ہر مرحلے پر کسی نہ کسی ناول، افسانے کا کوئی کردار چھم سے اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا یا کوئی نہ کوئی فقرہ کانوں میں رس گھولتا۔ ان ہی میں وہ خوش تھی، ان ہی میں اس کا دل آباد تھا مگر آج کیا ہوا......؟

سرورق کی ماڈل پر اس نے اچٹتی سی نگاہ ڈالی، تیزی سے انگلیوں نے صفحے پلٹے۔ راحت جبیں، عمیرہ احمد، اقبال بانو...... فہرست میں نام پڑھتی جارہی تھی اور خوش ہورہی تھی۔ اس کی پسند کی تمام مصنفین موجود تھیں۔ اس نے نسبتاً چھوٹا افسانہ منتخب کیا، انتہائی انہماک سے پڑھنا شروع کیا۔ چند منٹ کے بعد منہ کے زاویے بدلے، رنگ پھیکا پڑا، آنکھوں میں بےزاری کی لہر آئی اور اس نے بددل ہو کے رسالہ پرے پٹخ دیا۔

''ہونہہ...... بس یہی موضوع رہ گیا تھا، پتا نہیں کبھی کبھی اتنا اچھے لکھنے والیوں کو کیا ہوجاتا ہے۔''

اس نے سوچا اور کھانا کھانے کے لیے باورچی خانے میں گھس گئی۔ دو دن رسالہ اسی جگہ پڑا رہا، جہاں اس نے پٹخ دیا تھا مگر اس کا دل ہی آمادہ نہ ہوا۔

''خدا جانے ایسے محبت کرنے والے اور شفیق باپ کہاں پائے جاتے ہیں۔ اللہ جانے ہوتے بھی ہیں یا ایسے ہی لکھ دیتی ہیں۔''

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا، افسانہ ''بن تیرے اپنا جیون'' میں وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ جیون کسی کے بن ویران ہوگا؟ کوئی کزن، پڑوسن، منگیتر کی حد تک سوچا جاسکتا ہے۔ باپ...... لو جی کرلو گل! باپ کو رو رہی ہیں بی بی ہیروئن......

ایک ہماری طرف نظر ڈالو، باپ کے ہوتے ہوئے رونق ختم' زندگی ہی رخصت ہوجاتی ہے۔ زندگی کے اٹھارہ سالوں میں اس کی حسرت ہی رہی کہ باپ اس کی انگلی تھام کے میلوں دور چلے۔ اسے ٹافیاں لے کے دے، بسکٹ کھلائے، اس کے معصوم اور بے ضرر لطیفوں پر قہقہے مار کے ہنسے۔ اٹھارہ سالوں میں اس نے باپ کی شکل میں لوہے کے دل

والا باپ سامنے پایا۔ ماتھے پر تیوریاں، چہرے پر خشونت لیے۔ اماں بے چاری ان کا ہنکارا سن کر ہی دبک جاتیں۔

آپوں آپ ہی سر اچھی طرح چادر سے ڈھک جاتا، اماں زیرلب کوئی دم درود پڑھتیں لیکن ابا کو جاہ و جلال دکھانے کے لیے روز کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جاتا۔ کبھی نمک زیادہ یا کم ہوتا، کبھی مرچ تیز ہوتی، کبھی گھی کی کمی بیشی کو ناپا تولا جاتا اور کچھ نہیں تو اماں کے ہاتھوں کی بنی نرم گرم چپاتی کو ہی سونگھ سونگھ کر چیک کیا جاتا۔ معمولی کمی بیشی یا کوتاہی پر طوفان اٹھ جاتا۔ ایسے ایسے جملے مارے جاتے کہ دانیہ کئی کئی گھنٹے گم صم رہتی۔

اسے زبان سے تو کچھ نہ کہتے مگر اس کی بدتمیزی پر خونخوار نظروں سے دیکھتے۔ یہ تو شکر تھا کہ صبح کے گئے رات کو گھر آتے۔ وہی کافی تھا، عید بقر عید یا کسی ہڑتال پر بازار بند ہوتا تو سب کے دل بند ہوجاتے۔ گھر گھر نہ رہتا، قبرستان دکھائی دیتا۔ پڑوس سے بچوں کے رونے ہنسنے کی آواز پر اماں سہم جاتیں۔ دانیہ، لقمان اور فرحان تو ویسے ہی ابا سے ڈرتے تھے۔

اماں بے چاری سارا دن کاموں میں مصروف رہتیں، اب دکان پر چار بندوں کا کھانا بھیجنا ہے، تین کی چائے اور پکوڑوں کا بندوبست کرنا۔ گرما گرم چپاتی ابا کی شکل دیکھ کر ہی توے سے اترتی، ساتھ میں انار دانہ اور پودینہ کی چٹنی اور دہی کا رائتہ، گرمی ہو یا سردی ابا کے لیے لازم تھا۔

دانیہ نے ان سب کا غم ہلکا کرنے کے لیے رسالوں سے دل لگالیا، دل نہ لگاتی تو کیا کرتی؟ اماں میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے ابا کے بارے میں نرم گوشہ رکھنے کی تلقین کرتیں ''دل کے تو اچھے ہیں'' دانیہ سلگ کر رہ جاتی۔

''نہیں اماں! جو دل میں ہوتا ہے زبان پر وہی آتا ہے اچھا یا برا۔''

ان سب کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اماں کو خرچا دینے میں یا بچوں کے کپڑے لتے میں کنجوسی کرتے...... نہ نہ نہ...... عمدہ اور وافر مقدار میں اشیاء لاتے۔ دانیہ کی خواہشیں بن کہے ہی پوری ہوجاتیں مگر وہ حسرت سے کہتی۔

''کیا فائدہ اماں! ان چیزوں کا جو کڑوے لہجے کا تڑکہ لگا کے ملتی ہیں۔ کیا دنیا میں سارے ابّے ایسے ہی ہوتے ہیں؟'' وہ سوال داغتی۔

''مجھے کیا پتا، میرا باپ تو میری شکل بھی نہ دیکھ پایا، حادثے میں چل بسا۔ باقیوں کا مجھے کیا علم۔'' اماں ٹالتیں۔

ان ہی کڑوے لہجوں اور دنیا جہاں کے مہنگے کپڑے، جوتوں سے دل بہلاتے دانیہ اپنے شوہر کے ساتھ نئی زندگی کی مسافت پر روانہ ہوگئی۔ شوہر ابا سے بہت مختلف نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ مختلف ضرور تھا۔ وہ گھر میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتا، چھوٹی چھوٹی باتوں سے دانیہ کا دل لگائے رکھتا مگر ہاتھ کا ہی نہیں دل کا بھی تنگ تھا۔

شادی کے بعد بہت مدّت تک دانیہ نے کسی فرمائش کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اماں کے دیے جہیز



میں اس کے بلا مبالغہ گرمیوں سردیوں کے ان گنت سوٹ تھے۔ ابا نے صرف کپڑوں پر ہی بس نہ کیا تھا، ہر رنگ کے، ہر شیڈ میں کئی کئی سوٹ، جوتے، برتن فرنیچر......

جس چیز کی ضرورت اسے محسوس ہوتی وہ آرام سے جہیز کے سامان کی فہرست چیک کرتی۔ ابا نے بڑے اہتمام سے فہرست میں کارٹن نمبر ایک دو تین سے گنتی کا آغاز کرتے، ہر کارٹن کے اندر موجود اشیاء کی فہرست بھی چپکائی ہوئی تھی۔

دو ڈھائی سال تک دانیہ نے مطالبہ کیا نہ میاں نے کوئی چیز لے کے دی۔ اگر چیز گھر میں موجود نہ تھی تو عید بقر عید کے بہانے ابا ڈھیر ساری چیزیں بھجوا دیتے مگر کب تک......

گھر میں پچھلی جانب بارش کا پانی جمع ہوا اور کسی طرح وہاں پر موجود اشیاء کی بربادی کا باعث بن گیا۔ دانیہ کی قسمت کہ استری اسٹینڈ پر پڑے کپڑے بھی اس اچانک بارش سے خراب ہوئے، استری میں بھی خرابی پیدا ہوئی اور استری اسٹینڈ بھی کام سے گیا۔ باقی دونوں کمرے سامان سے بھرے، وہ سوچوں میں گم کہ استری کہاں سے لائے اور استری اسٹینڈ کی خیر ہے کپڑے استری کرنے کی جگہ کہاں بنائے کہ میاں گھر آیا۔

''کھانا نہیں بنایا ابھی تک؟'' سوچوں میں گم دانیہ سے سوال کیا۔

''نقصان ہوگیا ہے اچھا خاصا۔'' دانیہ نے نقصان کی تفصیل بتانا شروع کی تھی کہ میاں نے بے زاری سے ٹوکا۔

''خیر ہے، چیزیں ہی خراب ہوئی ہیں ناں اور آجائیں گی۔ تمہارے ابا کی چوائس بہت اچھی ہے۔ استری بھی لے دیں گے اور استری اسٹینڈ بھی۔ تم ان کا رونا رونے کے بجائے کھانا دو، مجھے سخت بھوک لگی ہے۔''

دانیہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، ان ڈھائی سالوں میں ایک مرتبہ بھی اس نے دانیہ کو خرچے کے نام پر دھیلا نہیں دیا۔ کوئی سوٹ، کپڑا، شال، جرسی، سوئٹر نہیں لے کے دیا۔ میکے جانے کو دل کرتا تو اماں لقمان کو گاڑی کرائے پر لے کے بھیج دیتیں۔ ابا واپس چھوڑنے آتے تو گاڑی کی ڈگی اور اندر سیٹوں کے اوپر، سیٹوں کے نیچے سامان ہی سامان ہوتا۔

دو دو تین تین سالن بنا کے، کباب، سموسے ڈھیروں ڈھیر مشہور سوغات کے نام پر مٹھائیاں، کیک بھی ہمراہ ہوتا۔

عید بقر عید پر دانیہ کے ساتھ اس کے میاں کے کپڑے جوتے لازمی دیے جاتے۔ میاں نے تو جھوٹے منہ دانیہ کیا اپنے کپڑوں کا بھی شکریہ ادا نہ کیا۔

''کیا کوئی بم پھینک دیا ہے جو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ صاف کہہ دو، برا لگا ہے تمہیں باپ سے ان چیزوں کے منگوانے کا کہہ دیا۔ ارے پہلی چیز مانگی تھی، پہلے بھی کوئی چیز کا کہا؟ اب جاہل عورتوں کی طرح سوگ مناؤ، میاں نے کیوں بکواس کردی، کھا مر لیتا ہوں تندور پر جاکے۔''

کسی بدمست ہاتھی کی طرح دھپ دھپ پاؤں مارتا وہ ٹھاہ کر کے دروازہ بند کرتے گھر سے باہر نکل گیا۔ باہر موسم سرما کی رخصتی کی کن من ہو رہی تھی۔

دانیہ سوچوں کی دنیا سے باہر آئی تو منہ آنسوؤں سے گیلا ہو چکا تھا، آنسوؤں کو بہنے کی پوری آزادی دے کے وہ کھانے پینے کے بندوبست کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

آج اسے پہلی دفعہ ابا پر بہت پیار آیا تھا۔

اور ابا کے لیے اس کے دل میں چاہت ہی چاہت تھی، اس کا ہر آنسو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔

وہ پوری دنیا کے سات پھیرے بھی لگا لے تو باپ جیسا رشتہ کہیں نہیں ملنے کا۔

نایاب جیلانی

سرخ گلابوں پہ شبنم

شامیانے کے اندر بھانت بھانت کی مخلوق تھی۔ یوں لگتا تھا۔ کھانے کے وقت پورا گاؤں اُمڈ آیا ہے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں جیسے کھانے پہ ٹوٹ پڑے تھے۔ انہیں لگتا تھا۔ پوری عمر بھی اچھا کھانا نصیب نہیں ہوا۔

اس منظر سے بے نیاز ایک کونے میں صدف کی ساس سے تائی ساس جھگڑنے میں مصروف تھیں۔ جی بری طرح سے اُوب گیا تھا۔ اس نے شکر کیا۔ اتنے ہجوم میں امی دکھائی دی تھیں۔ کچھ دیر بعد امی قریب آ گئیں۔ انہوں نے کھانے کا پوچھا تو اس نے بری سی شکل بنا کر تڑخ کے کہا۔

”نام مت لیں کھانے کا۔ الٹی آ رہی ہے۔ ایسے گھٹیا اور جاہل لوگوں میں تائی امی نے صدف کی شادی کر دی۔ ایک بھی ڈھنگ کا پڑھا لکھا بندہ نظر نہیں آ رہا۔ کتنے چیپ لوگ ہیں۔ کھانے کی بھی تمیز نہیں۔ اٹھنے کی تمیز نہیں۔ بولنے کی تمیز نہیں۔“ اس

مکمل ناول



کی زبان چلی تو پھر رکی نہیں۔ پون گھنٹہ وہ امی کی ڈانٹ کے باوجود زہر اگلتی رہی تھی۔

اپنے لفظوں کی شر انگیزی اور اپنے ''بے لاگ'' تبصرے سے کتنے لوگوں کو محظوظ کر رہی تھی اور کتنے لوگوں کو غم و غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ اس سے بے نیاز تھی۔

☆☆☆

''میں تو تمہیں ایک ہی مخلصانہ مشورہ دوں گی۔'' اس کی یونی فیلو اور بیسٹ فرینڈ ادیبہ نے فون پر بڑی محبت اور فرصت کے عالم میں اسے مشورے سے نوازا تھا اور یہ مشورے تو ہمیشہ سے انزلہ کے ساتھ ساتھ تھے۔

ادیبہ اس کی بہت پرانی نہیں، بس یونی ورسٹی کی دوست تھی۔ ان کی دوستی یونی ورسٹی کے بعد بس فون تک محدود تھی۔ ادیبہ شادی کے بعد سسرال جا بسی تھی۔ اس کی شادی پر انزلہ جا نہیں سکی تھی کیونکہ اس کے گھر آنا جانا نہیں تھا مگر فون پر ہمیشہ رابطہ رکھا۔

اپنی بھابھیوں اور بہن سے وہ اتنی قریب نہیں تھی۔ صدف کے بعد بس ادیبہ تھی۔ جس کی ہر بات پہ آنکھ بند کر کے اعتبار کرنا وہ اپنا فرض اولین سمجھتی تھی۔

اور جب صدف کے توسط سے یہ نیا سلسلہ شروع ہوا تو ادیبہ سے ہی انزلہ نے پہلا مشورہ لیا تھا۔ اور ادیبہ کے مشورے پہ جیسے وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر ''اڑ'' گئی تھی۔ لیکن اس کی تمام تر ''ضد'' اور انکار کے باوجود امی اور بھائیوں نے اپنی من مانی کر لی تھی۔

ادیبہ کے نادر مشوروں پہ ایک مرتبہ پھر انزلہ میں نئی روح آ گئی تھی اور وہ جو کسی شکستہ جرنیل کی طرح ہتھیار ڈال چکی تھی۔ نئے سرے سے تازہ دم ہو گئی۔

☆☆☆

''نہیں بھابھی! سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ میں حیران تھا۔ یہ ممکن کیسے ہوا...... مگر پھر اچانک اس کی روٹین بدل گئی۔ جانے بیچ میں کیا ہوا۔ ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' وہ فون پہ اونچی آواز میں کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔

پھر لمحہ بھر کی خاموشی چھا گئی تھی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ کچھ بہتری کی امید ہے۔'' اس کی آواز میں تاسف تھا۔

''کیونکہ کتے کی دم سو سال بعد بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔'' اب کے نہایت تنفر سے گوہر افشانی کی گئی تھی۔

''مسئلہ تو میں خود نہیں سمجھ پا رہا۔ جانے بیچ میں ''تیلی'' کس نے لگائی۔'' اس نے زچ ہو کر کہا۔

''ظاہر ہے، کھوج تو لگا کر رہوں گا۔'' اب وہ دوسری طرف کی گفتگو سن رہا تھا۔

''ایسے سستے میں تو کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ میرا ڈسا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔'' اب وہ اپنے خطرناک ارادے ظاہر کر رہا تھا۔ اور پردے کے پیچھے چھپی وہ سخت سراسیمگی کا شکار تھی۔ اس نے ساری بات گہرائی تک سن اور سمجھ لی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ جو وہ کہتا ہے۔ کر دکھاتا ہے۔

☆☆☆

ادیبہ سے انزلہ کی یونی ورسٹی میں دوستی ہوئی تھی۔ وہ ایک دیہات سے اٹھ کر اس بڑے شہر کی بڑی یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی۔

ان دو سالوں میں انزلہ کا ادیبہ کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا تھا۔ جس میں زیادہ ہاتھ ادیبہ کا ہی تھا۔ انزلہ تو کہاں ادیبہ کے دیہات جاتی...... لیکن ادیبہ بھی کبھی اس کے گھر نہیں آئی تھی نہ ہی انزلہ نے کوئی ایسی آفر کی تھی۔ پھر یونی ورسٹی کے بعد اچانک ہی ادیبہ کی شادی طے ہو گئی تھی۔

ان دنوں وہ بہت دکھی تھی۔ اکثر انزلہ ادیبہ کے لمبے لمبے میسجز پڑھ کر بہت ڈسٹرب ہو جاتی تھی۔ ادیبہ اپنے ماموں کی فیملی میں شادی کی خواہش مند تھی مگر وہاں کسی طور بات نہیں بن سکی تھی۔ جس جگہ اس کی شادی ہوئی تھی وہ لوگ بھی بہت اچھے تھے۔ ادیبہ ایسی ایسی تعریفیں کرتی کہ انزلہ شدید متاثر ہو جاتی تھی۔

کہاں ایک معمولی گھر کی معمولی سی کم رو ادیبہ اور کہاں اس کے سسرال والے لینڈ لارڈ۔

ادیبہ کی زندگی پہ رشک کرتی انزلہ کو آہستہ آہستہ سہیلی سے حسد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اس کا اپنا رشتہ ایک ''دیہی ماحول'' رکھنے والے گھرانے میں اچانک طے پا گیا تھا۔

وہ اپنی امی سے بلا سبب لڑتی جھگڑتی۔

''میرے لیے وہ ہی پینڈو رہ گیا تھا؟ مجھ سے اچھی تو ادیبہ ہے...... اتنے بڑے شہر میں اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر عیش کر رہی ہے۔ اور میں ایک پنڈ میں جھونک دی گئی ہوں۔'' انزلہ کے غصے کی ہر تان ادیبہ پہ آ کر ٹوٹ جاتی تھی تب امی کو اس پہ شدید تاؤ آتا تھا۔

''خبردار، جو تم نے ادیبہ کا نام بھی لیا۔ ہمارے تو کان پک چکے ہیں۔ ادیبہ نامہ سن سن کر۔ تم دیکھ کر آئی ہو اس کا لائف اسٹائل؟ جو بھی کسی نے بکواس کی اس کو مان لیا۔ ہمارا کسی کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں۔''

یہ وہ جنگ تھی جو تب بھی ناکام ہوئی تھی اور ابھی تک ''ناکامی'' سے ہی دوچار تھی۔

☆☆☆

خلیل جبران کہتا ہے۔

''آسمانوں سے ہماری محبت ہمارے دل پر اترتی ہے۔ اور سب کچھ بدل کر رکھ دیتی ہے۔

محبت ایک طلسم کدہ ہے۔ شہر دل کے موسم بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کبھی تو برسوں نہیں بدلتے اور کبھی لمحوں میں دل کی دنیا بدل دیتے ہیں۔''

کیا محبت واقعی ایسی ہوتی ہے؟

اگر خلیل جبران کہتا ہے تو پھر ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔

اس کی کیا مجال؟ جو انحراف کرتی۔

☆☆☆

بات بڑی نہیں تھی مگر بڑھا دی گئی تھی...... اور اسے بڑھانے چڑھانے میں بھی انزلہ کا ہی کمال تھا۔

مہمانوں کے جاتے ہی اسے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

تین ماہ پہلے جب اچانک یہ سلسلہ شروع ہوا تب بھی انزلہ نے اپنے گھر والوں کو اس ''عمل'' سے باز رکھنے کی سر توڑ کوشش کی تھی۔ جس میں وہ تب بھی اتنی ہی ناکام ہوئی جتنی آج، تب بھی اس کی پڑھی لکھی امی اور بہن بھائیوں نے اس کی رائے کو قطعاً اہمیت نہیں دی تھی۔

دراصل یہ سارا بگاڑ تین مہینے پہلے اس لیے شروع ہوا تھا جب انزلہ کی میٹھی چھری سی تائی نے اچانک اپنے کھاتے کماتے، خوش پوش، خوش لباس بیٹے شاہ ویز کا رشتہ طے کر دیا۔

شاہ ویز کا رشتہ کرن سے یعنی تائی امی کی بھانجی سے نہیں بلکہ اس کی سب سے زیادہ معاشی لحاظ سے بدحال پھوپھو، نفیسہ کے گھر ہوا تھا، ان کی بیٹی عائشہ کے ساتھ۔

ہر کوئی حیران اور ششدر تھا۔

شاہ ویز کے رشتے سے سب سے زیادہ دھچکا تو انزلہ کی امی کو لگا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ونیزہ ان کی اتنی حسین و جمیل، لائق فائق بیٹی کو چھوڑ کر نند کی بیٹی کو ترجیح دیں گی۔ امی اور ونیزہ تائی میں پیار بھی بہت تھا اور انزلہ پہ تو تائی جان چھڑکتی تھیں......

اوران کی یہ منہ دیکھے کی محبت اب ''کھل'' کر سامنے آچکی تھی۔

لیکن کچھ لوگ اس رشتے پہ خوش بھی تھے جیسے انزلہ کے پاپا اور تایا۔ پاپا نے تو جانے کتنی ہی مرتبہ ونیزہ تائی کا شکریہ ادا کیا تھا اور ان کے اس فیصلے کو سراہا تھا۔

''بھابھی! آپ نے یتیم بچی کو اپنا کر ہماری بہن کو ہی نہیں، ہمیں بھی خرید لیا ہے۔ آپ نے بہت بہترین فیصلہ کیا ہے۔''

مگر امی کا صدمہ اپنی جگہ برقرار تھا تب ہی تو امی نے بھی اندر ہی اندر انزلہ کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی مہم شروع کردی تھی۔ امی اور آپی ان ہی کوششوں میں مصروف تھیں جب اچانک ہی انزلہ کے اتنے پیارے ۔ پاپا ہلکے سے اٹیک میں چل بسے......اور بس وہیں سے انزلہ کے نصیب کا ''پھیر'' شروع ہوگیا تھا۔

وہ اپنی ایک بہن اور تین بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ بہن بھائی سب اچھی نوکریاں کر رہے تھے۔ اور تینوں بھائیوں نے اپنی پسند سے شادیاں کی تھیں۔ جس پہ امی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ تب بھی پاپا کی بڑی خواہش تھی کہ نفیسہ پھوپھو کی عائشہ کو اپنی بہو بنائیں۔ لیکن اس کے بھائیوں نے فرداً فرداً انکار کردیا۔ امی نے بھی کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ کہاں ایک عام سی دبو اور گھٹے گھٹے ماحول کی پروردہ لڑکی کو بہو بناتیں۔

ان کی تینوں بہویں اعلا تعلیم یافتہ تھیں، بیٹے بھی فارن کوالیفائیڈ اور بیٹیاں بھی گولڈ میڈلسٹ، انزلہ نے تو حال ہی میں پوری یونی ورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ کیا کمی تھی بھلا اس میں۔

انہیں رہ رہ کر جٹھانی کی عقل پہ افسوس ہوتا اور غصہ بھی آتا۔ مگر شوہر کے سامنے بے بس تھیں۔

امی اور پاپا میں محبت بھی بہت تھی......اور اب اچانک ان کی جدائی نے امی کو اکیلا اور ہراساں کردیا تھا۔ پاپا کی وفات پہ تینوں بھائی، بیویوں سمیت پہنچ گئے تھے۔

اور ابھی تک ان کا قیام پاکستان میں تھا۔

دسویں کے بعد مہروز بھائی نے امی کو جذباتی طور پر مضبوط رہنے کے مشورے دینے کے ساتھ ساتھ انزلہ کی سب سے بڑی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا۔

شاویز نام کی امید کا دیا تو بجھ گیا تھا اور امی اتنی سوشل نہیں تھیں پھر بھی انہوں نے پاپا کی وفات سے پہلے والی کوششوں کا ذکر بھائیوں سے کیا تو وہ صاف صاف امی کو جتلا کر بولے تھے۔

''امی! ہمارا اتنی جلدی پاکستان کا دوبارہ چکر لگانا ممکن نہیں ایک ہزار ڈالر کا ٹکٹ ہے اور پوری فیملی کے ساتھ بار بار ممکن نہیں......شہروز بھی سڈنی سے نہیں آسکتا۔ اس کا بھی نیا نیا بزنس ہے اور فیروز بھی لندن میں اپنا بزنس شروع کر رہا ہے کم از کم پانچ سال تک تو ہم میں سے کوئی نہیں آسکتا......بہتر یہی ہے چالیسویں کے فوراً بعد آپ انزلہ کی شادی کر دیں۔'' مہروز بھائی نے صاف، سیدھی اور دوٹوک بات کی تھی۔

اور امی خاموشی سے بیٹوں کی باتوں پہ سر ہلاتی رہیں۔ لیکن انہوں نے اتنا ضرور کہا تھا۔ ''اتنی جلد رشتہ کہاں سے ملے گا۔ جو نظر میں ہیں وہ کسی قابل نہیں۔ انزلہ کو ایسے تو نہیں اٹھا کر پھینک سکتی۔'' امی کی آواز دھیمی اور بوجھل بھی ہوگیا تھا۔ جو شاہ ویز سے رشتہ ہوجاتا تو ان کے ملال کو شہروز بھائی نے اور بھی ہوا دی تھی۔

''ونیزہ تائی نے بھی پھوپھو کے گھر رشتہ کرلیا۔ ہمارا سوچا تک نہیں۔''

یہ بات کہتے ہوئے وہ قطعاً بھول گئے تھے کہ انہوں نے بھی اپنے اپنے ''دل'' کو آباد کرتے ہوئے ونیزہ تائی کی صدف کو نہیں سوچا تھا۔ جس کی کم روئی کے سبب ونیزہ تائی سالوں پریشان رہیں۔ دو سال پہلے اس کی بمشکل شادی ہوئی تھی۔ خاصی مڈل کلاس فیملی میں۔ لڑکا جامعہ سرگودھا میں پڑھا رہا تھا۔ دقیانوسی خاندان تھا۔ دیہی ماحول بس لڑکا اچھا تھا اور صدف بہت خوش تھی۔ اسی لیے کم کم ہی لاہور آتی تھی۔

انزلہ نے تو صرف ایک ہی مرتبہ صدف کا سسرالی گاؤں اور گھر دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد توبہ کر لی۔ چھوٹا سا گھر، بھانت بھانت کے لوگ، ناکافی سہولیات اور ان سب میں مخصوص دیہی اور اجڈ پن کی چھاپ۔ کہاں صدف ڈیفنس کے خوب صورت بنگلے میں رہنے والی اور کہاں چک ستاسی۔

پھر بھی تائی اور صدف بہت خوش تھیں یا حالات پہ صابر و شاکر۔ صدف میں انزلہ جیسا طنطنہ اور نخرہ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ چک ستاسی کے دیہی سادہ لوح لوگوں میں رچ بس گئی تھی۔

جو ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا کھانے کے بجائے چارپائیوں اور چوکیوں پہ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور حقہ گڑگڑاتے تھے۔

انزلہ کو ایسی وحشت ہوئی کہ وہ لاڈلی، دلاری صدف کے ولیمے پہ ہی دوبارہ ادھر نہ جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اسے آج بھی صدف کا ولیمہ یاد تھا......اور ولیمے پہ ہونے والی لڑائی بھی۔

کس قدر چھوٹی اور معمولی باتوں پہ وہ لوگ لڑتے جھگڑتے اور ہاتھا پائی پہ اتر آتے تھے۔

علیم کی تائیوں اور چاچیوں میں زردہ نہ ملنے پہ لڑائی ہوگئی تھی اور یہ لڑائی اتنی بڑھی کہ پنڈال میں ہی انہوں نے ایک دوسرے پہ برتن، پلیٹیں، گلاس اچھالنے شروع کردیے تھے۔ یہ تو علیم کے ابو نے معاملہ سنبھالا تھا ورنہ جانے کیا سے کیا ہوجاتا۔

واپسی پر انزلہ نے صدف کے سسرالیوں کا اتنا مذاق اڑایا، اتنی باتیں بنائیں کہ شاہ ویز کو اسے ٹوکنا پڑا۔

''پتا نہیں تائی نے کیا سوچ کر صدف ایسے ال ھڑ، جنگلی اور بدتہذیب لوگوں میں بیاہ دی اور اپنے ایسے وحشت ناک ماحول میں صدف کیسے رہے گی۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو شاہ ویز نے تیکھی نگاہ سے اسے گھورا تھا۔

''والدین اپنے بچوں کے لیے اچھا ہی فیصلہ کرتے ہیں۔ یقیناً امی کا فیصلہ بھی بہت اچھا ہے۔ پھر علیم ایسا خوب صورت اور لائق ہے......باقی باتیں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔'' اس کا انداز تھوڑا روکھا ہوگیا تھا۔ تب آپی نے اس کو ٹہوکا دے کر چپ رہنے کا اشارہ دیا۔ لیکن وہ انزلہ ہی کیا جو چپ رہ جاتی۔

''چاہے جتنا بھی ایجوکیٹڈ ہے، رہے گا تو دیہاتی......دیکھا نہیں۔ آج کل تو لڑکے یونی ورسٹی سے گھوم آئیں تو اتنے اسٹائلش ہوجاتے ہیں اور وہ یونی ورسٹی میں پڑھا رہا ہے۔ ڈریسنگ دیکھی تھی اس کی۔ اپنے ولیمے پہ کھدر کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ تائی نے اتنے چاؤ سے بلیک ڈنر سوٹ خریدا تھا۔ جسے اس نے پہنا ہی نہیں۔''

''جب میں سیکنڈ ٹائم علیم سے ملنے اس کی یونی میں گیا تب وہ ویل ڈریسڈ تھا۔ بلیک ٹو پیس میں......انتہائی خوش اخلاق اور نفیس......مجھے بہت پسند آیا......میری امی کو پسند آیا۔ میری بہن کو پسند آیا تو باقی لوگوں کی ''پسند'' ناپسند کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

لاجواب ہونا تو انزلہ نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ''ساری بات تو ماحول کی ہوتی ہے۔ اسٹیٹس کی ہوتی ہے۔ اب دیکھیں نا۔ بس ایک علیم بھائی ہیں ان سب میں کچھ بہتر، باقی لوگ تو توبہ......ناقابل برداشت قسم کے ہیں۔ علیم سے بڑے عظیم بھائی اور ان کی زوجہ......پرائمری سکول کی اجڈ سی ٹیچر اور خود عظیم بھائی اسکول ہیڈ ماسٹر۔'' اس نے بڑے ہی بے رحم انداز میں تبصرہ کیا تھا۔

شاہ ویز اسے تاسف سے دیکھتا رہ گیا......کیسی ''سطحی'' سوچ تھی اس کی......اسے بے حد افسوس ہوا۔

''شاید تمہاری نظر علیم اور عظیم سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اسی پنڈال میں علیم کے دو اور چھوٹے بھائی بھی تھے۔ ایک نے ابھی مقابلہ کا امتحان دیا ہے اور ایک آرمی کا کیپٹن ہے۔ اس سے چھوٹا بھی یونی ورسٹی میں زیر تعلیم ہے البتہ دونوں بہنیں اتنی پڑھی لکھی نہیں۔ بڑی تو سب بہن بھائیوں سے بڑی ہیں ان کی اولاد بھی جوان ہے۔ تقریباً سب سے چھوٹی شاید

دسویں میں ہوگی...... اور تم برائے مہربانی ان لوگوں کے بخیے ادھیڑنے بند کرو۔"

شاہ ویز کا انداز درست ہوا تو انزلہ کو بھی زبان دانتوں تلے دبانی پڑی تھی۔ اسے تو صدف کے ولیمے میں کوئی خاص الخاص ہستی دکھائی نہیں دی تھی۔ نہ کوئی سول سرونٹ اور نہ کوئی آرمی کا کیپٹن، کوئی ایک بھی اپنی وضع قطع سے اچھی پوسٹ پہ کام کرنے والا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

صدف شادی کے بعد بہت کم آتی تھی۔ انزلہ کی صدف سے بہت بنتی تھی۔ لیکن شادی کے بعد صدف بہت مصروف ہوگئی تھی۔ صرف شاہ ویز کی منگنی پہ آئی تھی اپنی چھوٹی سی بیٹی کے ہمراہ...... اس کی بیٹی صدف پہ ہی تھی۔ ویسی ہی سانولی اور معمولی صورت گو کہ بہت صحت مند تھی اور پیاری لگتی تھی...... لیکن انزلہ کو کالے پیلے بچے پیارے نہیں لگتے۔

علیم کا سارا اجڈ اور بدتہذیب خاندان بلا کا گورا چٹا اور خوب صورت تھا۔ کیونکہ صدف کے سسر بہت گورے تھے، ایکسٹرا سفید اور گلابی...... ان کی سب اولاد تو ان پہ نہیں تھی تاہم علیم اور سب سے چھوٹی فاریہ اپنے والد پہ ہی تھے۔ انزلہ ان دونوں کے علاوہ صدف کے جیٹھ اور بڑی نند سے بھی ملی تھی۔ جو کہ علیم اور فاریہ کے الٹ تھے۔ اپنی والدہ ہی جیسے موٹے، بھدے، سانولے۔

شاید اس کے خیالات تائی تک بھی پہنچتے ہوں گے۔ تاہم تائی نے کبھی جتلایا نہیں تھا۔ وہ صلح جُو خاتون تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ دل میں کدورت نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن جب تائی نے عائشہ کو شاہ ویز کے لیے مانگا تو انزلہ کے دل میں ان کے خلاف خوامخواہ کدورت بھر گئی تھی۔ اسے تائی کی محبت ڈھکوسلہ لگتی۔ تاہم وہ اپنی ناراضی کا اظہار کرنے سے قاصر تھی۔ کیونکہ اس عمل سے اس کی اپنی ہی سبکی ہوتی۔

پاپا کا چالیسواں بھی ہوگیا۔ تو آہستہ آہستہ انزلہ کے بھائی رختِ سفر باندھنے لگے۔ امی اور آپی بوکھلا گئیں۔ ابھی تک انزلہ کا رشتہ کہیں بھی طے نہ پا سکا تھا جب اچانک ایک دن صدف، اپنی ساس، سسر اور بڑی نند کے ہمراہ آ گئی۔

اور اس کا مدعا جان کر ان کے پورے گھر میں بھونچال آ گیا تھا۔

☆☆☆

یہ بھونچال صرف انزلہ کی وجہ سے آیا تھا۔ باقی سب تو ایسے مطمئن اور خوش تھے جیسے انزلہ کے لیے اس سے بہتر لڑکا مل ہی نہیں سکتا تھا۔ جس طرح شاہ ویز علیم کی تعریفیں کر کر کے نہیں تھکتا تھا۔ اسی طرح انزلہ کے بھائی بھی زعیم کی تعریفیں کر کر تھک رہے تھے۔ وہ انہیں اتنا پسند آیا کہ فوراً ڈائریکٹ ہی ہاں کر دی۔ انزلہ کی انگلی میں شگن کی انگوٹھی سج گئی تب بھی اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ بھی صدف کی طرح ایک دیہی پس منظر رکھنے والے ماحول کا حصہ بن گئی ہے۔

وہ ماحول جس سے انزلہ کو نفرت تھی۔ وہ لوگ جو اس کے معیار کے نہیں تھے۔ اس کی موٹی، بھدی بے ڈھنگی سی ساس اور اونچے لمبے تہبند میں ملبوس حقہ گڑگڑاتے سسر...... سر پہ پگڑی سجائے ہمیشہ کے لیے انزلہ کو اپنے بیٹے کے نام کروا گئے۔

انزلہ تو مارے دکھ، حیرت کے اثر سے نکل ہی نہ سکی تھی جب بھائیوں نے آناً فاناً تاریخ مقرر کر دی۔ گھر میں شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں جب ایک دن صدف اور اس کی ساس، نند ایک مرتبہ پھر نازل ہوگئیں۔

امی اور آپی کے ساتھ ساتھ صدف کا بھی اصرار ہوتا تھا کہ وہ اپنی ساس اور نند کے پاس بیٹھی رہے۔ جب تک وہ لوگ یہاں رکتے، اس کی بڑی نند اس پہ واری صدقے اور نہال ہوتی رہتیں۔

کبھی اس کا ہاتھ پکڑ لیتیں۔ کبھی منہ چوم لیتیں آپا کی محبت کا یہ والہانہ انداز انزلہ کی بیزاری کو عروج پہ پہنچا دیتا تھا۔ آپا کے بدن سے اٹھتی۔ سستے پاؤڈر کی خوشبو سے اس کا جی متلانے لگتا۔

کہاں انزلہ جیسی خوشبوؤں میں مہکتی، دلفریب کلی...... سراپا حسن، سراپا نزاکت، سراپا غرور اور

کہاں یہ عام سے لوگ...... عام سا معیار زندگی رکھنے والے۔ کیا یہ لوگ انزلہ کے قابل تھے؟

عام سی ادیبہ کی کیسی اعلا قسمت نکلی۔ اسے اپنے نصیب پہ رونا آتا۔

کبھی وہ شاویز کو بڑے طنطنے سے کہا کرتی تھی۔ "اچھا شاہ ویز! کبھی تمہیں علیم بھائی کی فیملی کو اپنے سرکل میں متعارف کروانا پڑا تو تم کیا کرو گے؟"

تب شاہ ویز اس کے مذاق اڑاتے لہجے میں چھپے طنز کو سمجھ کر رسانیت سے جواب دیتا تھا۔

"کم از کم شرمندگی ہرگز محسوس نہیں کروں گا۔"

اور انزلہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔

اور اب انزلہ بھی ایک ایسی ہی "فیملی" کا حصہ بننے جا رہی تھی۔ اس کی دوستیں، کزنز کتنا اس کا مذاق اڑاتیں...... خاص طور پر ادیبہ جس سے آج کل رابطہ منقطع تھا۔ اسے صدف کی شادی پہ اس کی ساس، نندوں کا مذاق اڑانا یاد آیا۔ ان کے اوور میک اپ، پراندے، بڑے بڑے جھمکے۔ فضول جیولری، بھڑکیلے کپڑے۔ اور آج پھر صدف کا اپنی "ٹیم" کے ہمراہ آنا اسے شدید ہیجانی غصے میں مبتلا کر گیا تھا۔ اوپر سے آپا کا اوور قسم کا پیار اور الفت لٹانا۔

تاہم ایک بات انزلہ نے کافی بعد میں نوٹ کی تھی کہ اس کی ساس جتنی اہمیت صدف کو دیتی تھیں اتنی انزلہ کو نہیں اور اسے لگتا تھا کہ ان کا رویہ بھی اکھڑا اکھڑا اور بیزار قسم کا ہے۔ دراصل صدف اس کے کپڑوں کا ناپ لینے اس دن انزلہ کے ساتھ ہی کمرے میں آئی تو انزلہ نے بہت چڑ کر اپنا نیا اسٹائلش سوٹ، اس کے منہ پہ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"ایک ہی مرتبہ سب چیزیں لے جاؤ۔ کیا بہانے بہانے سے منہ اٹھا کر پورے "ٹبر" کو ساتھ لیے آ جاتی ہو۔" صدف اس کی بیزاری پہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تمہیں کیا پتا...... تم کتنی قیمتی ہو۔ آپا ہماری تو بہانے ڈھونڈتی ہیں تمہارے دیدار کے۔" صدف کا انداز ہلکا پھلکا قسم کا تھا...... انزلہ کا چڑھتا غصہ کچھ کم ہوا۔ اپنے حسن کی تعریف اس کو اسی طرح مغرور بنا دیتی تھی۔

"تمہاری آپا کے عاشقانہ رویے سے میں عاجز آ چکی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ میری شادی انہی سے ہونے والی ہے۔" صدف نے اس کے چڑچڑے انداز کو بڑا ہی انجوائے کیا۔

"تمہیں کیا خبر، آپا کی وجہ سے ہی تو تم ہمارے گھر جا رہی ہو پاگل۔ وہ تمہاری پکی عاشق ہیں۔ پورے خاندان کے سامنے تن کے کھڑی ہوگئیں، رشتہ لیں گی تو تمہارا ہی حتیٰ کہ اماں کو اور زعیم کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے...... آپا کا بہت رعب ہے ہمارے گھر پہ۔"

صدف نے سادگی سے بتا دیا۔ اور اپنے نخرے اور غرور میں انزلہ سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ اماں اور زعیم نے کیوں ہتھیار اٹھا رکھے تھے؟ جو آپا کی ضد پہ ڈالنے پڑے۔

پھر صدف کی زبانی ایک دن انزلہ نے سن لیا تھا۔ اماں کا ابھی اسے بیاہ کر لے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، صدف نے کہا زعیم بھی کچھ "ٹال مٹول" کر رہا ہے۔ وہ تائی کو بتا رہی تھی۔ انزلہ نے یہ بات ان سنی کر دی۔ اسے نہ زعیم سے دلچسپی تھی نہ اس کی ماں سے نہ بہن سے۔ صدف نے زعیم کی تصویر اپنے موبائل میں دکھانی چاہی تھی تو انزلہ نے بے زاری سے موبائل پیچھے ہٹایا۔

"مجھے نہیں دیکھنی، میں دیکھ کر کیا کروں گی۔"

اس کا لہجہ بے زاری سے پُر تھا۔

"دیکھ لو، بڑے دیکھنے کی چیز ہے میرا دیور۔" صدف نے بڑا ہی اصرار کیا تھا۔ مگر وہ نخوت سے اکڑی رہی...... فوٹو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

ناراضی ماں سے تھی، بھائیوں سے بھی، آپی سے بھی...... اور اس کمینی صدف سے بھی...... جو اپنے بھائی کا رشتہ تو اکلوتی سہیلی کے لیے لا نہیں سکی تھی۔ اٹھا کر دیور کا لے آئی۔ وہ بھلا اسے دیہی ماحول میں رہ سکے گی۔ اتنا اجڈ اور گنوار خاندان...... گرمیوں میں

بستر لگا کر صحن میں سونے والے اور چار پائیوں پہ ڈنر تناول کرنے والے۔
اس کا احتجاج کرنا کچھ کام نہیں آیا تھا...... اور یوں شادی کا دن بھی آن پہنچا۔

☆☆☆

انزلہ اور شاہ ویز کی مہندی ساتھ ہوئی تھی۔
بھائیوں نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا اور جہیز بھی صدف کی ٹکر کا دیا، مگر وہ خوش نہیں تھی۔ آخر یہ سب جو اسے دیا جا رہا تھا۔ جانا کہاں تھا؟ چک ستاسی میں، اتنے سے معمولی گھر میں۔ کیا ضرورت تھی اتنا مہنگا فرنیچر لینے کی۔ اس کا تو بیڈ روم سیٹ ہی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔
شاہ ویز کے ولیمے میں اس کی بارات آ رہی تھی۔ انزلہ کا دل ہولا جا رہا تھا۔ اسے صدف کی شادی کا ایک ایک منظر یاد آ رہا تھا۔ ویسی ہی بدمزگی، جاہل، بدتہذیب، اجڈ لوگ...... کھانے پہ ٹوٹ پڑنے والے۔ سستے میک اپ، بھڑکیلے لباس، تیز خوشبوئیں، نہ گفتگو، نہ لباس نہ زبان، نہ تہذیب۔
واپسی کا سفر بڑا تھکا دینے والا، بیزار کن، بوجھل اور فضول تھا۔ وہ جس گاڑی میں تھی اس میں دلہا ندارد تھا۔
"زعیم کہاں ہے؟" آپا صاحبہ نے سترہ مرتبہ سوال دہرایا تھا۔ اور کوئی اٹھارویں مرتبہ آپا صاحبہ کے بھائی نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔
"وہ میثم کے ساتھ ہے...... اماں اور ابو جی کی گاڑی میں۔"
"اس نے میرے سر میں سواہ (خاک) ڈلوا کے ہی دم لیا۔ کتنا کہا تھا۔ ہمارے ساتھ بیٹھنا...... پر نہ جی انا پہ حرف آ جاتا، ناک نیچی ہو جاتی، ساری اماں کی پشت پناہی ہے۔ اس کی پیٹھ کو ٹھوکتی ہیں ایمان سے۔" آپا صاحبہ، بھائی صاحب کے ساتھ ساتھ والدہ ماجدہ سے بھی بدگمان لگ رہی تھیں۔
"میرے ساتھ "شریکوں" جیسا سلوک کر رہا تھا۔ پورا دن بولا نہیں۔ میرا لایا سہرا نہیں پہنا۔ شیروانی کو دیکھا تک نہیں۔ کھسے پہ نظر نہیں ڈالی۔ میرے ارمانوں کو "سواہ" کر کے پینٹ شرٹ کو کس لیا۔ وہ بھی ہزار نکلوں سے۔" آپا کا بھونپو آن تھا۔ اور انزلہ کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ آپا کا "زعیم نامہ" ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔
انتہائی دیدہ زیب لباس میں، خوشبوؤں سے مہکتی دلہن کو آپا اور صدف نے بڑے ناز کے ساتھ گاڑی سے اتارا تھا۔ اسی وقت کیمرے الرٹ ہو گئے۔ مووی میکر چوکنا...... دودھیا روشنیاں بکھر رہی تھیں۔ گاؤں کی عورتوں کا ہجوم اسے دیکھنے کو بے تاب تھا۔
"رومانہ! دلہن کا گھونگھٹ تو الٹ دو۔" آپا اسے عورتوں کے جمگھٹے سے کسی چوزے کی طرح دبوچ کر اندر کی طرف بڑھ رہی تھیں جب عورتوں کے اصرار اور چیخ و پکار پہ آپا کو رکنا پڑا۔ پھر ایسا شور مچا کہ آپا کے ساتھ ساتھ انزلہ کو بھی کان دبانے پڑے۔
"اینی سوہنی؟"
"دودھ میں دھوئی۔"
"اینی چٹی...... جیسے میدہ۔"
"زعیم کی دلہن...... رج رج سوہنی، رومانہ تو تو لاہور لوٹ لائی ہے۔"
اور آپا صاحبہ کی ہر تعریفی جملے پہ گردن اونچی ہو رہی تھی۔ میثم، صائم اور نعیم اس کے آس پاس تھے اور زعیم جو اس کا دولہا تھا۔ وہ اب بھی کہیں نہیں تھا۔
انزلہ کو پہلی مرتبہ زعیم کا خیال آیا تھا اور اس خیال نے عجیب سی بے چینیاں اس کے اندر بھر دی تھیں۔
تب اس کے دیور نعیم نے کسی خاتون کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔
"تائی جی! زعیم اپنے دوستوں کو سی آف کر رہا ہے...... انہیں آج ہی کشمور کے لیے نکلنا تھا۔" جانے یہ بہانہ تھا یا حقیقت تاہم نعیم نے اپنی تیز طرار "تائی جی" کو چپ ضرور کروا دیا تھا۔
یہ وہی تائی جی تھیں جو صدف کے ولیمے پہ لڑائی میں پیش پیش تھیں۔ اپنی آواز سے ہی وہ ہوشیار اور جنگجو دکھائی دیتی تھیں۔
اللہ اللہ کر کے اسے ایک برآمدے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ انزلہ کی اکڑی کمر تختہ سی ہونے لگی۔ جی چاہتا تھا فرش پہ لیٹ جائے۔
صدف اب بھی نجانے کہاں تھی۔ شاید میاں جی کے لاڈ اٹھا رہی تھی۔ ایک تو یہ صدف بھی نا، بڑی بے وفا نکلی تھی۔ اتنے اجنبیوں کے چنگل میں اسے پھنسا کر غائب ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد صدف کا نزول ہوا۔ وہ انزلہ کے کانوں میں جھکی تھی۔
"الٹیاں کر کر کے میری پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ طبیعت سخت خراب ہے۔ برا مت ماننا انزلہ! میں تمہیں ٹائم نہیں دے سکی۔" وہ شرمندہ بھی تھی اور اس کے لیے متفکر بھی۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا۔ وہ ٹھیک نہیں۔
"تو کم ٹھونسا تھا نا اپنے بھائی کے ولیمے پہ۔" انزلہ نے بھی کھرک کر جتلایا تھا۔
"تین تین رشتے تھے۔ ایک بھائی کا ولیمہ، ایک کزن کی بارات، ایک دیور کی شادی...... تو تینوں کے حصے کا تھوڑا تھوڑا کھانے سے ہی "حشر" ہو گیا۔" صدف نے کھلکھلا کر کہا تھا۔
یہاں آ کر وہ کچھ زیادہ ہی مسخری ہو گئی تھی۔ ہر وقت ہنسی، مذاق، طنز، نوک جھونک...... وہ کتنی پراعتماد ہو چکی تھی۔ انزلہ کو اب اندازہ ہو رہا تھا...... اور صدف اپنی سسرال میں خاصی مقبول بھی تھی۔ کیونکہ ہر کوئی "صدفی بھابھی" صدفی پتر کی گردان کر رہا تھا یعنی نام بگاڑنے میں ان لوگوں کو کمال حاصل تھا۔
پھر یوں ہوا کہ ایک پلٹن اس کے سر پہ سوار ہو گئی...... ان میں کون کون شامل تھا۔ نعیم، میثم، صائم (بھانجا) اور بھی جانے کون کون پھر عظیم بھائی اور علیم بھی پہنچ گئے۔
ان لڑکوں نے "نیگ" کے نام پر انزلہ کو اتنا زچ کیا کہ اسے دانتوں پسینہ آ گیا۔
"بھابھی! ہم خالی ہاتھ جانے والے نہیں ہیں۔ لہٰذا ہو آپ کے کمرے میں دھرنا دے لیں۔ پھر آپ برآمدے میں قیام فرمانا۔ آپ کا کمانڈو بیٹھک میں سوئے گا اور ہم آپ کی خواب گاہ میں آرام کریں گے...... فیصلہ کریں ابھی کے ابھی...... بیس ہزار نیگ یا کمرہ بدر ہونا منظور ہے!" میثم نے کسی گھاگ سیاست دان کی طرح اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھا تو انزلہ کو کھڑے کھڑے چکر سا آ گیا۔
"بیس ہزار؟" اس کے پاس تو اتنی رقم تھی ہی نہیں پھر ان کے رواج بھی عجیب تھے۔ بھلا دیور بھی نیگ لیتے تھے؟ اب وہ کرے تو کیا کرے؟ پھر ان لوگوں کو علیم نے ہی مشورہ دیا۔
"احمقو! اپنے کمانڈو کو تو آ لینے دو۔ اس کی جیب ہلکی کرواؤ۔ انزلہ بے چاری کو کیوں تنگ کر رہے ہو۔"
علیم کا مشورہ ان لوگوں کو بھا گیا تھا۔ معاً برآمدے میں کوئی اور بھی پہنچ گیا۔ کیونکہ ہجوم میں رنگ رنگ کی بولیاں بیٹیاں اور ہوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ انزلہ کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا۔ آنے والا زعیم ہی تھا۔ کچھ دیر بعد کسی کی بھاری، دھیمی، سنجیدہ اور بارعب سی آواز ابھری تھی۔
اس کے رعب داب اور قدموں کی دھمک سے اندازہ ہوتا تھا۔ آنے والا پاک فوج کا کوئی جوان ہی ہے۔ تو یہ تھا کیپٹن زعیم عباس......
"یہ کیا "تماشا" لگا رکھا ہے۔" اس کا لہجہ روکھا اور آواز سرد تھی۔ برف سی، ٹھنڈی ٹھار، انزلہ کی ہڈیوں میں جیسے ٹھنڈک اتر سی گئی۔
"یہ تماشا نہیں...... آج تمہاری شادی ہے۔" علیم نے مسکرا کر اپنے بھائی کو جیسے یاد دلانا چاہا تھا۔ پھر اس کے جملے کو عظیم نے اچک لیا۔
"نہیں یار! آج تمہاری آزادی کی "بربادی" ہے۔" عظیم کی بات پہ ایک قہقہہ پڑا تھا۔ جس میں سب سے اونچی آواز عظیم کی بیگم نازو کی تھی۔
"اچھا...... اچھا، تو آج تمہیں یہ سب "تماشا" لگ رہا ہے؟ بھول گئے عظیم بھائی اور علیم کی شادی کو۔ اتنا زیادہ وقت تو نہیں گزرا، نہ تمہاری یادداشت

کمزور ہے۔ پھر بھی میں تمہیں یاد دلاتا ہوں۔ نازو بھابھی سے تم نے پورے دس ہزار نکلوائے تھے اور علیم کی دفعہ پچیس ہزار اور اس دس ہزار میں تم نے ہمیں صرف ایک ایک سو روپیہ دیا تھا۔ باقی سب ہڑپ کر لیے اور علیم سے ہتھیائے ہوئے پچیس ہزار تم لے کر اپنے دوستوں کے ساتھ کاغان گھوم آئے۔ ہمیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دی تھی۔" میثم کو جانے کیا کچھ یاد آیا تھا اور اس نے اگلے پچھلے سارے حساب پورے کر دیے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں ......وہ ایک ایک سو روپیہ بھی کیوں دیا؟ تم لوگ تو اس "بابرکت" سو سو روپے لینے کے بھی قابل نہیں تھے۔" زعیم کی آواز میں سنجیدگی نما تاسف تھا۔ اس کے جواب پہ ایک ہنگامہ مچ گیا۔ میثم اور نعیم لڑنے مرنے پہ اتر آئے تھے اور صائم دیوار چین بن کر بیڈ روم کے دروازے میں ایستادہ تھا......یعنی آگے رستہ بلاک تھا۔ اور اس کے تیور خطرناک۔

"ماموں! اس کمرے میں آنا ہے تو میری لاش پر سے گزر کر آنا ہوگا۔ ورنہ پیسے لیے بغیر میں نہیں ٹلوں گا۔" صائم نے سلطان راہی کی طرح بڑھک ماری، لیکن بھلا ہو زعیم کی باتونی آپا کا۔ جو بروقت انٹری مار کر انزلہ کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی تھیں۔

"ان بچوں کی خوشی پوری کرو۔ نکالو بیس ہزار......پانچ پانچ لڑکے لیں گے۔ باقی پانچ لڑکیاں بانٹ لیں گی۔"

"دیکھ لیں آپا! بندہ دیکھ کے قیمت لگتی ہے بیس ہزار زیادہ ہے۔" یہ زعیم تھا اور وہ کسے سنا رہا تھا؟ انزلہ کو؟ وہ جیسے سُن ہو گئی تھی۔ بے عزتی کے احساس سے انگ انگ میں شرارے پھوٹ پڑے تھے۔

"میری انزلہ کو تو ہیروں میں تول دو۔ تب بھی مول نہ پڑے۔" یہ ان کی محبت کی انتہا تھی یا سوچ۔ بس انہوں نے اپنی عقل کے مطابق جواب دیا تھا۔ لیکن انزلہ کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ تو یہ لوگ اس کی قیمت لگا رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر صائم کو تن کے اشارہ کیا......اس کے لہجے میں غصہ، تنفر، زہر اور جانے کیا کچھ تھا۔

"ہٹو۔" اس کا انداز بڑا بے لچک، ٹھوس اور سخت قسم کا تھا۔ جس پر ہنستا مسکراتا صائم پہلے تو ہونق ہوا اور پھر میکانکی انداز میں رستے سے ہٹ گیا۔ لحہ بھر کے لیے سکوت طاری ہو گیا تھا۔ اس غیر معمولی سچویشن کو آپا نے ہی آگے بڑھ کر سنبھالا تھا اور پھر انزلہ کو لے کر اندر چلی گئیں۔

انزلہ کے منظر سے ہٹتے ہی پھر سے ایک ہنگامہ مچ گیا۔ ہر کوئی اپنی بولی بول رہا تھا۔

"زعیم دی، ووہٹی دا اینا غصہ؟"

"نخرہ تے ویکھو اللہ دی پناہ۔"

اور کسی بڑی بی نے تو انتہا تک پہنچتے ہوئے پیشن گوئی بھی کر دی تھی۔

"ایسی کڑی نے نہ وسایا زعیم دا گھر۔"

جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ اور زعیم نے ایک ایک تبصرے کو کان میں اتارا تھا۔ ایک ایک لفظ کو سنا تھا......اور اسی حساب سے اس کی پہلے سے چڑھی تیوری کے بلوں میں اضافہ بھی ہو رہا تھا...... حالانکہ رومانہ نے اسے کتنی ہی قسمیں دے کر منہ بند رکھنے کی اور درگزر سے کام لینے کی التجا کی تھی۔

اس نے خاموشی کے ساتھ آپا کی ہر ہدایت کو سن لیا تھا اور آپا کا لجاجت سے تھمایا تحفہ بھی پکڑ لیا۔ مگر اس کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

☆☆☆

بارات واپس آئی تو انزلہ کو برآمدے میں گھاگ عورتوں کے چنگل میں چھوڑ کر وہ ہانپتی کانپتی بیٹھک میں آئیں تو زعیم انہیں موبائل کان سے لگائے کسی سے باتوں میں مصروف نظر آ گیا تھا۔ رومانہ کو بڑا ہی غصہ آیا۔ آپا کے تیور دیکھ کر وہ گہرا سانس کھینچتا سیدھا ہو گیا۔ وہ جتنا بھی بددماغ اور موڈی سہی، کم از کم آپا کے احترام میں کمی نہیں لا سکتا تھا۔ اور نہ ہی ان کے حکم سے انحراف کر سکتا تھا۔

"نہ میرے ویر! نہ تم ادھر انزلہ کے ساتھ آ کے بیٹھے۔ نہ فوٹو بنوائی۔ نہ کوئی رسم تم نے کرنے دی۔ وچاریاں دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑے اپنا سا منہ لیے رہ گئیں......تم نے اتھرے سانڈ کو بھی مات دے دی۔ چلو ادھر کا ٹیم گزر گیا۔ اب یہاں تو میرے چونڈے کا لحاظ کر جاتے......تمہیں احساس نہیں پوری برادری میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں......زعیم اس ویاہ پہ تیار نہیں تھا۔ میں نے زبردستی کی۔"

رومانہ جو ایک سانس میں شروع ہوئیں تو اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کر دیے تھے۔ زعیم تیکھے تیوروں سے ساری بات چپ چاپ سنتا رہا تھا۔ پھر جب رومانہ کی ساری بھڑاس نکل گئی تو اس نے لب کشائی کی۔

"برادری والے آنکھیں، کان، دماغ رکھتے ہیں۔ اگر وہ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں تو کرنے دیں۔ آپ کا کیا جاتا ہے؟ ویسے بھی کون سا غلط کہتے ہیں۔ کیا آپ نے اپنی "من مانی" نہیں کی؟......" اس کا سنجیدہ سا نپا تلا جواب رومانہ کو قدرے لاجواب کر گیا تھا۔

"چلو، میں نے بڑی بہن ہونے کے ناتے اپنا حق استعمال کیا۔ دعوے کے ساتھ کہ تم میری بھی نہیں ٹالو گے۔ میں نے زبردستی تمہارا ویاہ کر دیا۔ تو تم زبردستی اب "نباہ" بھی کر دیتے۔" کچھ دیر بعد وہ پھر سے "فارم" میں آ چکی تھیں۔

"تو آپ کی خوشی پوری تو کر دی ہے......اور نباہ بھی کروں گا اور کیا چاہتی ہیں آپ۔" وہ چڑ گیا تھا۔ آپا کی اس تقریر کا مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"اچھا "نباہ" ہے۔ وہ ادھر اکیلی بچوں کے نرغے میں پھنسی ہے۔ تم یہاں فون پہ عالمی مسائل حل کرنے میں جتے ہو......کیا سوچے گی وہ۔ نہ کوئی گرم جوشی نہ کوئی پرشوق استقبال۔"

"اس کے ذہن پہ آپ سب کے متعلق پہلے بھی کوئی اچھا اثر نہیں۔ دیکھا نہیں اس کا نخرہ، غرور جیسے کسی نواب کی اولاد ہو۔" زعیم نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

"میں نے آپ کو ہر بات کھل کے سمجھائی تھی مگر بھوت سوار تھا آپ کے سر پہ تو اس نواب زادی کو لانے کا......اب اپنے "ارمان" اور "شوق" پورے فرما لیں۔ امید ہے جلد ہی وہ آپ کو سر تا پا "ٹھنڈا" کر دے گی۔ ابھی تو ٹریلر ہے۔ پوری فلم ہنی مون پریڈ میں دیکھیے گا......اس کی اعلا زبان کے جوہر۔" زعیم کے لہجے میں عجیب سی بیزاری اور بے رخی تھی۔

وہ صدف کی اس کزن سے کسی قیمت پہ بھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس شدت کے انکار اور بیزاری کے پیچھے کیا کچھ چھپا تھا یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

لیکن جب آپا کا اصرار، ضد اور مان بھرا دباؤ بڑھتا گیا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ تو زعیم عباس ہر ایک کے سامنے تن کر کھڑا ہو سکتا تھا مگر اپنی آپا کے سامنے ہرگز نہیں اور اسے یقین تھا کہ اس کے الٹرا ماڈ بھائی کبھی اس رشتے پر رضامند نہیں ہوں گے اور وہ صاف انکار کر دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ سارے ہتھیاروں سے "لیس" ہو کر اس کے گھر میں آ چکی تھی۔

"اب اٹھ جا زعیم! چل اپنی دلہن کے پاس ادھر "لاگوں" (نیگ) کا سلسلہ مکا......تیرے بھائی اس کا ناک میں دم کر رہے ہیں۔" آپا نے اسے برآمدے سے اٹھتے شور اور نیگ کے لیے "دھرنا" دینے والوں کی ہاہاکار کی طرف متوجہ کیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا تھا۔

"اور اس میں اتنی برداشت نہیں ہو گی۔ جو میرے بھائیوں کے مذاق کا بار اٹھا سکے۔" طنزیہ انداز میں کہا ہوا وہ بادل نخواستہ اٹھ گیا۔ اس کے اٹھنے پہ آپا نے خوش ہو کر ایک مخملی ڈبیا اس کی طرف بڑھائی تھی۔

"اب یہ بھی کرنا ہوگا؟" زعیم کا موڈ آف ہو گیا۔

"نہیں......اس کام کے لیے اپنی "فوج" کو بلا لو۔" آپا نے چڑ کر کہا تھا۔

"فوج کیوں؟ اس نک چڑھی بلا کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔" زعیم نخوت سے بولا تھا۔

"جا میرے شیر! اب جا بچہ ورنہ تیری تائی اور میری ساس ہمارا دماغ پلپلا کر دیں گی الٹے سیدھے

سوال کر کر کے۔" آپا نے لہجے میں مزید لجاجت بھر لی تھی۔ زعیم پل بھر کے لیے سوچتا رہا تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کن انداز اپنا کر آپا کو جتا دیا۔

"دیکھ لیں آپا! اگر اس نے کچھ الٹا سیدھا کہا......ادھار رکھنے کا میں قائل نہیں ہوں۔ میرے مزاج کو جانتی ہیں آپ۔" اس کا انداز صاف دھمکانے والا تھا۔

"زعیم!" آپا دہل گئی تھیں۔

"وہ ایک دن کی دلہن تجھے کیا کہے گی؟ اور خبردار جو تم نے اسے کچھ کہا۔ ابھی سے یہ ارادے ہیں۔ ہائے میں کہاں جاؤں۔" آپا سخت ہراساں ہو گئی تھیں۔ زعیم نے ان کے "دہلنے" کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ قمیص جھاڑتا ہوا اٹھ گیا اور آپا کی تقلید میں برآمدے تک پہنچ گیا۔

اسے دیکھ کر کچھ منچلوں نے معنی خیز قسم کی ہوٹنگ کی تھی اور کچھ سیٹیاں بجانے لگے تھے۔ ان کی اس تکرار اور مذاق کے سب ہی عادی تھے۔ شادیوں میں سب ہی اکٹھے ہوتے تھے اور یوں یہ سارے کزنز مل بیٹھ کر خوب رونق لگاتے۔ اصل تو جان محفل زعیم ہوا کرتا تھا۔ ہر ایک کی شادی میں غل غپاڑہ بھی مچاتا۔ عظیم بھائی کی شادی میں اس نے نازو کو کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اور چابی تب عظیم کے حوالے کی تھی جب نازو نے دس ہزار دینے کی ہامی بھر لی۔

اور علیم کے ساتھ تو اس نے اور بھی برا کیا تھا۔ اسے زبردستی گاڑی میں بیٹھا کر جامعہ سرگودھا چھوڑ آیا۔ جہاں رات کے وقت سواری کا ملنا ممکن نہ تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے دھکے کھا کر اپنے گوٹھ پہنچا تو زعیم صاحب صدف سے مطلوبہ رقم نکلوا کر خود منظر سے غائب ہو چکے تھے یوں علیم آدھی رات تک زعیم کو گالیاں دیتا رہا۔

وہی زعیم اپنی شادی پہ اتنا خفا، ناراض اور اکھڑا اکھڑا تھا۔

سو بہت سے لوگ چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ کچھ کے دبے دبے تبصرے تو کچھ کا کھلم کھلا اظہار خیال۔ حتیٰ کہ سارے بھائیوں کو زعیم کی "ناپسندیدگی" کی پوری پوری خبر تھی۔ مگر انزلہ کے مزاج سے ناواقف تھے۔

گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپی انزلہ نے شدید جھلاہٹ، تنفر اور غصے میں صائم کو رستہ چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ وہ تو ابھی مامی کے حکم اور لب و لہجے کی ترشی پہ ہکا بکا تھا جب اچانک میثم نے آگے بڑھ کر انزلہ کے ہاتھ سے سنہرا کلچ جھپٹ لیا۔ یہ بالکل اچانک واردات تھی۔ انزلہ ہائی ہیل میں تھوڑا لڑکھڑا گئی تھی۔ تب ہی عظیم بھائی کے چھوٹے بیٹے نے اس کا گھونگھٹ پکڑ کر کھینچا۔ انزلہ کا پہلے سے کھولتا دماغ پوری شدت کے ساتھ گھوم گیا تھا۔ ایک زوردار تھپڑ کی گونج اٹھی تھی جس نے پورے برآمدے میں سکوت طاری کر دیا تھا۔ یوں لگا جیسے پورے برآمدے میں ایک بھی ذی نفس نہ ہو۔ ایک دم موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا۔ عظیم بھائی کا بیٹا چکرا کر گرا تھا جبکہ انزلہ کے الفاظ نے حاضرین کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور کانوں سے دھواں نکال دیا تھا۔

"واٹ نان سینس۔ کس قدر بدتہذیب ہو تم۔ یو شڈ بی آشیمڈ آف یور سیلف۔ اجڈ، دیہاتی! اگر میں گر جاتی!"

انزلہ کے منہ میں جو الٹا سیدھا آیا، اس نے بول دیا۔ اپنے گھر والوں کا غصہ، زبردستی کی شادی، رسومات، لمبا سفر، تھکان، الجھن، بھانت بھانت کے لوگوں کی بولیاں۔ اس کا سارا جمع شدہ غصہ ایک دم الٹ پڑا۔ اپنی خودی اور گھمنڈ میں نخوت سے ایک ایک ہراساں چہرے کو دیکھتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ صائم دروازے سے کب کا ہٹ چکا تھا۔ ہر کوئی میثم کو دیکھ رہا تھا۔ جو شدید خجالت، شرمندگی اور تاسف میں ڈوبا کھڑا تھا۔ جسے وہ بڑے غرور کے عالم میں "اجڈ، دیہاتی اور جاہل" کہہ کر اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

وہ میثم عباس جو ضلع منڈی بہاؤالدین میں اس وقت دیوانی یعنی سول عدالت میں جونیئر سول جج تھا۔ اتنا لائق اور قابل اس ساری بدترین سچویشن کو آپا نے

بڑی مشکل کے ساتھ قابو میں کرتے ہوئے انزلہ کو گھسیٹ کے کمرے میں بھیجا۔ یہ تو شکر تھا اماں دوائی کھا کر سو چکی تھیں ورنہ قیامت تو ابھی آ جاتی۔ اماں تو انزلہ کو کسی بھی قیمت پہ کبھی نہ بخشتیں اور جب مجمع چھٹنے لگا تب میثم کی بڑبڑاہٹ نے آپا کے اندر پھانس چبھو دی تھی۔

"زعیم ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ ہمارے قابل نہیں تھی۔"

☆☆☆

آدھے مہمان جا چکے تھے اور آدھے ابھی قیام پذیر تھے۔ جنہوں نے اس خبر کو مسالے کے ساتھ بہت آگے تک پہنچا دیا تھا۔

"مل گیا رومانہ کو سواد، بڑے گھر کی چھوٹے دل اور چھوٹی سوچ والی لڑکی گھر لا کر......آتے ہی "اوقات" دکھا دی۔" ہر طرف تبصرے ہو رہے تھے۔

وہ نفرت، غصے اور توہین کے احساس میں بھڑ بھڑ جلتا آگ بگولا ہوتا دروازہ دھاڑ سے کھول کر اندر آیا تو کمرے میں نیلگوں روشنی بکھری تھی اور اس نے بازو آنکھوں پہ رکھا ہوا تھا۔

زعیم کا پہلے سے تپا، سلگا دماغ اور بھی ابلنے لگا۔ یعنی وہ اپنے ایک ایک عمل سے ثابت کر رہی تھی اس گھر کا کوئی بھی فرد اس کی نگاہ میں ذرا سی بھی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ زعیم بھی نہیں۔

اور اسے ابھی اپنے اس "عمل" کی انتہا اور "نتائج" کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ تبھی وہ اتنی پرسکون اور مطمئن تھی۔

زعیم لب بھینچے اسے کچھ پل کے لیے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر انتہائی وحشیانہ انداز میں اس کا بازو دبوچ کر ایک جھٹکے کے ساتھ ــــ کھڑا کر دیا تھا۔ انزلہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی......شاید وہ تھکن سے بے حال ہو کر سو چکی تھی۔

انزلہ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا۔ جو کچھ چند گھنٹے پہلے ہوا تھا۔ وہ کچھ اتنا اچھا نہیں ہوا تھا۔ اس نے کبھی کسی غصیلے مرد کو نہیں دیکھا تھا۔ انزلہ کے پاپا بڑے نرم خو تھے اور بھائی پاپا کا پورا پورا عکس۔ تایا اور شاہ ویز بھی نرم طبیعت تھے۔

زعیم کے بھڑکتے لہجے نے انزلہ کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ زبان تالو سے چپک گئی تھی۔

"اچھا تو ہم جنگلی ہیں، وحشی، درندے، جاہل۔" وہ اتنی شدت سے غرایا کہ انزلہ کو اپنے کان پھٹتے محسوس ہوئے تھے۔ اس نے بے ساختہ اپنے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔

"بدتہذیب ہیں، بدتمیز ہیں، اجڈ ہیں۔ تم نے ابھی وحشی دیکھے ہی نہیں، آج ارمان تمہارا پورا کر دوں گا۔ پھر تمہیں کوئی حسرت نہیں رہے گی۔ تو آج اس "وحشی" کا اچھی طرح نظارہ کر لو۔ اسی وحشی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے جہاں سے "رہائی" ممکن نہیں ہو گی۔ ساری عمر تڑپتی رہو گی۔"

اس نے بالوں سے پکڑ کر انزلہ کو زوردار جھٹکا دیا تھا۔ وہ لہرا کر بیڈ سے نیچے جا گری تھی......پھر اس کی جیسے چیخ نکل گئی۔

"اس ہاتھ سے تم نے میرے بھتیجے کو مارا......میرے بچے پہ ہاتھ اٹھایا۔ بڑی اعلا تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ ہو تم......تمیز تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔ تمہیں ان کا مذاق برا لگ رہا تھا تو آپا سے کہتیں......تم نے بچے پہ ہاتھ کیوں اٹھایا؟ اب اتنی ہی ذلت اٹھاؤ گی اور اتنے ہی تھپڑ کھاؤ گی۔" زعیم کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گلے پر جم گیا......اس کی زبان چلی تو پھر تھمی نہیں......وہ نہ بول بول کر تھک رہا تھا نہ اس کے گلے سے ہاتھ اٹھا رہا تھا۔

"چھوڑو مجھے، مار دو گے کیا ظالم درندے۔" وہ چلا کر خود کو بچانے کی کوشش میں اور بھی اس کے غصے کو ہوا دے رہی تھی......لیکن زعیم کا نہ غصہ تھم رہا تھا۔ نہ ہاتھ رک رہا تھا۔ آخر میں اس نے انزلہ کو پاؤں کی ٹھوکر ماری اور ہٹ گیا۔

باہر سے دروازہ پیٹا جا رہا تھا۔ شاید میثم کی آواز تھی ــــ اور آپا کی بھی مگر زعیم نے دروازہ نہ کھولنا تھا نہ کھولا۔

انزلہ وہیں فرش پہ بیٹھ کر اپنی "نادانی" کے ہاتھوں پوری رات روتی رہی تھی۔ کوئی اس سا نادان اور بدقسمت بھی تھا۔ جس نے اپنی بے وقوفی، کم عقلی اور جذباتیت کی وجہ سے اپنی قسمت کا دروازہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے ہمیشہ کے لیے بند کر لیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن ولیمہ تھا اور جس حال میں ولیمہ ہوا یہ آپا اور صدف کا اللہ جانتا تھا۔ انزلہ نے وہ تماشا لگایا کہ رو رو کر پورا گھر سر پہ اٹھا لیا۔ کچھ اس کی حالت بھی بڑی شکستہ تھی۔ اوپر سے غم و غصے اور ذلت کے احساس کی وجہ سے بخار چڑھ گیا تھا۔

صدف نے ہاتھ جوڑ کر اسے بمشکل تیار کروایا تھا اور صدف کی ہزار ناراضی کے باوجود اس نے ولیمہ میں دس منٹ سے زیادہ شرکت نہیں کی تھی۔ آپا اور صدف اسے بہانے سے اٹھا لائی تھیں۔

ولیمہ جیسا تیسا نپٹ گیا۔ مہمان گئے تو اس کے سارے بھائی بھی لمبے عرصے کے لیے اسے اسی گھر میں "الوداع" کہہ گئے۔ بھائیوں نے بالا ہی بالا امی کا ویزا لگوا لیا تھا اور امی کو اپنے ساتھ لے جانے کا پکا پروگرام بنا لیا تھا۔

ولیمے کے چوتھے دن یہ سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پہ نکل گئے۔ امی کی اس بے وفائی نے انزلہ کو پورا ہفتہ "شاک" میں رکھا تھا۔ وہ جو ولیمے کے بعد ہمیشہ کے لیے اس گھر پہ لعنت بھیج کر امی کے گھر جانے کا منصوبہ بنا کر بیٹھی تھی۔ وہ لمحوں میں چکنا چور ہو گیا۔

اصل دکھ تو یہ تھا کہ امی نے اسے بتانا بھی گوارا نہیں کیا...... وہ اپنی بہوؤں اور بیٹیوں کے پاس جانے کے لیے اتنی خوش، اتنی پرجوش تھیں کہ انزلہ کے سارے شکوے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ وہ لوگ جاتے ہوئے اس سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ صرف ایک گھنٹہ رکے اور چلے گئے۔

جاتے وقت امی نے اسے خوب سمجھایا تھا، نصیحتیں کی تھیں اور وہ ــــ خالی دماغ سے سب کچھ سنتی رہی۔

"جب تمہارا رشتہ طے ہوا تب ہی شہروز نے میرا ویزا لگوا لیا تھا...... مرینہ تو دبئی میں سیٹ ہے۔ بھائی تمہارے باہر ہیں...... تمہاری شادی کے بعد میں یہاں اکیلی تھی۔ تمہارے بھائیوں کو گوارا نہیں تھا۔ تم بس یہاں خوش رہنا پھر فون پہ بات تو ہوتی رہے گی۔"

امی نے اس کی پیشانی چومی اور آباد رہنے کی ڈھیروں دعائیں دے کر چلی گئیں اور یوں انزلہ کے لیے "واپسی" کے بھی سارے دروازے بند ہو گئے۔

☆☆☆

شادی کے ساتویں دن صدف نے صبح ہی صبح اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"مجھے بتاؤ تمہیں کس بات کا "زعم" ہے؟ ابھی تک تمہارا غصہ ختم نہیں ہوا۔ تمہاری اکڑ نہیں گئی۔ تم آخر چاہتی کیا ہو؟ جبکہ غلطی بھی تمہاری تھی۔ اور بجائے معافی مانگنے کے تم بلاوجہ اکڑ رہی ہو۔" صدف کا مارے اشتعال کے برا حال تھا۔ انزلہ کو صدف کی طوطا چشمی پہ بڑا ہی غصہ آیا تھا۔

"تمہارے دیور نے مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ میری اتنی انسلٹ کی اور تم کہہ رہی ہو میں بلاوجہ اکڑتی ہوں۔" انزلہ بھی ابل پڑی۔

"شروعات آخر کس نے کی تھی؟ ابھی بھی سوچوں تو خود سے نگاہ نہیں ملا سکتی...... مجھے اتنی شرم آتی ہے کہ حد نہیں...... کیا تم میری کزن ہو؟ میرے ہی نام پہ دھبہ؟ اور آفرین ہے میرے شوہر اور اس گھر کے اعلیٰ ظرف لوگوں پہ جنہوں نے ایک مرتبہ بھی مجھے نہیں جتایا اور تم نے ایک مرتبہ بھی سوچنے کی زحمت نہیں کی ہوگی کہ ان لوگوں کی تمہاری اس گری ہوئی حرکت پہ کتنی سبکی ہوئی ہے۔ وہ کس قدر اپنے ہی خاندان والوں کے سامنے شرمسار ہیں اور میرا سر کس قدر جھک چکا ہے۔ یہ تو علیم کی وسیع القلبی ہے جس نے ایک دفعہ بھی مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ ہر کوئی زعیم کو سمجھا تا پھر رہا ہے کہ وہی درگزر سے کام لے۔

اس بات کو ختم کرے حتیٰ کہ میثم بھی۔ آپا کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں اماں بے چاری ہاتھ ملتی ہیں۔ تائیاں ٹھٹھے لگاتی ہیں۔ اور تمہیں ذرا بھی احساس نہیں۔"

صدف آج ساری کسر نکالنے کے ارادے سے آئی تھی۔ اسے بے بھاؤ کی سنا کر جب تھوڑا سا رکی تو انزلہ کو بھی بولنے کا موقع مل گیا تھا۔

"مجھے یوں لگا، جیسے مجھے کسی نے دھکا دیا ہے میرا تماشا لگانے کے لیے۔ تاکہ میں گروں اور یہ لوگ ہنس سکیں۔ گھونگھٹ میں مجھے پتا نہیں چلا۔ بس میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ میں ابھی تک خود "شاک" میں ہوں۔ میں ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر مجھ سے غیر دانستہ طور پر جو بھی ہوا۔ مجھے اس پہ شرمساری ہے۔" بالآخر انزلہ نے تسلیم کر ہی لیا تھا۔

"تم نے عظیم سے معذرت کی، نہیں نا، کیا تمہارا فرض نہیں تھا کہ تم ان لوگوں سے معذرت کرتیں۔ اتنے لوگوں میں چھوٹے سے مذاق پہ تم نے تماشا بنا دیا۔" صدف نے اسے بھگو بھگو کر ماریں تو اس کا سر جھک گیا تھا۔

"اور تمہارے دیور نے کیا بدلہ نہیں لیا تھا۔ جانوروں کی طرح مجھے پیٹا۔" انزلہ کو نئے سرے سے اپنی ساری تکلیف یاد آ گئی تھی۔ وہی ذلت، وہی مار، وہی بے عزتی۔

"جسے منہ پھاڑ کر جانور بول رہی تھیں۔ اس نے جانور بن کر تو دکھانا ہی تھا۔ مانا کہ اس نے ضرورت سے زیادہ کر دیا مگر وہ غلط نہیں تھا۔" صدف نے جتا کر کہا تو وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

"تمہیں مجھ سے زیادہ ان لوگوں کی پرواہ ہے۔"

"ان کی پرواہ کیوں نہ کروں؟ یہ لوگ میرے محبوب شوہر کے پیارے ہیں۔ وہ اپنے گھر والوں سے محبت کرتا ہے اور میں اپنے شوہر سے۔" صدف نے اب کے کچھ رسان سے اسے سمجھایا تھا۔ پھر اس نے غصہ ترک کر دیا اور اس کو ــــ نرم انداز میں سمجھاتی رہی تھی۔

"دیکھو میری جان! جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ مٹی ڈالو۔ یہ لوگ بھی درگزر کر چکے ہیں۔ زعیم کا غصہ بھی اتر جائے گا۔ تم خود میں تبدیلی لاؤ۔ سب میں گھلو ملو اور خاص طور پر زعیم پہ توجہ دو۔ تمہیں تو خبر ہی نہیں وہ تم سے کتنے فاصلے پہ چلا گیا ہے۔" صدف اسے ایک ایک نزاکت سمجھا رہی تھی۔ اسے زعیم کے ساتھ "نازک" رشتے کا احساس دلا رہی تھی۔

"پہلے جیسے وہ میرے بڑا قریب تھا۔" اس نے جل بھن کر کہا تھا۔

"قریب تھا نہیں...... مگر آ ضرور جاتا۔ تم نے اپنے ایک عمل سے اتنی بڑی خلیج حائل کر دی ہے۔ اب اس خلیج کو تم ہی پاٹ سکتی ہو۔" صدف نے ملائمت سے سمجھایا۔

"تم چاہتی ہو میں اس فرعون کے قدموں میں گروں۔ اس سے بھیک مانگوں، ہرگز نہیں۔" انزلہ ایسے بدکی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اور صدف نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔ آخر وہ اس کو کیسے سمجھاتی؟

☆☆☆

وہ تائی امی کے گھر جا کر شاہ ویز اور عائشہ کی خوشحال زندگی کو دیکھ کر مزید ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اور دل یہاں بھی نہیں لگ رہا تھا۔

آج اتنے دن ہو چکے تھے، اس نے زعیم کو دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اسے پتا تھا وہ گھر میں ہی ہے۔ کیونکہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو اس کی آواز انزلہ کو کمرے میں سنائی دیتی تھی۔

دراصل وہ اس شادی کے سرے سے ہی خلاف تھی کیونکہ اسے اپنے موجودہ سسرالیوں کا معیارِ زندگی اپنے معیار کے بالکل مطابق نہیں لگتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے ہی نہیں ان کے ماحول، ان کے رہن سہن، ہر چیز سے متنفر تھی۔

جبکہ اسے تو صدف کو دیکھ کر بڑی حیرانی ہوتی۔ کیسے وہ اپنا سابقہ اندازِ زندگی بھول کر ان لوگوں کے رنگ میں رنگ چکی تھی۔ کہاں وہ ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ پورے شہر میں مرسڈیز دوڑایا کرتی تھی اور کہاں ایک چھوٹے سے دیہات میں معمولی سے

گھر کی چار دیواری میں مقید تھی۔ جہاں پہ ایکٹویٹی کے نام پہ چغلیاں تھیں۔ گھریلو سیاست تھی، ایک دوسرے کی برائیاں کرنے کے لیے دلچسپ جملے بازی ہوا کرتی تھی یا پھر دوسروں کی ذاتیات پہ حملے کیے جاتے۔ اور ان دنوں تو انزلہ کی ذات موضوع گفتگو تھی۔ وہ سارا وقت کمرے میں بند رہتی۔

وہ ہونق پن سے صدف کی لمبی تقریر سن رہی تھی۔

''انزلہ! میں یہ نہیں کہوں گی۔ تمہاری اس شادی میں رضامندی شامل نہیں تھی تب ہی تم اتنی بیزار ہو، یہاں کے لوگوں سے کیونکہ اتنا تو میں جانتی ہوں۔ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔'' صدف کی تمہید پہ اس نے گہرا سانس خارج کیا تھا۔

وہ صدف سے یہ نہیں کہہ سکی کہ۔ اس کے سامنے دوسرا کوئی انتخاب نہیں تھا۔ اس نے کبھی کسی کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ شاہ ویز کا خیال ضرور آیا تھا مگر محبت یا پسندیدگی نہیں تھی۔ یونی ورسٹی میں بھی اس نے کبھی کسی کو منہ نہیں لگایا تھا۔ پھر بھلا وہ کیسے زعیم کے رشتے سے انکار کرتی۔

اور اس رشتے کے کچھ تقاضے بھی تھے۔ جن کا احساس دلانے صدف اس وقت انزلہ کے کمرے میں موجود تھی۔

''دیکھو انزلہ! انسان کو وقت اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ تبدیلی اور نرمی لانا پڑتی ہے۔ یہاں پر سب کچھ مختلف ہے۔ لیکن دیکھو جان! یہاں پہ کچھ نہیں بدلے گا۔ تم کو ہی بدلنا ہوگا۔

تمہیں تو پتا نہیں یہاں پہ سب پردیسی ہیں، ہر کوئی اپنے اپنے کام پہ نکل جائے گا۔ یہ لوگ ویک اینڈز پہ آتے ہیں۔ یا چھٹی پہ، ان کے آتے ہوئے اور جاتے ہوئے کتنا کام ہوتا ہے۔ یہ تمہیں آہستہ آہستہ اندازہ ہوگا۔ اس گھر کی دیکھ بھال اور چھوٹی موٹی ذمہ داریوں کو سمجھو جبکہ تم جانتی بھی ہو کہ یہ تمہارا آخری ٹھکانہ ہے۔

تمہارے بھائی اور بہن اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔ نازو بھابھی بھی نکلنے والی ہیں...... ہیثم آج چلا جائے گا۔ نعیم کل، وہ ہاسٹل میں رہتا ہے عظیم بھائی اور نازو بھابھی ساتھ والی تحصیل میں جاب کرتے ہیں، دونوں اسکول ٹیچر ہیں۔ ہم لوگ بھی دوپہر تک نکل جائیں گے۔ آپا کب تک ہمارے گھر کی ذمہ داری اٹھائیں گی۔ انہیں بھی جانا ہے۔''

صدف بہت نرمی اور ملائمت سے ایک کے بعد ایک بم اس کے سر پہ پھوڑ رہی تھی۔ اور انزلہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے حواس جیسے گم ہو رہے تھے۔

''تم بھی چلی جاؤ گی؟ مم میں یہاں اکیلی۔''

انزلہ کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ صدف اس کی پریشانی دیکھ کر چپ ہوگئی۔

''اکیلی کیوں؟ ابا جی ہیں، اماں ہیں، فاریہ بھی ہے گو کہ وہ اسکول جاتی ہے۔ لیکن دوپہر تک گھر آ ہی جاتی ہے۔ پھر زعیم ہے نا...... وہ تو ہر ویک اینڈ پہ گھر آتا ہے۔ جب سے اس کی پوسٹنگ، کھاریاں ہوئی ہے، وہ ہر ویک اینڈ پہ آ جاتا ہے۔ پہلے کشمور میں تھا تو وہاں سے جلدی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ اور کھاریاں تین چار گھنٹے کی ڈرائیو پہ تو ہے پھر تم پریشان مت ہونا۔ بس زعیم کے ساتھ تعلقات اچھے کر لو۔ وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا۔ لیکن جب تک ہیثم کی شادی نہیں ہو جاتی تمہیں بھی یہیں رہنا ہوگا۔

زعیم سے اپنا رویہ اچھا کرو۔ ہنسا بولا کرو۔ اس کے کام کرو۔ عورتوں کو تو سو طریقے آتے ہیں۔ ایک تم ہو جسے پرواہ نہیں، اپنا شوہر شتر بے مہار چھوڑ رکھا ہے۔'' صدف اسے اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا چاہتی تھی۔

★ ★ ★

اماں تخت پہ لیٹی تھیں۔ اپنی بھیگی آنکھیں پونچھتی ابا جی سے مخاطب ہوئیں۔

''میں تو ان سب کے جانے آنے کی عادی ہو چلی ہوں۔ میرے بچوں کے کندھوں پہ ''سفر'' سوار رہتا ہے۔ اللہ کی امان میں رہیں۔ جہاں بھی رہیں پر چوہدری جی! دل بڑا اداس ہوتا ہے۔ ابھی کل کی تو بات ہے...... نازو بیاہ کر لائے تھے، ہر طرف رونقیں، ہلا گلا پھر وقت گزارا تو دونوں کی ٹرانسفر ہوگئی۔ دونوں تلاش رزق میں پردیسی ہوئے۔ پھر اللہ سلامت رکھے میرے علیم کو۔ اس کی دلہن میں بڑے ارمانوں سے لائی تھی بڑے شہر اور بڑے گھر کی لڑکی، اللہ اسے سدا سہاگن رکھے۔ جتنے بڑے شہر کی تھی۔ جتنے بڑے گھر کی تھی، اتنا بڑا دل بھی پایا۔ ایسے گھل مل گئی کہ اجنبیت کا احساس تک نہ ہوا۔ اب زعیم کی دلہن آئی ہے۔ یوں لگتا ہے گھر میں کسی نئے فرد کا اضافہ نہیں ہوا۔ اتنی چپ، اتنی گم صم، اتنی خاموش میرا تو دل ہولتا ہے چوہدری جی! بچی اتنا چپ کیوں رہتی ہے۔ زعیم بھی اکھڑا اکھڑا بدمزاج، نہ ڈھنگ کی بات کرتا ہے۔ نہ بولتا ہے۔''

اماں آج سارے بچوں کو بھیج کر بڑی فرصت کے ساتھ زعیم اور انزلہ کا تجزیہ کر رہی تھیں۔ اور ان کی آواز اس سناٹے میں اندر تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ خود کو موضوع گفتگو بنا سن کر انزلہ پوری جان سے ٹھٹک گئی تھی۔

''میری بات سنو جی...... یوں ہی دل نہیں ہولتا میرا۔ یہ اس رات جو بچوں نے شغل شغل میں ''رولا'' ڈالا تھا اس کی وجہ سے تو نہیں؟ میں نے اڑتی اڑتی سنی تو تھی۔ زعیم نے دلہن کے ساتھ خاصا فساد مچایا تھا۔ آپ زعیم کے کان کیوں نہیں کھینچتے؟ ہم عزت دار لوگ ہیں، ایسے تماشے لگاتے اچھے لگتے ہیں اور یہ کس خوشی میں بیٹھک کے حجرے میں ڈیرہ لگائے سوتا ہے؟ بہو اکیلی یہاں اور وہ نواب زادہ وہاں۔''

ابا جی گہری سوچ میں گم حقہ گڑگڑاتے رہے۔ ان کے چہرے پہ گہرا تفکر تھا۔

''انزہ پتر، واقعی کمرے سے باہر نہیں آتی؟ اور یہ سدا کا الٹی کھوپڑی والا...... اس کو میں ایسی مار دیتا ہوں۔ آئندہ تو یہ کرے گا۔'' ابا جی نے کچھ دیر بعد اماں کو جیسے تسلی دی تھی۔ وہ حقہ گڑگڑانے کا شغل ترک کر کے گلا کھنکھارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سر پہ رکھی پگڑی کو سیدھا کرتے ان کے قدموں کا رخ اس طرف تھا۔ جس طرف آج کل زعیم کا عارضی قیام تھا۔

☆☆☆

انزلہ کے لیے دوسرا جھٹکا کچھ اس طرح سے تھا۔ جب اس نے اپنے سسر کو دوسری مرتبہ دیکھا۔

وہ سفید براق کرتے، تہبند میں ملبوس تھے۔ لمبے سے، سفید پگڑی باندھے۔ نورانی چہرہ...... پھر وہ اکیلے نہیں آئے تھے ان کے ساتھ زعیم بھی تھا۔ خاصا مودب نظر آتا ہوا۔

اور زعیم کو شرافت کے لبادے میں دیکھ کر انزلہ کو اندازہ ہو رہا تھا ابا جی کا اپنے بچوں پہ کتنا ''رعب'' ہے۔ مجال تھی جو زعیم نے ابا جی کے سامنے ''چوں'' بھی کی ہو تو۔

وہ انزلہ کے سامنے زعیم کو گھرکتے رہے تھے۔ اور زعیم نے نہ بحث کی، نہ دلیل دی نہ وضاحت کی۔ بلکہ ہر بات چپ چاپ تسلیم کرتا رہا۔

انہوں نے ان دونوں کی ''ان بن'' یا جھگڑے کی وجہ ہرگز نہیں پوچھی تھی۔ انہوں نے بس اس ان دیکھی دیوار کو ایک ضرب کے ساتھ گرایا تھا جو ان دونوں کے درمیان نادانستگی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

ابا جی نے جاتے سمے بڑی حلیمی سے کہا بھی تو بس اتنا۔

''شادی دو انسانوں کا بندھن نہیں۔ دو خاندانوں کا ملاپ ہوتی ہے۔ شادی کی ذمہ داریاں بس نکاح تک محدود نہیں ہوتیں۔ کیا تمہیں اپنے اللہ کے سامنے حاضر نہیں ہونا؟ جس اللہ اور رسول کو گواہ بنا کر اس بچی کو اپنے ساتھ گھر لائے ہو۔ اس کے حقوق کا تمہیں کوئی احساس نہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی کمزوریوں اور عیبوں کو ڈھکتے ہیں نہ کہ تشہیر کریں۔ اگر تمہاری بیوی غلطی پہ ہے تو اسے غلطی کا احساس دلانے کا یہ طریقہ کہاں سے سیکھا۔ اگر اپنی بہن کی

خوشی اور چاہ پہ سر جھکایا تھا تو دل بھی جھکا لیتے۔“

ابا جی ایسا ہی فصیح لیکچر انزلہ کو بھی دے رہے تھے جس میں انہوں نے اس کی ساری غلطیوں کی نشان دہی کی تھی۔ اور انزلہ ابا جی کو دیکھ کر ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے پاپا کا کوئی دوسرا عکس ہو۔ اتنے ہی حلیم اور پیار کرنے والے۔ اتنے ہی میٹھے انداز میں سمجھانے والے۔

ابا جی جب تک بیٹھے رہے، زعیم چپ رہا۔ ابا جی کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد بھی چپ رہا تھا۔ پھر آرام سے بیڈ پہ لیٹ کر سو گیا۔ انزلہ ہکا بکا رہ گئی۔ یہ کوئی سونے کا ٹائم تھا؟

انزلہ کو بادل نخواستہ اٹھ کر صوفے پہ آنا پڑا۔ زعیم کے برابر لیٹنا مناسب نہیں لگا۔ وہ نجانے کیا سوچتا؟

جانے وہ کتنی دیر تک سوتی رہی۔ جاگی تو تب جب اسے کسی نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

انزلہ کو غصہ تو بلا کا آیا تھا۔ مگر پھر برداشت کر گئی تھی۔ کیونکہ ابا جی کی تازہ تازہ نصیحتوں کا اثر ابھی باقی تھا۔

”یہ جگانے کا کون سا طریقہ ہے؟“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ”جتانے“ سے باز نہیں آئی تھی۔

”تم سے کس نے کہا کہ میں اتنا سولائزڈ ہوں؟“ اس نے الٹا سوال کر دیا تھا۔ طنز میں ڈوبا ہوا لہجہ......انزلہ کو بمشکل ہی ”پینا“ پڑا۔

”میرا اندازہ ہی تھا۔“ انزلہ جز بز ہو کر بولی تھی۔ یہ اس رات کے بعد ان کی پہلی باضابطہ گفتگو تھی۔ جو ہرگز بھی خوشگوار نہیں تھی۔

”اچھا؟“ اس کا ”اچھا“ مذاق اڑانے والا تھا۔ اس ”ٹریلر“ کو دیکھ لینے کے بعد بھی تم نے ایسا اندازہ قائم کیا؟ پھر تو بڑی عقل مند ہو۔“

اس نے صاف صاف بات اڑائی تھی۔ انزلہ کا دل چاہا۔ وہ کوئی منہ توڑ جواب دے کر اسے ٹھنڈا کر دے۔ کیونکہ وہ ”ٹریلر“ سے مراد شادی والی رات کی ساری سچویشن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ انزلہ کا مارے توہین اور غصّے کے بُرا حال ہو گیا۔

”مجھے تمہاری شاہانہ نیند کو ڈسٹرب کرنے کا شوق نہیں تھا۔ لیکن تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے۔ تمہارے سارے ”شاہی ملازم“ جا چکے ہیں جن میں سرفہرست نازو بھابھی، صدف بھابھی اور آپا تھیں۔ جنہوں نے تمہیں دس دن تخت پہ بٹھا کر عیش کرائے۔ شاہی کنیزوں کے چلے جانے کے بعد تمہیں خود بخود اپنی ذمہ داریوں کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ آپا کا بنایا ہوا سالن دوپہر میں ختم ہو گیا تھا۔ ابا جی اور اماں سر شام کھانا کھا لیتے ہیں۔ وہ ابھی تک بھوکے بیٹھے تھے۔ ابا جی کو نماز پڑھنے جانا تھا۔ مجبوراً اماں کو کچن میں جانا پڑا اور انہیں گھٹنوں کی شدید تکلیف ہے۔ سردی میں یہ درد ان کی برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔“ اس نے گہرے طنزیہ کاٹ دار انداز میں جتلایا تو وہ لمحہ بھر کے لیے ہونق ہو گئی تھی۔

”تو پھر؟“

وہ اس کے ”تو پھر“ پر جیسے بدک گیا تھا۔ یعنی اس کی اتنی لمبی تقریر کے بعد بھی اس کا یہ سوال بنتا تھا؟

”تو پھر یہ کہ آپ اپنی شاہی سواری کو باورچی خانے تک لے جائیں۔ اماں کو عرصہ ہوا۔ وہ ان کاموں سے ریٹائر ہو چکی ہیں۔ وہ تو پیاز کاٹنا بھی بھول چکی ہیں اب شاباش، ہری اپ، اٹھو۔“ کافی طنزیہ انداز میں بولتے ہوئے اس کا لہجہ آخر میں نہ صرف ملائم ہو گیا تھا بلکہ اس کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ شاید ابا جی کی نصیحتوں کا اثر تھا۔

انزلہ نے بغیر بحث کیے پیروں میں چپّل پھنسالی تھی۔ پھر وہ کھلے بال دائیں کندھے پہ ڈال کر خاموشی سے باہر نکلنے لگی تھی جب زعیم نے اسے بے ساختہ ٹوک دیا۔

”انزلہ! بال سمیٹ لو۔“ اس کے لہجے میں واضح تنبیہہ تھی۔ انزلہ سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”باہر اور لوگ بھی ہیں۔“ زعیم کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ انزلہ حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

باہر بھلا کون لوگ تھے؟ سب لوگ تو جا چکے تھے؟ وہ تجسس کو لیے جب باہر آئی تو غیر ارادی طور پر پورے گھر پہ نگاہ ڈالی۔

چھوٹے سے صحن میں چھوٹی سی برائے نام باؤنڈری دیوار کے پار بھی ایک گھر آباد تھا۔ عالیشان سا، چونکاتا ہوا۔ زعیم کی تنک چڑھی تائی کا گھر۔

اس نے بے ارادہ ہی ان کے صحن میں جھانکا۔ وہاں پہ ایک مونچھوں کو تاؤ دیتا ”جٹ“ دکھائی دیا۔ جو اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر جانے کیوں مسکرایا تھا۔ انزلہ کو اس کی مسکراہٹ بہت بری لگی تھی۔ اسی لیے وہ جھپاک سے باورچی خانے میں گھس گئی۔

اماں انزلہ پہ نگاہ پڑی تو حیران رہ گئیں۔

وہ بھی تھوڑا کنفیوز سی اردگرد پہ نگاہ ڈالتی رہ گئی۔ صاف ستھرا باورچی خانہ تھا۔ شیلف پہ برتن سجے تھے۔ ایک کونے میں گیس کا سلنڈر اور چولہا تھا۔ جس میں آگ جل رہی تھی۔ اماں کو شاید اسی پہ ہانڈی چڑھانی تھی۔ قریب ہی دیچی میں گھی ڈال کر کٹی ہوئی پیاز رکھی تھی۔

انزلہ کو ہول اٹھے تو کیا وہ لکڑیاں جلائے گی؟ اسے رہ رہ کر ادیبہ کا خیال آ رہا تھا۔ کیا ٹھاٹ تھے اس کے۔ کہاں وہ چھوٹے سے دیہات سے اٹھ کر ہاسٹلوں میں رہی۔ ماسٹرز کیا اور پھر ایک بڑے شہر میں بیاہ کر چلی گئی۔ اپنی اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے۔ کہاں انزلہ محلوں سے اٹھ کر جھونپڑی میں آ پڑی تھی۔

اسے اپنی قسمت کے خراب ہونے پہ پھر سے رونا آ گیا تھا۔

کہاں اس کا بزنس مین شوہر اور کہاں یہ پاک فوج کا جوان۔ ماہوار تنخواہ لینے والا، جس کی ناک پہ غصہ ہمہ وقت دھرا رہتا تھا۔ اور ہتھ چھٹ اتنا کہ بات بعد میں کرتا، گھونسا پہلے دے مارتا۔ اس کے بھائی سب اس کے ”رعب“ میں تھے۔ آ خر اسم بامسمّیٰ تھا۔ جانے زعیم صاحب کس بات کے ”زعم“ میں مبتلا تھے۔

اس نے کچھ الجھ ہو کر دوبارہ سے صحن میں پچھلی شام کو دیکھا تھا۔ چھوٹی دیوار کے پار عالیشان خوب صورت بنگلہ تھا۔ جدید طرز پہ بنا ہوا۔ آخر اس نے پہلے کیوں نہیں دیکھا تھا؟ شاید وہ خود میں ہی اتنی مگن تھی کہ کھلی کھڑکی سے اب منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ چھوٹی دیوار کے پار اب مونچھوں والا کوئی آدمی نہیں کھڑا تھا اس لیے وہ خاصی فرصت سے بنگلے کو دیکھ سکتی تھی۔ ایک چھوٹے سے دیہات میں اتنی خوب صورت رہائشی عمارت؟ وہ خاصی متاثر ہو گئی تھی۔

اماں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور گہرا سانس بھر کے رہ گئیں۔

”زعیم کی تائی کا گھر ہے۔ اس کے تایا نے کویت میں بڑا پیسہ کمایا۔ ہمارے سارے خاندان میں سب سے آگے بھائی جی نکل گئے۔ بیٹے بھی دو جمع چار کرنے والے تھے۔ دونوں نے باوا کے کمائے پیسے سے کاروبار چلائے۔ ڈیری فارم، چکن شیڈ، مین بازار میں بڑا سا پلازہ کھڑا کر لیا۔ ادھر گھر بنایا۔ پڑھائی میں دماغ نہیں چل سکا مگر کاروبار بڑا چمکایا۔ تمہارے ابا جی (مراد زعیم کے والد تھے) سادہ لوح انسان تھے۔ بھائی جی والی تیزی طراری نہیں تھی۔ حساب کا کمایا، کھیتی باڑی کی۔ آمدن سے بچے پڑھائے لکھائے۔ آج اپنے باپ کا نام روشن کر رہے ہیں ماشاءاللہ۔

بھابھی جی کا مزاج بڑا تیز ہے۔ کافی عرصے سے ناراضی چل رہی تھی۔ رشتوں پہ جھگڑا تھا۔ بس ہم لوگ سمجھتے نہیں، رشتے ناتے آسمانوں پہ لکھے ہیں زمین پہ جھگڑے بنا بیٹھتے ہیں۔

تمہاری شادی پہ کوئی بھی نہیں آیا۔ سوائے بھابھی جی کے اور وہ بھی بس گھڑی دو گھڑی کے لیے۔ بہوؤں کو بھی نہیں لائیں۔ چلو خیر ہے۔ وقت گزر گیا۔“ ان کی تقریر کو انزلہ نے خاصی بے دھیانی سے سنا تھا۔ اس نے برابر والے بنگلے سے نگاہ ہٹالی تھی۔

”رومانہ کی نند، بھابھی جی کی بہو ہے۔ رومانہ اپنی پھپھی کے گھر بیاہی تھی۔ بڑی تنگی تھی وہاں۔ میری بچی نے بڑا مشکل وقت دیکھا...... بڑا مشکل گزارا کیا۔ پھر رضیہ نے ضد لگالی۔ ہم ادلی کا رشتہ لیں۔ بس تمہارے ابا جی نہیں مانے۔ بچے بھی نہیں مان

رہے تھے۔ رومانہ پہ رضیہ نے زندگی تنگ کر دی۔ ہر لحاظ سے ستایا ہر حربہ آزمایا۔ پر تمہارے ابا جی اور رومانہ ڈٹ گئے۔ نہ علیم کے لیے رشتہ لیا نہ زعیم کے لیے...... علیم کی صدف سے کر دی اور زعیم کے لیے تمہیں لے آئے۔ تب سے لے کر اب تک رضیہ نے ہم سے سارے تعلقات ختم کر لیے ہیں۔ ادی کی شادی اشفاق سے کر دی۔ اشفاق، بھائی جی کا بیٹا ہے۔" انہوں نے برابر گھر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

رومانہ کی نند اب تایا جی کی بہو تھی۔ اس کی چھوٹے ماموں کے گھر نہیں بلکہ بڑے ماموں کے گھر شادی ہو گئی تھی۔

"ہاں، تو اچھی جگہ ہو گئی نا...... یہاں آ کر آگ ہی جھونکنی تھی۔ نوکروں کی طرح کام ہی کرنے تھے۔" انزلہ نے کلس کر سوچا۔ نگاہ بے ارادہ ہی برابر کے گھر کی طرف اٹھ گئی تھی۔ کیا ٹھاٹ تھے وہاں کے۔ اس عالیشان گھر کے سامنے تو یہ گھر سرونٹ کوارٹر لگ رہا تھا۔

تب ہی اذان ہو گئی...... اور اماں ساری باتوں، کام اور ہانڈی کو چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھ گئیں۔

"میں نماز ادا کر کے آتی ہوں پتر!" انہوں نے گھٹنوں پہ بمشکل ہاتھ رکھے اور کراہتی ہوئی اٹھ گئیں۔ انہیں واقعی گھٹنوں کی شدید تکلیف تھی۔ ان کی آہ و بکا پہ انزلہ نے کان نہیں دھرے تھے۔ بلکہ اسے سبزی کی ٹوکری پہ غصہ آ رہا تھا۔

"کیسے بہانے سے اٹھ گئی ہیں۔ اب میں کیا کروں؟ اوف ان لکڑیوں پہ آگ جلاؤں کیا؟"

"یہ تھی میری قسمت؟" وہ سسک اٹھی تھی۔

"آہ ادیبہ! تم نے مجھے کتنا بغاوت پہ اکسایا تھا مگر میں بھی کیسی احمق نکلی...... امی اور آپی کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو گئی...... اور آج اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔ آج کروں گی تم سے بات کتنے دنوں سے تم نے بھی کال نہیں کی۔" وہ ادیبہ سے تصور میں مخاطب تھی۔

وہ سبزی کی ٹوکری کو اٹھا کر مٹر چھیلتی سوچوں میں گم تھی جب کوئی اچانک اندر داخل ہوا تھا۔ انزلہ نے بے ارادہ ہی دیکھا اور چونک گئی۔ آنے والا زعیم تھا۔ اس نے ایک ڈرم اٹھا رکھا تھا۔ شاید وہ ڈیرے سے آیا تھا۔

زعیم نے شیلف سے ایک بڑا پتیلا اتار کر ڈرم کھولا، اس سے دودھ الٹ کر پتیلے میں ڈالا اور کسی ماہر خاتون خانہ کی طرح پتیلا آگ پہ چڑھا دیا...... پھر اس نے چولہے میں لکڑیاں سیٹ کر کے آگ بھی جلا دی تھی۔ وہ یہ کام بڑی مہارت کے ساتھ کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو ہونق بنی انزلہ پہ نظر پڑی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے زعیم کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی حیران آنکھوں میں جھانک کر سنجیدگی سے بولا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"یہ سب؟" اس کا اشارہ آگ اور دودھ سے بھرے پتیلے کی طرف تھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔" زعیم نے کندھے اچکائے۔ "ابھی تم اور دیکھو" اس نے سبزی کی ٹوکری گھسیٹ لی تھی۔

"ہماری آپا ہمارے بچپن میں بیاہی جا چکی تھیں۔ ہم چھوٹے تھے اور اماں بیمار رہتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ہم لوگوں نے سب کچھ سیکھ لیا جو رہ گیا تھا۔ وہ فوج نے سکھا دیا۔" وہ اتنے نارمل انداز میں بول رہا تھا کہ انزلہ کو غش آنے لگے۔ کیا یہ وہی زعیم تھا؟ اسے شادی کی رات یاد آئی تھی۔ بلاشبہ وہ اس کی زندگی کی خوفناک رات تھی۔

انزلہ نے بے ساختہ جھرجھری لی۔ وہ جو بغور اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے چونک گیا۔ اس کے ہونٹوں پہ خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ اس کی سوچوں میں گھس گیا تھا۔ انزلہ کو خود پہ بھی غصہ آ گیا۔ پھر وہ سبزی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ مٹر چھیل رہا تھا۔ انزلہ نے گاجریں کاٹنی شروع کیں۔

"تمہیں کھانا بنانا نہیں آتا؟" کچھ دیر بعد زعیم نے پوچھا۔ اس کا انداز طنزیہ نہیں تھا۔ انزلہ کو اس کے

سادہ انداز پہ حیرت ہوئی تھی۔

"آتا ہے۔" انزلہ کو مرے مرے انداز میں بتانا پڑا۔ سوچا تھا، جھوٹ بول دے۔ لیکن پھر منہ سے "سچ" ہی نکل سکا۔

"ویٹس ویری گڈ۔" وہ بے ساختہ خوش ہو گیا تھا۔

"لیکن میں یہ سب نہیں بنا سکتی۔" انزلہ نے اسے زیادہ خوش ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔ زعیم کچھ چونکا۔ پھر اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ جیسے بات سمجھنا چاہتا ہو۔ پھر اس نے بات سمجھ بھی لی تھی۔

"او...... سنیے محترمہ! ہم اٹالین، چائنیز، انگلش کھانے نہیں کھاتے...... سادہ خوراک ہے ہماری، روٹی سالن، کبھی چاول، تو کبھی حلوہ وغیرہ...... یہ [illegible] کوکنگ یہاں مت آزمانا۔" اس نے خاص طور پہ تنبیہہ کی تھی۔

"مگر یہ سادہ کوکنگ مجھے نہیں آتی۔" اس نے بے رخی سے کہا تھا۔

اتنی جلدی وہ کچھ بھی بھلانے والی نہیں تھی۔ خاصی کینہ پرور اور منتقم مزاج واقع ہوئی تھی۔ زعیم کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ ابھی تک گلے پہ اس کے ہاتھوں کا دباؤ پڑتا محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ اب دم گھٹا کہ گھٹا۔

"کچھ مشکل نہیں، سیکھ جاؤ گی۔" زعیم کا انداز لاپروا قسم کا تھا۔

"ہونہہ، سیکھ جاؤ گی۔" اس نے دانت کچکچائے تھے۔

"ویسے تم شہری "ریڈی میڈ" لوگ فاسٹ فوڈ کو بڑی خوراک سمجھتے ہو۔ تب ہی یہ بلڈ پریشر اور کولیسٹرول ہائی کی بیماریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اصل طاقت تو روٹی میں ہے۔ بندہ جتنا مرضی میکرونی، پاستا یا چائنیز فوڈ کھا لے۔ بھوک تو روٹی سے مٹتی ہے۔"

"کبھی چائنیز کھایا جو نہیں تمہیں کیا پتا چائنیز فوڈ کیا بلا ہوتی ہے۔" اس نے حسب معمول دل ہی دل میں کلس کر کہا تھا۔

"میں جب کلر کہار کیڈٹ کالج میں تھا۔ تب ہمارا جس دن "چائنیز" میس ہوتا تھا۔ اس رات ایک بجے ہی پیٹ میں چوہے کودنے لگ جاتے تھے۔ صبح تک آنتیں باہر نکل آتیں۔ اللہ اللہ کر کے صبح ناشتہ ملتا تھا۔ ہم دیسی پراٹھے کھانے والے کہاں چائنیز پہ اکتفا کر سکتے تھے۔ چائنیز تو یوں معدے میں اترا یوں ہضم ہوا۔"

زعیم نے چٹکی بجائی اور چھلکوں کا ڈھیر کوڑے میں الٹ آیا۔ وہ بڑے سلیقے سے کام کر رہا تھا۔ جو پلیٹ گندی کرتا، فوراً دھوتا۔ جو ٹوکری گندی ہوتی فوراً صاف کرتا۔ یوں کچن میں کوئی بھی پھیلاوا نہیں تھا۔ وہ بڑے اچھے سے کوکنگ کر رہا تھا۔ انزلہ دل ہی دل میں بہت متاثر ہوئی تھی۔

اور ایک وہ خود تھی۔ چائے بنانے بھی کچن میں جاتی تو سو برتن گندے کر آتی۔ چائے چولہے پہ بھی گرتی، فرش پہ بھی...... اور اس نے کپڑا مار کر صاف کرنے کا کبھی تردد نہیں کیا تھا۔ چاہے امی پیچھے سے کتنی ہی جھڑکیاں دیتی تھیں۔ اس نے کبھی امی کی جھاڑ پہ کان نہیں دھرے تھے۔

"ہماری اماں اور آپا غضب کی صفائی پسند ہیں۔ اماں سے اب کام نہیں ہوتا۔ ہمارا گھر شیشے کی طرح چمکتا تھا۔ جبکہ ہماری تائی اور اکلوتی پھوپھی بہت پھوہڑ خواتین تھیں۔ بالکل تمہاری طرح کی۔" زعیم نے بولتے بولتے انزلہ کی طرف رخ کیا تو وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"اب میں نے کیا کر دیا" وہ تڑخ کر بولی۔

"جو کیا...... وہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔" زعیم نے آلوؤں اور گاجروں کے چھلکوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ انزلہ کے قدموں میں چھلکوں کی ایک پہاڑی کھڑی تھی۔ وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو گئی۔ چھلکے اٹھانا بہت محال لگ رہا تھا۔ اس کا تذبذب محسوس کر کے زعیم نے خود ہی چھلکے اٹھا لیے۔

اب وہ سلنڈر آن کر کے گیس کے اسٹو پہ ہانڈی رکھ رہا تھا۔

"آگ دودھ کے لیے جلائی جاتی ہے۔ اگر دودھ اس چولہے پہ "کاڑھا" جائے تو سلنڈر ایک

ہفتہ بھی نہ نکالے۔ ارجنٹ چائے بنانی ہو یا تھوڑا سا کھانا پکانا ہو، تب اس چولہے کا استعمال کیا کرو۔'' وہ ساتھ ساتھ ہدایات بھی جاری کر رہا تھا کہ بلا ضرورت وہ ''فضول خرچی'' سے بھی پرہیز کرے۔ یعنی آگ جلانے کی بھی ٹریننگ حاصل کرے۔ انزلہ نے تو یہی اس کی بات سے مفہوم اخذ کیا تھا۔

''اب یہاں آ جاؤ تم، مسالا تیاری کے قریب ہے۔ اس میں کٹی ہوئی سبزیاں ڈال کر بھون لو۔ پھر سالن کو دم پہ رکھنا۔ بعد میں ہری مرچیں اور دھنیا ڈالنا۔ تھوڑا سا گرم مسالا پاؤڈر بھی ڈالنا۔ پھر چولہا دھیان سے بند کر کے ہانڈی اتار لینا...... روٹی آپا بھجوا دیں گی۔ لیکن کل سے تم خود ناشتہ بناؤ گی۔ مجھے آپا کو تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا...... اور ہاں، صبح جلدی اٹھنے کی عادت ڈالو۔ ہم سب صبح خیز ہیں۔

ابا جی کو نہار منہ چائے کی طلب ستاتی ہے۔ اماں سے اتنی سویرے کچن کا کام نہیں ہوتا۔ میں بھی صبح تک نکل جاؤں گا۔ چھٹی ختم ہے۔ اس ویک اینڈ پہ کوئی بھی گھر نہیں آئے گا۔ نہ ہیثم نہ نعیم...... نہ علیم۔

اگلے ویک اینڈ پہ سب اکٹھے ہوں گے تو کام کا بوجھ بھی ہو گا۔ علیم تو دو تین ماہ بعد چکر لگاتا ہے۔ عظیم بھائی بھی جلدی نہیں آ سکتے۔ البتہ ہیثم اور نعیم پندرہ دن بعد گھر آتے ہیں۔

ان کے آنے اور جانے کی تیاری تمہارے ذمے ہے...... یاد رہے یہ ذمہ داری نازو بھابھی اور صدف نے اپنے اپنے ''ٹائم پریڈ'' میں پوری ذمہ داری سے نبھائی ہے۔ جب تمہارا ٹائم پریڈ ختم ہو گا۔ تم بھی آزاد ہو جاؤ گی۔ لیکن ابھی تمہیں اس گھر کی بہو ہونے کا فرض اور حق ادا کرنا ہے۔''

زعیم نے اتنے سلیقے سے بات مکمل کی کہ انزلہ نہ چاہتے ہوئے بھی سننے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ وہ پہلے سا اجڈ زعیم کا سایہ بھی نہیں لگ رہا تھا۔ بڑے تحمل اور طریقے سے بات کر رہا تھا۔ شاید ابا جی، آپا اور اماں کی نصیحتوں کا اثر تھا۔

اسے اپنی طرف ہونقوں کی طرح دیکھتا پا کر آخر میں وہ مسکرا دیا۔

''میں اتنا برا نہیں ہوں۔ جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔''

انزلہ جزبزسی ہو گئی۔

''اور تم بھی ویسی نہیں...... جس طرح میں نے سوچ رکھا تھا۔ بس ہماری ''سمجھ'' کا کچھ قصور تھا۔ جو مس انڈرسٹینڈنگ رہی۔ امید ہے ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔'' اب وہ اپنی روشن آنکھوں میں امید لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

تو گویا کپتان صاحب ''صلح'' کے موڈ میں تھے۔ انزلہ نئے سرے سے سلگ اٹھی تھی۔ دل چاہ رہا تھا۔ مکس سبزی سے بھری ہانڈی اس پہ الٹ دے یعنی انزلہ کی اتنی انسلٹ کے بعد ایک حرف معذرت بھی نہیں۔ اس کی اتنی ہی اوقات تھی۔ وہ مارے غصے اور اہانت کے بھڑ بھڑ جلنے لگی تھی۔

اس کی ''اعلیٰ ظرفی'' کو نظر انداز کرتی ہوئی وہ ایک مرتبہ پھر اپنی ''اکڑ'' میں آ گئی تھی۔ اسے اپنی زیادتی بھول چکی تھی۔ زعیم کا ''ردعمل'' ابھی تک یاد تھا۔

☆☆☆

سرما کے دن تھے۔ لوگ رات کا کھانا کھا کر مغرب کے بعد ہی لحافوں میں گھس جاتے تھے۔ اس چھوٹے سے دیہات میں دو ہی ''قابل توجہ'' چیزیں تھیں۔

ایک اس کے سسر چوہدری نذر عباس کے پانچ عدد سپوت اور دوسرا سسر صاحب کے بڑے بھائی کا عالیشان بنگلہ...... باقی سب تو فضول ہی تھا۔

یہ اس کی پہلی سوچ تھی، باورچی خانے کی کنڈی چڑھانے کے بعد، باورچی خانہ صحن میں تھا۔ جس کے آگے برآمدہ اور پھر رہائشی کمرے تھے۔

انزلہ کو شدید ٹھنڈ میں پھریری آ گئی تھی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور جلدی سے ساس کے کمرے میں آ گئی۔ انہیں چائے دے کر ان کی ڈھیروں دعائیں سنے بغیر اس نے ابا جی کو چائے بیٹھک میں پہنچائی تو اسے یاد آیا...... آج کے کاموں کی لمبی فہرست میں رات کو زعیم کے لیے دودھ بھی گرم کرنا تھا اور دودھ

کے ساتھ انگوری بھی...... آخر تھے نا دیسی لوگ، دیسی خوراک کے بغیر کہاں گزارا تھا۔

دیسی گھی اور باداموں سے گندھی سوہن حلوے ٹائپ کی یہ انگوری ذائقے میں بہت ہی لذیذ تھی۔ وہ انگوری کی مہک کو اندر اتارتی دودھ گرم کر کے اندر آئی تو تب تک زعیم بھی کمرے میں آ چکا تھا۔

''میں تمہیں اس روپ میں دیکھ کر ''مر'' نہ جاؤں۔ یقین نہیں آتا کہ یہ کنیزانہ روپ تمہارا ہے۔'' زعیم دودھ کا مگ پکڑ کر شرارتاً بولا تھا۔ اسے انزلہ کا وہی پہلے والا مغرور اکڑا اکڑا انداز یاد آیا۔ انزلہ جیسے خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔

''کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آنٹی کی خاطر یہ سب کرنا پڑا۔ وہ اتنی ٹھنڈ میں کہاں لحاف سے باہر آ کر دودھ گرم کرتیں عالی جاہ کے لیے۔'' بالآخر انزلہ نے اسے منہ توڑ جواب دے کر جتلا ہی دیا تھا کہ وہ جو کر رہی ہے بادل نخواستہ کر رہی ہے۔

''اچھا ہوا تم نے جلد ہی بتا دیا...... میں ایویں تم پہ ''لٹو'' ہو رہا تھا۔ اپنی تعریف واپس لیتا ہوں۔'' زعیم نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔

''ویسے اگر تم اماں کو ''آنٹی'' نہ کہو تو اچھا لگے گا۔'' ساتھ ہی اس نے انزلہ کو جتا بھی دیا۔

''ہونہہ، میں کیوں تمہاری اماں کو اماں کہوں......'' اس نے دل ہی دل میں غصہ اتارا لیکن جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''اچھا، چھوڑو، لیٹس چینج دی ٹاپک۔'' زعیم نے ''خوشگواریت'' کا دامن ہرگز نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے شاید ارادہ کر لیا تھا وہ اس کی کسی بھی بات پہ فی الحال برا نہیں مانے گا۔

انزلہ نے ناگواری چھپا کر بال کھولے۔ وہ روزانہ بالوں میں رات کو برش کرتی تھی اور چہرے کا مساج بھی۔ کھانے میں ناغہ ہو سکتا تھا مگر حسن نکھارنے میں نہیں۔ زعیم دودھ کے گھونٹ بھرتا ہوا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف پشت کیے، اس کی باتوں پہ دھیان دیے بغیر مگن سی اپنے کام میں لگی رہی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے صوفے کی طرف رخ کیا تھا۔ بال پشت پہ لہرا رہے تھے۔ اس نے سمیٹنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ زعیم کو الجھن ہونے لگی۔ وہ دن بھر بال کھلے رکھتی تھی۔ نہ پونی لگاتی تھی نہ کیچر...... اسے الجھن بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بہن ایسی نہیں تھیں۔ انہوں نے تو کبھی دوپٹہ سر سے نہیں اتارا تھا اور انزلہ نے کبھی لیا نہیں تھا۔

''انزلہ......'' اس کی پکار میں محسوس کی جانے والی ''نرمی'' تھی۔

انزلہ اس طرز تخاطب پہ ذرا کی ذرا چونکی۔ پھر اس نے ''کیا'' کہنے کا تکلف نہیں کیا تھا بلکہ ایک ابرو اچکا کر اشارتاً پوچھا ''کیا؟''

''یہاں آؤ......'' زعیم کی فرمائش پہ انزلہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''جو فرمانا ہے۔ ادھر ہی سے فرما دیں، کان رکھتی ہوں، اونچا نہیں سنتی۔'' کچھ دیر بعد انزلہ نے تڑخ کر جواب دیا تھا۔ زعیم برا ماننے کے بجائے ہنس دیا۔

''اللہ...... اللہ، اتنا ایٹی ٹیوڈ۔'' اس نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ''ویسے فرمانا تو بہت کچھ تھا۔ اگر تم موقع فراہم کرو تو...... بات دراصل یہ ہے کہ میں اتنے فاصلے سے کچھ ''فرما'' نہیں سکتا۔ قریب آؤ گی تو بات اچھی طرح سے سمجھا دوں گا۔''

''سوری، میں چل نہیں سکتی۔'' اس نے صوفے پہ دونوں ٹانگیں رکھ کر کمبل خود پہ لپیٹا۔ زعیم لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

''ماشاءاللہ، سے میری سماعت کیا سن رہی ہے؟ یقین نہیں آتا؟ ویسے آپ چل نہیں سکتیں تو میں خادم کس لیے ہوں۔ کیا اٹھا کر لے جاؤں۔'' وہ شرارتاً اپنی جگہ سے اٹھا تو انزلہ اسپرنگ کی طرح اچھل پڑی۔

''ارے نہیں...... نہیں، آتی ہوں میں۔'' وہ

اتنی تیزی سے اٹھی تھی جیسے ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو وہ اپنے ارادے پہ عمل کر گزرتا۔

دو تکیے پیچھے رکھے، دونوں ہاتھ بھی سر کے پیچھے باندھے، اسے دیکھ رہا تھا گرم نگاہوں سے اور لبوں پہ میٹھا میٹھا تبسم مچل رہا تھا۔

انزلہ پائنتی پہ بمشکل ٹکی تھی۔ پھر سلگتی نگاہوں سے زعیم کو دیکھ کر منہ پھاڑ کر کہا۔

”اب بولیں بھی۔“ وہ بری طرح سے چڑی ہوئی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ”اب بکو بھی“۔

زعیم بھی جان بوجھ کر اسے ”زچ“ کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ اس کی ”بے بسی“ زعیم کو بڑا لطف دے رہی تھی۔ وہ جان کر منہ بند کیے اسے آنکھوں سے ”ستا“ رہا تھا، گہری گہری نگاہوں سے دیکھ کر۔

”کیا بولوں؟“ اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر بڑی معصومیت سے پوچھا تھا۔

”جس کے لیے بلایا ہے۔“ انزلہ نے منہ بنا کر جتلایا۔ زعیم جیسے کھل کر مسکرایا تھا آنکھوں میں معنی خیز سی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”او..... تو بڑی جلدی ہے کیا؟ اتنی بھی کیا بے صبری۔“ اس کا انداز صاف تاؤ دلانے والا تھا۔

اس نے ہونٹ بھینچ کر بمشکل غصہ ضبط کیا۔

”واٹ ڈز اٹ مین.....“ اس کے تیور خاصے خطرناک تھے۔ زعیم نے جان بوجھ کر ڈرنے کی اداکاری کی۔

”پھر وہی جلد بازی؟ کیوں اتاؤلی ہوتی ہو۔“ زعیم نے جیسے انزلہ کو پچکارا۔

زعیم نے اس کا ارادہ بھانپ کر پھرتی سے اٹھ کر اسے قابو میں کیا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ فوراً ہی گھبرا گئی۔

”میری نیندیں چرا کر..... میں تو بڑا منتقم مزاج ہوں۔ فوراً ادلے کا بدلہ لیتا ہوں۔ اب تمہاری ”نیند“ چراؤں گا۔ تب ہی تو ”چین“ پاؤں گا۔“ اس کا کہتا، کچھ بولتا لہجہ، واضح اشارے دے رہا تھا۔

پہلی مرتبہ انزلہ کا دل بڑے ہی زور زور سے دھڑکا تھا۔ وہ بری طرح سے گھبرائی، تلملائی۔

کہیں دور ادیبہ کی نصیحتیں اور تنبیہہ ”رکاوٹ“ کھڑی کر رہی تھیں۔

”خود کو بچا کر رکھنا۔ یہ دیہاتی بڑے اجڈ اور بدتہذیب ہوتے ہیں۔“ شاید وہ اپنے ”تجربوں“ کی آڑ میں اسے چوکنا کرتی تھی۔ دیہاتیوں کے بارے میں اس سے بہتر بھلا کون جانتا تھا؟

اور ایک ادیبہ ہی تو تھی۔ اس کے دکھ، درد کو سمجھنے والی۔ اس پہ ٹوٹنے والی قیامت کا حال جاننے والی۔ باقی اس کے اپنے تو اسے ایک بوجھ کی طرح اتار کر پھینک کے خود چلے گئے تھے۔ اپنی زندگیوں میں مگن ہو چکے تھے۔

وہ گھبراہٹ میں خود کو چھڑاتی ذرا دور ہٹی تھی لیکن زعیم نے اس کی کمزوری کوشش ناکام بنادی تھی۔

”کیوں بھاگ رہی ہو؟“ اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔

انزلہ کی گھبراہٹ دوچند ہوگئی۔

”آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟“ انزلہ نے بمشکل اپنا بکھرتا اعتماد یکجا کیا تھا۔ وہ اس کے سوال پہ چونک گیا۔

”مسئلہ تو ہے نا..... تم حل کر دو۔“ اس کی جھنجلاہٹ پہ زعیم نے کان نہیں دھرے تھے۔

”کک کیا ہے؟“ انزلہ حواس باختہ تھی۔

”تم نے میرا دل چرا لیا ہے..... چین چرا لیا ہے..... پورے کا پورا زعیم چرا لیا ہے۔ ابھی بھی پوچھتی ہو۔ مسئلہ کیا ہے؟“ اس نے انزلہ کو باتوں کے گھیرے میں یوں لیا کہ وہ پہلی مرتبہ لاجواب ہوگئی تھی۔ پھر زعیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ چاہ کر بھی مزاحمت نہیں کر سکی تھی۔

”آپ پاگل ہو چکے ہیں۔“ اس نے تڑپ کر کہا۔

”تم نے کر دیا ہے۔“ زعیم کی آواز نرم اور بوجھل تھی۔ جذبات کی تپش سے اس کے گال بھی تپ رہے تھے۔ سرخ، آگ سے انزلہ کو نگاہ اٹھانی محال تھی۔ اس نے بمشکل اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

”چھوڑیں بھی مجھے۔“

”کیوں چھوڑوں؟“ زعیم نے جیسے اپنے دل کی بات اس تک پہنچائی تھی۔ انزلہ چپ سی رہ گئی۔ ہونٹ کاٹتی وہ خاصی خفیف تھی۔

وہ یہ بات سوچ ہی نہیں رہی تھی کہ اگر زعیم نے فاصلے بڑھانے میں اس کے وجود کی نفی کر دی تھی تو اب فاصلے مٹانے میں بھی تو پہل وہی کر رہا تھا۔

وہ اس کا ”گریز“ سمجھ رہا تھا۔ یہ گریز حیا پہ محمول نہیں تھا۔ وہ کافی دیر اس کے ناگوار تاثرات کا مطالعہ کرتا رہا۔ وہاں پہ غصہ تھا اور عجیب سی بیزاری بھی..... غصہ سمجھ میں آتا تھا۔ بیزاری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

ویسے بھی زعیم نے اب تک انزلہ کے روّیے اور مزاج سے اخذ کیا تھا کہ محترمہ یونی ورسٹی کی فارغ التحصیل ضرور ہیں مگر عقل کے معاملے میں قطعاً کوری ہیں۔ انتہائی بیوقوفانہ قسم کی ”اکڑ“ تھی اس میں۔

اب اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟

انزلہ کو اس کے حال پہ چھوڑ دیتا اس کی مرضی اور ”رضا“ پہ چھوڑ دیتا یا پھر اس کے ساتھ زبردستی کا مظاہرہ کر کے اسے ”جتا“ دیتا کہ وہ اپنی پرانی اکڑ اور روش کو بھول جائے۔ یہ اس کے شوہر کا گھر ہے باپ کا نہیں۔

وہ کافی دیر سوچ ”بچار“ کے بعد دھیمے انداز میں مسکرایا۔ تب تک وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر واپس کمبل میں غروب ہو چکی تھی۔

وہ کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ پھر الماری میں کچھ دیر تک کھٹ پٹ کرتا رہا۔ انزلہ کمبل کے نیچے اس کی ساری ”مصروفیت“ پہ کان دھرے ہوئے تھی۔

کچھ دیر بعد اسے قدموں کی چاپ قریب سنائی دی تھی۔ اس کا دل کانوں میں دھڑکنے لگا۔ ادیبہ نے اسے سمجھایا تھا اگر وہ اس شادی کو قائم نہیں رکھنا چاہتی تو کبھی بھی اپنے ”اجڈ شوہر“ کو ”اپنانے“ کی کوشش نہ کرے۔

اور اس نے ادیبہ سے خود کہا تھا۔

”میں بھائیوں اور امی کے سامنے وقتی طور پہ ”بے بس“ ضرور ہو چکی ہوں مگر میں کبھی بھی روشنیوں کے اس شہر کو چھوڑ کر اسی چھوٹے سے دیہات میں — نہیں رہ سکتی مائی فٹ میرے لیے وہ دیہاتی رہ گیا تھا۔“

یہ تب کی بات تھی جب اس کا نیا نیا رشتہ زعیم سے جڑا تھا۔ وہ غم و غصے اور نفرت وحقارت کی انتہا پہ تھی۔ تب ادیبہ بھی اس کا برابر ساتھ دیتی تھی۔ گو کہ وہ خود بھی دیہاتی ماحول کی پروردہ تھی مگر پھر بھی ایک لمبا عرصہ شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب اس کی شادی ایک ”ان پڑھ“ مرد سے ہوئی تب ادیبہ کس قدر پریشان تھی۔ گو کہ اس کا سسرال معاشی طور پر مضبوط تھا۔ ادیبہ جیسی نفیس لڑکی کے کتنے ہی خواب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنا جس سے مزاج ہی نہ ملتا ہو کس قدر اذیت ناک تھا۔

جب انزلہ نے اسے رو رو کر بتایا کہ ”میرے بھائیوں نے مجھ سے جان چھڑانے کے لیے ایک دیہاتی، پینڈو، ان پڑھ اور اجڈ شخص کے پلے باندھ دیا ہے تب ادیبہ نے تڑپ کر اسے اپنے بھیانک تجربے کی روشنی میں سمجھایا تھا۔

”تم انکار کر دو انزلہ! میں جانتی ہوں۔ تم کبھی بھی کسی گاؤں میں سروائیو نہیں کر سکتیں..... تم خود کو اندھے کنویں میں مت گراؤ۔“

بہت مشکل سے ہی سہی مگر وہ اپنے قطعاً بدتہذیب شوہر کے ساتھ زندگی کی گاڑی کو چلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس دوران وہ خود کیا سے کیا ہو چکی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ انزلہ کو اس ”آبلہ پائی“ کے سفر سے روکنا چاہتی تھی۔

جب انزلہ کی ہزار کوششوں کے بعد زعیم سے شادی ہوگئی تب ادیبہ کی ایک اور بات اسے یاد آئی تھی۔

”فرض کرو تمہاری شادی ہو جاتی ہے تو خدارا، کبھی اس موڑ پہ اپنے آپ کو مت لے آنا جہاں بچے تمہارے پیروں کی زنجیر بن جائیں۔ میں تمہاری نیچر سمجھتی ہوں۔ تم کسی طور کمپرومائز نہیں کر سکتیں تو بہتر ہے کسی انتہائی

فیصلے سے پہلے تم اپنے شوہر کو اپنے سے فاصلے پہ رکھو۔ تاکہ راہیں جدا کرنا تمہارے لیے آسان ہو۔"

ادیبہ جیسے اس کے قریب بول رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر زعیم کی طرف دیکھا۔

"کک، کیا ہے؟" انزلہ کے حواس بے قابو تھے۔ رنگ اڑ رہا تھا۔

"یہ......" زعیم نے اپنے ہاتھ کو سامنے کیا۔ مٹھی ابھی بند تھی۔ اور وہ بند مٹھی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح زعیم کو دیکھنے لگی۔

اس نے مٹھی کو ذرا سا کھولا تو نیچے سے ایک خوب صورت مالا پھسل کر ہاتھ میں لٹک گئی تھی۔ وہ مبہوت سی خوب صورت مالا کے موتیوں کو دیکھتی رہ گئی۔

"یہ تمہاری رونمائی کا تحفہ جو اس رات بدمزگی کی نذر ہو گیا تھا۔ اینی وے یہ تمہارا تھا۔ تمہارا ہے۔ تمہارے لیے خریدا تھا...... میں پہنا دوں؟" اس کا کھنکتا لہجہ بہت سرشار تھا۔ وہ اس سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

انزلہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ گپ چپ، خاموش، مہر بہ لب...... اس کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا...... نہ وہ مزاحمت کر سکی...... نہ اسے جھٹلا سکی۔

دراصل زعیم کی پراثر شخصیت کا رعب ہی ایسا تھا وہ اس کے حواسوں پہ ہی نہیں، اس کی ذات پہ بھی چھاتا چلا گیا تھا۔ یوں کہ اس کی ظاہری سی مزاحمت بھی رک کر دم توڑ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح بہت نکھری اور شفاف تھی...... کم از کم زعیم کو تو بہت شفاف لگ رہی تھی۔ حالانکہ باہر قیامت کے بادل تھے۔ موسم اچانک بدلا اور پورا آسمان بادلوں سے ڈھک گیا۔

زعیم کو آج جانا تھا۔ وہ بڑی سست روی سے پیکنگ کر رہا تھا۔ انزلہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی شرٹس کے ڈھیر استری کے بعد بیڈ پہ رکھ رہی تھی۔ جسے ایک کے بعد ایک کر کے وہ اپنے بیگ میں ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ کمرے میں معنی خیز سی خاموشی چھائی ہوئی تھی جسے کچھ دیر بعد زعیم کی آواز نے توڑا تھا۔

"خواہ مخواہ اتنے دن ضائع کیے۔ بے کار کی جھوٹی انا میں۔ ساری چھٹی کا بیڑہ غرق کر دیا۔" زعیم کی افسوس میں ڈوبی آواز ابھری تو انزلہ بھی چونک سی گئی۔ معنی خیز انداز میں مسکراتا وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

"تو کس نے جھوٹی انا کا پرچم بلند کیے رکھا۔" انزلہ نے تیکھی نظر سے اسے دیکھا تو وہ سستی کے ساتھ کپڑوں کے ڈھیر کو پیچھے ہٹا کر خود بیڈ پہ نیم دراز ہو چکا تھا۔

"تم نے......" زعیم نے آرام سے کہا۔

"میں نے......" وہ اس الزام پہ تڑپ اٹھی تھی۔

"ہاں تو۔" زعیم نے خواہ مخواہ جمائی لی تھی۔

"میری دس چھٹیاں تم نے برباد کیں۔" زعیم کا قلق ہی نہیں ختم ہو رہا تھا۔ انزلہ کا نہ چاہتے ہوئے بھی موڈ اچھا ہو گیا۔ اس نے چور نگاہوں سے بیڈ پہ لاپروائی سے الٹا لیٹے زعیم کی طرف دیکھا۔ اس کے دل نے ہلکی سی ایک بیٹ مس کی تھی۔

"اوں...... ہوں، یہ اتنا بھی برا نہیں...... اسی لیے سب گھر والوں کو پسند آ گیا تھا...... لیکن یہاں کا ماحول۔" وہ لمحہ بھر کے لیے اٹکی تھی۔ پھر سر جھٹک کر زعیم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"انزلہ......" وہ سوچوں میں گم تھی۔ جب زعیم کی پکار اٹھی اس نے بالوں کو جھٹک کر ایک مرتبہ پھر گردن موڑی تھی۔

نرم گرم تاثرات بھک سے اڑ گئے تھے۔

"یہ اس قابل ہی نہیں......" انزلہ بری طرح سے جز بز ہوئی تھی۔ "بدتمیز، انسان......"

"کیا بددعائیں دے رہی ہو اونچا بولو ذرا۔" زعیم کے کان فوراً کھڑے ہوئے تھے۔ انزلہ نے سر جھٹکا۔

"کچھ نہیں کہا۔ وقت دیکھ رہے ہیں آپ بارش بھی ہوا ہی چاہتی ہے۔ سائم کو کال کریں۔ وہ آپ کو اسٹاپ تک چھوڑ دے۔ ابھی اماں گیارہویں مرتبہ پوچھنے آئیں گی کہ آپ تیار ہوئے یا نہیں......؟"

انزلہ نے اسے گزرتے وقت کا احساس دلایا۔ زعیم کو جیسے مطلق پرواہ نہیں تھی۔ اسی طرح لیٹا ٹانگیں جھلاتا رہا۔

"ویسے اندر سے تم بھی چاہتی ہو، میں نہ جاؤں بس منہ سے اقرار نہیں کرتیں۔ کمبخت انا جو آڑے آتی ہے۔ ویسے میں بھی زعیم عباس ہوں۔ لوگوں کی انا کو چاروں شانے چت کر ڈالتا ہوں۔ ایسے بے بس ہوتے ہیں کہ۔" وہ ایک آنکھ میچ کر شرارتاً بولا تو انزلہ مارے توہین کے پھڑ پھڑا کر رہ گئی تھی۔

"میں نے تمہارے "گپ چپ" تاثرات اور مہر بہ لب خواہش کو جان لیا ہے۔ خاموشی کا ایک مطلب "اداسی" بھی ہوتا ہے۔ مطلب تم اداس ہو۔ میرے جانے سے' میرے بغیر تمہیں نیند بھی نہیں آئے گی۔" اس کی چلتی زبان نان اسٹاپ تھی۔ نہ رکنے والی۔ اور سدا کی منہ پھٹ انزلہ دل ہی دل میں تاؤ کھاتی جواب دینے کو مچل رہی تھی۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ تمہیں مجھ پہ غصہ بہت ہے۔ چہرے پہ ناراضی بھی تھی اور ناگواری بھی۔ پھر رات کو کیا ہوا۔ اتنا پگھل کیسے گئیں؟" زعیم اس کے صبر پہ آخری ضربیں لگاتا ایک مرتبہ پھر مسکرایا تھا اور انزلہ کا دل چاہا کہ گرم گرم استری اس کے سر پہ دے مارے۔ انزلہ تو مارے غم و غصے کے بھڑ بھڑ جل رہی تھی۔

"پورا کمینہ ہے آدھا نہیں......" اس نے بالآخر اپنی تپش بڑبڑا کر نکال ہی لی تھی۔

اسے مسلسل "چپ" دیکھ کر زعیم پہلے تو چونکا تھا پھر گردن اچکا کر انزلہ کو دیکھا۔ اس کی پشت پہ کھلے بال مرتعش تھے۔ وہ کپڑوں کو پریس کر رہی تھی۔ اس کی زعیم کی طرف پشت تھی۔ وہ ایک ہی جست میں انزلہ کے برابر آ کھڑا ہوا تھا۔ یوں کہ وہ بے ساختہ چونک گئی تھی۔

"انزلہ!" اس کی پکار میں اتنی مٹھاس تھی کہ انزلہ کا سارا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ آخر وہ اسے اتنا بے بس کیسے کر دیتا تھا؟ اور وہ اس کے سامنے کیوں اتنی "نرم" پڑ جاتی تھی، آخر کیوں؟

"جی......" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے یہ کمزور سا "جی" برآمد ہوا تھا۔ وہ اس کی کھلی زلفوں پہ ہاتھ پھیرتا کان کے قریب چہرہ کرتے ہوئے بھی بولا تھا۔

"تمہاری ان مشک فام زلفوں میں میرا دل الجھتا ہے...... خدارا، انہیں سمیٹ کر رکھا کرو۔" اس نے سرگوشی کی تھی۔ تب ہی باہر سے صائم کی آواز پر چونک گیا تھا۔

☆☆☆

انزلہ کو اندازہ ہی نہیں تھا...... زعیم کے چلے جانے کے بعد زندگی ایک دم جمود کا شکار ہو جائے گی۔ یوں لگتا تھا ساری رونق زعیم کے دم سے تھی۔ وہ پورا ہفتہ مزید گزار کے گیا تھا۔ اس نے یونٹ فون کر کے چھٹی بڑھوالی تھی۔

جب وہ چلا گیا تب انزلہ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا۔ اس نے انزلہ کے ساتھ کتنا تعاون کیا اور کتنا خیال بھی رکھا...... وہ ہر کام میں اس کی رہنمائی کرتا تھا۔

گھر کے کاموں کا لمبا چوڑا سلسلہ نہیں تھا...... کیونکہ افراد ہی کم تھے۔ صفائی کے لیے کام والی آتی تھی۔ بس جھاڑو پوچا کرتی اور چلی جاتی۔ ناشتہ انزلہ بناتی کچا پکا سا...... جیسا تیسا، سب ہی نام دھرے بغیر کھا لیتے تھے۔

دوپہر میں تازہ سالن بنتا تھا۔ اور رات کو بھی چاہے سبزی ہوتی چاہے دال۔ تازہ بنائی جاتی تھی۔ زعیم اس کی برابر مدد کرواتا...... اگر وہ مشین لگاتی، کپڑے کھنگالتی تو وہ الگنی پہ ڈال آتا۔ انزلہ استری کرتی اور وہ الماریوں میں سیٹ کرتا۔ حتیٰ کہ کام والی سے صفائی بھی سر پہ کھڑے ہو کر کرواتا تھا۔

زعیم گیا تو انزلہ کو پتا چلا گھر کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے؟

اسے ایک مہینے میں ہی دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ وہ اتنا گھبرائی کے پہلی مرتبہ آپی کو کال کر کے بے بھاؤ کی سنائیں۔

"مجھے دوزخ میں پھینک کر چلی گئی ہیں۔ میری

زندگی جہنم بنا دی۔'' آپی سے طویل جھگڑے کے بعد
ان کی ایک بھی محبت بھری نصیحت سنے بغیر دل کھول کر
امی کو باتیں سنائیں۔ وہ جو بھی ایک بیٹے کے پاس
انگلینڈ جا رہی تھیں اور کبھی دوسرے کے پاس سڈنی۔
انزلہ کا دل کڑھ کڑھ کے جل رہا تھا۔
وہ کہاں ایک دیہات کے ایک چھوٹے سے
گھر میں پڑی تھی اور اس کے بہن بھائی عیش ------
کر رہے تھے۔ اسے رہ رہ کے رونا آ رہا تھا۔
امی اس کے رونے دھونے پہ گھبرا گئی تھیں۔
پھر ان کی نصیحتیں شروع ہوئیں۔ زعیم کی تعریفوں پہ
انزلہ نے اپنے کان بند کر لیے تھے...... پھر غصے میں
کال ہی کاٹ دی۔
کوئی بھی اس کے جذبات نہیں سمجھ رہا تھا۔
سوائے ادیبہ کے۔ اب زعیم نہیں تھا تو وہ کھل کر سب
کو یاد کر سکتی تھی حتی کہ ادیبہ کو بھی۔
امی اور آپی سے بات کر کے دل کی بھڑاس
نکالنے کے بعد اس نے ادیبہ کو بھی فون کر دیا تھا۔ پہلی
مرتبہ ہی کال لگ گئی تھی۔ ادیبہ کا نمبر آن تھا۔ اس کا
دل بلیوں اچھل پڑا۔
انزلہ نے فون لگتے ہی اسے بے بھاؤ کی سنائی
تھیں۔ جواباً پہلے تو وہ لمبی چوڑی ڈانٹ کو سنتی رہی تھی
پھر گہرا سانس کھینچ کر بولی۔
''جانتی تو ہو، میرے میاں کو یہ ٹیلی فونک
رابطے پسند نہیں، شروع میں تو سخت پابندی تھی۔ اب
تو پھر کچھ نہیں کہتے ---- وقت کے ساتھ تبدیلی آ ہی
جاتی ہے'' ادیبہ نے رسانیت سے سمجھایا تو انزلہ نے آہ
بھری...... کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھی۔ وہ بھی کتنا بدل
گئی تھی۔
ڈھیروں فکریں دامن گیر رہتی تھیں اب۔
ابا جی کو چائے دینی ہے۔ اماں کو وقت پہ دوا
...... دودھ ابالنا ہے، صفائی کروانی ہے پھر زعیم کے
لیے لمبے فون لگتا تھا کہ فوج میں اسے فون کرنے کے
سوا کوئی کام ہی نہیں۔ چولہے پہ رکھا دودھ ابل ابل کر
ختم ہی ہو جاتا۔

''تم سناؤ میری جان! کیسی گزر رہی ہے؟ کیا
دل لگا، ایڈجسٹ ہو گئیں تم سسرال میں ......؟''
ادیبہ نے نرمی سے پوچھا تھا۔ انزلہ بس ٹھنڈی آہ بھر
کر رہ گئی تھی۔
''بس یار! کاموں کا انبار ہوتا ہے۔ دن چڑھتا
ہے اور ڈھل جاتا ہے۔'' انزلہ کا لہجہ اداس سا تھا۔
''اگر کمپرومائز کرنے کا فیصلہ کر ہی چکی ہو تو
میری جان یہ رنجیدگی کیوں؟''
''پورا دن کام ہی کتنا ہوتا ہے۔ اکثر آپا آ جاتی
ہیں تو وہی دو تین دن کا سالن بنا جاتی ہیں۔ میرے
ہاتھ کا سالن کھانے سے شاید توبہ کر لی گئی ہے۔ نند
کے بیٹے کی آج کل چھٹیاں ہیں...... وہ پیپر دے کر آ
چکا ہے۔ صبح ناشتہ دے جاتا ہے۔ رات میں روٹی بھی
پہنچا دیتا ہے۔ اور کمپنی بھی دینے کی کوشش کرتا ہے۔
نند بھی اپنے بھائی کے پاس گئی ہے۔ سمجھو، میرا دن
دیواروں کو تکتے گزرتا ہے۔'' انزلہ نے اپنے
معمولات کڑھ کڑھ کر بتائے تھے۔ ادیبہ نے ساری
بات دھیان سے سنی تھی۔ پھر اچانک چونک گئی۔
اس پورے قصے میں انزلہ نے اپنے پینڈو شوہر
کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔
''تو وہ کدھر ہے جسے تم منحوس، اجڈ اور پینڈو کہا
کرتی تھیں؟ تمہارا نکھٹو شوہر؟'' ادیبہ نے بڑی
سنجیدگی سے سوال کیا تو انزلہ اس کے ''نکھٹو'' کہنے پر
تھوڑا کھسیا گئی تھی۔ انزلہ نے یہ القاب زعیم کو خود
دیے تھے۔ اسے یاد تھا...... وہ زعیم کے بارے میں
جانے بغیر کیا کچھ بکواس نہیں کرتی تھی۔
''ادیبہ! وہ پینڈو ہے۔ ان پڑھ، دو جمع چار
کرنے والا، کھیتوں میں ہل چلانے والا۔ میرے
بھائیوں نے مجھے کسی بوجھ کی طرح اتار پھینکا ہے۔''
''وہ ایجوکیٹڈ...... جاب مطلب اپنی جاب پہ''
اس نے اٹک اٹک کر بتا ہی دیا تھا۔ ادیبہ کو اچھا بھلا
شاک لگا۔
''ہیں...... کیا واقعی تب ہی میں بھی کہوں، یہ
کیسے ممکن ہے کہ تمہارے بھائی تمہیں کسی عذاب کی

طرح اپنے سر سے اتار پھینکیں۔ وہ تم پہ اتنا ظلم کیسے کر
سکتے تھے۔ اس لیے مجھے یقین نہیں آیا تھا۔'' ادیبہ
نے گہرا سانس بھر کے جتایا۔
''اس بات کو چھوڑو...... میری زندگی تو عذاب
ہے مجھے یہاں باندھ گیا۔ اپنے ماں باپ کی خدمت
کے لیے سارا دن ''جُتی'' رہتی ہوں۔ کبھی ساس کی
خدمت، کبھی سسر کی...... دل کرتا ہے خود کشی کر لوں
شوہر بھی لاپرواہ۔''
انزلہ کے پاس ہمدردیاں بٹورنے کے بڑے
گر تھے۔ ادیبہ کو ایک مرتبہ پھر ترس آیا تھا۔ کہاں
محلوں میں رہنے والی نازک اندام انزلہ اور کہاں
گاؤں کا ماحول پھر اکھڑ ساس، نندوں اور دیوروں کا
جمگھٹا۔ ادیبہ کو بے پناہ ترس آیا۔
''تم اپنے شوہر سے کہو...... تمہیں ساتھ لے
جائے۔ تم اس کی خاطر آئی ہو۔ اس کے گھر والوں کی
خاطر نہیں۔'' ادیبہ نے ایک اور مخلصانہ مشورہ پیش کیا
تھا۔ جو اسے بے حد پسند آیا۔
''ہائے، یہ مجھے خیال کیوں نہیں آیا پہلے کی
بات اور تھی۔ زعیم نہیں مان سکتا تھا۔ لیکن اب تو ضرور
مانے گا۔ آخر میری محبت کا دم بھرنے لگا ہے۔'' وہ
اس کی سابقہ ''بے قراریوں'' پہ بے ساختہ خوش ہو
کر سوچ رہی تھی۔
''تمہارے لیے گاؤں کے ماحول میں رہنا
دشوار ہو گا۔'' ادیبہ اس کی نازک اندامی کے باعث
کہہ رہی تھی۔
پھر انزلہ بھی ہمدردی پا کر اپنی جٹھانیوں کی
چالاکیاں بتانے لگی۔
''ارے، سوچی سمجھی اسکیم پہ تمہیں یہاں پھنسا
کر چلتی بنی ہیں...... اپنے اپنے شوہروں کو دام میں کر
رکھا ہے۔ اور تمہاری چالاکو نند بھی میٹھی بن کے
مطلب نکال رہی ہے۔ تمہیں چاروں طرف سے گھیر
رہے ہیں۔'' انزلہ کے بتانے پر ادیبہ نے اپنا تجزیہ
پیش کیا تھا۔
''کچھ نہ پوچھو...... میری ساس سگی مامی تھیں۔

سوئی کے منہ سے گزارا ہے مجھے۔ بڑی خواری اٹھائی
پانچ سال میں نے...... نہ شوہر ہم مزاج، ہم
خیال...... نہ قدر کرنے والی سسرال، ساس سیر تھیں
نند سوا سیر۔ جٹھانی سب پہ حاوی۔ اتنے سالوں کی
تپسیا اب کام آئی۔ شوہر نے اچانک باہر آنے کا
پروگرام بنا لیا...... ریاض میں پیسہ لگایا تھا اپنے
کاروبار میں۔ اچھا چل پڑا تو عمرے کے بہانے مجھے
بھی بلا لیا۔ بچے بھی ساتھ ہیں۔ ان کے اسکول میں
ایڈمیشن بھی کروا دیے۔ اب زندگی میں سکون ہی
سکون ہے۔ ماں کے گھیرے سے نکلے ہیں تو میری خوبیاں
کھلی ہیں۔ میری تعلیم، میری ذہانت، میرا حسن
اخلاق تب ان کی نظر میں دو کوڑی کا تھا۔ اب کہتے
ہیں تم اللہ کا انعام ہو میرے لیے۔ صد شکر کہ تمہاری
چھوٹے چچا کے گھر شادی نہیں ہوئی۔ ان کے پڑھے
لکھے بیٹے کو تو بہت مل جاتیں۔ پر مجھے تمہارے جیسی
کبھی نہ ملتی۔'' اس لیے تو تم سے اتنا عرصہ ہوا رابطہ
نہیں کر سکی۔ نئی جگہ، نیا شہر، نیا ملک تھا۔ سیٹ ہونے
میں بڑا ٹائم لگا۔'' ادیبہ کی خوفناک زندگی میں جو، اب
موڑ آیا تھا۔ وہ خاصا خوشگوار تھا۔ انزلہ کو خوشی بھی ہوئی
اور رشک بھی آیا۔
ادیبہ پھر اس سے آگے تھی۔ ایک دیہی ماحول
سے ہمیشہ کے لیے نکل کر پہلے ایک بڑے گھر میں گئی
اور اب ملک سے بھی باہر چلی گئی تھی۔
''اللہ کرے تمہاری زندگی میں بھی سکون
آئے۔ میں تمہارے لیے بہت دعا کروں گی۔ جیسے
شوہر کے ساتھ کچھ نہ کچھ کمپرومائز کر لیا ہے۔ ویسے ہی
اس کے گھر والوں کے ساتھ کر لو...... جانتی ہوں
سسرال سسرال ہی ہوتا ہے...... تم سونے کی بھی بن
جاؤ تب بھی تم میں کیڑے نکالیں گے۔'' اس نے اپنا
پورا پورا تجزیہ بیان کیا تھا۔ پھر اس کے شوہر آ پہنچے تو
فون بند ہو گیا۔ مگر انزلہ کے دماغ کی کئی کھڑکیاں کھل
چکی تھیں۔
وہ کیوں ایک لمبی آزمائش سے گزر کر من پسند
زندگی پاتی۔

جو کل ملنا تھا وہ آج ہی کیوں نہیں۔
اس میں نہ صبر تھا نہ حوصلہ نہ ادیبہ جیسی ہمت...... نہ عقل، نہ سوجھ بوجھ...... وہ دل سے سوچتی تھی اور کر گزرتی تھی۔
اب بھی ایک فیصلہ کیا اور اڑ گئی۔
اسے ہر صورت زعیم کو منانا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ اسے چھوٹے سے گھر میں ایک لمبا عرصہ گزار کے "اچھی بہو" کے سرٹیفکیٹ کی چاہ نہیں رکھتی تھی...... اسے نازو اور صدف کی طرح اچھا بننے کا کوئی شوق نہیں تھا...... اس نے ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

زعیم اس کے لیے بہت اچھا تھا۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی۔ لیکن اس دن زعیم کی تائی اپنے بنگلے سے ان کے غریب خانے میں جلوہ افروز ہوئیں تو انزلہ کی اچھی بھلی پُرسکون ندی جیسی زندگی میں کئی کنکر ایک ساتھ اٹھا کر پھینکے۔ گو کہ وہ یہاں خوش نہیں تھی مگر ظاہر نہیں کرتی تھی۔ لیکن جانے زعیم کی تائی نے کیسے کھوج لگا لیا تھا۔ ان کی دوربین جیسی نظروں نے انزلہ کو اندر تک کھنگال ڈالا۔
"اے لڑکی! تم تو ایسی ویران لگتی ہو جیسے پرانا کھنڈر —— کیا خوش نہیں تم۔ چہرے پہ ویرانی برستی ہے۔" انہوں نے اچانک ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا تو وہ لمحوں میں بوکھلا اٹھی۔
"نن...... نہیں تو۔" انزلہ کو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔
"کیا میں جھوٹ کہتی ہوں...... تیرا بھی کوئی قصور نہیں...... ماں اور بھائی تجھے کسی بوجھ کی طرح اتار کر پھینک گئے۔ نہ مڑ کر آئے نہ خبر لی۔ پھر شوہر بھی ایسا لاپرواہ...... تین مہینے ہوئے پلٹ کر نہ آیا۔ پہلے تو ہر ہفتے بھاگا آتا تھا...... ہاہ، رومانہ نے بھی تو زبردستی کی...... وہ کہاں مان رہا تھا۔ شہر سے لڑکی لانے کو۔ دل جو پھوپھی کے گھر اٹکا رکھا تھا۔ بیاہتا لڑکی سے۔" ان کے تیور ہی نہیں الفاظ بھی زہر میں بجھے تھے۔ انزلہ تو جیسے چکرا گئی تھی اور چکر تو اماں کو بھی ایسے آئے کہ بمشکل ہی سنبھل پائیں۔
"بھابھی جی! توبہ استغفار پڑھیں، کیا کفر بولتی ہیں۔ میرے بچے اور ادی پہ الزام تو نہ رکھیں۔ بہن بھائیوں سا پیار تھا بچوں میں...... اتنا بڑا الزام اللہ توبہ...... پھر آپ جانتی تو ہیں کہ زعیم شہر سے دلہن لانے پہ کیوں اعتراض کرتا تھا۔ باقی خبردار جو آپ نے میرے زعیم پہ بہتان لگایا۔ ادی پہ...... توبہ، توبہ کیا اندھیر ہے اپنی بہو پہ کیچڑ اچھالتی ہیں۔ اب تو معاف کر دیں بے چاری کو...... جانے کس گناہ کی سزا ملی اسے۔ ایسی گنوں والی بچی کو "رول" کر رکھ دیا۔ صد شکر کہ اس کی زندگی میں اب آسانی ہوئی۔ اللہ نے اشفاق کی آنکھیں کھول دیں۔ ورنہ اس محل میں بے چاری بچی کو کون سا سکھ ملے۔" اماں تو تڑپ کر بولتی چلی گئی تھیں۔ ان کا صدمے اور دکھ سے برا حال تھا۔
تائی کو دیورانی کے الفاظ پتھر کی طرح لگے تھے۔ انزلہ کے سامنے اس عزت افزائی پہ جل بھن گئی تھیں۔
"میرے گھر میں کون سا اس پہ ظلم کے پہاڑ ٹوٹے تھے؟ تمہیں بھول گیا رومانہ کے ساتھ اس کی ماں کا رویہ۔ یہ تو ادلے کا بدلہ ہے۔ نہ رضیہ نے اپنی اکلوتی بہو کو عمر بھر سکھ لینے دیا اور نہ ہی اس کی بیٹی کو میرے گھر چین ملا۔" تائی کے پاس گھڑا گھڑایا جواب موجود تھا۔ اماں تو ہکا بکا رہ گئیں۔
"تو پھر آپ کیوں بھول رہی ہیں اگر ادی اور روزی کو آپ کے گھر سکون نہیں ملا تو شائقہ اپنی سسرال میں پھولوں کی سیج سجا کر بیٹھے گی۔" اماں بھی جواب دینے پہ آتیں تو مقابل کو چاروں شانے چت کر دیتی تھیں۔ تائی لمحہ بھر کے لیے چپ ہی رہ گئیں۔
"آں...... ہاں تم تو ادی کی دیوانی ہو۔ اسے بہو نہیں بنا سکیں۔ ورنہ تم نے تو بڑا زور لگایا تھا۔ رضیہ کی دھمکیوں سے ڈر گئے۔" تائی کو بھی بھولی بسری باتیں اچانک یاد آ گئی تھیں۔

"ادی میں کیا کمی تھی، بس بچے ہی نہیں مانے۔ بہن سمجھتے تھے اسے علیم اور عظیم۔" اماں نے لب بھینچ کر کہا۔
"میں تو زعیم کی بات کر رہی ہوں۔ وہ تو مان رہا تھا۔ اس کی کر دیتیں۔ میرے پلے تو نہ پڑتی۔ ڈائن نے میرا بیٹا چھین لیا۔" تائی جانے کب کے انگارے چبائے بیٹھی تھیں۔
"اپنی بہن رومانہ کے لیے ہی مانا تھا۔ پھوپھی کی دھمکیاں سن کر۔ لڑائی ختم کرنے کے لیے۔ پھر رضیہ نے ضد میں آ کر اشفاق کو رشتہ دے دیا۔" اماں نے تائی کو بہت کچھ یاد دلایا تھا۔
"اچھا...... اچھا، بس کرو اس کی وکالت۔ میں تو تمہاری بہو کی بات کر رہی ہوں۔ بچی مرجھا کر رہ گئی ہے۔" تائی جب لاجواب ہو گئیں تو پھر لمحوں میں بات پلٹ دی تھی۔ اماں نے گہرا سانس بھرا۔
"اس کے میکے والے تو اچھے نکلے۔ پلٹ کر خبر نہیں لی۔ صدف کی دفعہ تو ایسا نہیں تھا۔" وہ طنزیہ بولیں۔
"اللہ رکھے اس کے بھائی سارے یورپ میں بیٹھے ہیں۔ بہن دبئی میں ہوتی ہے۔ چند مہینے پہلے تو سب یہاں سے اتنا خرچا کر کے گئے ہیں۔ اتنی جلدی کہاں سے آ جائیں پھر فون پہ تو روز بات ہوتی ہے۔" اماں نے رسان سے جواب دیا تو انزلہ نے تشکر بھری نگاہ اماں کے شفیق چہرے پہ ڈالی تھی۔
اس کے دل میں جہاں ساس کی قدر و منزلت کچھ بڑھی تھی وہیں تائی کے چند الفاظ نے اس کا دل عجیب سے شکنجے میں پھنسا دیا تھا۔ وہ اپنے دل سے یہ بات نکال ہی نہ سکی۔
"زعیم نے تو دل اٹکا رکھا تھا بیاہتا لڑکی میں...... تبھی تو شہر سے لڑکی لانے کے لیے مان نہیں رہا تھا۔" یہ الفاظ نہیں تھے، نوکیلے بھالے تھے جو ساری رات انزلہ کے دل کو فگار کرتے رہے۔

☆☆☆

اور زعیم اپنے جانے کے ساتویں مہینے بھی نہ آیا۔
انزلہ کو تو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ زعیم "ہٹ" کا اتنا پکا ہے۔ دوسرے معنوں میں اتنا ہٹ دھرم ہے۔ ان کی پہلی جھڑپ تب ہوئی تھی۔ جب وہ اسے اپنے آنے کی اطلاع دے رہا تھا تب انزلہ نے جھٹ سے بغیر سوچے سمجھے اس کے سر پہ بم گرایا۔
"مجھے بھی آپ کا انتظار ہے۔ ایک ایک دن گن کر گزار رہی ہوں۔ آپ آئیں اور مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ میرا دل نہیں لگتا یہاں...... کوئی ایکٹویٹی نہیں۔" انزلہ کے الفاظ نے زعیم کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے امڈتے غصے کو بمشکل قابو کیا۔
"میں نے تمہیں بتایا تو تھا انزلہ...... ابھی ممکن نہیں۔ کم از کم میثم کی شادی تک...... ابا جی اور اماں اکیلے ہو جائیں گے۔"
"ابا جی اور اماں صرف ہماری ذمہ داری نہیں ہیں زعیم! ان کے باقی بیٹوں کا بھی کچھ فرض ہے۔ وہ سب تو مزے سے عیش کر رہے ہیں۔ مجھے پھنسا کر۔" انزلہ اپنا غصہ قابو نہیں کر سکتی تھی۔
"بے صبری کیوں بنتی ہو تھوڑا سا انتظار کر لو...... میں گھر کے لیے بھی اپلائی کر دوں گا۔" زعیم نے پھر بھی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔
"گھر نہیں ملتا نہ ملے۔ آپ رینٹ پہ لے لیں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا، میں تنگ آ چکی ہوں۔" اس نے رونا شروع کر دیا تو زعیم اور بھی گھبرا گیا۔
"آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟" وہ سخت پریشان تھا۔
"کسی نے کچھ نہیں کہا، میں گاؤں میں نہیں رہ سکتی۔" انزلہ غصے میں تڑخ اٹھی تھی۔
"یہ تو کوئی بات نہیں...... انزلہ! انسان میں لچک ہونی چاہیے، ہر ماحول میں ڈھلنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ وہ ملائمت سے اسے سمجھاتا رہا۔
"جو کہ مجھ میں نہیں ہیں، سوری۔" وہ زہرخند تھی۔

اس نے اسے ہر طریقے سے سمجھایا تھا کہ اتنی جلدی وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لاسکتا۔لیکن اس پہ کسی بات کا اثر نہیں ہوا تھا۔وہ ابھی تک اپنی ضد پہ قائم تھی۔تب ہی زعیم نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔
''ٹھیک ہے۔میں بھی تب ہی آؤں گا جب تم اپنی ضد چھوڑ دو گی۔'' زعیم نے ایسے ہی ''بڑھک'' نہیں ماری تھی...... بلکہ اس نے اپنے عمل سے ثابت بھی کردیا تھا۔

☆☆☆

زعیم واقعی گھر نہیں آیا۔اتنا لمبا عرصہ کبھی وہ گھر سے دور نہیں رہا تھا۔پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا۔اماں اور ابا جی تک اداس ہو گئے تھے۔اس دوران میثم، نقشم، سائم اور علیم عظیم، وغیرہ کے چکر لگتے رہے تھے۔اس نے سب کو کسی کورس کا کہہ کے مطمئن کر رکھا تھا۔تب ہی کوئی بھی سوال نہیں اٹھاتا تھا۔البتہ صدف ضرور کھٹک رہی تھی۔اس ویک اینڈ پہ سب لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔صرف زعیم نہیں تھا۔حتیٰ کہ آپا بھی آ گئیں۔یوں گھر میں دعوت کا سا سماں بندھ گیا۔
رات کو سب نے ''باجماعت'' زعیم کو کال کی تھی۔ہر کسی نے زعیم سے بات کی۔ایک بات تو سچ تھی۔اس گھر کا ہر فرد دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔وہ سب زعیم کی کمی محسوس کر رہے تھے۔اور کمی تو انزلہ بھی محسوس کرتی تھی۔بس اپنے غصے اور انا میں ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔
''تو ادھر فوج کی دال اُڑا۔ہم تو اپنی انزلہ بھابھی کے ہاتھ کا بنا پاستا کھا رہے ہیں۔'' بڑوں سے ہوتا ہوا فون میثم کے ہاتھ میں گیا تو اس نے کہا۔
''ایک ہماری دیسی بھابھی ہے۔ایک ہماری دیسی پلس بدیسی کا فارمولا بھابھی ہے اور ایک پکی انگریز بھابھی ہے۔'' میثم نے اپنے ہی انداز میں نازو بھابھی اور صدف کی تعریف کے بعد انزلہ کی شان میں قصیدہ پڑھا تھا۔اس کی بات پہ ایک ـــــ قہقہہ پڑا۔
''تیرے لیے امریکی لے آئیں گے۔تو دل نہ چھوٹا کر۔'' زعیم نے اسے جان کر چھیڑا...... اسپیکر آن تھا۔سب ہی لطف اندوز ہو رہے تھے۔
''میں تو انزلہ بھابھی کے ہاتھ کے بنے چائنیز اور اٹالین فوڈز کا فین ہو چکا ہوں۔اب تو دیسی فوڈ میں ٹیسٹ نہیں آتا...... ویک اینڈ پہ گھر بھاگنے کی کرتا ہوں۔'' میثم خوب لمبی لمبی چھوڑ رہا تھا۔زعیم نے اس کی بات کو آگے بڑھایا۔
''بس کر...... وڈا انگریز نہ بن...... اپنے پاکستانی معدے پہ اتنا بوجھ نہ ڈال۔یہ نہ ہو تیری عیادت کرنے مجھے کھاریاں سے منڈی بہاؤالدین آنا پڑے۔'' زعیم کے جواب پہ صدف اور نقشم ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔میثم اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔
سب نے دل بھر کے زعیم سے باتیں کر لی تھیں تب ہی میثم اور علیم کو خیال آیا تو موبائل چپ بیٹھی انزلہ کی طرف بڑھا دیا۔وہ جو چائے کے خالی برتن دھونے جا رہی تھی۔لحہ بھر کے لیے رک گئی۔وہ جس طرح اس ماحول سے کٹی ہوئی تھی۔ایک دم سب کی نگاہوں میں آ کر خفیف ہو گئی۔
''چل اب اپنی زوجہ محترمہ سے دو چار رومینٹک ڈائیلاگ بول لے۔کچھ تیری طبیعت اچھی ہو جائے گی۔'' میثم نے اونچی آواز میں زعیم سے کہا تھا۔
''میری طبیعت ویسے ہی بڑی اچھی ہے اللہ کے فضل سے۔مزید اچھی کرنے کی ضرورت نہیں۔''
اچانک ہی زعیم نے تڑخ کر جواب دیا تھا۔تو جہاں انزلہ مارے اہانت کے لب بھینچ گئی تھی وہیں پورے ماحول پہ لحہ بھر کے لیے سناٹا چھا گیا تھا۔ایک دم طاری ہونے والا سکوت زعیم کو بھی کھٹک گیا تھا۔اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔تب ہی اس نے لہجہ بشاش بنا کر کہا۔
''جن کے تصور سے طبیعت سرسبز ہو۔ان سے بات کر کے ''باغ و بہار'' ہونے میں کچھ حرج نہیں۔'' زعیم نے اگلے ہی پل اپنے کرخت الفاظ کا تاثر مٹا دیا تھا۔

یوں موبائل انزلہ کے ہاتھ میں آیا تو وہ شائستگی سے ''ایکسکیوز می'' کرتی باہر نکل گئی تھی۔
اس نے کچن میں آ کر ٹرے شیلف پہ رکھی۔دروازہ ہاتھ سے بند کیا اور چولہے کے پاس آ گئی۔انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔اور اس کا دل بھی ان کوئلوں کی طرح دہک رہا تھا۔
باہر جنوری کی ٹھنڈ عروج پہ تھی...... انزلہ کا دل غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔
''کچھ دماغ سے خناس نکلا۔'' زعیم کا لہجہ پہلے سے کچھ نرم تھا۔
''آپ کی بلا سے۔'' وہ تڑخ کر بولی تھی۔
''میری بلا، میرے عذاب! مجھے خودکشی پہ مجبور مت کرو۔'' وہ جیسے دہائی دے رہا تھا۔انزلہ کا رواں رواں سلگ اٹھا۔
''میری زندگی جہنم بنا کے خود مرنے کی باتیں کرتے ہیں۔'' وہ جیسے حلق کے بل چیخی تھی۔
''آہستہ چیخو...... اور یہ تم کس لہجے میں بات کرتی ہو۔جب میں نے تمہیں ایک بات سمجھا دی ہے تو تم کیوں نہیں سمجھتیں۔بکواس تو کی ہے کہ تمہیں جلدی بلوا لوں گا۔'' زعیم بھی غصے میں پھنکارا تھا۔اس کا تلخ لہجہ انزلہ کے دل پہ پہاڑ بن کر ٹوٹا۔
وہ اس کے ماں باپ کی نوکری تھی جو ادھر رہتی۔پہلے اس کی ساتھ جانے کی ضد تھی۔لیکن اب غم و غصے اور نفرت کا انداز بدل گیا تھا۔وہ اب قیامت تک بھی زعیم کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی اور نہ ساتھ جانا چاہتی تھی۔اس نے آخری فیصلہ کر لیا تھا۔بس ادیبہ سے ایک مرتبہ مشورہ کرنا باقی تھا۔اگر آج ہی بات ہو جاتی تو پھر...... اسے نہ زعیم کے ساتھ جانا تھا۔نہ اس گھر میں رہنا تھا اور نہ ہی میکے میں رہنے کا کوئی جواز تھا۔
اسے رہ رہ کر اپنی توہین یاد آتی تھی اور دل خون کے آنسو روتا تھا۔
بس بہت ہو چکا تھا۔اب مزید اس میں کچھ بھی سہنے کا یارا نہ تھا۔
''مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا...... نہ کل نہ آج نہ کبھی۔'' بالآخر اس نے ٹھنڈے لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔تب پہلی دفعہ تو زعیم سمجھ ہی نہ سکا۔وہ بے ساختہ خوشی سے چلایا تھا...... اور اس نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا۔
''یاہو...... تو پھر میں ابھی آیا۔پہلی کوچ میں بیٹھا اور صبح تک تمہارے پاس۔'' زعیم کی آواز میں اتنی کھنک تھی کہ انزلہ نے گھبرا کر موبائل پھینک دیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔
آخر اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔

☆☆☆

''کیا واقعی......؟'' ادیبہ جیسے سنتے ہی چیخ پڑی۔
''وہ اپنی میرڈ کزن میں ابھی تک انوالوڈ ہے۔کیسا کمینہ آدمی ہے۔لعنت بھیجو ایسے بے غیرت شخص پہ۔'' ادیبہ کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا تھا۔اور یہی انزلہ کا بھی حال تھا۔
زعیم کا فون بند کرتے ہی اس نے ادیبہ کو کال ملائی تھی۔ادیبہ نے بھی پہلی فرصت میں ہی فون اٹھا لیا۔اور اب زار زار روتی انزلہ کو چپ کرواتے ہوئے وہ خود غم و غصے سے بے حال تھی۔انزلہ نے روتے روتے تصحیح کرنا ضروری سمجھا تھا۔
''ابھی تک کا تو نہیں پتا...... لیکن پہلے ضرور تھا۔''
''یعنی اب تو نہیں نا......'' ادیبہ کو کچھ تسلی ہوئی تھی۔''ویسے تمہیں ''شک'' کیسے ہوا؟ فون یا میسج کرتے پکڑا گیا ہے؟'' ادیبہ نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے تو انزلہ نے بیچ میں ہی اسے روک دیا تھا۔
''نہیں...... مجھے کسی اور سے پتا چلا ہے۔اب میں اس فراڈیے کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔بلکہ اس گھر میں بھی نہیں رہوں گی۔'' وہ اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر رہی تھی۔ادیبہ کچھ گھبرا گئی۔
''نہ...... نہ میری پیاری! اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔تم کہاں جاؤ گی۔بھائی سب تمہارے پردیس

میں ہیں۔ماں بھی نہیں۔ادھر تم ابھی ٹھنڈے دل سے سوچو۔" ادیبہ نے اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔انزلہ سوں سوں کرتی بس روتی رہی۔

"دیکھو، جذباتی مت بنو۔ پہلے کوئی ثبوت تو ڈھونڈو۔کوئی فون پکڑو، کوئی میسج دیکھو۔ایسے کس طرح سب کچھ چھوڑ کر بھاگ رہی ہو۔اپنے گھر والوں کی نظر میں تم ہی بری بنو گی۔سب ہی کہیں گے تمہارا دل نہیں تھا تب ہی گھر نہیں بسایا۔ارے جو مجرم ہے اسے ثبوتوں کے ساتھ پکڑ کر اس کے ماں باپ سامنے پیش کرو، اسے جوتے لگواؤ۔حد ہے یار! تم تو میدان چھوڑ کر بھاگ رہی ہو۔" ادیبہ نے اسے نئی راہ دکھائی تو انزلہ کی سمجھ میں آیا کہ۔آخر وہ کیوں بری بنے اپنے سب گھر والوں کے سامنے۔

اب اسے زعیم کا انتظار تھا۔تاکہ اس کے سامنے دوٹوک ہر بات صاف ہو جاتی۔اس کے ابا جی، اماں اور آپا کے سامنے ساری شرافت کا پول کھل جاتا۔

☆☆☆

زعیم کو چھٹی نہ مل سکی۔وہ اگلے کئی ہفتے تک کے لیے مصروف ہو گیا۔زعیم سے البتہ فون پہ بات بھی محدود ہو گئی تھی۔اس کا انتظار تو دور کی بات تھی۔

اور وہ جو اسے چھوڑ دینے کے بڑے بڑے دعوے کرتی تھی۔اندر ہی اندر ٹوٹتی رہی۔

انزلہ کے اندر، باہر سناٹوں کے بسیرے تھے تو گھر کی فضا بھی مکدر۔

اماں بے زار تھیں اور ابا جی متفکر۔

بہو بیگم پورے گھر سے بے نیاز تھیں...... نہ کسی آئے کی فکر نہ کسی گئے کا غم تھا۔گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑ گیا۔اور تین وقت کھانے کے لیے آپا کی خدمات لی جاتی تھیں۔اگر آپا کا سسرال قریب نہ ہوتا.... تو اس سے آگے انزلہ نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

وہ سارا دن بولائی بولائی پھرتی تھی۔کبھی چھت پہ، کبھی صحن میں...... کبھی کمرہ بند کیے پڑی رہتی۔

پورا گھر تلپٹ پڑا تھا۔ہر چیز اوندھی، گندی اور دھول سے اٹی ہوئی۔

آپا تین وقت کا کھانا بھیج دیتی تھیں۔بس یہی غنیمت تھا۔

فاریہ اماں اور ابا جی کو وقت پہ چائے بنا دیتی۔دوائی دے دیتی۔اماں جی کے گھٹنوں میں مالش کر دیتی۔وہ چھوٹی تھی۔بس اتنا ہی کر سکتی تھی۔

کام والی نے کوئی اور گھر ڈھونڈ لیا تھا۔وہ آتی ہی نہیں تھی...... یوں ہر چیز پہ وحشت برس رہی تھی سمیت انزلہ کے۔

دیوار سے کبھی کبھار تائی سر نکال کر اماں پہ گولہ باری ضرور فرماتیں۔

"ارے...... اپنی بہو تو دیکھ...... جانے کس کے سوگ میں ہے۔گھر کو جنگل بنا دیا...... کیا یہی لشکارے مارتا تمہارا گھر تھا۔" تائی کے چمک کر بولنے پہ انزلہ شرمسار ہو گئی تھی اور اماں بیزار۔پہلی مرتبہ اماں نے انزلہ کی تائی کے سامنے حمایت نہیں کی تھی۔انزلہ کے دل میں کچھ بہت زور کا لگا تھا۔

اسے اماں برہم برہم نظر آتی تھیں۔لبوں سے کچھ نہیں کہتی تھیں تاہم ان کا گپ چپ رویہ اسے ہولائے دیتا تھا۔وہ اسے چپ چاپ شرمسار کرتی تھیں۔

"زعیم آتا ہے تو اس کے ساتھ بھیج دوں گی۔خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔شوہر کے بنا کملا رہی ہے۔" انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں تجزیہ کیا تھا۔جو ایک لحاظ سے ٹھیک ہی تھا۔

ان دنوں فاریہ بے چاری گھن چکر بنی ہوئی تھی۔کیونکہ آپا کسی فوتگی میں شرکت کرنے گئی تھیں۔اور ان کے گھر کا چولہا بھی بند ہو چکا تھا۔

فاریہ کھانا نہیں پکا سکتی تھی۔لیکن پھر بھی بے چاری بھابھی کو ٹھس پڑا دیکھ کر کچن میں آ گئی۔سالن بنانے کے لیے آگ جلاتے ہوئے فاریہ کا بازو جل گیا تو اس کی چیخوں نے پورے گھر میں حشر برپا کر دیا۔وہ تکلیف کی شدت سے روتی رہی۔برابر والے گھر سے تائی بھی پہنچ گئیں۔فاریہ کا بازو دیکھ کر انہیں

باتیں سنانے کا موقع مل گیا تھا۔

"اے بہو! بچی بے چاری کو "ساڑنے" کے لیے کچن میں بھیجا تھا۔ذرا شرم نہ آئی، سارا وقت بستر توڑنے کے سوا تمہیں کوئی کام نہیں...... اور لاؤ باہر سے بہوئیں...... دیکھ لیا، ناتم نے۔" انزلہ کے لتے لیتے لیتے اب وہ اماں پہ چڑھ دوڑی تھیں۔

"اس لڑکی کو سوائے آرام کرنے کے کوئی کام نہیں...... یا فون کان سے لگائے باتیں بگھارتی ہے۔ایسی نکمی اور ہڈ حرام...... ساس بیمار، نند کم سن بچی...... سسر بے چارا گپ چپ...... اس میں ذرا حیا نہیں۔"

تائی کی چلتی زبان پھر رکی نہیں تھی...... یہاں تک کہ نقشم اور میثم اچانک آ گئے تھے۔

گھر کی حالت دیکھ کر چکر کیا کھاتے، آتے ساتھ ہی فاریہ کی پڑ گئی۔اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگے تھے۔واپس آ کر حالات اور گھر کا جائزہ لیا تو دنگ رہ گئے۔

اماں بیٹوں کی آمد پہ گرتی پڑتی کچن میں گئیں تو میثم ان کے پیچھے بھاگا تھا۔

"اماں! اپنے کمرے میں چلیں، میں کر لیتا ہوں۔" اماں کو اپنے کمرے میں بھیج کر وہ دونوں بھائی جت گئے تھے۔پھر صائم بھی آ گیا۔

ان تینوں نے اگلے پانچ گھنٹوں میں گھر کا کچھ نہ کچھ نقشہ بدل دیا تھا۔

صائم نے پائپ لگا کر سارا گھر دھو ڈالا تھا اور نقشم نے وائپر لگا دیا۔پھر میثم مشین لگا کر کپڑوں کا گٹھڑ اٹھا لایا۔شاید مہینے بھر کے کپڑے تھے۔کام والی جب سے گئی تھی لگتا تھا کپڑوں کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔میثم نے اپنے اور نقشم کے بھی ان دھلے کپڑے نکال کر دھوئے۔ایک کپڑے کھنگال رہا تھا۔دوسرا ڈرائیر میں ڈال رہا تھا اور تیسرا الگنی پہ پھیلا رہا تھا۔

کپڑے دھوتے ہوئے نانی اور دادی تک یاد آ گئیں۔بڑے عرصے بعد ایک مرتبہ پھر گھر کا کام کیا تھا۔اب تھکاوٹ ہو رہی تھی۔لیکن باورچی خانہ توجہ کا طالب تھا ابھی۔

مشین کا پھیلاوا سمٹ گیا تو نقشم نے سبزی بنائی۔صائم نے نوڈلز تیار کیے۔تینوں نے صبر شکر کے ساتھ نوڈلز کھائے تو دل اور معدے کو کچھ سہارا ہوا۔

پھر میثم ہانڈی پکاتا رہا...... نقشم برتن دھوتا رہا...... ہانڈی پک گئی تو صائم تندور سے روٹی لے آیا۔جب تک ابا جی گھر آئے، پورا گھر چمک رہا تھا۔

ان کا دل بڑا خوش ہوا...... چہرے پہ رونق سی آ گئی تھی۔

"انزلہ بیٹی کا مزاج اچھا ہو گیا؟"

وہ بے انتہا خوش تھے...... انہیں پتا نہیں تھا کہ انزلہ کیوں کٹ کھنی بلی بنی ہوئی ہے پھر بھی اتنا تو پتا تھا کہ بہو کا مزاج برہم ہے تب ہی گھر کی طرف دیکھتی نہیں، باہر نکلتی نہیں، کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتی۔پر صائم نے ابا جی کی خوشی کو ملیا میٹ کر ڈالا۔

"مامی کی طبیعت ابھی تک ناساز ہے...... اب ہمارے ماموں آئیں گے تو ناساز طبع کو بحال کریں گے۔یہ کیا دھرا تو ہمارا ہے۔چلو، مامی کا ٹیگ لگ گیا۔"

"اچھا بکو نہیں۔" میثم نے اسے ڈانٹا تو وہ منہ بسور کر رہ گیا تھا۔ابا جی جانے کچھ سمجھے تھے یا نہیں، محض ہنکارا بھر کے کمرے میں چلے گئے تھے۔نقشم نے اماں اور ابا جی کو کھانا دیا تھا۔پھر فاریہ کو بھی دلیہ کھلایا۔اسے بخار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ویک اینڈ ختم ہوا تو میثم، نقشم اور صائم بھی چلے گئے تھے۔

آپا آ تو گئی تھیں لیکن بیمار پڑ گئی تھیں۔موسم بدلا تو سب ہی پہ اثر انداز ہو گیا۔اماں بیمار۔ابا جی کی طبیعت ناساز۔فاریہ کو کھانسی زکام...... اور ایک مرتبہ پھر لا تعداد کام۔

اس دفعہ انزلہ رکھائی نہیں دکھا سکی تھی۔گو کہ دل تو نہیں کرتا تھا مگر مارے باندھے کرتی رہی۔اماں کی بیماری بھی طویل ہو گئی تھی۔ابا جی بھی ٹھیک نہیں تھے۔

ان کی بیماری میں انزلہ کا بھرکس بن گیا تھا۔ لیکن مجبوری تھی...... اماں گو کہ کچھ نہیں کہتی تھیں تاہم تائی کے طعنوں سے خائف ہو کر انزلہ کو مارے باندھے گھر کو صاف رکھنا پڑتا تھا۔ پھر مہمان بھی آتے جاتے تھے۔ انزلہ اگلے چند دنوں تک بمشکل برداشت کر سکی۔

آخر وہ نوکرانی تھی یہاں کی جو ڈھور ڈنگروں کی طرح جتی رہتی۔ بغیر کسی ستائش کے بغیر کسی تمغے کے اور وہ کس لیے یہاں کنیزوں کی طرح زعیم کے والدین کی خدمتیں کرتی پھر رہی تھی۔ جب سوچ نے پلٹا کھایا تو ایک مرتبہ پھر انزلہ پہ "بے حسی" کی چادر طاری ہو گئی تھی۔

اس زعیم کی خاطر جو اس کا تھا ہی نہیں...... اس کے ساتھ مخلص ہی نہیں تھا، دل اس مقام پہ کٹ کٹ جاتا تھا۔ رہ رہ کر تائی کی باتیں یاد آتی تھیں۔

"زعیم اپنی بیاہتا کزن کے ساتھ......"

انزلہ کا جیسے خون کھول اٹھتا تھا۔ پھر زعیم کا گریز اور شادی پہ خفا رویہ یاد آتا۔ وہ کتنا بیزار اور اکھڑا اکھڑا تھا۔ اسی لیے نا...... کہ اس کی شادی پسند سے نہیں ہوئی تھی۔ اسی دکھ کی تشہیر کرتا پھر رہا تھا روتی شکل بنا کر۔ اب جب ساری حقیقتیں کھل چکی تھیں تو انزلہ بھلا انتظار کیوں کرتی۔

پھر اسی شام اچانک زعیم چلا آیا تھا۔ آف موڈ کے ساتھ۔ جیسے اسے انزلہ کے "روکھے" رویے کی اطلاع مل چکی تھی۔ کچھ اس نے خود بھی آکر دیکھ لیا تھا۔

انزلہ مارے باندھے بمشکل کام نمٹا رہی تھی۔ زعیم اماں کے کمرے میں گھس گیا۔ جانے کب تک میٹنگ چلتی رہی۔ انزلہ کو غصہ آتا رہا۔

آج اس نے آر یا پار کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اللہ اللہ کر کے تو زعیم گھر آیا تھا۔ انزلہ غصے میں برتن اٹھا اٹھا کر ٹوکری میں پٹختی رہی۔ معاً زعیم بھی کچن میں آ گیا۔ پہلے کی نسبت اب موڈ کچھ بہتر تھا۔ یقیناً اماں کے کمرے میں آپا سے ملاقات ہوئی تھی۔

اور آپا نے اسے سمجھا بجھا کر بھیجا تھا۔ آپا ایسی ہی تھیں۔ ٹھنڈے مزاج کی...... سب کے لیے مخلص۔

"ایسی لاتعلقی حد ہے، یار بندہ آٹھ ماہ بعد گھر آئے تو ایسے استقبال کرتی ہیں بیویاں۔" وہ اس کے قریب چلا آیا تھا۔ انزلہ نے مڑ کر دیکھا نہیں۔ وہ ہونٹ بھینچے اپنا کام کرتی رہی۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ، سب کے ساتھ اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں ہو؟" اس کے لہجے میں ملائمت تھی۔ نرمی تھی وہ ایک ٹک انزلہ کے سرخ برہم چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے اتنی ناراض تھی، محض اتنی سی بات پہ اب وہ اس کی ناراضگی ہی تو دور کرنے آیا تھا۔ اماں اور آپا کے مجبور کرنے پہ ان کی ایک ہی رٹ تھی۔ "انزلہ کو آکے لے جاؤ۔"

اور وہ چڑ کر جواب دیتا تھا۔ "کہاں لے جاؤں گھر تو ملے۔"

اب چونکہ گھر کا انتظام ہو چکا تھا اس لیے وہ انزلہ کو لینے بھی آ گیا تھا۔ وہ اماں اور آپا کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ پھر ویسے بھی اسی انزلہ کو ساتھ تو لانا ہی تھا۔ سو اب ہی کیوں نہیں۔

پھر جب زعیم نے اسے گھر مل جانے کی خوشخبری سنائی تو انزلہ کا جواب سن کر لمحہ بھر کے لیے تو وہ بول ہی نہیں سکا تھا۔

"مجھے نہیں جانا کہیں اور نہ ادھر ہی رہنا ہے۔" اس کا لہجہ دوٹوک، غصے میں کھولتا ہوا تھا۔ زعیم حق دق رہ گیا۔ ایسے جواب کی تو اسے امید ہی نہیں تھی۔

"تو پھر کہاں جانا ہے۔" زعیم کو نرمی کا دامن پھر سے پکڑنا پڑا جو ابا اسے بھی بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ویسے بھی انزلہ ناراض تھی۔ اسے اتنے مہینوں بعد دیکھ کر وہ غصہ کرنے میں حق بجانب تھی۔ لیکن صفائی کا موقع بھی تو نہیں دے رہی تھی۔

"جہاں بھی جاؤں، آپ سے مطلب۔" وہ تڑخ کر گویا ہوئی تھی۔ زعیم اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی ناراضی کا اصل سبب کھوجنا چاہتا ہو۔ وہ محض اس بات پہ ناراض نہیں تھی کہ وہ ضد لگا کر

کھاریاں بیٹھا رہا تھا بلکہ شاید کوئی اور بات بھی تھی۔ وہ بات بھلا کیا تھی۔

☆☆☆

انزلہ برتن دھوتی رہی جب زعیم نے غصے میں آ کر نل بند کر دیا۔

"میں کیا دیواروں سے باتیں کر رہا ہوں۔" وہ غصے میں دہاڑا۔ پھر اس نے انزلہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچا اور سیدھا اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ انزلہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک دم سنبھل کے چیخ پڑی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اس کا لہجہ تلخ اور آواز بلند تھی۔

"مجھے ایسے لہجے کی عادت نہیں...... آواز نیچی رکھو۔" زعیم کو تڑختے ہوئے کہنا ہی پڑا تھا۔ پھر اس نے اپنے برہم لہجے پہ قابو پا لیا۔ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے دوبارہ نرمی سے بولا۔

"تم ایک دو دن میں تیاری کر لو۔ پھر چلیں گے۔ تمہارا شکوہ بھی دور کر دیا۔ اور جہاں تک اتنے مہینے گھر نہ آنے کا سوال تھا تو میں واقعی کورس پہ چلا گیا تھا۔ تب ہی رابطہ نہیں کر سکا۔"

"میں نے کوئی وضاحت نہیں مانگی۔"

"مگر مجھے تو وضاحت کرنا ہے۔ آخر تمہارا موڈ بھی تو ٹھیک کرنا ہے۔ دیکھو، اتنے مہینوں بعد آیا ہوں۔ کوئی خدمت نہیں۔ کوئی لفٹ ہی نہیں۔"

اس نے نرمی سے انزلہ کا منہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔ پھر اس نے تھوڑی سی شرارت کی تو انزلہ نے مارے جھلاہٹ کے کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ جھٹک دیے تھے۔ وہ اس کے اتنے جارحانہ ردعمل پہ ششدر رہ گیا تھا۔

پھر اس کی آنکھوں میں ناگواری اور غصہ در آیا۔ وہ جتنی نرمی دکھا رہا تھا، وہ اتنا ہی سر پر چڑھ رہی تھی۔

"میرے ساتھ یہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جان گئی ہوں آپ کی اصلیت۔"

"کیا ہے میری اصلیت ذرا روشنی ڈالو گی؟ کچھ وضاحت کرو گی۔" اس نے بڑے ہی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن اگلی بات پہ اس کا تحمل، صبر اور ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا تھا۔ وہ صرف دھاڑا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا ہاتھ بھی اٹھ گیا۔

"اپنی اس شادی شدہ کزن کے ساتھ ابھی تک چکر چلا رکھا ہے۔ جو آپا کی نند ہے، تائی کی بہو ...... آپ کی پھوپھی زاد اوی......" انزلہ کے باقی الفاظ اس کے منہ میں دبے رہ گئے تھے۔ زعیم کا ہاتھ اٹھا تو وہ چکرا کر بیڈ پہ اوندھی گری تھی۔ یوں لگا تھا جیسے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہے۔

اور اس کے سر پہ کھڑا زعیم چلا رہا تھا۔

"تم بے ہودہ اور بے شرم عورت تم میں ذرا حیا نہیں ...... مجھ پہ الزام لگاتی ہو...... وہ بھی میری بہنوں جیسی کزن کے حوالے سے ...... میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ کس قدر نیچ سوچ ہے۔ تمہاری شرم آ رہی ہے مجھے کاش یہ تھپڑ میں تمہیں اس رات سب کے سامنے مارتا جب تم نے میرے اتنے معزز بھائی کو بھری محفل میں شرمندہ کیا تھا۔ میری نرمی کا نتیجہ ہے کہ آج تم میرے کردار تک بھی پہنچ گئیں۔" وہ اٹھا اور تن فن کرتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

زعیم نے اپنی پوری زندگی میں ایسی ڈھٹائی نہیں دیکھی تھی۔ پورے تین دن ہو چکے تھے۔ انزلہ نے اس سے کلام نہیں کیا تھا۔ نہ ایک حرف معذرت لبوں سے ادا کیا۔

اس دن جب انزلہ اور زعیم کی لڑائی ہو رہی تھی تب تائی شور کی آواز سن کر دیوار سے چپک گئی تھیں۔ لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اسٹول لے آئیں۔ تھوڑا سر اونچا کر کے صحن کا جائزہ لیا تو اسی چکر میں پیر رپٹ گیا اور تائی کی ٹانگ بری طرح سے گرنے کے باعث فریکچر ہو گئی تھی۔

تائی کے "ایکسی ڈنٹ" پہ ہی انزلہ کی زندگی میں فلمی موڑ چلا آیا۔

تائی کی دونوں بہوویں اپنے اپنے شوہروں کے ہمراہ گزشتہ ساری ناراضی کو بھلا کر اپنی ساس صاحبہ کی عیادت اور خدمت کے لیے حاضر ہوگئی تھیں۔

وہ آپا، اماں اور زعیم کے ہمراہ تائی کی مزاج پُرسی کے لیے ان کی شاندار کوٹھی میں گئی تو وہاں موجود ذرا فربہی مائل ہنستی کھلکھلاتی سی ادیبہ کو دیکھ کر انزلہ کو ہزار والٹ کا کرنٹ لگا تھا۔ کچھ یہی کیفیت ادیبہ کی بھی تھی۔

تعارف کا مرحلہ زعیم نے لاکھ ناراضی کے باوجود بھی نبھانا چاہا تو ادیبہ انزلہ سے گلے ملتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر چیخی۔

”بس بس زعیم! کچھ مت بتاؤ...... ابھی مجھے اس شاک سے سنبھلنے دو۔ یہ انزلہ ہے تمہاری بیوی یا میری کم عقل سی جذباتی سہیلی...... مجھے یقین نہیں آتا۔ دنیا اتنی چھوٹی ہے کیا اور مجھے پتا ہی نہیں چل سکا۔ انزلہ میرے اتنے قریب تھی۔“ دونوں یوں ملی تھیں جیسے برسوں کی بچھڑی بہنیں ہوں۔

پھر کدھر کی عیادت اور کہاں کی احوال پرسی۔

وہ دونوں خود میں ایسے گم ہوئی تھیں کہ دوپہر سے سہ پہر اور پھر رات تک ڈھل گئی۔ یہاں تک کہ زعیم انزلہ کو تیسری مرتبہ بلانے آیا تھا۔ لیکن ادیبہ اسے جانے نہیں دے رہی تھی۔

جب زعیم اسے لینے آیا تو اس نے ادیبہ کو گہرے الفاظ میں جتلایا بھی تھا۔

”بچ کر رہنا اس زہریلی خاتون سے، معاف کرنے والی نہیں۔ تمہیں تک نہیں بخشا یعنی اپنی سہیلی کو۔“ زعیم نے ادیبہ کو سارا قصہ سنا ڈالا تھا۔ انزلہ جو پہلے ہی شرمسار تھی۔ کچھ اور بھی شرمندہ ہوگئی۔

”تم اسے شرمندہ مت کرو۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے بلکہ میں تو اس کی زندگی کے ہر گوشے سے واقف ہوں اور میں ابھی تک حیران ہوں۔ تقدیر، کیسے کیسے لوگوں کے کہاں کہاں ستارے ملا دیتی ہے۔“

ادیبہ کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ انزلہ ان دونوں کو گفتگو کرتا ہوا چھوڑ کر گھر چلی آئی تھی۔ کیونکہ ادیبہ کے سامنے دل کا بوجھ تو ہلکا کر ہی لیا تھا۔ موبائل کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے پہلی مرتبہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے گھر آکر جلدی سے پہلی مرتبہ دل لگا کر سالن بنایا۔ روٹی بھی بنائی۔ اماں اور ابا کو کھانا بھی خود دیا پھر چائے بھی بنائی تھی۔ یہ کایا پلٹ کیوں ہوئی تھی۔ اب کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ سب عیاں ہو چکا تھا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئی تو زعیم بھی بیچ والی دیوار پھلانگ کر آ گیا۔

اب وہ صحن میں ٹہل ٹہل کر کسی کو فون کر رہا تھا۔ نجانے کس کو؟ انزلہ نے کان لگا کر سنا اور دھک سے رہ گئی تھی۔

وہ شاید نہیں یقیناً صدف سے مخاطب تھا۔

”سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پھر جانے کیا ہوا؟ دیکھ لوں گا سب کو۔ تیلی کس نے لگائی۔“

وہ غصے میں کھول رہا تھا۔ اور صدف اسے ٹھنڈا کر رہی تھی۔

انزلہ جیسے بے دم ہوگئی۔ کچن کے پردے کے پیچھے چھپ کر اس نے پوری بات سن لی تھی۔ آخر وہ کرے تو کیا کرے؟

جب پانی پلوں کے نیچے سے گزر گیا تھا۔ تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن سارا قصور تو تائی کا تھا۔ انہوں نے غلط بیانی کی تھی اور انزلہ کے دل میں شک کا بیج بویا تھا...... اب تائی سے کون باز پُرس کرتا۔ وہ تو اچھی خاصی ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ سزا جھیل رہی تھیں اور زعیم کو آپا نے بتا بھی دیا تھا پھر بھی زعیم کا غصہ۔

دوسری طرف انزلہ کو ادیبہ سے بھی شرم ساری تھی۔ اس کی سہیلی کیا سوچتی ہوگی۔ وہ کیسے کیسے نازیبا الفاظ اس کے خلاف کہتی تھی۔

لیکن تب تک انزلہ بے خبر تھی۔ اور تائی کی جھوٹی باتوں پہ یقین رکھتی تھی۔ سچائی تو اب کھلی تھی

لیکن فائدہ کیا تھا بھلا۔

زعیم اس سے ناراض تھا۔ گھر آکر بھی بات نہیں کی تھی۔ جب ادیبہ نے اسے بتا دیا تھا پھر بھی ناراضی تھی آخر کیوں؟ انزلہ کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا تھا۔ تب ہی ادیبہ اس سے ملنے برابر گھر سے آ گئی۔

”مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا، تم میری ہی فیملی کا حصہ بن چکی تھیں اور میں تمہیں اپنی ہی فیملی کے خلاف بھڑکاتی رہی۔ تم اپنی سسرال سے متنفر ہی اس طرح سے کرتی تھیں۔ دل چاہتا تھا تمہارے سسرالیوں کو آگ میں جھونک دوں۔ مجھے کیا پتا تھا۔ تم میرے چھوٹے ماموں کی بہو ہو۔ زعیم کی بیوی۔

ارے تم تو اتنی خوش نصیب لڑکی ہو۔ جسے اتنا اچھا گھرانہ ملا۔ زعیم جیسا شوہر ملا۔ اوف پاگل لڑکی! تم اپنے کیسے کیسے نقصان کرتی رہی ہو۔ چلو میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ ادیبہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور نرمی سے بتاتی چلی گئی۔

”دراصل میں ادیبہ امتیاز، اپنے خاندان کی پہلی یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل، پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اماں کو میری اعلا تعلیم پر بڑا مان تھا۔ وہ مجھے کسی پڑھے لکھے لڑکے سے بیاہنا چاہتی تھیں۔ یوں ان کی پہلی نظر چھوٹے ماموں کے گھرانے پہ تھی۔ اماں نے بڑی کوشش کی بڑا ہی زور لگایا، میری شادی عظیم، علیم یا پھر زعیم سے ہو جائے...... عظیم بھائی تو مجھ سے بڑے تھے بہت۔ تاہم علیم، زعیم سے جوڑ بنتا تھا۔ لیکن ہوا یوں کہ مامی کو علیم کے لیے صدف بھا گئی۔ انہوں نے بڑے شہر سے بڑے گھر کی لڑکی کو دلہن بنا کر اپنا گھر سجا لیا۔

اماں کو شدید صدمہ پہنچا۔ انہوں نے اپنا غصہ رومانہ بھابھی پہ نکالا تھا۔ وہ انہیں بڑا ہی ٹارچر کرتی تھیں۔ لیکن جلد ہی اماں اسے بھول کر زعیم کے پیچھے پڑ گئیں...... اب وہ زعیم سے میری شادی کے لیے رومانہ بھابھی پہ دباؤ ڈالتی رہیں۔ اماں نے ویسے بھی رومانہ بھابھی کو کبھی سکون کا سانس لینے نہیں دیا تھا۔ یوں رومانہ بھابھی اور میرے ماموں بھی ہرگز اس وٹے سٹے پہ تیار نہیں تھے۔

گھر میں جھگڑے بڑھتے گئے۔ تو اماں نے دھمکانے کی خاطر بھابھی کو گھر سے نکال دیا۔ اس طرح زعیم کو خبر ہوئی تو اس نے مجھ سے شادی کے لیے رضامندی دے دی لیکن یہاں میں اٹک گئی۔ وہ مجھے عزیز تھا مگر بھائیوں کی طرح...... اور وہ اپنی بہن کے لیے قربانی دے رہا تھا۔ جو مجھے گوارا نہیں تھی۔ پھر میں اپنی بھابھی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسی جھگڑے میں بڑے ماموں نے مجھے اشفاق کے لیے مانگ لیا گو کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھا مگر اس کی مالی حیثیت مضبوط تھی۔ سب سے بڑھ کر ماموں کا گھر تھا۔

میری ہاں پر اماں مجھ سے ناراض ہوگئیں۔ اپنی جیسی ہی اپنی بیٹی کی ساس کو دیکھ کر اماں کے بل بھی نکل گئے۔ تاہم انہوں نے چھوٹے ماموں کو معاف نہیں کیا تھا۔

ہمارا آنا جانا بند ہوگیا۔ شادیوں پہ بھی ایک دوسرے کو نہیں بلایا تھا۔ بڑی مامی مزاجاً کرخت تھیں۔ ان کے سرد مزاج اور کرختگی کے ساتھ بمشکل سمجھوتا کرتے وقت گزر رہا تھا۔ مامی نے مجھ پر ہر وہ حربہ آزمایا تھا جو عام طور پر دیہاتی عورتوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ حالات ایسے ہی بگڑتے رہے۔ اشفاق بھی اماں کے سامنے بول نہیں سکتے تھے۔

کافی عرصے بعد اشفاق نے باہر کاروبار کے لیے پیسہ انویسٹ کیا تو مجھے بھی ساتھ بلوا لیا۔ یوں زندگی میں آسانیاں آنے لگیں۔

جہاں تک زعیم کا معاملہ تھا۔ بڑی مامی نے ہمیشہ مجھے زعیم کے حوالے سے ٹارچر کیے رکھا تھا۔ ایک عرصہ تک اشفاق بھی مجھ سے اکھڑے اکھڑے رہے۔ کیونکہ مامی نے انہیں میرے خلاف اندر تک بھر رکھا تھا۔

اب یہی حربہ وہ تمہارے ساتھ استعمال کر رہی تھیں۔ صد شکر کہ تمہاری آنکھیں جلدی کھل گئیں۔

مجھے جدہ میں اتنا تو معلوم ہوا تھا زعیم کی شادی ہو چکی ہے۔ علیم کی بیوی کے رشتہ داروں میں...... مجھے یہ خبر نہیں تھی علیم کی بیوی بھی تمہاری کزن ہے۔

ہم لوگ اتنی قریبی سہیلیاں تھیں مگر آج تک ایک دوسرے سے اتنا انجان اور بے خبر، جب تم نے مجھے بتایا۔ تمہاری شادی ایک چھوٹے سے دیہات میں ہو رہی ہے۔ تب میں بہت اپ سیٹ ہوئی۔ مجھے نہیں لگتا تھا تم کسی گاؤں میں ایڈجسٹ کر پاؤ گی۔

کہاں تم میں نزاکت، نخرہ، حسن ......اور کہاں ایک معمولی سا دیہاتی کسان۔

میں اپنے تجربوں کے تناظر میں تمہیں الٹے سیدھے مشورے دیتی تھی۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر میرے بھائی یا اشفاق جیسے دیہاتی تھے تو زعیم اور علیم جیسے دیہاتی بھی تو موجود تھے۔ باوقار، تعلیم یافتہ......اخلاقی قدروں کو جاننے والے۔

بس اتنی سی کہانی تھی۔ اور تم نے جان بوجھ کر اپنی سیدھی سادی زندگی کو مشکل بنا لیا تھا۔ باقی جو کچھ بڑی مامی نے کہا۔ وہ سراسر الزام تھا۔ ایسے الزاموں کی زد میں بہت دفعہ میں بھی آئی تھی۔ تب ہی تو اشفاق کا سلوک میرے ساتھ ناروا تھا۔

صد شکر وہ سمجھ ہی گئے۔ اور تمہیں بھی عقل آ گئی۔" ادیبہ نے نرمی اور ملائمت سے ایک ایک گرہ کو کھول دیا تھا۔ ادیبہ کی ایک ایک بات پہ یقین رکھنے کے باوجود انزلہ کے دل سے ایک پھانس نہیں نکل رہی تھی۔

"تمہاری ساری باتیں ٹھیک سہی لیکن اتنا تو تم بھی نہیں جانتیں۔ زعیم مجھ سے شادی کسی طور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات مجھے وثوق سے پتا ہے۔ وہ میرے مقابل کسی ان پڑھ کو لانے پہ تیار تھے مگر صدف کی کزن کو نہیں......حالانکہ زعیم سے نہ تو میں کبھی ملی تھی۔ نہ ہی انہیں مجھ سے کوئی پرخاش ہونا چاہیے تھی۔"

"اس سوال کا جواب تم زعیم سے لینا۔ وہ تمہیں بہت اچھے طریقے سے سمجھا دے گا۔" ادیبہ نے شرارت سے آنکھ دبائی دی۔ انزلہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

یہ دوسرا ویک اینڈ تھا۔ اس دفعہ بھی بہانہ بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ آیا ہی نہیں۔ وہ اس سے ناراض ہو گیا تھا؟ لیکن ناراض تو انزلہ کو ہونا چاہیے تھا۔ اور وہ اس سے ناراض تھی بھی۔

لیکن اس دفعہ وہ زعیم سے ناراضی کا غصہ گھر والوں پہ نہیں نکال رہی تھی۔ بلکہ اس نے گھر والوں سے کشیدہ تعلقات بحال کر لیے تھے۔ خاص طور پر اماں اور اباجی کو اپنی خدمت سے راضی کر لیا تھا۔ پھر فاریہ سے بھی دوستی کر لی۔ گھر کے کام کاج بھی احسن طریقے سے کرنے لگی تھی۔

انزلہ نے سب کی شکایتوں کو دور کر دیا تھا۔

اماں اور اباجی اس سے خوش تھے۔ اس دفعہ میثم اور نقشم بھی بہت خوش خوش واپس گئے تھے۔ کیونکہ اس دفعہ انہیں جمعداروں اور دھوبیوں، باورچیوں والا کوئی بھی کام نہیں کرنا پڑا تھا۔

انزلہ کا رویہ اچھا تھا بلکہ بہت ہی اچھا تھا۔

اباجی اس لیے خوش تھے کہ ان کی تیسری بہو بھی بے مثال تھی۔ ان کے بیٹوں کو جوڑے رکھنے والی۔

انزلہ سے گھر والے خوش تھے تو آپا نہال ہو ہو جاتی تھیں۔ بار بار اماں کو جتاتیں۔

"انزلہ دل کی بری نہیں......بس تھوڑی جذباتی اور ناسمجھ ہے۔ دیکھیں تو، ہمارے گھر میں صدف کی طرح ہی گھل مل گئی۔" آپا اپنے فیصلے پہ خوش نظر آتی تھیں۔

جاتے دسمبر کی بھیگی شاموں میں بظاہر سب کے درمیان چہکتی انزلہ کے دل میں چٹکیاں بھرتا ملال اتنا بڑھ جاتا تھا۔ وہ زعیم کی واپسی کا دل سے انتظار کر رہی تھی۔ کس مقام پہ آ کر دل نادان نے ہاتھ دکھایا تھا۔ ان ہی اداس دنوں میں ادیبہ ہنستی مسکراتی انزلہ کے لیے ڈھیروں خوشیوں کی دعائیں کرتی اپنے شوہر

کے ہمراہ واپس جدہ چلی گئی تھی۔ انزلہ کا دل اور بھی ویران اور سنسان ہو گیا۔

وہ اپنی گزشتہ زندگی کو سوچتی اور حیران رہ جاتی۔ کیا وہ پہلے والی انزلہ تھی؟ تنک چڑھی، ہٹ دھرم اور ضدی۔

وہ تو کوئی اور ہی انزلہ تھی......ایک نئے سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ ذمہ دار، کم گو اور باوقار سی۔

یوں جیسے زعیم کے گھر والوں کا دل جیت کر زعیم کے دل کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔

زعیم ناراض تھا اور اس کا گناہ بھی معمولی نہیں تھا۔ اس نے زعیم پہ الزام لگایا تھا۔ لیکن زعیم نے بھی تو اسے تھپڑ مار کر بدلہ پورا کر لیا تھا۔ پھر اس "معنی خیز" چپ کا سبب کیا تھا؟

ایسے ہی ویران دنوں میں اچانک میثم، نقشم اپنی ہنسی اور مسکراہٹوں کے ساتھ چلے آئے تھے۔ ان کے آتے ہی صدف اور علیم بھی پہنچ گئے۔ پھر عظیم بھائی اور نازو بھابھی بھی۔ آپا اور صائم بھی چلے آئے۔

نہ آیا تو بس زعیم۔

انزلہ کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ وہ اندر کی کیفیات چھپا کر ان سب کی تواضع میں جت گئی تھی۔ پھر اس کے ساتھ صدف اور نازو بھابھی بھی لگ گئیں۔

میثم اور نقشم کے ساتھ صائم بھی کچھ پراسرار سا چوری چھپے مصروف نظر آ رہا تھا۔

انزلہ نے غور ہی نہ کیا......ہر کوئی معنی خیزی سے اسے دیکھتا۔

بالآخر اس "پُراسراریت" کا عقدہ بھی شام تک کھل گیا۔

جب اچانک زعیم گھر آ گیا۔ اور اباجی کا آنگن ———— بھر گیا۔ زعیم کے آتے ہی چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ زعیم بھی پراسرار سا دکھائی دیتا تھا۔

اس کا جلا کٹا انداز، انزلہ کے دل میں آگ سی بھر دیتا تھا۔ حالانکہ اس کی مخاطب آپا ہوتی تھیں۔

"کہا تھا نا......نازو بھابھی کی میٹرک فیل چچا زاد لے آئیں۔ کم از کم صدف کی کزن مت لائیں۔ اب بھگتیں اس مصیبت کو۔"

زعیم کے الفاظ انزلہ کی آنکھیں نم کر دیتے تھے۔ جی چاہتا تھا۔ اسے منہ پھاڑ کر جواب دے۔ لیکن بڑے صبر اور ضبط کا مظاہرہ کرتی چپ ہو گئی تھی، اس کے حصے کا جواب آپا نے جو دے دیا تھا۔

"ایک بھی انزلہ جیسی ڈھونڈ کر دکھاتے...... ناشکرے، مجھ سے بہت پٹو گے۔" آپا کی ڈپٹ پہ وہ آنکھ بچا کر صدف کو اشارہ کرتا باہر نکل گیا تھا۔

پھر رات کا کھانا سب نے بڑے خوشگوار ماحول میں کھایا تھا۔ میثم، نقشم اور صائم کی شرارتوں میں انزلہ کا کلستا دل بھی بہل گیا۔

میثم انزلہ کی بنائی سویٹ ڈش "اورنج ڈیلائٹ" کے بخیے ادھیڑ رہا تھا۔

"اچھا اس کا نام اورنج ڈیلائٹ کیوں رکھا گیا۔ اس کا سادہ سا نام ہماری زبان میں کسٹرڈ ہونا چاہیے تھا۔ فرنی۔" میثم نے چمچہ بھر کے منہ میں رکھا اور حاضرین کو بھی متوجہ کیا۔

"اسے اورنج ڈیلائٹ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مالٹوں کے رنگ جیسا ہے......اور دن کو اس کی کوئی لائٹ جلتی ہو گی۔" صائم نے بھونڈے انداز میں کہا......علیم نے ان دنوں کے سامنے سے ڈونگا اٹھا لیا تھا پھر اس کو "ڈبے" میں پکایا جاتا ہے۔ تو اسے ڈیلائٹ کہا جاتا ہے۔"

"ایک تو کھائے جا رہے ہو۔ پھر باتیں بھی بنا رہے ہو۔ اب اس پہ تمہارا کوئی حق نہیں۔" علیم کے ڈپٹنے پہ میثم اور صائم منہ بنا کر رہ گئے تھے۔ تاہم عظیم اور زعیم کافی لطف اندوز ہوئے۔

"صائم نے ٹھیک کہا......اس کو ڈبے میں پکایا ہے تو ڈیلائٹ ہوا۔ دن کی روشنی میں چمکنے والا...... لیکن یوں لگتا ہے چینی کی جگہ کڑواہٹ ڈال دی گئی ہے یا تب ہی ذائقہ کڑوا لگتا ہے شاید یہ ہاتھوں کا کمال ہو۔" اس نے صاف انزلہ کو سنایا تھا۔ انزلہ اس

عزت افزائی پہ برہم ہوتی غصے میں اٹھ کر چلی گئی۔

پیچھے سے زعیم کو خوب ہی ڈانٹ پڑی۔ تاہم گرین ٹی کے بعد انزلہ کا موڈ کچھ بہتر ہوا تھا۔ کیونکہ اچانک رات کو عیشم، نقشم، صائم حتیٰ کہ صدف اور علیم کے ساتھ نازو نے بھی تحفے دیے تو وہ حیران رہ گئی۔

انزلہ کی حیرت اس وقت کمال عروج پہ پہنچی تھی جب اماں اور آپا نے بھی اسے گرم سوٹ گفٹ کیے۔

"ان موئے فرنگیوں کے اوچھے تہواروں کو میں مانتی تو نہیں...... پر اپنی بیٹی انزلہ کے لیے کرنا پڑا...... اب عید تو دور تھی، سوچا اسی بہانے ہی سہی۔" اماں نے اسے لپٹا کر ماتھا چوما اور آپا نے بھی نہال ہوتی نگاہوں سے دیکھ کر انزلہ کو پیار کیا۔

"جب ساری بہوؤں کو وش کیا...... ان کی شادی کے پہلے سال میں...... اتنے بھرپور انداز میں تو انزلہ کو کیوں نہیں...... یہ سب نقشم اور عیشم کا کمال ہے۔"

آپا نے مزید بتایا تو وہ الجھی الجھی نگاہوں سے سب کے معنی خیز چہرے دیکھنے لگی۔ زعیم نے کشن منہ پہ رکھا ہوا تھا۔ علیم اخبار دیکھ رہا تھا۔ عظیم البتہ ان کی طرف متوجہ تھا اور مسکرا رہا تھا۔

"اور آئیڈیا کس کا تھا...... وہ جو اتنا اچھوتا...... جس پہ تین گھنٹے ہم نے چوری کا مال اڑایا۔" صائم جو اپنے نظر انداز کیے جانے پہ کلس کر بھانڈا پھوڑنے لگا تھا۔

زعیم کی بروقت مداخلت پہ چپ سا ہو گیا۔ جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ عیشم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"کمینہ! سارے سرپرائز کا بیڑہ غرق کرنے والا تھا۔" وہ زعیم کے کان میں جھکا تو زعیم نے اسے پھر سے گھوری جیسی گولی سے نوازا تھا۔

انزلہ ابھی تک ہونق بنی کھڑی تھی۔ پھر اس نے اماں کے اشارہ کرنے پہ سارے تحائف اٹھائے اور اپنے کمرے میں جانے لگی۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا ایک دم اس کے اوپر سرخ گلابوں کا ڈھیر آن گرا۔ انزلہ تو جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

کیا وہ اپنے ہی کمرے میں غلطی سے آ گئی تھی۔ کیا یہ اس کا کمرہ تھا۔

وہ جیسے ہونق بنی پاگل ہوتی دھڑکنوں کے شور میں ساکت کھڑی تھی۔ اس کے اردگرد پھول ہی پھول تھے۔ سرخ گلابوں پہ شبنمی قطروں سے سجے، نم نم انتہائی دلنشین...... خوشبو سے معطر...... پھول ہی پھول۔

سامنے ہی چھوٹی میز پہ کیک رکھا تھا۔ سرخ کریمی کیک...... دل کی شکل کا۔ اوپر موم بتیاں جل رہی تھیں اور پورا کمرہ گلابوں میں نہایا ہوا تھا۔

انزلہ کو چکر سا آ گیا۔

اس کی سالگرہ تو نہیں تھی...... پھر یہ کیک؟ اور سب کے تحائف؟؟

وہ کسی خواب کی کیفیت میں چلتی ہوئی کیک کے قریب آئی تو کیک پہ کندہ سنہرے حرفوں نے جیسے پورے کا پورا "معمہ" حل کر دیا تھا۔

اس کی شادی کو سال گزر گیا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ گاؤں کے رہنے والے اس کی شادی کی سالگرہ اس طرح منائیں گے۔

اس انوکھے سرپرائز پہ اس کا دل خوشی کے احساس سے لبالب بھر گیا۔ سب کے خلوص، محبت اور اپنائیت نے انزلہ کے دل کو جھکا دیا تھا۔ وہ جیسے ان سب کی محبتوں کے سامنے زیر بار ہو چکی تھی۔ ان سب کی "قرض دار" ہو گئی تھی۔ انزلہ کی آنکھیں دیکھتے ہی دیکھتے نمکین پانی سے لبالب بھر گئی تھیں۔

کیا وہ ان محبتوں کی قابل تھی؟ کیا وہ ان پرخلوص لوگوں کی محبت کا حق ادا کر رہی تھی؟ اپنی زیادتیاں یاد آئیں تو دل بھر بھر آیا۔ اپنا وہ ابتدائی روکھا رویہ اور اکھڑا انداز...... اس کے آنسو گالوں پہ پھسلتے چلے گئے تھے۔

معاً دروازہ کھلا اور کوئی چپکے سے انزلہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے جھکے سر کو اٹھایا تو سامنے زعیم کو پایا...... اس کا دل اور شدت سے رونے کو چاہا تھا۔ مگر خود پہ ضبط کے بندھ باندھے کھڑی رہی تھی۔ ساکت، جامد اور بے حس۔

بس دونوں کے درمیان خاموشی بول رہی تھی۔ بولتی جا رہی تھی۔

اس معنی خیز خاموشی کو بالآخر زعیم نے توڑا تھا۔

"انزلہ!" اس نے بڑے میٹھے لہجے میں انزلہ کو پکارا۔ انزلہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے زعیم کو دیکھا تھا۔ پھر بے ساختہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ شاید ناراضی کا اظہار تھا۔ زعیم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

ایک بات تو سمجھ میں آ گئی تھی۔ غلطی چاہے انزلہ کی ہوتی یا زعیم کی۔ معافی صرف زعیم کو ہی مانگنا تھی۔ یہ شاید لکھا جا چکا تھا۔ انزلہ کی لغت میں۔

زعیم گہرا سانس بھرتا ایک مرتبہ پھر انزلہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اب کہ انزلہ نے دوبارہ رخ نہیں موڑا تھا۔ زعیم کچھ دیر سوچتا رہا پھر انزلہ کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ تک آ گیا۔ اس کو بیڈ پہ بیٹھا کر خود نیچے دوزانو کارپٹ پہ بیٹھ چکا تھا۔ یوں کہ انزلہ کے گھٹنوں پہ زعیم نے ہاتھ رکھ لیے تھے۔ جیسے اس کے بھاگنے کی ہر کوشش کو روکنا چاہتا ہو۔

"ناراض ہو۔" اس نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیا نہیں ہونا چاہیے۔" انزلہ نے سوں سوں کرتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔

"کیوں نہیں میری جان! ناراض ہونے کا صرف تمہیں ہی تو حق ہے۔ شوق سے ہوتی رہو۔ خادم موجود تو ہے منانے کے لیے۔" زعیم کا ہلکا پھلکا لہجہ بتا رہا تھا کہ — وہ پچھلی ناراضیوں کو طول دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

"اب کیا لینے آئے ہیں۔ یہاں مار دھاڑ کر چلے تو گئے تھے۔" وہ ابھی تک تھپڑ کو بھولی نہیں تھی۔ زعیم نے بے ساختہ آنکھیں میچیں۔

"آ گیا ہوں نا...... تم بدلے لے لو۔" اس کا جواب انزلہ کی توقع کے خلاف تھا۔

"کیا معافی نہیں مل سکتی۔" اس نے مسکین شکل بنا کر جیسے گزارش کی تھی۔ انزلہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زعیم کا شفاف چہرہ روشن دن کی طرح چمک رہا تھا۔ انزلہ نے بے ساختہ نگاہیں چرائیں۔

"اپنے اس عاشق صادق کو معاف کر دو۔ تمہاری جدائی میں سلگ سلگ کر آدھا ہو چکا ہوں۔ اب مزید برداشت نہیں کر سکتا۔" اس کے چہرے پہ سچائی صاف لکھی تھی۔ انزلہ کا ہمکتا دل کچھ اور اترایا۔

"کیا میں جانتی نہیں کہ آپ مجھ سے شادی پہ کتنا معترض تھے۔" انزلہ کو گزشتہ سارے قصے اور شکوے ابھی یاد آ رہے تھے۔ زعیم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

وہ بہت پرانی بات کر رہی تھی۔ اس وقت کی جب ان کے گھر میں زعیم کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی مہم شروع ہو رہی تھی۔

تب زعیم کی آپا کے سامنے زعیم کے لیے پہلا اور آخری انتخاب بس انزلہ کی صورت تھا۔ انہوں نے انزلہ کو اس گھر میں لانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ حالانکہ صدف تک متذبذب تھی اور زعیم بالکل نہیں مان رہا تھا۔

لیکن آپا نے اس کے کسی "انکار" پہ کان نہیں دھرے تھے...... انزلہ کو اس گھر میں لا کر ہی دم لیا تھا۔ صدف کو یہ اعتراض تھا کہ انزلہ کا مزاج تھوڑا گرم ہے۔ وہ شاید یہاں ایڈجسٹ نہ کر سکے۔

اور خود زعیم کو انزلہ پہ اعتراض نہیں...... اعتراضات تھے۔

ان اعتراضات تک پہنچنے کے لیے کچھ پیچھے کا سفر کرنا پڑا تھا۔ تاہم اس کی بدگمانی دور کرنے کے لیے یہ بہت ہی ضروری امر تھا۔

زعیم کو گلا کھنکھار کے بتانا ہی پڑا۔

"یہ بات اتنی پرانی نہیں کہ تم بھول چکی ہو۔ تمہیں بھی یاد ہی ہو گا۔ صدف کا ولیمہ...... جی ہاں صدف، تمہاری کزن کا ولیمہ...... جو یہاں گاؤں میں منعقد کیا گیا تھا۔ گاؤں کے رواج اور برادری کے

اصرار کی وجہ سے۔

اور شہر سے آئے تھے ہمارے معزز مہمان...... صدف کے گھر والے، عزیز و اقارب......اور ان میں ایک طرح دار ماڈرن دوشیزہ بھی تھی۔ نخوت سے ناک چڑھاتی۔ اکڑ کر چلتی ہوئی۔ دیہاتی لوگوں کو ناگواری اور بیزاری سے دیکھتی ہوئی۔ پورے فنکشن میں اکھڑی اکھڑی۔ ایک کونے میں سب سے کٹ کر الگ تھلگ بیٹھی۔ جی، وہ صدف کی کزن تھی انزلہ۔

جس کا غصے اور بیزاری سے منہ پھولا ہوا تھا۔ جیسے اس ماحول میں سخت تکلیف کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مجبوراً دل پر پتھر رکھ کے اور اس کے الفاظ مجھے اتنے عرصے تک نہیں بھولے تھے۔ مجھے یعنی زعیم عباسی کو۔

اس لڑکی نے یعنی مغرور ترین خود پسند لڑکی نے کیا کہا تھا۔

''ایسے گھٹیا اور جاہل لوگوں میں تائی امی نے صدف کی شادی کردی ہے۔ ایک بھی ڈھنگ کا پڑھا لکھا بندہ نظر نہیں آرہا۔ کتنے چیپ لوگ ہیں۔ تہبند میں ملبوس، اجڈ، گنوار، دیہاتی ......اور عورتیں دیکھو، ......سستے پاؤڈر میں لتھڑی زیورات کی دکان بنی ......کھانے کی تمیز تک نہیں ان لوگوں کو بوٹیوں پہ ٹوٹ پڑے ہیں۔ جیسے کبھی کھانا نہ دیکھا ہو جاہل لوگ بے ہودہ بچے اور گندا سا سیٹ اپ ......اب تو دیہاتی لوگ بھی شہروں میں ہوٹل بک کروا کے شادیاں کرتے ہیں۔ ان جاہلوں کو اتنی بھی عقل نہیں...... کمینے اور کنجوس لوگ مجھے نہیں لگتا، صدف ان پینڈوؤں میں رہ سکے گی۔ میں تو لعنت بھیجوں ایسے لوگوں پہ......اور ایسے پرپوزلز پہ جس بندے کا بیک گراؤنڈ ہی اچھا نہ ہو۔''

وہ لڑکی بہت اونچا بول رہی تھی۔ بہت بدتہذیبی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ یوں کہ اردگرد کے لوگ بھی متوجہ ہو رہے تھے۔

میں نے یہ سب کیسے سنا؟ مجھ تک کیسے پہنچا...... شاید تمہیں معلوم نہ ہو......شاید تمہارے گمان میں بھی نہ ہو۔'' زعیم بولتے بولتے لمحہ بھر کے لیے رکا تو انزلہ کی بہتی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔

وہ جیسے ہکا بکا ہو گئی تھی۔

زعیم نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے اپنے یہ الفاظ بھولے نہیں تھے۔ اسے سب یاد تھا۔ اپنا کہا ایک ایک لفظ یاد تھا۔

لیکن وہ حیران تھی۔ زعیم کو یہ سب کس نے بتایا تھا تب تو پورے فنکشن میں اسے ایک بھی ڈھنگ کا بندہ نظر نہیں آیا تھا۔ تو پھر زعیم کہاں تھا؟ اس کی حیرانی کو محسوس کر کے زعیم نے خود ہی بتا دیا۔

''میں تب دوسری طرف تھا۔ مردانے میں اور بیچ میں پارٹیشن تھی۔ زنانہ حصہ الگ تھا اور مردانہ حصہ الگ ......اور تم ٹینٹ کے بالکل ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھی۔ تمہاری آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ اور میرا غصے، توہین کے مارے برا حال تھا۔ تب میں شدید غصے میں اٹھا تھا۔ تاکہ نظارہ تو کر کے آؤں آخراتنی بکواس کرنے والی خاتون ہے کون۔

جب میں دوسری طرف آیا تو تم وہاں سے اٹھ رہی تھیں۔ تمہاری امی بھی ساتھ تھیں۔ تب میں خود پر قابو پاتا باہر چلا گیا۔

بعد میں صدف سے تمہارے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔ مجھے تم تب اچھی نہیں لگی تھیں۔ لیکن آپا کا تم پہ دل آگیا اور انہوں نے تمہیں اس گھر میں لانے کی ضد ٹھان لی۔ میں ایک مغرور اور خود پسند لڑکی سے کبھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے انکار کی بس یہی وجہ تھی۔ لیکن شادی کے بعد میں نے تمہیں مختلف رنگوں میں پایا ہے۔ ان میں ایک رنگ تو بہت ہی گہرا ہے۔''

زعیم نے پوری روداد سنائی تو انزلہ کا سر جھک گیا تھا۔ ڈھیر ساری ندامت نے اسے آن گھیرا تھا۔

انزلہ کی نکھری ہوئی شرمندگی پہ زعیم دھیرے سے مسکرایا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر انزلہ کی جان میں جان آئی تھی۔

''تو میرا کون سا رنگ گہرا ہے۔'' انزلہ کا اعتماد بحال ہوا تو اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''اصل میں تم مغرور، خود پسند تو ہو ہی۔ پر تم میں بے وقوفی کا رنگ بہت گہرا ہے۔ اللہ کی قسم! جذبوں کو بالکل نہیں سمجھتیں۔ یہ اتنی لمبی کتھا تو سنا ڈالی ہے اور اب کتنا ''اظہار محبت'' اور چاہتی ہو۔''

زعیم نے بے ساختہ اسے چھیڑا تو وہ ہنستے ہوئے میز تک آگئی تھی۔ چھوٹا سا خوب صورت کیک سجا منتظر تھا۔ انزلہ نے چھری پکڑ کے کیک کاٹا...... اور ایک پیس زعیم کی طرف بڑھایا۔ پھر اس کا بچا ہوا کیک اپنے منہ میں رکھ لیا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا...... آپ مجھے اتنے رومینٹک انداز میں بھی منا سکتے ہیں۔'' زعیم کی شرارتوں پہ سرخ پڑتی وہ گھبرا کر بمشکل بول پائی تھی۔

سرخ گلاب، مزے دار کیک، جلتی ہوئی موم بتیاں اور زعیم کی محبت، انزلہ تو جیسے پور پور سرشار ہو چکی تھی۔

اسے اپنی بے وقوفیاں یاد آئیں اور وہ ساری لڑائیاں، غصہ، جھڑپیں۔ امی اور بھائیوں سے ناراضی......وہ کتنی احمق تھی جو سمجھ ہی نہ سکی۔

بھلا امی اور بھائی اس کے لیے کچھ غلط سوچ سکتے تھے؟ کوئی غلط فیصلہ کر سکتے تھے؟ وہ کس قدر ان لوگوں سے بھی بدگمان تھی۔

اسے بہت ساری باتوں پہ پشیمانی تھی اور اب ازالہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے سوچا، وہ صبح اپنی امی اور بھائیوں کا شکریہ ادا کرے گی لیکن اس وقت انزلہ پہ سجدۂ شکر واجب تھا۔ اسے سب سے پہلے نوافل ادا کرنے تھے۔ اور زعیم کے رومانس کے طویل ہونے سے پہلے ادیبہ کو بھی شکریہ کا میسج کرنا تھا مگر اس سے بھی پہلے۔ دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔ اور ایک لشکر اندر امڈ آیا۔

میثم اور نقشم چلا رہے تھے۔ اور صائم کیک پہ ٹوٹ پڑا تھا۔

''کتنا کمینہ ہے تو! اکیلے اکیلے کیک کاٹ لیا۔ ہمیں یاد تک نہ کیا۔ بے وفا، ذلیل! اللہ دتہ چاچے کے سارے پھول ''اڑا'' کرلائے ہیں۔

پورا کمرہ پھولوں سے سجایا۔ کیک بنوایا تیرے لیے اتنا رومینٹک ''سیٹ'' تیار کیا اور تو ہمیں بھول گیا پورا کمینہ ہے تو۔'' میثم جلبلا رہا تھا......زعیم قہقہہ لگا رہا تھا......باقی سب کے چہروں پہ مسکراہٹ تھی۔

نقشم نے بیک گراؤنڈ میں میوزک چلا دیا...... کمرے میں مدھری دھن بکھرنے لگی تھی اور جیسے تازہ گلاب کی کلیاں کھلنے لگی تھیں۔ زرد، اداسی اور بدگمانی کے دن گزر چکے تھے۔ یقین بھری رات سایہ فگن تھی۔

اور اسے کہیں دور خلیل جبران کی بات یاد آرہی تھی اور بڑے ہی بھلے وقت میں یاد آرہی تھی۔

''محبت آسمانوں سے سیدھی دلوں پہ وارد ہوتی ہے۔''

اگر خلیل جبران کہتا تھا تو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ انزلہ کی کیا مجال تھی جو انحراف کرتی۔

☆

ناولٹ

نفیسہ سعید



"دیکھو بیٹا! شادی تو آخر کرنا ہی ہے تو پھر کیا حرج ہے جو اگر عانیہ سے ہی کرلی جائے' گھر کی دیکھی بھالی بچی ہے اور پھر ثوبیہ بھی تم سے امید لگائے بیٹھی ہے۔" رافعہ نے موقع ملتے ہی زادان کو ایک بار پھر سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بلاشبہ عانیہ اچھی لڑکی ہے اس سے مجھے بالکل انکار نہیں' لیکن میں اس سے شادی نہیں کرسکتا کیونکہ وہ میرے شادی کے معیار پر پوری نہیں اتری۔"

"ایسا کون سا تمہارا شادی کا معیار ہے جس پر میری بہن پوری نہیں اترتی۔" ثوبیہ بھابھی کب ان کے پیچھے آکر کھڑی ہوئیں' دونوں ماں بیٹا کو اپنی گفتگو کے دوران اندازہ ہی نہ ہوا۔ اب جو ان کی آواز "زادان" کے کانوں سے ٹکرائی تو امی کے ساتھ ساتھ وہ بھی شرمندہ ہوگیا۔

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا بھابھی۔" وہ فوراً" ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا ثوبیہ کے قریب جا پہنچا۔

"تم تو رہنے ہی دو' جانے کون سے راجہ اندر بنے پھرتے ہو۔ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے' ساری زندگی بھائیوں کی کمائی پر عیش کرنے والے' ابھی خود کہیں کوئی آفیسر لگے ہوتے اور ایسی باتیں بناتے تو اچھا بھی لگتا۔" اپنی بہن کے سلسلے میں ہونی والی گفتگو کا شاید آخری جملہ ہی ثوبیہ کے کانوں میں پڑا تھا۔ جس نے اس کا پارہ سوا نیزے پر پہنچادیا اور اس کی اس تلخ کلامی کے ساتھ ہی زادان کی نظروں کے سامنے عانیہ کا چہرہ گھوم گیا' جو زبان کی تیزی میں اپنی دونوں بہنوں کو مات دیتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کوکنگ' سلائی نیز ہر ہنر میں ماہر تھی۔ بے شک وہ جسمانی طور پر بھی خاصی صحت مند تھی۔ اس کے باوجود زادان اسے قبول کرلیتا اگر جو وہ مزاج میں ثوبیہ بھابھی اور سمیعہ بھابھی سے مختلف ہوتی' مگر افسوس وہ اس گن میں اپنی دونوں بہنوں سے آگے تھی۔

"اللہ نے شکل کیا اچھی دے دی' صاحبزادے کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" یہ **سمیعہ** بھابھی تھیں جو ہر جگہ اپنی بڑی بہن کا ساتھ دینے آن موجود ہوتیں۔

"اس نے ایسا کیا کہہ دیا ہو! جو تم دونوں کا مزاج اس قدر برہم ہوگیا؟" زادان نے پلٹ کر اپنی بیوہ ماں کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جو جانے پچھلے کتنے سالوں سے دو جوان بیاہے بیٹوں کی ماں ہونے کی سزا بھگت رہی تھیں۔ ابا جی کے فوت ہونے کے بعد اس کے دونوں بھائی آبائی گھر بیچ کر ان ماں بیٹے کو اپنے ساتھ اس گھر میں لے آئے تھے۔

اس وقت شاید وہ چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ تب سے اب تک اس کی تعلیم کا خرچا بھائیوں نے ہی اٹھا رکھا تھا۔ جس پر وقتاً" فوقتاً" دونوں بھابھیاں جو آپس میں بہنیں بھی تھیں' اسے باتیں سناتی رہتیں۔ وقت اور حالات نے زادان اور رافعہ بیگم کو خاصا متحمل مزاج بنادیا تھا یا شاید دونوں اس گفتگو کے عادی ہوچکے تھے اور ان کی برداشت اور تحمل مزاجی کا فائدہ

دونوں بھابھیاں بخوبی اٹھا رہی تھیں۔ رافعہ کی تو شروع سے ہی عادت تھی کبھی کوئی غلط بات جو بہوؤں کے حوالے سے ہو بیٹوں تک نہ جانے دیتیں تاکہ ان کے دل آپس میں خراب نہ ہوں، مگر مجال ہے ان کی اس خوبی کا اعتراف کبھی کسی بہو یا بیٹے نے کیا ہو۔ جب کہ زادان جانتا تھا کہ اس کے دونوں بھائی اپنی بیویوں کی تمام حرکات سے اچھی طرح واقف ہیں۔

"شکل اچھی ہونے سے کیا ہوتا ہے جب پلے پیسہ ہی نہ ہو۔" وہ اپنی سوچوں میں گم تھا تب سمیعہ بھابھی کی آواز ایک بار پھر اس کے کان سے ٹکرائی۔

"پیسہ بھی آجائے گا بھابھی! پہلے تعلیم تو مکمل ہو جائے۔" اپنے لہجہ کو حتی الامکان نرم بناتا وہ مسکرا کر بولا۔ تاکہ ماحول کی تلخی کچھ کم ہو سکے۔

"پتا نہیں ابھی اور تعلیم پر کتنا روپیہ خرچ ہوگا۔ ہم تو وہ ہی پورا کر کے ختم ہو گئے اپنی ضروریات پس پشت ڈال کر بھائی اس لاڈلے کی مہنگی تعلیم کا خرچہ اٹھا رہے ہیں اور انہیں دیکھو احسان فراموش لوگ۔"

"میری تعلیم کا خرچا پورا کر کے کوئی مجھ پر احسان نہیں کر رہا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی زادان کو غصہ آہی گیا رافعہ بیگم نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"جانے دو بہو! اتنا غصہ مت کرو۔ میں اس سے بات کر کے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بات مزید آگے بڑھے۔

"رہنے دیں اماں! ہماری بہن کے لیے بھتیرے رشتہ ہیں وہ تو ہم ہی بے وقوف تھے جو چاہتے تھے کہ اس نکمے کا مقدر بھی سنور جائے۔ وہ تو پارس ہے۔ جسے چھوئے گی سونا بنا دے گی اور ہاں تم میں ذرا بھی غیرت ہے نا تو اپنے بھائیوں کی کمائی پر عیاشی کرنے کے بجائے خود کما کر دکھاؤ۔"

امی کو باتیں سناتی سمیعہ بھابھی یک دم اس کی جانب پلٹیں۔

"اور پھر کوشش کرنا ست پھلاں رانی بیاہ کر اس گھر میں لانے کی۔ تاکہ ہمیں علم ہو کہ ہماری باتوں نے تمہارے اندر سوئی ہوئی غیرت کو جگا دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں تم بے مثال حسن کی ملکہ کو دل کی رانی بنا کر لائے ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ دونوں رکی نہیں اور دھپ دھپ کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"آپ نے مجھے کیوں خاموش کروا دیا؟" میدان صاف ہوتا دیکھتے ہی زادان نے ماں سے گلہ کیا۔

"میرے باپ کا اتنا پیسہ آخر کہاں گیا؟ کیا میرے حصہ میں صرف وہ چند ہزار روپے ہی تھے جو ہر سمسٹر کی فیس کے طور پر جمع کروائے جاتے ہیں۔"

"صرف سمسٹر کی فیس نہیں بیٹا! تمہارے اسکول، کالج، ٹیوشن، وین، رہائش غرض کہ ہر خرچا تمہارے باپ کے بعد بھائیوں نے ہی اٹھایا ہے اور اب یونیورسٹی کے ہر سمسٹر میں فیس کے نام پر جمع ہونے والے لاکھوں روپے بھی وہ دونوں ہی بھر رہے ہیں۔ تمہارا کپڑا لتا اور کھانا پینا بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔"

رافعہ ماں تھیں نہیں چاہتی تھیں کہ بیٹے کا دل بڑے بھائیوں سے خراب ہو اور آپس میں لحاظ مروت ختم ہو جائے۔

"ایسا ہے تو پھر آج کے بعد میں ان سے ایک روپیہ نہیں لوں گا کیونکہ میں اب مزید کسی کی کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا۔"

زادان غصہ میں کہتا کمرہ سے باہر نکل گیا۔ رافعہ نے چاہا کہ آواز دے کر اسے روک لیں، مگر پھر یہ سوچا کہ شام تک غصہ اتر جائے گا تو یقیناً گھر ہی لوٹ کر آئے گا، مگر ایسا نہ ہوا شام سے رات ہو گئی۔ زادان گھر نہ لوٹا۔ یہاں تک کہ اس کا موبائل بھی بند تھا اور اس بات نے ماں کے ساتھ دونوں بھائیوں کے بھی ہاتھ پیر پھلا دیے۔ جب کہ بھابھیاں مطمئن تھیں انہیں ابھی بھی یقین تھا کہ آرام پسندی کا عادی دیور حالات کی سختی دو چار دن سے زیادہ برداشت نہ کر سکے گا اور آخر کار لوٹ کر اپنے ہی گھر واپس آئے گا کہ آخر جانا کہاں ہے۔

☆ ☆ ☆

"رانی او رانی! کم بخت، منحوس کہاں مر گئی ہے؟ چھت پر چار کپڑے کیا ڈالنے گئی، واپس آنا ہی بھول گئی۔"

نیچے سے آنے والی چیخ و پکار کی آواز سن کر رانی نے نہایت اطمینان سے چھت کی منڈیر پر کھڑے ہو کر جھانکا۔ جہاں اس کی سوتیلی ماں زہرہ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ دھرے، اسے زوردار آواز سے گالیاں دے رہی تھی۔ مغلظات بکنے کے دوران اس کے چہرے کے بگڑتے زاویہ دیکھ کر رانی بے اختیار ہنسی ــــ وہ نہایت اطمینان سے منڈیر سے نیچے اتری، ہاتھ میں پکڑا رسالہ اندر اسٹور میں رکھی بستروں والی الماری میں چھپایا اور خالی بالٹی اٹھا کر دھپ دھپ کرتی نیچے اتر گئی۔

"کیا بات ہے اماں! کیوں اتنا رولا ڈال رہی ہے؟" نیچے اترتے اترتے اس کے کانوں میں اپنے بارہ سالہ بھائی علی احمد کی آواز آئی جو غالباً ماں کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

"ارے یہ منحوس ایک گھنٹے پہلے اوپر کپڑے ڈالنے گئی تھی اور جا کر گم ہو گئی۔ جانے اوپر ایسا کون سا خزانہ دبا ہے جو سارا وقت کھوجتی رہتی ہے۔"

"اوپر آکر دیکھ لیتیں اگر خزانہ مل جاتا تو اس میں سے تمہیں بھی حصہ دے دیتی۔"

بالٹی کو صحن میں زوردار آواز سے تقریباً پٹختے ہوئے وہ ماں کی جانب پلٹی۔

"میرے اندر کوئی مشین نہیں لگی جو پھرکی کی طرح سارے گھر کے کام کروں۔ اٹھاؤ اپنی مہارانی کو اوپر جا کر کپڑے ڈال کر آئے اب میں مزید چھت پر نہیں جا سکتی۔ بالٹی بھر بھر کر تین چکر اوپر گئی ہوں تا نگیں شل ہو گئیں۔ یہاں باتیں بنانا ہی کم نہیں ہو رہا۔"

"میرے اوپر کوئی احسان نہیں کیا تم نے اگر گھر کے کام میں ہاتھ بٹایا ہے تو یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ مفت کی روٹیاں توڑ رہی ہو اس گھر میں تم، ماں خود تو چھوڑ کر بھاگ گئی اور نکما جواری باپ اور بدزبان بیٹی میرے حوالے کر گئی۔"

وہ بھی زہرہ جہاں تھی بھلا چھٹانک بھر چھوکری سے کیسے اتنی باتیں سنتی۔

"ایکسکیوز می اماں! اپنا جملہ ٹھیک کر میری ماں اس گھر سے بھاگی نہیں تھی بلکہ آپ نے ابا سے عشق چلا کر اسے گھر سے نکالا ہے تمہاری محبت میں خوار میرا باپ سب کچھ بھلا کر اپنا ہنستا بستا گھر برباد کر بیٹھا اور وہ جواری تھا یا نکما۔ تم سب جانتی تھیں پھر کیا ضرورت تھی عشق کی پینگیں بڑھانے کی۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں بلکہ تیزی سے چلتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ بچی نہ تھی جب سلامت نے عشق بازی کر کے زہرہ سے بیاہ کیا اور نتیجہ میں اس کی مظلوم ماں کو بے گھر ہونا پڑا۔ دس سال پرانی بات تھی جو اسے ہمیشہ کل ہی کی لگتی، جب ایک دن اس کا باپ ایک عورت اور دو سالہ بچے کو لے کر گھر آیا تھا اور آتے ہی دھماکے کی طرح یہ خبر سنائی تھی کہ یہ عورت اس کی بیوی ہے جس کی گود میں اس کا بیٹا ہے۔ اس وقت نرما عرف رانی محض بارہ سال کی تھی جبکہ اس کی چھوٹی بہن ریما آٹھ سال کی۔"

غصے میں اس کی ماں اپنا بسا بسایا گھر چھوڑ کر بھائی کے گھر جا بیٹھی۔ ریما بھی ماں کے ساتھ ہی چلی گئی لیکن ماں کے لاکھ چاہنے پر بھی رانی نے باپ کا گھر نہ چھوڑا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں کے اتنی محبت سے بنائے گھر میں کوئی غیر عورت آکر عیاشی کرے۔ یہ ہی سبب تھا جو وہ پچھلے دس سالوں سے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ زہرہ جہاں کی ہر بات نہ صرف برداشت کر رہی تھی بلکہ پوری طرح اس کا مقابلہ بھی ڈٹ کر کرتی۔ اس گھر میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے

رانی نے ہر قدم پر اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ غلط تھی جس نے اپنی اندھی محبت میں ڈوب کر ایک شادی شدہ شخص سے محبت کا کھیل کھیلا اور اس کا بسا بسایا گھر برباد کردیا۔ اپنی ماں کی بے کھری کا بدلہ وہ زہرہ کو ذلیل کرکے لیتی جس پر اسے ہمیشہ ہی تسکین ملتی۔

✡ ✡ ✡

ساری رات اور دن گزر گیا۔ زاوان گھر نہ آیا اور یہ سارا وقت سب نے جیسے سولی پر گزارا۔ اس کا فون بدستور بند جارہا تھا جبکہ فہد اور حماد اس کے سارے دوستوں کے گھر سے بھی پوچھ چکے تھے وہ کہیں نہ تھا۔ اب جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ ماں کے ساتھ بھائی بھی پریشانی میں گھر گئے۔ رات گئے جب فہد نے تھانے جاکر رپورٹ درج کروانے کا حتمی فیصلہ کیا تب ہی زاوان کی کال آگئی جو کسی انجان نمبر سے تھی۔

"السلام علیکم بھائی! مجھے امی سے بات کرنی ہے۔"

فہد کے فون ریسیو کرتے ہی وہ قدرے اجنبی لہجہ میں مخاطب ہوا۔

"کہاں ہو تم؟ جانتے ہو ہم سب کس قدر پریشان ہیں؟" اس کی آواز سنتے ہی فہد غصے سے چلایا۔

"ایکسکیوز می! آپ پلیز میری امی سے بات کروادیں ورنہ انہیں یہ بتادیں کہ میں جہاں ہوں ...؟"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ رافعہ فہد کے ہاتھ سے فون تھام کر ریسیور کان سے لگاتے ہی بول اٹھیں۔

"میرے بچے کہاں ہو تم گھر واپس آجاؤ۔ اپنی ماں کو اس قدر پریشان نہ کرو۔"

"پلیز اماں! آپ روئیں مت۔ میں جہاں بھی ہوں بالکل خیریت سے ہوں اور ان شاء اللہ گھر بھی واپس آجاؤں گا مگر اس وقت جب خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنے ساتھ ساتھ آپ کا بوجھ اٹھانے کے بھی قابل ہوجاؤں گا۔ آپ دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے جلد ہی میرے مقصد میں کامیاب کرے۔"

"لیکن بیٹا! یہ تو بتادو تم کہاں ہو؟ تمہارے امتحانات سر پر ہیں۔ آخری سمسٹر ہے بیٹا! کیوں ضد میں آکر اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔ اپنا مستقبل داؤ پر مت لگاؤ اور گھر واپس آجاؤ۔"

"آپ گھبرائیں مت، میں اپنا سمسٹر ڈراپ نہیں کررہا۔ ان شاء اللہ وقت پر تمام پرچے دوں گا۔ آپ میری کامیابی کی دعا کریں۔ ویسے میں نے ایک دو جگہ نوکری کے لیے بھی درخواست دے دی ہے مجھے امید ہے کہ جلد ہی مجھے جاب مل جائے گی۔ اچھا امی آپ اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ پھر بات کریں گے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کردیا۔

"شکر اللہ کا میرا بیٹا صحیح سلامت ہے بس ناراض ہے۔ کہتا ہے کہ اب کچھ بن کر ہی گھر واپس آؤں گا۔"

رافعہ دھیمی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے پاؤں میں چپل پہن کر اٹھ کھڑی ہوئیں تاکہ وضو کرکے دو نفل شکرانے کے ادا کرسکیں جب ان کے کان سے ثوبیہ کی آواز ٹکرائی۔

"لو جی ساری زندگی بھائیوں نے اپنی کمائی دونوں ہاتھوں سے شہزادے کی تعلیم پر لگائی کہ کل کو سی اے کرکے بڑا افسر بن جائے گا اور کچھ ہمارے دن بھی بدل جائیں گے مگر یہاں احسان فراموشی کا یہ عالم ہے کہ جہاں منزل قریب نظر آئی وہاں بھائیوں کو لات مار کر مہاراجہ اپنی نئی دنیا دریافت کرنے چل پڑے۔ واہ جی واہ عقل ہو تو ایسی۔"

"خاموش ہوجاؤ ثوبیہ! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

باتھ روم میں داخل ہوتے سمے ان کے کان میں فہد کی بے بس آواز آئی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی زبان بھی نہیں روک سکتا اگر ایسا ممکن ہوتا تو ان کا جوان جہاں بیٹا اس طرح گھر چھوڑ کر دربدر نہ پھرتا۔

✡ ✡ ✡

"یہ لو تمہارا اپائنٹمنٹ لیٹر اور انکل نے کہا ہے کہ تم کل سے ہی آفس جوائن کرلو۔" شاہ زیب نے اپنے ہاتھ میں پکڑا لفافہ زاوان کی جانب بڑھایا جسے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

"تھینک یو یار، بہت بہت شکریہ، سمجھ میں نہیں آرہا میں تمہارا یہ احسان کس طرح ادا کروں، ساری زندگی کے لیے قرض دار کردیا تم نے مجھے اپنا۔"

"فضول باتیں مت کرو، یہ کوئی احسان نہیں ہے تم خود اتنے قابل ہو کہ کوئی بھی ادارہ تمہیں آرام سے ملازمت دے دے گا۔ بات صرف اتنی ہے کہ آج تک تم نے اسے کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں ورنہ اب تک جانے کتنی ترقی کرچکے ہوتے۔"

"تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ امی نے کبھی مجھے ملازمت کی اجازت نہ دی۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کرلوں پھر کہیں نوکری کروں۔ یہ تو اب حالات ایسے ہوگئے کہ مجھے محسوس ہوا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے۔"

"شکر ہے، تمہیں اس بات کا احساس ہوا ورنہ میرے خیال میں تو تمہیں بہت پہلے سے ہی ملازمت شروع کردینی چاہیے تھی جیسے کہ ہم سب کررہے ہیں بہرحال دیر آید درست آید اور ہاں میں نے تمہاری رہائش کا انتظام بھی کردیا ہے۔ ایک جاننے والی خاتون ہیں ان کے گھر کی چھت پر ایک کمرہ بنا ہوا ہے جس کی سیڑھیاں گھر کے باہر سے نکلتی ہیں۔ ضرورت کے تحت وہ اسے کرایہ پر دینا چاہتی ہیں۔ خاصی لالچی خاتون ہیں کرایہ کے ساتھ انہیں ماہانہ کچھ اضافی رقم بھی دے دینا تاکہ وہ تمہیں صبح ناشتا اور رات کا کھانا بھی دے دیں گی۔"

نوکری کے ساتھ ساتھ شاہ زیب نے زاوان کی ایک اور بڑی مشکل اتنی آسانی سے حل کردی اسے یقین ہی نہ آیا۔

"واہ یار! جیو ہزاروں سال، دوست ہو تو تمہارے جیسا۔"

اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے بے اختیار ہی شاہ زیب کو گلے لگالیا۔

✡ ✡ ✡

"السلام علیکم آنٹی کیسی ہیں آپ!" وہ نماز پڑھ کر اٹھی ہی تھیں جب زوردار آواز سے دروازہ کھولتی عانیہ اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم السلام بیٹا جیتی رہو۔" جائے نماز لپیٹتے ہوئے انہوں نے اسے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

"آجائیں، میں آپ کے سر میں تیل ڈال کر مالش کردوں۔"

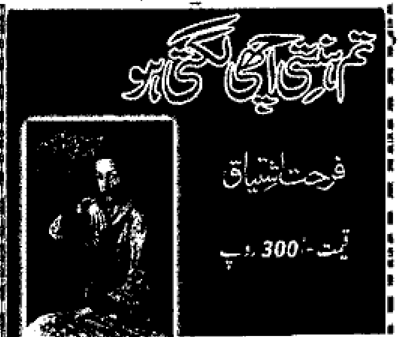
رافعہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اسی پل ان کی نگاہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی سمیعہ پر پڑی جسے دیکھتے ہی وہ فوراً سمجھ گئیں کہ یہ نیا سبق اسی کا پڑھایا ہوا ہے کہ بیٹا قابو کرنے کے لیے پہلے ماں کو قابو کرو کیونکہ گھر کا بھیدی ہونے کے ناتے وہ جانتی تھی کہ زاوان کی جان اپنی ماں میں ہے مگر بے خبر یہ نہ جانتی تھی کہ رافعہ اپنی مرضی پوری کرنے کے لیے اپنے لاڈلے کے ارمانوں کا خون نہ کرسکتی تھیں کیونکہ وہ سمجھ چکی تھیں کہ زاوان کو عانیہ قطعی ناپسند ہے۔

"نہیں بیٹا! رہنے دو میں نے ابھی نہا کر بالوں میں تیل ڈالا ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" تیل کی بوتل ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ دھپ سے ان کے قریب آن بیٹھی۔

"آنٹی! زاوان کیسا ہے؟ آپ کی اس سے بات ہوئی؟"

"اوہ!" اب ساری بات ان کی سمجھ میں آئی۔ عانیہ کو کمرے میں بھیجنے کا اصل مقصد دراصل یہ جاننا تھا کہ زاوان کہاں اور کن حالوں میں ہے کیونکہ وہ سوائے



اپنی ماں کے کسی سے رابطہ میں نہ تھا۔

"ہاں بیٹا! اللہ کا شکر ہے' وہ بالکل ٹھیک ہے اور جلد ہی واپس اپنے گھر آجائے گا۔"

"کون سا اپنا گھر؟" اسی پل دروازہ کھول کر سمیعہ کمرے میں داخل ہوئی۔ "یہ گھر اس کا نہیں ہے بلکہ ہمارا ہے جہاں اب وہ ہماری مرضی کے بنا نہیں آسکتا سوائے ایک شرط کے اور وہ شرط کیا ہے یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"اُفوہ آپا! آپ تو چپ کریں' بلاوجہ ہماری باتوں میں کیوں گھس رہی ہیں۔" سمیعہ کی آواز سنتے ہی عانیہ قدرے بے زاری سے بولی۔

"واہ بھئی صدقے جاؤں ایسی کون سی تمہاری باتیں ہیں جن میں مَیں ناچیز گھس رہی ہوں۔"

اب اس کی توپوں کا رخ اپنی بہن کی جانب ہو گیا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اکثر ہی ایسا ہوتا جب آپس میں بے حد پیار جتلاتی تینوں بہنیں معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے تکرار کرتی نظر آتیں۔

"ایک تو آپ سے کوئی بات کرنا مشکل ہے' سمجھ آپ کے پاس ہے نہیں اور کوئی سمجھائے تو آپ سمجھنا نہیں چاہتیں۔" اپنا فربہی مائل جسم سنبھالتی عانیہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لو جی یہ ایک اور آگئیں سمجھ دار۔"

"بس کر جاؤ بہو! کیوں بلاوجہ اتنا ہنگامہ کر رہی ہو۔"

"کرنے دیں آنٹی! انہیں عادت ہے۔ آپ بتائیں چائے پئیں گی میں بنا لاتی ہوں۔"

بہن کو قدرے نظر انداز کرتی عانیہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ویسے بھی پانچ بجنے والے تھے اور چائے کی طلب اسے بھی ہو رہی تھی اور عانیہ کی یہ ہی عادت اچھی تھی' وہ جب آتی بنا پوچھے رافعہ کے کئی کام کر جایا کرتی' شاید اگر وہ سمیعہ اور ثوبیہ کی بہن نہ ہوتی تو وہ ضرور زادان پر زور ڈالتیں کہ وہ عانی کو اپنا لے مگر اب ایسا ممکن نہ تھا' عانیہ کے باہر نکلتے ہی انہیں بری طرح گھورتی سمیعہ بھی کمرے سے باہر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"رانی کہاں ہے؟" نلکے پر ہاتھ دھوتے سلامت کو جانے کیسے آج اپنی بیٹی کا خیال آگیا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"خدا جانے کہاں گشت کرنے نکلی ہے۔ صبح سے ہی غائب ہے۔ اس لیے تم سے کہتی ہوں جلد از جلد اس بلا کی شادی کر کے اپنا پیچھا چھڑا لو۔ ایسا نہ ہو کل کلاں کو کوئی بدنامی ہتھے لگ جائے۔"

"فکر نہ کر اماں! میں زہرہ نہیں ہوں جو سلامت کے عشق میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔"

زہرہ کی پاٹ دار آواز گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتی رانی کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ وہیں سے چلا اٹھی۔

سلامت نے دیکھا اپنا دوپٹا کندھے سے گزار کر اس نے کمر سے باندھ رکھا تھا ہاتھ میں سائیکل تھامے علی احمد بھی اس کے ساتھ تھا۔

"سن لی زبان۔ کتنی لمبی ہے' قینچی کی طرح سارا دن چلتی ہے مجال ہے جو کسی کا ڈر یا خوف اس لڑکی کے دل میں ہو۔"

"کہاں تھیں تم...؟" زہرہ کی چیخ و پکار کو قطعی نظر انداز کرتا سلامت رانی سے مخاطب ہوا۔

"میں اور آپا سامنے والے گراؤنڈ میں سائیکل چلا رہے تھے۔" رانی کے بجائے علی احمد کی جانب سے آنے والے جواب نے زہرہ کو جیسے جلتے توے پر بٹھا دیا۔

"لو جی اب یہ ہی باقی کسر رہ گئی تھی جوان جہاں لڑکی میدانوں میں سائیکل چلاتی پھرے....."

نیچے سے آتے تیز شور کی آواز نے زادان کے تسلسل کو قدرے توڑ دیا۔ کل اس کا پیپر تھا جس کی تیاری کے لیے وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ شور نے اسے قدرے ڈسٹرب کر دیا اور یہ پہلی بار نہ ہوا تھا۔ ایک ہفتہ میں کوئی چار دفعہ ایسا تماشا وہ اپنے کانوں سے سن چکا تھا ہاتھ میں پکڑا پین ٹیبل پر رکھتا ہوا اٹھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھڑکی اچھی طرح بند کر کے اس پر

پردے لگا دیے شور کی آواز بالکل ختم ہو گئی۔ وہ واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔

اس دن سے آج تک اپنے گھر میں بھابھیوں کو ساس سے لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا جبکہ یہاں سارا دن ماں بیٹی محاذ پر کھڑی رہتیں۔ اس نے لڑائی کے دوران کبھی نیچے نہ جھانکا تھا۔ صرف باتوں سے اندازہ لگا سکا تھا کہ لڑنے والی خواتین کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ جبکہ اس کی ملاقات ابھی تک علی احمد سے ہی ہوئی تھی جو روزانہ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا دینے اوپر آتا خاموشی سے برتن رکھتا اور واپس چلا جاتا۔ فون مسلسل بج بج کر خاموش ہو گیا۔ رانی نے بے دلی سے اٹھا کر دیکھا۔ ریما کی دس مس کالز اور جانے کتنے میسج آچکے تھے۔ اس کا دل ہی نہ چاہا بات کرنے کو' اسی لیے ہاتھ میں پکڑا فون ایک بار پھر سے تکیہ پر پٹخا ہی تھا کہ وہ دوبارہ سے بج اٹھا۔

"کیا مصیبت ہے؟" یس کا بٹن دبا کر سیل کان سے لگاتے ہوئے وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"السلام علیکم آپا! کہاں ہیں آپ؟ میں کب سے فون کر رہی ہوں۔" ریما اس کے دل کی حالت سے بے خبر جلدی سے بول اٹھی۔

"میں نے کہاں جانا ہے اس گھر میں مری ہوئی ہوں۔"

وہ غصہ سے بولی' اسے آج صبح سے اس بات کا بھی بے حد غم تھا جب ابا نے امی کو طلاق نہیں دی تھی تو وہ کیوں اپنا گھر چھوڑ کر بھائی کے در پر جا بیٹھیں؟ کیوں حالات کا مقابلہ نہ کیا؟ اور اس کی ان باتوں کا صباحت کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا سوائے خاموشی کے اور ان کی یہ خاموشی رانی کو مزید غصہ دلا دیتی۔

"کیا بات ہے آج پھر جھگڑا ہوا ہے آپ کا؟" اس کی چڑچڑاہٹ نے ریما کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

"یہ کون سی نئی بات ہے۔ یہ تو روز کا تماشا ہے نہ وہ عورت تھکتی ہے اور نہ ہی میں ہار مانتی ہوں۔" روز کی چخ چخ سے شاید وہ اب تھکنے لگی تھی جس کا اندازہ اس کے لہجہ سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

"اچھا چھوڑیں۔ آپ ٹینشن مت لیں اور یہ لیں امی سے بات کریں۔"

"سوری ریما! فی الحال میں کسی سے کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں تم امی کو بتا دینا کہ جب میرا موڈ بحال ہو گا خود ہی کال کر لوں گی اللہ حافظ۔"

ریما کے جواب کا انتظار کیے بنا نرما نے فون بند کر دیا جبکہ دوسری طرف صباحت سمجھ چکی تھیں کہ وہ پھر سے یاسیت کا شکار ہو گئی ہے اور ایسا اکثر ہی ہوتا ہے اور جب بھی ایسا ہوتا صباحت کو ہمیشہ ایک دکھ اور پچھتاوا گھیر لیتا کہ کیوں بلاوجہ اپنی بیٹی کو اس غیر عورت کے پاس چھوڑ کر وہ وہاں سے نکلیں' کاش ریما کی طرح نرما بھی ان کے ساتھ ہوتی تو آج صورت حال اتنی افسردہ نہ ہوتی جتنی اس وقت وہ محسوس کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آج صبح سے ہی سمیعہ اور ثوبیہ کچن میں مصروف تھیں۔ جسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ شاید گھر میں کوئی مہمان آنے والا ہے اور اسی مصروفیت میں وہ رافعہ کو شام کی چائے بھی بھجوانا بھول گئیں۔

عصر سے مغرب ہو گئی' چائے نہ آئی اور بالآخر چائے کی طلب سے رافعہ کا سر دکھنے لگا تو وہ خود ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئیں تاکہ کچن میں جا کر ایک کپ چائے بنا لیں جیسے ہی باہر آئیں تو دیکھا سامنے ہی لاؤنج میں سونو اور فاران ٹیبل پر بیٹھے اپنا ہوم ورک مکمل کر رہے تھے جبکہ ان کی مائیں کہیں دکھائی نہ دیں۔

"السلام علیکم دادو.....!" ان پر نظر پڑتے ہی دونوں بچے خوشی سے چہچہائے "وعلیکم السلام بچوں جیتے رہو اللہ لمبی عمر کرے۔"

سچ یہ تھا کہ یہ دونوں پوتا' پوتی انہیں اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز تھے یہ ہی وجہ تھی جو یک دم ان دونوں کو دیکھ کر وہ ایک پل کو اپنے سر کا درد بھی بھلا بیٹھیں۔

"کیا بات ہے امی! کچھ چاہیے؟"

کچن سے باہر نکلتی ثوبیہ انہیں دیکھتے ہی ٹھٹک گئی

کیونکہ عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت وہ ہمیشہ اپنے کمرے میں ہی گزارتی تھیں۔ ان کی شروع سے ہی عادت تھی کہ عصر کی نماز کے بعد عموماً جائے نماز پر بیٹھ کر کچھ سورتوں کا ورد کرتیں، قرآن مجید کی تلاوت کرتیں اور پھر مغرب پڑھ کر وہاں سے اٹھتیں۔ آج خلاف توقع انہیں باہر دیکھ کر ثوبیہ کا اس طرح چونک جانا یقیناً "فطری عمل تھا۔

"شام کی چائے نہیں ملی تو سر دکھنے لگا۔ سوچا، تم آج مصروف ہو اس لیے خود ہی جا کر بنا لوں۔"

"وہ اچھا..... ہاجرہ..... ہاجرہ!"

رافعہ کی بات سنتے ہی اس نے ہاجرہ کو آواز لگائی۔ جسے پچھلے دنوں ہی اس نے گاؤں سے دن رات گھر کام کرنے کے لیے بلوایا تھا۔

"جی باجی جی....." کھیرا اور چھری ہاتھ میں تھامے حاجرہ کچن کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔

"تم نے امی کو چائے نہیں دی جبکہ میں نے کہا بھی تھا کہ پہلے انہیں چائے دے کر آؤ پھر کوئی کام کرنا۔"

"بھول گئی تھی جی۔ جی۔ ابھی بنا دیتی ہوں۔" جواب دیتے ہی ہاجرہ واپس کچن میں غائب ہو گئی۔

"آپ جائیں کمرے میں، ہاجرہ چائے بنا کر وہیں لے آتی ہے۔"

"نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں، کچھ دیر بچوں کے پاس بیٹھوں گی۔" ثوبیہ کو جواب دیتی وہ سونو کے قریب رکھی کرسی پر جا بیٹھیں۔

"دادو! چاچو کب آئیں گے پلیز ان سے کہیں نا جلدی آجائیں میں ان کے بغیر بور ہو گیا ہوں۔"

دونوں بچے دادی کے ساتھ ساتھ چاچا سے بھی بے حد محبت کرتے تھے اور وقتاً "فوقتاً" رافعہ سے زادان کے متعلق اسی طرح سوال کرتے جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ دونوں زادان کو بے حد مس کر رہے تھے۔

"آجائیں گے بیٹا! جلدی آجائیں گے۔ تم بس دعا کرو۔ اللہ میرے بچے کو اس کے مقصد میں کامیاب کرے۔"

"زادان بھائی کا کون سا ایسا مقصد ہے اماں جی! جس کے لیے وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے کیا وہ مقصد یہاں رہتے ہوئے پورا نہ ہو سکتا تھا؟" چائے کا کپ ٹیبل پر ان کے سامنے دھرتی ہاجرہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"نہیں بھئی۔ یہاں کیسے پورا ہوتا ان کا مقصد....." حسب عادت دونوں کی گفتگو کے درمیان ثوبیہ نے بنا پوچھے دخل اندازی کی تھی۔ "ہم کوئی راجے مہاراجے تھوڑی ہیں اور نہ ہی کسی ریاست کے والی وارث جو ان کے لیے کسی شہزادی کا انتظام کرتے ہم تو سیدھے سادے شریف لوگ ہیں جبکہ دیور صاحب کی زندگی کا مقصد تخت پر بیٹھنا۔ پھر اس کے لیے انہیں کسی شہزادی کی ضرورت ہے جو حسن و کمال میں بھی یکتا ہو اور اپنے ساتھ اس نکھٹو کو کسی ریاست کا مالک بھی بنا دالے بد حرام"

رافعہ نے ناگواری کی ایک نظر تابڑ توڑ حملے کرتی ثوبیہ پر ڈالی جسے بہن کے رشتے کے انکار نے اس قدر سلگا رکھا تھا کہ وہ ساس کو باتیں سنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا یہ تم بلاوجہ ہر پل کیوں اتنا واویلا ڈالے رکھتی ہو۔" آہستہ سے کہتی رافعہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ اپنی نا سمجھی میں کیے گئے سوال پر تاسف بھرا چہرہ لیے ہاجرہ ایک بار پھر کچن میں جا کر غائب ہو گئی۔

"واویلا نہ ڈالوں تو اور کیا کروں؟ غضب خدا کا ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا ہمارے سامنے ہماری بہن کو اتنا کچھ کہہ گیا اور میں اس کا منہ بھی نہ توڑ سکی۔ یقین جانیں امی، ساری زندگی مجھے اس بات کا افسوس رہے گا جو میں نے اپنے گھر سانپ پالا اور اس کی پرورش کی۔

"خدا کا خوف کرو بہو! جو منہ میں آیا الٹا سیدھا بولے جا رہی ہو اور یاد رکھو، زادان کسی کے ٹکڑوں پر نہیں پلا۔ جو کچھ اس گھر سے اسے ملا، وہ اس کا حق تھا۔ باپ کی زمین جائیداد سے حاصل ہونے والا پیسہ بڑے بھائیوں کے ہی پاس تھا جو اس کی ذات پر خرچ ہوا۔ تم نے اپنے باپ یا بھائی سے کچھ لا کر میرے بچے کو نہیں پالا۔"

برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور آج یہ حد ختم ہو گئی تھی جس نے رافعہ کو اس طرح غصہ دکھانے کا حوصلہ دیا "اور جب بڑے دونوں بھائیوں نے شادی اپنی پسند کی تو پھر چھوٹا کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ ان شاء اللہ وہ بھی اپنی پسند سے ہی میری بہو لے کر آئے گا جو رانی مہارانی نہ سہی لیکن بدزبان بھی نہ ہو گی۔"

ایک کے بعد دوسرا آئینہ دکھاتی وہ اپنے کمرے میں واپس چلی گئیں۔ یہ دیکھے کہ بنا کے ان کی باتوں نے کس طرح ثوبیہ کے ساتھ ساتھ سمیعہ کو بھی غصہ دلا دیا ہے جس کا معمولی سا مظاہرہ ثوبیہ نے زوردار آواز میں فریج کا دروازہ بند کر کے دیا۔

☼ ☼ ☼

پیاس کی شدت سے اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس نے یہاں وہاں دیکھا تپتے صحرا میں موجود واحد کنویں کے قریب ہی ایک ڈول رکھا تھا۔ زادان نے تیزی سے آگے بڑھ کر ڈول اٹھایا اور کنویں میں پھینک دیا۔ پانی کے تصور نے ہی اس کے سوکھے حلق کو تر کر دیا تھا ڈول جیسے ہی پانی سے ٹکرایا، زادان نے کنویں میں جھانکا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ کنویں کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا سرخ رنگ کا پھول کھلا ہوا تھا۔ سارا صحرا جہاں کسی پتے کا نام و نشان نہ تھا وہاں موجود کنویں کے اندر اتنا خوب صورت پھول، وہ پھول دیکھنے میں محو تھا کہ جانے کیسے وہ پھول تیرتا ہوا اس کے پانی سے بھرے ڈول میں آگیا۔ زادان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا کچھ دیر قبل والی پیاس کو اس نے یکسر فراموش کرتے ہوئے جلدی جلدی ڈول کھینچا اور پینے سے قبل ہی ہاتھ بڑھا کر پھول تھامنا چاہا جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوب صورت جوان لڑکی میں تبدیل ہو گیا اتنی خوب صورت لڑکی جو شاید زادان نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی۔

"کون ہو تم؟"

مارے حیرت کے سرسراتی آواز اس کے لبوں سے برآمد ہوئی۔ لڑکی اسے دیکھتے ہوئے مسلسل مسکرا رہی تھی۔ "جواب دو کون ہو تم اور اس کنویں میں کیا کر رہی تھیں؟"

"میں ست پھلاں رانی ہوں جسے جادوگرنی نے اپنے جادو کے زور سے پھول بنا کر اس کنویں میں ڈال دیا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے ایک خوب صورت اور ایمان دار نوجوان ہی اس قید سے رہائی دلا سکے گا اور اس کی یہ شرط پوری ہو گئی شہزادے! تم نے مجھے اس قید سے رہائی دلوا کر اپنا قیدی بنا ڈالا آج سے میں تمہاری ہوئی۔"

"نکلو یہاں سے اور خبردار جو دوبارہ کبھی اماں کی غیر موجودگی میں تم نے یہاں آنے کی جرأت کی....."

زادان جو ست پھلاں رانی کے حسین سپنوں میں گم تھا نیچے سے آنے والے شور کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا وہ باہر برآمدے میں رکھے صوفہ پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا۔ اس نے ٹائم دیکھا صبح کے گیارہ بجے تھے آج چونکہ اتوار تھا اس لیے آفس کی چھٹی تھی جب کہ یونیورسٹی بھی سمسٹر کے بعد بند ہو چکی تھی اب تو صرف رزلٹ کا انتظار تھا وہ باہر سے ناشتا کر کے آیا تھا جب دیوار کے پاس رکھے صوفہ پر بیٹھا اور پتا نہیں کیسے اتنی گہری نیند سو گیا کہ خواب میں بھی بھابھی کی بیان کردہ ست پھلاں رانی اس کے تصور میں آگئی۔

"ہولے بھئی ہولے، کیوں اتنا رولا ڈال رہی ہے ڈر مت۔ میں تجھے کھانے نہیں لگا۔" یقیناً نیچے موجود لڑکی گھر میں تنہا تھی جس کا اندازہ زادان اپنے کان میں پڑنے والے اس کے پہلے جملے سے لگ چکا تھا۔

"ڈرتی ہے میری جوتی۔ میں تیرے جیسے لفنگے سے نہیں ڈرتی۔ تو نکل یہاں سے۔"

لڑکی کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہے، زادان خاموشی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا دیوار تک پہنچ گیا جس کی منڈیر سے اس نے آج تک نیچے نہ جھانکا تھا مگر جانے کیوں آج اس کا دل چاہا کہ وہ ایک بار نیچے ضرور جھانکے کہ صورت حال کیا ہے؟ کہیں تنہا لڑکی کو اس کی مدد کی ضرورت تو نہیں۔ نیچے جھانکا اسے داخلی گیٹ کے عین سامنے سفید لباس میں

ملبوس ایک لڑکی دکھائی دی جس کا چہرہ تو دکھائی نہ دیا البتہ اس کے کمر تک جھولتے لمبے سیاہ بالوں نے زادان کی توجہ پل بھر کو اپنی جانب ضرور مبذول کروالی۔

“بلے بھئی بلے، بڑی ہمت ہے تیرے میں، سچ بتاؤں۔ تیری یہ ہمت ہی شیر محمد کو پسند ہے ورنہ لڑکیاں تو۔”

اونچا لمبا مرد بیرونی دروازے کے درمیان میں کھڑا تھا اور شاید اندر آنے کی پوری کوشش بھی کر رہا تھا اور یقیناً اس لیے لڑکی نے نہ صرف دروازے کے پٹ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا بلکہ اپنا ایک پاؤں دروازے میں بھی پھنسایا ہوا تھا۔

“تم جاتے ہو یا میں چیخ کر سارا محلہ اکٹھا کرلوں۔”

اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی لڑکی زور سے چلا اٹھی۔ زادان کے لیے اب مزید برداشت کرنا مشکل ہوگیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اس لڑکی کی مدد کیے بنا کوئی چارہ نہیں۔ لہٰذا وہ منڈیر سے اترا اور تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ وہ دو سیڑھیاں پھلانگتا جیسے ہی وہ گلی میں پہنچا۔ سامنے نظر آنے والے منظر کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس لڑکی نے شیر محمد کو شاید دھکا مار کر باہر نکال دیا تھا کیونکہ نیچے والا۔ بیرونی دروازہ اب مکمل طور پر بند ہوچکا تھا اور شیر محمد کھسیانی بلی کی مانند دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ جب اس کی نظر اندرونی جانب سیڑھیوں پر کھڑے زادان پر پڑی۔ زادان مزید اس پر دھیان دیے بنا جس تیزی سے نیچے آیا تھا۔ اسی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا واپس اوپر چلا آیا کیونکہ اسے گلی میں کھڑے اس شیر محمد سے کوئی غرض نہ تھی البتہ اتنے ماہ میں یہ پہلا موقع تھا، جب اس کا دل بے اختیار ہی اس لڑکی کو داد دینے کے لیے بے تاب ہوگیا اور ساتھ ہی یہ خواہش بھی زور پکڑ گئی کہ کم از کم ایک نظر وہ اس لڑکی کو دیکھے ضرور، جو شیر محمد جیسے لوگوں کا مقابلہ اتنی ہمت اور دلیری سے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

✲ ✲ ✲

“مبارک ہو امی! زادان کا فون آیا تھا اسے بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے۔”

حماد نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی سامنے تخت پر بیٹھی اپنی ماں کو یہ خوش خبری سنائی جو انہیں رات بھی زادان بتا چکا تھا مگر اس نے بھائیوں کو بتانے سے فی الحال منع کیا تھا اسی لیے رافعہ خاموشی سے منتظر تھیں کہ وہ خود ہی یہ خبر اپنے بھائیوں کو سنائے کیونکہ وہ اندازہ لگا چکی تھیں کہ زادان کے منع کرنے کی وجہ بھی یقیناً یہ ہی ہے کہ وہ یہ خبر انہیں خود دینا چاہتا ہے۔

“خیر مبارک بیٹا! یہ سب تم ہی لوگوں کی محنت اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔”

بیٹے کی کامیابی نے انہیں بھی خوشی سے سرشار کردیا تھا۔ جبکہ کچن میں مصروف ثوبیہ کے ہاتھ باہر ہونے والی گفتگو سن کر جیسے ساکت ہوگئے۔ زادان ایک محنتی اور قابل نوجوان تھا۔ یہ بات وہ دونوں بہنیں شروع سے ہی جانتی تھیں، یہ ہی وجہ تھی جو انہوں نے اس پر اپنی بہن کے لیے نظر رکھی ہوئی تھی مگر وہ ان کی توقعات سے بھی زیادہ چالاک نکلا اور اپنا وقت نکلتے ہی انہیں ٹھینگا دکھا گیا اور یہ بات انہیں مسلسل غصہ دلا رہی تھی مگر اب زادان کی اچھی ملازمت سنتے ہی اسے تاسف نے گھیر لیا۔

“کیا ضرورت تھی بلاوجہ اس دن اتنا ہنگامہ کرنے کی، گھر میں رہتا تو آہستہ آہستہ راضی کرلیتے۔”

سمیعہ نے اس کے تاسف کو مزید گہرا کردیا۔

“غصہ میں کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا اور بلاوجہ بات اتنی بڑھ گئی۔”

پہلا موقع تھا جو ثوبیہ نے سمیعہ کی کسی بات پر چراغ پا ہوئے بنا جواب دیا۔

“سچ جانو عانیہ کے تو نصیب ہی کھل جائیں جو اتنا قابل اور خوب صورت لڑکا اس کا مقدر بن جائے۔”

“میرا خیال ہے کہ اب اسے خود ہی کوشش کرنا ہوگی کہ وہ بڑی بی کو اپنے قابو میں کر ڈالے۔ ان کی اتنی خدمت کرے کہ وہ اسی کے گن گانے لگیں اور بیٹے کو مجبور کردیں کہ وہ عانیہ سے ہی شادی کرے۔”

“عانیہ اور خدمت؟” جملے کے ساتھ ہی ثوبیہ ہلکا سا ہنس دی۔ “ذرا کسی کی بات برداشت نہیں ہوتی اسے بھلا بتاؤ ان بڑی بی کو کیسے برداشت کرے گی جو ذرا ذرا سی بات پر نکتہ چینی کرنے کی عادی ہیں۔”

“زادان کو حاصل کرنا ہے تو یہ سب بھی برداشت کرنا ہی ہوگا ورنہ بیٹھی رہے اور اماں جیسا تیسا رشتہ ڈھونڈیں گی اور وہ بیاہ دیں گی۔”

ان دونوں بہنوں کے مقابلے میں سمیعہ صاف بات کرنے کی عادی تھی اس لیے قدرے چڑ کر بولی۔

“بہرحال میں تو نہیں کہتی اس سے کچھ بھی۔ ہاں البتہ تم اگر چاہو تو ایک دفعہ سمجھا کر دیکھ لو۔”

عانیہ کی زبان درازی کے سبب اکثر ہی ثوبیہ سے لڑائی ہو جاتی جس کی بنا پر ثوبیہ اس سے کوئی بھی بات کرتے سے کتراتی تھی۔

“چلو خیر میں ایک بار اسے سمجھانے کی کوشش تو ضرور کروں گی باقی آگے جو اس کی مرضی۔”

✲ ✲ ✲

تو رُس کے نہ جایا کر میری جان سجنا
اک دن چھڈ جانا اے جہاں سجنا

وہ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ایک دم ہی رک گیا کان میں پڑنے والی رسیلی آواز یقیناً اس لڑکی کی تھی جسے دیکھنے کی خواہش آج کل زادان کے دل میں زور پکڑتی جا رہی تھی۔ جانے کیوں وہ ایک دفعہ ضرور دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر یہ پٹاخہ دیکھنے میں کیسی نظر آتی ہے جس نے اس دن شیر محمد جیسے مرد کا مقابلہ انتہائی دلیری سے کیا اور یقیناً یہ کسی بھی شخص کی فطری خواہش ہوسکتی ہے کہ جو چیز اس کی نظروں سے اوجھل ہو وہ اسے دیکھنے اور جاننے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور یہ ہی مسئلہ اسی وقت زادان کے ساتھ بھی تھا کہ وہ بنا کسی وجہ کے صرف تجسس کے ہاتھوں مجبور رانی کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔

ابھی بھی اگر وہ چاہتا تو سیڑھیوں کے اندرونی سمت کھلنے والے دروازے کی جھری سے جھانکنے کی کوشش ضرور کرتا مگر محض تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی کے گھر جھانکنا سخت معیوب محسوس ہوا۔ لہٰذا وہ کان میں پڑنے والی آواز کو قطعی نظر انداز کر کے اوپر کی جانب بڑھ گیا۔ ابھی وہ کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ علی احمد اس کے کھانے کی ٹرے لیے اوپر آگیا۔

“السلام علیکم زادان بھائی!”

“وعلیکم السلام، کیسے ہو یار تم؟”

ان دو ماہ میں اس کی علی احمد سے کچھ دوستی ضرور ہوگئی تھی۔

“فرسٹ کلاس۔”

ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتا وہ سامنے پڑی کرسی پر جا بیٹھا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا جو علی احمد کھانا دینے آئے اور کمرے میں رک جائے عام طور پر وہ بہت جلدی میں ہوتا۔

“میرا ایک کام کرسکتے ہیں آپ؟” زادان کی جانب تکتا وہ کچھ جھجکتا ہوا بولا۔

“ہاں بھئی بولو کرسکا تو ضرور کروں گا۔”

“مجھے میتھس پڑھا دیا کریں۔ میں حساب میں بہت کمزور ہوں اور باوجود کوشش کے ہر دفعہ امتحان میں بمشکل پاس ہوتا ہوں۔”

“اچھا۔۔۔!” زادان نے کچھ دیر سوچا۔ “تم رات میں فری ہو تو آجایا کرو کیونکہ میرے پاس یہ ہی ٹائم ہوتا ہے۔”

“جی ضرور، میں کل سے ہی آجاؤں گا۔”

خوشی سے جواب دیتا وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

“بہت شکریہ زادان بھائی، آپ نے میرا ایک بڑا مسئلہ حل کردیا۔”

“نہیں یار کوئی بات نہیں تم کل رات کو آجانا میں پڑھا دوں گا۔”

“اوکے!” کہہ کر وہ واپس مڑا ہی تھا کہ جیسے زادان کو کچھ یاد آگیا۔

“ایک منٹ علی!”

“جی۔۔۔!” وہ رک گیا۔

“ایک بات پوچھوں؟” زادان نے جھجکتے

ہوئے سوال کیا۔

"جی ضرور پوچھیں۔"

"تمہارے علاوہ گھر میں اور کون کون ہوتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم کتنے بہن بھائی ہو؟"

"ہم دو ہیں ایک میں اور ایک چھوٹی بہن سویا۔"

"چھوٹی بہن!" زادان نے حیرت سے دہرایا' بارہ سالہ علی کی چھوٹی بہن یقیناً" دس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی پر وہ لڑکی کون ہے؟

"وہ لڑکی کون ہے جو ہر لمحہ تمہاری امی سے جھگڑتی رہتی ہے۔"

چونکہ آج بات کا آغاز ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد ہر بات واضح ہو جائے۔

"میری آپا ہیں۔"

"تم نے تو ابھی کہا کہ تمہاری بہن تم سے چھوٹی ہے؟" علی کا ہر جواب زادان کے تجسس کو بڑھا رہا تھا۔

"جی مگر رانی آپا میری سوتیلی بہن' ابا کی پہلی بیوی سے ہیں وہ۔"

"اوہ۔" تو اب سمجھ میں آیا کہ نیچے ہر پل میدان جنگ کیوں بنا رہتا تھا۔

"تو کیا اس کی امی فوت ہو گئی ہیں؟"

"نہیں انہیں اماں نے گھر سے نکال دیا تھا جب آپا بہت چھوٹی تھیں۔" جو باتیں وہ بچپن سے سن رہا تھا وہ من و عن زادان کے سامنے دہراتا جا رہا تھا۔

"اور شیر محمد کون ہے؟"

"میرا ماما' امی کی خالہ رجو کا بیٹا مگر آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟" جواب دیتے دیتے وہ حیرت سے پوچھ بیٹھا۔

"میں۔۔۔!" زادان تھوڑا سا گھبرا گیا۔ "میرا ایک دوست اسے جانتا ہے۔"

"اچھا دراصل اماں چاہتی ہیں کہ آپا کی شادی شیر محمد سے ہو جائے بس اس وجہ سے ان دونوں کا ہر پل جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔"

شیر محمد کو قطعی نظر انداز کر کے اس نے ہر بات زادان کو بتا دی جسے سنتے ہی ایک پل میں ہی اس کے سامنے خرانٹ شکل والا وہ ادھیڑ عمر شخص آ گیا جو اس دن نیچے گیٹ پر کھڑا تھا۔

"اور تمہارے ابا کیا چاہتے ہیں؟"

"ابا صرف وہ چاہتے ہیں جو اماں چاہتی ہیں اب میں جاؤں؟" جواب کے ساتھ ہی اس نے سوال بھی کر دیا۔

"ہاں۔"

علی احمد کی باتوں نے زادان کی طبیعت کو خاصا مکدر کر دیا اور بہادر رانی کا تصور یک دم ہی ایک مظلوم لڑکی میں تبدیل ہو گیا اسے اپنے اور رانی کے حالات خاصے مشترک لگے۔ فرق صرف اتنا تھا وہاں اس کا ساتھ دینے کے لیے بھابھیوں کے مقابلے میں اماں ہوتیں جب کہ یہاں رانی بالکل تنہا سوتیلی ماں کے ساتھ نہ صرف شیر محمد بلکہ اپنے بے حس سگے باپ کا بھی مقابلہ کر رہی تھی اور یہ ہی وجہ تھی جو اسے اپنے مقابلہ میں رانی زیادہ مظلوم اور زیادہ بہادر محسوس ہوتی۔

☼ ☼ ☼

"شیر محمد آیا تھا۔ وہ اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا کر رہا ہے۔" برتن دھوتی رانی کے کانوں میں جیسے ہی زہرہ کی آواز ٹکرائی اس کے ہاتھ سست اور کان چست ہو گئے۔

"تجھے اچھی طرح پتا ہے میرے لیے یکمشت اتنی رقم کا انتظام کرنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں اسے سمجھا۔ مجھ سے ماہانہ قسط باندھ لے' تھوڑا تھوڑا کر کے جلد ہی اس کا پیسہ لوٹا دوں گا۔"

"میں نے سمجھایا ہے مگر وہ نہیں مانتا اور آج کل تو اس کا مزاج ویسے ہی بہت برہم ہے۔ سخت ناراض ہے وہ ہم سے' اس لیے چاہتا ہے کہ تم جلد از جلد اس کا روپیہ واپس کرو تاکہ وہ ہم سے فوراً" سارے رابطے ختم کرے۔"

اماں کی غصیلی آواز رانی کو بہت کچھ سمجھا گئی۔ وہ جان گئی کہ شیر محمد کی کچھ دن قبل کی جانے والی بے عزتی پر نہ صرف اسے بلکہ اماں کو بھی غصہ ہے۔

"ہم نے ایسا کیا کر دیا جس نے اس کے مزاج کو اس قدر برہم کر دیا کہ ہم سے تعلق ختم کرنے کی بات کرنے لگا۔"

اماں کی بات سن کر ابا گھبرا گیا جس کا اندازہ اس کے لہجے سے ہی رانی لگا چکی تھی ویسے بھی جب سے اماں اس گھر میں آئی تھی۔ اس نے ابا کے دل پر اپنا ایسا قبضہ جما رکھا تھا کہ وہ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتوں سے بالکل ہی محروم ہو چکا تھا' یہاں تک کہ اماں کے ساتھ ساتھ شیر محمد بھی کئی سالوں سے ابا کے حواسوں پر بری طرح سوار تھا۔ اس کے بنا وہ خود کو بالکل ہی بے دست و پا سمجھنے لگا تھا۔

"اپنی لاڈلی سے پوچھو کیا سلوک کیا تھا اس غریب کے ساتھ۔ جب وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ گھر سے دھکے دے کر باہر نکالا ہے اس لڑکی نے شیر محمد کو۔۔۔"

باہر سے آتی اماں کی آواز نے رانی کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا اور وہ ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سنک میں پٹختی تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔ جہاں اماں' ابا کو الٹی سیدھی باتیں سکھا کر مزید اس کے خلاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وہ تم سے ملنے آیا تھا اماں؟" کمر پر ہاتھ دھرے وہ سیدھی زہرہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ "تم تو خود اس دن خالہ رجو کے گھر گئی تھیں پھر تمہارا وہ رنڈوا بھانجا تم سے ملنے اس گھر میں کیوں آیا۔ جواب دو۔"

"خاموش ہو جا رانی! تیری ماں ہے یہ۔ عزت کر اس کی۔"

رانی کے اچانک آنے سے زہرہ کی زبان جیسے تالو سے لگ گئی اور وہ باوجود کوشش کے اپنے حلق سے کوئی آواز نہ نکال سکی اب اس کی مدد کے لیے ابا آگے آ گیا۔

"یہ کیسے خاموش ہو گی۔ گز بھر لمبی زبان ہے اس لڑکی کی۔ سارے خاندان میں بدنام ہو رہی ہے۔ ہر شخص اس سے ڈرتا ہے اس کی بدکلامی سے سب گھبرانے لگے ہیں کون شادی کرے گا اس سے۔"

ابا کی تنبیہہ نے اماں کی خاموشی کو پھر سے زبان بخش دی۔

"اتنا تمہارا خاندان مجھ سے ڈرنے والا ہوتا تو اس دن مجھے تنہا اور کمزور سمجھ کر شیرو یہاں دندناتا ہوا نہ آتا۔ سچ بات کہوں اماں مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اسے تم نے ہی یہاں بھیجا تھا۔"

"یہ کیا بکواس کر رہی ہے تو۔" رانی کے لگائے گئے پے در پے الزامات نے اماں کو جیسے پتنگے لگا دیے۔

"زبان سن رہے ہو تم اس کی۔ ذرا آنکھوں میں لحاظ مروت نہیں۔ اسی لیے کہتی ہوں۔ شیرو کا پیسہ واپس دو اور قصہ ختم کرو اس غریب نے ترس کھا کر تمہاری مدد کی جس کا صلہ تمہاری اولاد' ہم دونوں بہن بھائیوں کو ذلیل کر کے دے رہی ہے۔"

رانی کی چلتی زبان کو روکنے کے لیے زہرہ کا اس طرح دہائی دینا ضروری تھا ورنہ وہ جانے اور کیا کیا کہہ جاتی۔

"یہ قرضہ نہ میں نے لیا ہے اور نہ ہی اس کی واپسی کی میں ذمہ دار ہوں اس لیے اس لین دین میں تم لوگ میرا نام نہ ہی لو تو اچھا ہو گا ورنہ۔۔۔" آستینیں چڑھائے' خونخوار نگاہوں سے زہرہ کو گھورتی رانی تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

"یہ ہے تمہارا بے جا لاڈ پیار جس نے اس لڑکی کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔"

"اُفوہ زہرہ! چھوڑ دے اس کا پیچھا اور مجھ سے شیر محمد کی بات کر۔"

"کیا بات کروں اس کی' اسے تو تمہاری لاڈو نے دھکا مار کر ایسا گھر سے نکالا کہ ساتھ ہی ہماری قسمت کو بھی لات مار دی۔"

باہر سے آتی زہرہ کی آواز نے اندر کمرے میں بیٹھی رانی کے دل کو ایسا دکھایا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو زادان اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے تو مجھے بتاؤ ورنہ میں خود تمہارے لیے کوئی رشتہ تلاش کروں' کیونکہ ماشاء اللہ تم اب برسر روزگار ہو چکے ہو

اور ویسے بھی بڑی عمر لڑکوں کی شادی کی ہوتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں! مگر کیا کروں مجھے ابھی تک کوئی ست پھلاں رانی ملی نہیں، جسے لا کر بھابھی کے سامنے کھڑا کردوں کہ لو یہ ہے تمہاری دیورانی جو کم از کم رشتے نبھانا جانتی ہے اور اخلاق میں بھی تم دونوں سے بہتر ہے۔"

رافعہ نے چونک کر ایک نظر زادان پر ڈالی بظاہر وہ ہنس رہا تھا، مگر چونکہ وہ ماں تھیں، لہٰذا سمجھ گئیں کہ زادان کے دماغ سے ابھی تک ثوبیہ کی تلخ باتوں کی گرمی نکلی نہیں ہے۔

"چھوڑو تم ان دونوں کی باتوں کو۔ اس دن بلاوجہ غصہ میں اتنا کچھ ہو گیا ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ اتنی بری نہیں ہیں۔" بیٹے سے نظریں چراتی ماں نے بہوؤں کی کمزور سی حمایت کرنے کی کوشش کی۔

"آپ یہ سب چھوڑیں اور ابھی فی الحال یہ بتائیں کہ آپ میرے ساتھ کب چل رہی ہیں کیونکہ میں دوسروں کے گھر کا کھانا کھا کر تھک گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چل کر رہیں۔"

"فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے۔ تم جانتے ہو ثوبیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ فارغ ہو جائے تو ان شاء اللہ میں تمہارے پاس آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اس وقت تک میں شاید وہ مکان بھی تبدیل کرلوں آفس میں گھر کے لیے درخواست دی ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی کام ہو جائے گا۔"

ماں کی باتوں سے مطمئن زادان نے فون بند کر دیا اسے جلد ہی آفس کی جانب سے گھر اور گاڑی ملنے والی تھی اور وہ خود چاہتا تھا کہ اس وقت تک اماں بھائیوں کے ساتھ ہی رہیں۔

☆ ☆ ☆

"ایک شرط ہے اگر تم پوری کر سکو تو میں تم سے ایک روپیہ بھی واپس نہیں لوں گا بلکہ چاہو تو کچھ اور رقم بھی دے دوں گا جس سے تم اپنی دکان میں مزید مال بھی ڈال سکتے ہو۔"

مونچھوں کو بل دیتے شیرو نے اپنے سامنے بیٹھے سلامت پر ایک نظر ڈالی۔

"میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔" دو لاکھ جیسی بڑی رقم کا معاف ہو جانا اور مزید پیسہ ملنے کی امید نے سلامت سے جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی۔ ویسے شیرو کی طرف سے تھوڑی تھوڑی کر کے قرض کے نام پر دی جانے والی رقم کب لاکھوں میں تبدیل ہوئی اسے علم ہی نہ ہوا۔

"پہلے اچھی طرح سوچ لو پھر کوئی وعدہ کرنا۔ ایسا نہ ہو تمہارا کوئی وعدہ کل کلاں کو تمہیں ہی کسی مشکل میں ڈال دے۔" دانتوں میں خلال کرتا شیرو، سلامت کی جانب دیکھ کر خباثت سے مسکرایا۔

"مرد کی زبان ہے پھروں گا نہیں۔ تو شرط بتا۔"

"اچھا تو پھر سن۔۔۔" اتنا کہہ کر شیرو، سلامت کے بالکل نزدیک آگیا اور آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔ مبادا اس کی بات کوئی اور نہ سن لے، وہ جیسے جیسے بول رہا تھا سلامت کا منہ حیرت سے کھلتا گیا۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شیرو کی بات ختم ہوتے ہی وہ منمنایا۔

"اسی لیے کہا تھا پہلے سوچ سمجھ لے، پھر وعدہ کرنا، اگر منظور ہے تو ایک لاکھ تجھے اور دے دوں گا۔ ورنہ تین دن کے اندر میری رقم واپس کر، بڑی مشکل سے کمایا ہوا روپیہ ہے میرا حرام کا نہیں جو یہاں وہاں پھینک کر بھول جاؤں۔"

ایک دم ہی شیرو کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ آنکھیں جیسے اس نے اپنے ماتھے پر رکھ لیں۔

"مجھے کچھ دن سوچنے کی مہلت دے۔"

"تین دن سے زیادہ ایک دن بھی نہیں اگر میری شرط منظور ہے تو بھی تین دن اور اگر نامنظور تو بھی تین دن، بس اب مزید میرے پاس وقت نہیں ہے جو کرنا ہے تین دن میں کرلے ہاں یا ناں۔"

یہ کہہ کر شیرو وہاں رکا نہیں اور تیزی سے چلتا جلد ہی سلامت کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

رات وہ جلد ہی سو گیا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی جو صبح آنکھ بھی جلد ہی کھل گئی۔ قریب ہی موجود مسجد سے آنے والی اذان کی تیز آواز نے فوری طور پر اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ ویسے تو وہ نماز پڑھتا تھا، مگر عام طور پر فجر کی نماز سستی کے باعث گھر میں ہی پڑھ لیتا تھا، مگر آج اس کا دل چاہا کہ وہ فجر پڑھنے بھی مسجد ہی چلا جائے، یہ ہی سوچ کر اس نے باتھ روم جا کر وضو کیا، کپڑے تبدیل کیے اور تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھا دروازہ کھول کر جیسے ہی پہلا قدم باہر نکالا۔

یک دم ہی اندھیرے میں پاؤں کسی گٹھڑی نما چیز سے ٹکرایا مارے گھبراہٹ کے اس نے اپنا پاؤں واپس کھینچ کر فوراً ہی لائٹ کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ کانوں سے ٹکرانے والی کسی لڑکی کی آواز سن کر بٹن کی جانب بڑھتا اس کا ہاتھ وہیں ساکت ہو گیا۔

"پلیز لائٹ مت کھولیں۔" آواز یقیناً" رانی کی تھی جو اپنی جگہ سے کھڑے ہوتی ہوئے اس کے سامنے آگئی، چادر کی اچھی طرح بکل مارے اس نے اپنا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا تھا، چھت پر پھیلے ملگجے اندھیرے میں زادان نے دیکھ لیا اس کی۔۔۔ آنکھیں رونے کے باعث سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ اور وہ بھی اس وقت؟ تم اوپر کیسے آئیں۔" پے در پے سوال کرتا وہ اس قدر بدحواس تھا کہ یہ بھی بھول گیا کہ اسے نماز پڑھنے مسجد جانا ہے۔

"پلیز آپ آہستہ بولیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی آواز نیچے چلی جائے اور میرے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔" زادان نے دیکھا وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

"تم اندر کمرے میں جاؤ۔ میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں سیڑھیوں کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں آگیا، لیکن نیچے اترتے ہوئے اس نے یہ احتیاط ضرور کی کہ اپنے پیچھے دونوں دروازے لاک کرنا نہ بھولا۔

☆ ☆ ☆

"میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ یہ لڑکی گئی کہاں؟" کمرے میں یہاں وہاں بے چینی سے ٹہلتے شیرو نے کئی بار کا کیا ہوا اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا جس کا جواب فی الحال کمرے میں موجود کسی ذی نفس کے پاس نہ تھا۔

"اسے بتایا کس نے کہ تم اس سے میرا نکاح کرنے والے ہو۔"

کچھ سوچتا وہ یک دم سلامت کے سر پر جا پہنچا جو پریشانی کے عالم میں اپنی گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

"اسے کچھ نہ کہہ شیرو! یہ کچھ نہیں جانتا وہ خود بڑی حرافہ چیز ہے، کہیں نہ کہیں سے سن گن مل گئی ہوگی۔ اس لیے بھاگ لی۔" زہرہ نے آگے بڑھ کر شیرو کا بازو تھامتے ہوئے سمجھایا۔

"مگر کہاں سے؟" وہ دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا ہوا بولا۔

"اسے چھوڑ، پہلے یہ پتا چلا وہ گئی کہاں ہے؟"

"اپنی ماں کی طرف ہی ہوگی اور کہاں جانا ہے۔"

"نہیں۔ اس کی ماں پچھلے ایک ہفتہ سے ملتان گئی ہوئی ہے وہاں اس کے عزیزوں میں کوئی شادی تھی۔ اس کے ماموں کے گھر تالا پڑا ہے میں صبح پہلے وہاں ہی گیا تھا۔" سلامت نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔

"میں نے صبح ہی سارا پتا چلا لیا ہے اور یہ ہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے کہ تنہا جوان لڑکی رات کے اندھیرے میں گئی کہاں۔"

جو بھی تھا، تھی تو رانی اس کی سگی اولاد۔ سلامت کے لہجہ میں پریشانی در آئی۔

"جہاں بھی گئی ہے بھاڑ میں جائے سلامت! یہ میرا مسئلہ نہیں مجھے یا تو۔۔۔ لڑکی دے یا پھر میرا روپیہ واپس کر، ورنہ میں تیرے خلاف تھانے میں رپٹ درج کروا دوں گا۔"

"اتنا او کھا نہ ہو شیرو! مل جائے گی لڑکی، کہیں نہیں جاتی وہ۔"

زہرہ نے زبان کے ساتھ ساتھ آنکھ کے اشارے

سے بھی شیرو کو سمجھایا۔

"تیرا ہی منہ مجھے ماردیتا ہے ورنہ تو اپنی رقم کب کی وصول کرلیتا۔" سلامت کو گھورتا وہ زہرہ سے مخاطب ہوا۔

"جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں کچھ ویلا (وقت) اور نکال لے، آج کہیں نہ ملی تو پھر میں تھانے جاکر اس کی گم شدگی کی درخواست جمع کرادوں گی خود ہی پولیس ڈھونڈلے گی اسے کہیں نہیں جاتی۔ تو فکر نہ کر۔"

زہرہ اسے چمکارتے ہوئے بولی جب کہ سلامت گردن جھکائے بالکل خاموش بیٹھا تھا کیونکہ رات اس نے خود رانی کو کرایہ دار کی سیڑھیوں میں چھپایا تھا کہ صبح سویرے وہ اپنی ماں کے گھر چلی جائے اور اسے پورا بھروسا تھا کہ وہ چلی بھی جائے گی' اسی لیے وہ صبح دس بجے تک مطمئن تھا' مگر جیسے ہی گیارہ بجے اسے یہ علم ہوا کہ صباحت اور اس کے بھائی کی فیملی پچھلے ایک ہفتہ سے ملتان گئی ہوئی ہے اس کا سارا اعتماد ہوا بن کر اڑ گیا اور ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ رانی کہاں گئی؟ اور اپنے اس خوف کا اظہار وہ کسی سے نہ کرسکتا تھا بلکہ اسے تو یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں شیرو اور زہرہ یہ نہ جان جائیں کہ رانی کو اس گھر سے فرار کروانے میں اس کا ہاتھ ہے اور اسی خوف نے اس کی زبان مکمل طور پر بند کی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم پہلے یہ ناشتا کرو پھر مجھے ساری بات بتاؤ۔"

زادان نے چائے کا کپ اور پراٹھا اپنے سامنے بیٹھی خوب صورت سی لڑکی کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکی جسے دیکھنے کی خواہش وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے دل میں پالے ہوئے تھا۔ آج اس قدر اچانک اس کے سامنے آئی کہ وہ اس کی ہمت اور بہادری کو داد دینے کی اپنی خواہش فی الحال دل میں ہی دبا گیا۔

"میں صرف چائے پیوں گی۔" آہستہ سے کہتی رانی نے پراٹھا ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر اپنے لبوں سے لگالیا۔ زادان نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر سے اس کا جائزہ لیا گورا چٹا رنگ اور رنگین آنکھوں والی رانی خوب صورتی میں بالکل ست پھلاں رانی جیسی تھی اور اس تشبیہ کے ذہن میں آتے ہی اس کے ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ سی آگئی۔

"جانے ابا کے دل میں کیسے رحم آگیا جو اس نے اندر کی طرف سے اوپر آنے والے دروازے کا لاک کھول کر مجھے سیڑھیوں پر چھپا دیا کہہ رہا تھا کہ صبح فجر کے ساتھ ہی اپنی ماں کی طرف چلی جانا' مگر میں جانتی تھی کہ اماں اور ریما یہاں نہیں ہیں' مگر اس گھر میں بیٹھ کر شیرو کے ظلم کا شکار ہونے سے اچھا تھا کہ میں اس گھر سے کہیں نکل جاتی۔ یہ ہی سبب تھا جو میں نے ابا سے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے سیڑھیوں پر آن بیٹھی۔ وہ تو اچھا ہوا جو تم نماز کے لیے جاگ گئے ورنہ میں اذان کے بعد ہی باہر والا گیٹ کھول کر کہیں نکل جاتی اور جانے کہاں چلی جاتی۔"

وہ رب ہی تو تھا جس نے زادان کو فجر کی نماز پڑھنے مسجد جانے کی ترغیب دی کیونکہ وہ یہ ہی چاہتا تھا کہ زادان' رانی کو اپنے گھر پناہ دے۔ واقعی میرا رب وہ سب جانتا ہے جو ہم نہیں جانتے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے زادان اپنے رب کی حکمت اور رانی کے لیے کی جانے والی غیبی مدد پر حیران رہ گیا۔

"ویسے میں عام طور پر علی احمد کے جانے کے بعد نیچے کے دونوں دروازوں کی اندر سے کنڈی لگادیتا ہوں' مگر یہ اللہ کی رضا تھی جو رات مجھے جلد ہی نیند آگئی۔ علی احمد کب پڑھ کر نیچے گیا مجھے پتا ہی نہ چلا اور یہ ہی وہ سبب تھا جس کے باعث سیڑھیوں کے دروازے اندر سے کھلے رہ گئے اور تم یہاں وہاں دربدر ہونے سے بچ گئیں اب تم کہاں جاؤ گی؟"

"فی الحال تو یہاں رہ کر اپنی امی کا انتظار کروں گی۔ وہ دس دن تک واپس آجائیں گی پھر تم سے درخواست کروں گی کہ مجھے ان کے گھر چھوڑ آؤ۔"

"اور یہ درخواست نہیں کروگی کہ دس دن میں

تمہیں اپنے گھر رہنے کی اجازت دے دوں؟" ماحول میں پھیلی تلخی دور کرنے کے لیے زادان نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔ کیوں کہ اس گھر میں میری موجودگی میرے رب کی مرضی سے ہے۔ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔" رانی نے دھیرے سے جواب دیا اور اس کا جواب سن کر زادان ہنس دیا۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بہرحال میں آفس جارہا ہوں اور دونوں دروازے لاک کرکے جاؤں گا۔ برائے مہربانی تم صحن میں بالکل مت نکلنا۔ فریج میں جو کچھ کھانے کو ہے۔ نکال کر بنا گرم کیے کھالینا ایسا نہ ہو۔ اوپر ہونے والی کسی کھٹ پٹ سے تمہاری ماں الرٹ ہوجائے۔" اس نے رانی کو سمجھایا۔

"میں سب جانتی ہوں۔ تم فکر مت کرو۔"

اور پھر ہر طرح سے مطمئن ہوکر زادان پورا گھر اچھی طرح لاک کرکے آفس آگیا' مگر کام کے دوران اسے سارا دن یہ ہی دھڑکا لگا رہا کہیں سلامت کسی کمزور لمحہ کی زد میں آکر شیرو کے سامنے اعتراف جرم نہ کرلے جس کے نتیجہ میں شیرو یا زہرہ زادان کے گھر کی تلاشی لینے اوپر نہ آجائیں' مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ رات جب گھر آیا تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ صبح چھوڑ کر گیا تھا سوائے اس کے کہ اس کی غیر موجودگی میں رانی نے اس کے اکلوتے کمرے کی نہ صرف خوب اچھی طرح صفائی کردی تھی بلکہ اس کے کپڑے بھی استری کرکے ہینگر میں لگادیے تھے' آج وہ کھانا بھی باہر سے ہی پیک کروا کر لے آیا تھا۔ اسی سبب اس نے اوپر آتے ہوئے علی احمد کو کھانے سے بھی منع کردیا۔

☼ ☼ ☼

صباحت جب سے گھر واپس لوٹی تھی بہت پریشان تھی۔ پچھلے ایک ہفتہ سے نرما کا فون بند تھا اور نہ ہی اس نے خود اپنی ماں سے رابطہ کیا اور ایسا شاید پہلی دفعہ ہوا تھا ورنہ وہ تقریباً" روزانہ ہر رات ریما سے بات کرکے سوتی تھی پھر اب کیا ہوا؟ یہ ہی سوچ کر اس نے ریما سے کہا کہ وہ سلامت کو فون کرکے رانی کے متعلق دریافت کرے' جس کی وجہ صباحت کے دل کی گھبراہٹ تھی' مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی اس سے قبل کہ ریما باپ کو فون کرکے رانی کے متعلق دریافت کرتی' قریبی تھانہ سے آنے والے فون نے صباحت پر واضح کردیا کہ اس کے دل کی گھبراہٹ کا سبب یقیناً" یہ ہی تھا کہ رانی پچھلے ایک ہفتہ سے کہیں غائب ہے کہاں؟ یہ بات کوئی نہ جانتا تھا جب کہ صباحت اور ریما کے علاوہ اس کے ماموں جہاں زیب صاحب کو پورا یقین تھا کہ اس کے اس طرح گھر سے غائب ہونے میں یقیناً" زہرہ کا ہاتھ ہے۔ انہیں تو یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں زہرہ نے رانی کو مار نہ دیا ہو' مگر وہ اپنے اس خدشہ کا اظہار بہن کے سامنے نہ کرسکے مبادا وہ گھبراہٹ میں کہیں اپنا دل ہی نہ چھوڑ دے۔ دوسری طرف زہرہ اس گمان میں مبتلا تھی کہ رانی اپنی ماں کے گھر ہے جس کے لیے وہ سلامت پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ ہر حال میں نرما کو وہاں سے لاکر شیرو کے حوالے کرے۔

☼ ☼ ☼

شاہ زیب نے محسوس کیا کہ پچھلے کچھ دنوں سے زادان الجھا ہوا ہے' ہر دم کھویا کھویا اور شاید کچھ گھبرایا ہوا بھی' جب کہ اسے ایک ہفتہ قبل آفس کی طرف سے پوش ایریا میں فرنشڈ اپارٹمنٹ بھی مل گیا تھا پھر بھی جانے کیا وجہ تھی' جو وہ وہاں شفٹ ہونے سے کترا رہا تھا یہ ہی سبب محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک دن زادان کو جالیا۔

"کیا بات ہے زادان' تم ابھی تک شفٹ نہیں ہوئے؟"

"آں۔۔ ہاں یار۔" شاہ زیب کی بات سن کر وہ جیسے چونک اٹھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں تم ابھی تک اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ کیوں نہیں ہوئے۔"

"کیا بتاؤں یار! ایک عجیب سی مشکل میں پھنس گیا ہوں سمجھ میں نہیں آرہا۔ اس سے کیسے نکلوں۔"

"ایسی کون سی مشکل ہے جو تم مجھے نہیں بتا پا رہے۔"

شاہ زیب کے سوال کرنے پر زاوان نے اسے سب کچھ بتانے کا ارادہ کر لیا۔ اور پھر زاوان کی بتائی ہوئی کہانی سن کر وہ جیسے حیران رہ گیا۔

"اوہ میرے خدا! مطلب یہ کہ رانی تمہارے پاس ہے؟"

زاوان کی توقع کے برخلاف شاہ زیب کا جوشیلے انداز میں کیا گیا سوال یہ بتا رہا تھا کہ وہ رانی سے بخوبی واقف ہے۔

"تم رانی کو جانتے ہو؟" زاوان نے اپنے سامنے بیٹھے شاہ زیب کے خوشی سے چمکتے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں وہ میری بڑی پھوپھی کی بیٹی ہے اور سوری یار میں نے تمہیں گھر دلواتے وقت یہ نہیں بتایا کہ وہاں میری کزن بھی رہتی ہے۔ دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ تم سے ملنے جب میں وہاں آؤں تو رانی کی خیر خبر بھی ملتی رہے۔"

فون پر اپنے گھر کا نمبر ملاتے ہوئے اس نے جلدی جلدی ہر بات زاوان کو بتادی۔

"ہیلو ریما...!"

دوسری طرف شاید کسی نے کال ریسیو کرلی تھی نام سن کر زاوان سمجھ گیا کہ ریما رانی کی چھوٹی بہن ہے۔

"رانی مل گئی ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔" محض اطلاع پہنچا کر اس نے فون بند کر دیا۔

"تم جان نہیں سکتے یار! کہ آج تم نے میری کتنی بڑی مشکل حل کی ہے۔ یقین جانو ہم سب رانی پر فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ آج تم نے رانی کی مدد کر کے مجھے ساری عمر کے لیے اپنا مقروض کر لیا ہے۔" جواباً" زاوان خاموش رہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب تمہیں جلد از جلد وہ گھر چھوڑ دینا چاہیے قبل اس کے کہ شیرو اور اس کی بہن تم تک پہنچ جائیں۔"

"یہ ہی تو مشکل ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں وہاں سے رانی کو کیسے نکالوں، سامان تو میرا کوئی خاص ہے نہیں، کسی بھی لمحے لے کر نکل آؤں اصل مسئلہ رانی ہے چونکہ میرے گھر میں کوئی عورت نہیں، لہٰذا ایسا نہ ہو اسے میرے ساتھ وہاں سے نکلتا دیکھ کر کوئی شیرو کو اطلاع کر دے اور ہم بے خبری میں مارے جائیں۔"

"اوہ...!" اصل وجہ شاہ زیب کی سمجھ میں اب آئی کہ کیوں ابھی تک زاوان نے گھر تبدیل نہیں کیا۔

"تم آج واپسی میں اپنے ساتھ ایک عدد برقعہ لے جاؤ۔ رات میں تمہارے گھر آؤں گا اور برقعہ میں ملبوس رانی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور صبح تم بھی اپنا ضروری سامان لے کر وہاں سے نکل آنا۔"

شاہ زیب نے چٹکیوں میں اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

ویسے بھی وہ زہرہ کو اپنے گھر چھوڑنے کی اطلاع کے ساتھ سارے واجبات ادا کر چکا تھا۔ اس لیے اس طرح گھر چھوڑنا اسے نہایت آسان لگا اور جب رات وہ گھر واپس آیا تو برقعہ کے علاوہ رانی کے لیے کچھ کپڑے بھی خرید کر لے آیا کیونکہ پچھلے ایک ہفتہ سے وہ ایک ہی سوٹ بار بار دھو کر پہن رہی تھی۔

"ارے اس کی کیا ضرورت تھی؟" شاپنگ بیگ سے کپڑے نکال کر دیکھتے ہوئے رانی نے حیرت سے سوال کیا۔

"پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ میں تمہارے لیے کچھ خرید لوں۔"

وہ پچھلے دس دن سے زاوان کے ہمراہ تھی باوجود بہادری کے وہ ایک لڑکی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ رات جب تک زاوان جاگتا وہ اپنا وقت اسٹور میں بیٹھ کر گزارتی اور پھر زاوان کے سونے کے بعد کمرے کے دروازے کی باہر سے کنڈی لگا کر صحن میں نیچے فرش پر ہی سو جاتی۔ وہ کمرے کی صفائی کے علاوہ اس کے کپڑے بھی دھو کر استری کر دیا کرتی۔ یہ ہی وجہ تھی جو ان دس دنوں میں وہ اس لڑکی کا عادی ہو چلا تھا۔ وہ لڑکی جس کے ہر دم لڑنے کی آواز سن کر وہ اسے کوئی پٹاخہ ٹائپ چیز سمجھتا تھا۔ درحقیقت ایک نہایت سادہ اور محبت کرنے والی تھی جس کا اندازہ ان چند دنوں میں ہی زاوان نے اس کے ساتھ رہ کر لگا لیا تھا۔

"اور یہ برقعہ کس کے لیے ہے؟" وہ اپنے خیالوں میں گم تھا جب رانی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ جواباً" اس نے شاہ زیب سے ہونے والی اپنی ملاقات کے ساتھ ساتھ ہر بات رانی کو بتادی، جسے سن کر وہ ایک پل کے لیے خاموش ہو گئی یا شاید زاوان کو ایسا محسوس ہوا۔

"میں دعا گو ہوں کہ تم آج رات بخیریت اپنی فیملی تک پہنچ جاؤ۔"

"جب میں نے آج رات چلے ہی جانا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی میرے لیے شاپنگ کرنے کی، میں اپنی امی کے گھر جا رہی تھی جہاں میری ضرورت کی ہر چیز پہلے سے ہی موجود ہے پھر کیوں بلاوجہ مجھ پر احسان کیا۔"

رانی کے روکھے لہجہ میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے زاوان کو بے چین کر دیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"تم خوش نہیں ہو؟" بے تکا سوال جسے پوچھنے کے بعد وہ تھوڑا سا گھبرا گیا۔

"آپ کو میری خوشی سے کیا لینا دینا مسٹر زاوان دیگر احسانوں کی طرح میں آپ کے مزید ایک احسان کی مقروض ہو گئی ہوں کہ آپ نے مجھے میرے گھر والوں تک پہنچا دیا۔"

آنکھوں میں آنسو چھپائے رانی اسٹور کی جانب بڑھ گئی بنا یہ جانے کے اس کے پیچھے کھڑا زاوان کس کیفیت کا شکار ہے۔ زاوان کو ایک پل لگا یہ جاننے میں کہ اسے محبت ہو گئی ہے ہاں یہ سچ تھا کہ وہ رانی کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا اور شاید وہ بھی جس کا اندازہ اسے رانی کے کچھ دیر قبل والے رویہ سے ہو چکا تھا۔



اسے تنہا کر کے رانی شاہ زیب کے ہمراہ چلی گئی ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ اس رات اسے خوب کھل کر نیند آتی کیونکہ آج وہ اس ٹینشن سے آزاد تھا کہ باہر صحن میں موجود رانی کو کوئی دیکھ نہ لے، مگر ایسا نہ ہوا اپنی زندگی کی شاید وہ پہلی رات تھی جو زاوان نے بستر پر کروٹیں بدل کر گزار دی وہ جب آنکھ بند کرتا چھم سے رانی کا وجود اس کی نظروں کے سامنے آجاتا، کانوں میں اس کی آواز رس گھولتی محسوس ہوتی۔ اسی بے چینی میں کب صبح ہوئی اسے پتا ہی نہ چلا اور پھر بنا ناشتا کیے اپنا مختصر سامان سمیٹ کر وہ نیچے آگیا۔ دروازہ بجا کر گھر کی چابی زہرہ کے حوالے کی اور سامان اٹھائے روڈ تک آیا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی اور دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلامت اس کی گاڑی کے قریب کھڑا غالباً" اس کا منتظر تھا۔

"السلام علیکم زاوان صاحب!"

اتنے ماہ میں اس کی سلامت سے کوئی خاص بات چیت نہ ہوئی تھی۔ اس لیے اسے اس طرح خود سے مخاطب ہوتا دیکھ کر زاوان چونک اٹھا۔ سلامت کا رویہ اسے سمجھا گیا کہ ضرور کوئی ایسی خاص بات ہے جس کے لیے وہ جانے کب سے وہاں کھڑا زاوان کی آمد کا منتظر ہے۔

"وعلیکم السلام انکل! خیریت تو ہے۔ آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے؟" گاڑی میں سامان رکھتا وہ سلامت سے مخاطب ہوا۔

"دراصل بیٹا! تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔" لہجہ میں بے چینی لیے وہ زاوان کے قریب ہوا۔

"میں رانی کا باپ ہوں۔" زاوان جو اس کی جانب سے کسی سوال کا منتظر تھا یک دم یہ جملہ سن کر چونک اٹھا۔ اسے لگا رانی کے حوالے سے سلامت کچھ مشکوک ہے۔

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔" دھڑکتے دل کو سنبھالتا وہ بظاہر نارمل انداز میں بولا۔

"دراصل بیٹا! میں بہت پریشان ہوں اس رات میں نے رانی کو اوپر جانے والی سیڑھیوں پر چھپایا تھا، مگر پھر جانے وہ کہاں غائب ہو گئی۔ یقین جانو۔ جس دن سے وہ غائب ہوئی ہے میرے دل کا سکون بھی مانو جیسے کہیں

کھو گیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے میری جوان اور تنہا بیٹی!"

اتنا کہہ کر وہ رونے لگا۔

"پلیز انکل! آپ روئیں مت اور شاہ زیب کے پاس چلے جائیں وہ جانتا ہے کہ رانی کہاں ہے؟"

گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے زادان نے سلامت کو جیسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا اور پھر یہ جانے بنا کہ سلامت پر اس کی بات کا کیا رد عمل ہوا ہے۔

وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے کی جانب بڑھ گیا مگر اس نے گاڑی کے شیشے سے اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ سڑک کے کنارے کھڑے سلامت نے اپنی آستینوں سے آنکھ میں آئے آنسو پونچھ لیے تھے۔

☆ ☆ ☆

صباحت خوش تھی کہ رانی اس کے پاس واپس آگئی مگر جانے کیوں جب سے وہ ماں کے گھر آئی تھی' بالکل خاموش تھی وہ واویلا اور رہا گلا جو وہ زہرہ کے پاس رہ کر کرتی یہاں تقریباً" ختم ہو چکا تھا۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی' الجھی ہوئی رانی اس رانی سے قطعی مختلف تھی جسے صباحت اور ریما جانتے تھے۔ ریما کو تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی پیاسی نگاہیں کسی کا انتظار کر رہی ہیں' مگر کس کا؟ یہ ایک ایسا راز تھا جو بنا رانی کے لب کھولے کوئی نہ جان سکتا تھا۔ جب کہ رانی تو ہونٹ سیے' چپ سادھے بیٹھی تھی' مگر اس کی یہ چپ اس دن ٹوٹ گئی جب تھکا ہارا سلامت' صباحت کے در پر آن بیٹھا۔

وہ جاتی سردیوں کی ایک اداس شام تھی۔ رانی خاموشی سے منڈیر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی آسمان پر اکا دکا اڑتے پرندے دیکھ رہی تھی جب چھت پر آتی سیڑھیوں کے دروازے سے سلامت اندر داخل ہوا' جسے دیکھ کر رانی کے ساتھ ساتھ صباحت اور ریما بھی چونک اٹھیں۔ جھکے کندھے اور چہرے پر ندامت لیے وہ صباحت کے قدموں میں آن بیٹھا' وہ رو رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دے صباحت! میں نے ایک انجانی محبت میں ڈوب کر تیرے ساتھ زیادتی کی۔"

صباحت ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے حیرت تھی آج اتنے سالوں بعد سلامت کو اپنی زیادتیوں کا احساس کیسے ہو گیا؟

"میں تیرے پاس واپس آگیا ہوں سب کچھ چھوڑ کر وہ گھر' دکان اور بچے اس لالچی عورت کے حوالے کرکے میں آزاد ہو گیا ہوں۔"

"واہ ابا واہ! جب خالی ہاتھ ہو گئے تو صباحت یاد آگئی۔" صباحت جو سلامت کے رونے دھونے میں کھوئی ہوئی تھی یک دم ہی رانی کی آواز سن کر چونک اٹھی۔

"جو کمایا تم نے اس عورت پر لگا دیا اور جب کمانے کے قابل نہ رہے تو ہمارا حق بھی اسے سونپ آئے۔ یہاں تک کہ ایک بار پھر سے دو بچوں کو یتیم کر دیا' جن کا باپ ابھی زندہ ہے۔" رانی کا اشارہ علی احمد اور سوہا کی جانب تھا۔

"جب ہمیں باپ کی محبت کی ضرورت تھی تو تم پر زہرہ کے عشق کا بخار چڑھا ہوا تھا اور آج جب علی اور سوہا کو تمہاری ضرورت ہے تو وہی عشق نفرت میں بدل گیا۔ دونوں بار تم فائدے میں رہے اور نقصان کس کا ہوا۔ پہلی بار ریما اور رانی کا' دوسری بار علی اور سوہا کا واہ ابا کیا انصاف ہے تمہارا۔"

اپنے باپ کو داد دیتی رانی طنزیہ انداز میں مسکرائی تھی۔

"چپ کر رانی' یہ ہم دونوں کا آپس کا مسئلہ ہے ہمیں حل کرنے دے۔"

اتنے سالوں بعد شوہر کو اپنے سامنے پا کر صباحت کے اندر چھپی مشرقی عورت بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔

"اب یہ تمہارا آپس کا مسئلہ نہیں ہے امی! یہ ہمارا سب کا مسئلہ ہے ابا کو اگر ہمارے ساتھ رہنا ہے تو مکان اور دکان میں سے ہم دونوں بہنوں کو بھی حصہ دیں ورنہ بہتر ہوگا واپس جا کر زہرہ سے کیا گیا اپنا سالوں

پرانا عشق نبھائیں ہمیں ایسے باپ کی ضرورت نہیں جس کے پاس ہمارے لیے کچھ نہ ہو۔"

تڑ تڑ بولتی رانی' دندناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ سچ تو یہ ہے جہاں گھر ٹوٹتے ہیں۔ وہاں پروان چڑھنے والے بچے شاید ایسے ہی ہوتے ہیں وہ بچے جو باپ کا تحفظ اور ماں کی محبت کے بنا پل کر جوان ہوتے ہیں۔ وہ رانی جیسے منہ زور ہو جاتے ہیں اور اس میں اصل قصوروار اولاد نہیں بلکہ ماں باپ ہوتے ہیں جو اپنی انا اور ضد میں آکر بچوں کا بچپن برباد کر دیتے ہیں' جس کا احساس انہیں وقت کے ساتھ ہوتا ضرور ہے مگر شاید بہت دیر بعد۔۔۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو بیٹا مجھ سے اب گھر نہیں سنبھالا جاتا جو بھی تھا کئی سالوں سے دونوں بہوؤں نے بٹھا کر کھلایا ہے۔ اب بھلا اس بڑھاپے میں کیسے پتا چلے کہ کیا پکانا ہے؟ کیسا پکانا ہے؟"

رافعہ ایک ہفتے میں زادان کے ساتھ گھر سنبھالتے ہوئے جیسے ہانپ گئیں۔

"بہتر ہوگا تم بھی اب شادی کر لو' کوئی ہے تو ٹھیک ورنہ عانیہ۔"

"پلیز اماں! آپ کیوں ہر وقت عانیہ کو میرے سر پر تھوپنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔"

زادان نے تیزی سے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اس کے ساتھ ہی رانی کا تصور چھم کرکے زادان کی نظروں کے سامنے آگیا۔

"یہ ٹی شرٹ کہاں لے کر جا رہی ہو؟" بلو ٹی شرٹ جو رانی جاتے ہوئے استری کرکے رکھ گئی تھی جیسے ہی اس پر زادان کی نظر پڑی وہ تیزی سے صفیہ کی جانب لپکا۔

"اماں نے کہا تھا کہ آپ کے سارے کپڑے استری کرکے ہینگر میں لگا دوں۔" صفیہ یک دم ہی گھبرا کر بول اٹھی۔

"یہ ٹی شرٹ استری تھی۔ رانی نے خود میرے سامنے کی تھی' پر تم نے کیوں ہینگر سے نکالی۔" صفیہ کے ہاتھ سے ٹی شرٹ لیتا وہ قدرے ناراضی سے بولا اور اس کی یہ ناراضی جیسے رافعہ کو بہت کچھ سمجھا گئی۔

"رانی وہی لڑکی ہے نا جس نے کچھ دن تمہارے پاس پناہ لی تھی غالباً" شاہ زیب کی کزن ہے نا وہ۔" انہوں نے بیٹے کو کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی امی۔۔۔!" ٹھنڈی سانس بھرتا زادان ان کے نزدیک آن بیٹھا۔ "یقین جانیں امی! خوب صورتی میں تو وہ ست پھلاں رانی جیسی ہے مگر اس کا باپ کوئی مہاراجہ نہیں جو آپ کے بیٹے کو کسی ریاست کا ولی بنادے بلکہ وہ تو ایک نہایت ہی غریب سا بندہ ہے۔ بس یہ ہی سوچ مجھے مارے دے رہی ہے کہ رانی کے ساتھ ریاست کہاں سے لاؤں جو بھابھیوں کی شرط پوری کر سکے۔"

اماں کی جانب دیکھتا وہ شرارت سے مسکرایا۔

"ارے لعنت بھیجو ریاست پر' رانی مل رہی ہے یہ ہی بہت ہے۔" رافعہ جیسے کھل اٹھیں۔

"بس اب تم مجھے جلدی سے اس کے گھر لے چلو۔"

"میں پہلے شاہ زیب سے بات کر لوں پھر آپ کو بتاتا ہوں۔"

ماں کی رضامندی نے زادان کو بالکل ہلکا پھلکا کر دیا۔ اب اصل مسئلہ شاہ زیب سے بات کرنے کا تھا۔ جس کے بعد وہ امی کے ساتھ رانی سے ملنے اس کے گھر جا سکتا تھا جسے دیکھنے کے لیے اس کی نظریں جیسے ترس گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"آج میرا دل مراداں پا گیا"

دور کہیں سے آتی گانے کی آواز میں ڈوبی رانی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نیچے گیٹ پر کوئی گاڑی آکر رکی تھی۔ سلور گاڑی شاید اس نے پہلے کہیں دیکھی تھی کہاں؟ اسے یاد نہ آیا۔ ہاتھ میں پکڑی بالٹی فرش پر رکھ کر وہ تھوڑا منڈیر کے قریب ہوئی تاکہ نیچے جھانک کر دیکھ

سکے کہ کون آیا ہے؟ شومئی قسمت جیسے ہی اس نے نیچے جھانکا گیٹ کے عین سامنے کھڑا زاوان اوپر ہی دیکھ رہا تھا۔ رانی پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرادیا' اس کی مسکراہٹ نے جیسے رانی کو خجل کردیا۔

"سمجھ رہا ہوگا۔ میں اسے جھانکنے آئی ہوں۔"

منڈیر سے پیچھے ہٹتے ہی وہ بڑبڑائی۔

"کون سمجھ رہا ہوگا؟" ریما جانے کب اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی اسے پتا ہی نہ چلا۔

"کوئی نہیں۔۔۔ اور یہ تم کیا ہر وقت میری کن سوئیاں لیتی رہتی ہو' بندہ خود سے کبھی کوئی بات نہیں کرسکتا۔"

زاوان کی مسکراہٹ کا بدلہ ریما سے لیتی وہ اندر کمرے میں چلی گئی اور پھر شام تک انجانے میں بھی اس کا دل منتظر رہا شاید زاوان ایک بار اس سے ملنے اوپر آجائے مگر ایسا نہ ہوا۔ شاید جو ہم سوچتے ہیں وہ اکثر ہی نہیں ہوتا اور جب وہ نہیں ہوتا تو اسی طرح مایوسی میں گھر جاتے ہیں جیسے اس لمحہ رانی گھر گئی۔

"میں ہی بے وقوف ہوں جو اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے مری جارہی تھی وہاں تو ایسا کوئی خیال بھی نہیں' اگر ہوتا تو کیسے ممکن تھا جو یہاں تک آکر بنا مجھ سے ملے واپس چلا جاتا۔" مایوسی نے بدگمانی کو جنم دیا۔

"تو طے یہ ہوا کہ آج کے بعد سے زاوان کا قصہ ختم' اگر اسے میرا احساس نہیں تو پھر میرے پاس بھی اس کے لیے وقت نہیں۔"

اپنے دل کو اچھی طرح سمجھا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اسی لمحے صباحت اندر کمرے میں داخل ہوئیں۔

"یہاں بیٹھو' مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اٹھتے اٹھتے رانی ایک بار پھر سے بیٹھ گئی۔

"مجھے شاہ زیب نے نیچے بلایا تھا تمہارے رشتہ کی بات کرنے۔"

"میرے رشتہ کی بات کرنے۔" ایک بالکل انہونی خبر نے ایسے جیسے چونکا دیا۔

"ہاں شاہ زیب کا کوئی دوست ہے بقول شاہ زیب بہت اچھا لڑکا ہے۔ کھاتا پیتا خاندانی اور برسرروزگار۔"

رانی کا دل ایک پل کے لیے جیسے دھڑکنا تمام کیا ہے؟؟

بنا سوچے سمجھے ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔ "نام تو میں نے نہیں پوچھا لیکن لڑکا اچھا ہے اور اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے گھر آنا چاہتا ہے۔"

"وہ لڑکا مجھے کیسے جانتا ہے؟"

اپنے دل میں آئے ہر شک کو وہ دور کرلینا چاہتی ہیں

"میں نے کب کہا تمہیں جانتا ہے؟"

صباحت نے حیرت سے بیٹی کی جانب دیکھا جو ایک بار پھر سے شرمندہ ہوگئی۔

"پھر وہ میرے رشتہ کا طلب گار کیسے ہوا؟"

شرمندگی کو چھپاتی وہ ایک بار پھر سے سوالیہ تھی۔

"اس نے تو کسی اچھی لڑکی کے لیے کہا تھا شاہ زیب کو تمہارا خیال آگیا اور بس' تم جانے کیوں اتنی جرح کررہی ہو' مجھے سوچ کر جواب دو تاکہ میں نیچے خبر کرسکوں۔" ہدایت دیتی صباحت کمرے سے باہر نکل گئی۔

"زاوان نہیں تو کوئی بھی سہی کیا فرق پڑتا ہے ویسے کون سا ہم دونوں کے درمیان کوئی عہدو پیمان ہوئے تھے۔ جنہیں لے کر میں اپنی زندگی تیاگ دوں۔"

خود کو مطمئن کرکے اس نے ایک ہی پل میں فیصلہ کیا اور اپنا جواب ہاں کی صورت امی تک پہنچادیا۔ جسے سن کر صباحت نے سکھ کا سانس لیا۔ سچ ہے بیٹی کا اچھا نصیب کسی بھی ماں کا پہلا خواب ہوتا ہے اور اسی خواب کی تکمیل کے لیے صباحت نے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کے ہر قدم کو سرخرو کرے۔

☆ ☆ ☆

منگنی کا خوب صورت سوٹ لڑکے والوں کی طرف سے آیا تھا جسے پہن کر ملکے سے میک اپ کے ساتھ رانی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ لڑکے کے گھر سے آنے والی خواتین کی تعداد چھ سے زیادہ نہ تھی جن میں سے ایک لڑکے کی والدہ تھیں جو جب سے

آئی تھیں رانی کے بے مثال حسن پر فریفتہ ہوئی جارہی تھیں' دو عالیا' اس کی بھابھیاں تھیں جنھوں نے آتے ہی بڑے روکھے انداز سے اپنا تعارف رانی سے کروایا۔ مردانے میں کون تھا یہ رانی نہ جان سکی کیونکہ سارے مرد حضرات نیچے ماموں کے گھر تھے اسے سب سے زیادہ خوشی علی احمد اور سوہا کے آنے سے ہوئی جواباً کے ساتھ اس کی خوشی میں شریک ہونے آئے تھے' سب بہت خوش تھے اور سب کو دیکھ کر وہ بھی خوش تھی۔ جب دولہا' شاہ زیب اور ماموں کی سنگت میں اوپر آگیا۔ سب سے نظر بچا کر اس نے اپنا دوپٹا سرکا کر دیکھا اور مطمئن ہوگئی۔ دروازے سے اندر داخل ہونے والا سفید شلوار قمیص میں ملبوس نوجوان کوئی اور نہیں زاوان تھا۔ جس کی آمد کی امید وہ کب سے دل میں لیے بیٹھی تھی اس کی نظریں جیسے ہی زاوان سے ملیں وہ مسکرادیا جب کہ رانی ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھی تھی۔

"حیرت ہے تم مجھے دیکھ کر شاکڈ نہیں ہوئیں۔" رانی کے برابر بیٹھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا اتنے شوروغل میں اس لمحے کوئی بھی ان کی جانب متوجہ نہ تھا۔

"کیونکہ میں جان چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میرا مقدر بنادیا ہے ورنہ اس صبح تم فجر کی نماز پڑھنے کبھی مسجد نہ جاتے۔" زاوان اس کے لہجہ میں چھپے یقین پر حیران رہ گیا۔

"اور پھر دعائیں دو اپنی بھابھیوں کو جن کے آتے ہی میرا شک سوفیصد یقین میں بدل گیا۔ کہ تمہیں ان کا دیور ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔" مہندی والے ہاتھ سے اپنا دوپٹا درست کرتی وہ آہستہ سے بولی۔

"اچھا وہ کیسے؟"

وہ جو رانی کے لیے سرپرائز بن کر آیا تھا سب کچھ نارمل دیکھ کر تھوڑا سا مایوس ہوتے ہوئے بولا۔

"جانتے ہو تمہاری بڑی بھابھی نے مجھے دیکھتے ہی کیا کہا تھا؟"

زاوان کو نفی میں سرہلاتا دیکھ کر وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"دیکھیں تو سہی وہ کون سی ست پھلاں رانی ہے جس نے ہمارے دیور کو راجہ مہاراجہ بنادیا ہے۔"

اس کا یہ جملہ سنتے ہی زاوان ہنس دیا کیونکہ اس حوالے سے وہ ہر بات پہلے ہی رانی سے شیئر کرچکا تھا۔

"کیا ہوگیا ہے بھائی کیوں اتنا منہ کھول کر ہنس رہے ہو؟" زاوان کی ہنسی نے شاہ زیب کے ساتھ سب کو ان دونوں کی جانب متوجہ کردیا زوان کے ساتھ رانی کے چہرے پر چھائی خوشی نے جہاں دور بیٹھی صباحت اور رافعہ کو مطمئن کیا۔ وہاں سلامت بھی آسودہ ہوگیا ۔ کم از کم اس کے ایک صحیح اور بروقت فیصلے نے اس کی بیٹی کو تباہ ہونے سے بچالیا ورنہ جو اگر وہ اس دن شیرو کی بات مان جاتا تو شاید آج کی یہ خوشی اس کا مقدر نہ بنتی جو اس وقت اسے حاصل ہوئی تھی۔

☆

نمرہ احمد



تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے اگلے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ



آ تا ہے۔ فاتح سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے باپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو سچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرھویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اور اس نے تالیہ کے بابا کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنا دے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں

جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پھل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم اینگنس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر محل کا اسکیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبدہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اسکالر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آیا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسکیچ بنواتی ہے۔ تو وہ غلط اسکیچ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔

تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس فیملی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ

ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو "ابوالظفیر" نامی آدمی کے کارندے سے ایک پنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملاکہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کرا لیتی ہے۔ مگر فاتح کو آزاد کرانے سے پہلے اغوا کاروں کو خبر ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں فاتح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاتح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک "الیہنو" قیدی کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جل دے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ پہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بنداہارا کی بیٹی ہے۔ بنداہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

گیارہویں قسط

☆☆☆

وہ احاطہ دراصل ابوالخیر نامی امیر تاجر کی حویلی کے گرد بنا تھا اور برآمدے میں تعمیر شدہ وہ طویل جیل اس کی ذاتی ملکیت تھی جہاں فاتح سمیت بہت سے دوسرے انسان قید تھے۔ رات بھر وہ اندر قید رہتے اور دن بھر وہ مشقت کرتے۔

صبح سلاخ دار دروازے کھول دیے گئے اور پہریدار قیدیوں کو قطار کی صورت باہر نکال لائے۔ ہر قیدی کے پیروں اور ہاتھوں میں لمبی زنجیر بندھی تھی۔ اتنی لمبی کہ وہ ہاتھ پیر ہلا کے کام کر سکتا تھا، اتنی چھوٹی کہ وہ تیز بھاگ نہ سکتا تھا۔

پہریدار دو قیدیوں کو اپنے ساتھ حویلی کے اندر لے گئے اور جب واپس آئے تو وہ دونوں ان کے ہمراہ نہ تھے۔ جانے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ کوئی پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

باہر سڑک پار ایک اونچی عمارت بنائی جا رہی تھی جس کے پاس لکڑی، گارے، مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے۔ قیدیوں کو وہاں تعمیراتی کام کرنا تھا۔ باہر آتے ہی تمام قیدی روز کے معمول کے مطابق اپنے اپنے کام میں جت گئے۔ فاتح بھی انہی لمبی زنجیروں میں بندھا تھا۔ جینز گھٹنوں سے پھٹ گئی تھی اور سفید شرٹ مزید گدلی ہو چکی تھی۔ شیو بھی پانچ روز کی بڑھی ہوئی تھی۔ دوسرے غلاموں کی پیروی میں وہ بھی خاموشی سے کام کرنے لگا۔ دھوپ تیز تھی اور زنجیروں کے باعث چلنے میں مشکل پیش آتی تھی مگر اس نے گارے کا تھال سر پہ رکھا اور اس طرف لے جانے لگا جہاں دوسرے قیدی جا رہے تھے۔

سورج سوا نیزے پہ پہنچا تو فاتح سڑک پہ چلتے لوگوں سے بے نیاز کھڑا ایک دیوار پہ گارا لیپتا دکھائی دے رہا تھا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ بار بار آستین سے پیشانی پہ آیا پسینہ پونچھتا۔ سڑک کنارے وہ لوگ دیوار تعمیر کر رہے تھے۔ ادھر اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑتا، ادھر کوئی پہریدار آ کے کمر پہ چھڑی رسید کرتا۔

قریب میں ایک خوانچہ فروش اپنی ریڑھی دھکیلتا آ رہا تھا۔ جب وہ فاتح کے قریب پہنچا تو کسی گاہک نے اسے روک لیا۔ وان فاتح اپنے ساتھ کھڑی ریڑھی سے بے نیاز دیوار پہ ہاتھوں سے گارا لگا رہا تھا۔

''سر!'' سرگوشی پہ اس کے ہاتھ ٹھٹھک کے رکے۔ چونک کے مڑنے لگا مگر......

''گارڈز دیکھ رہے ہیں سر۔ میری طرف مت گھومیں۔ اپنا کام کریں۔'' فاتح نہیں گھوما' بس آہستہ سے ازسرنو گارا ملنے لگا۔ پھر اسی آہستگی سے رخ ذرا سا موڑ لیا۔

اب اسے کن اکھیوں سے نظر آ رہا تھا کہ ریڑھی کے ساتھ سر جھکائے' ہیٹ پہنے' وہ معزز سا دکھائی دیتا آدمی ایڈم ہی تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' وہ لب ہلائے بغیر بولا۔ دل کو سکون سا ملا تھا۔

''جی سر۔ مگر آپ ٹھیک نہیں ہیں۔'' ایڈم سر جھکائے' منہ میں بولتا' ریڑھی کی ایک ایک چیز اٹھا کے دیکھ رہا تھا۔

''اور تالیہ؟'' اس نے اپنے متعلق سوال نظر انداز کیا۔

''آہ.....بے چ تالیہ!'' ایڈم نے گہری سانس بھری۔ ''وہ بھی ٹھیک ہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ تو وہی ٹھیک ہیں۔''

''تم الور سونگائی کیوں نہیں گئے؟ تمہیں مراد کو ڈھونڈنا تھا۔'' فاتح اب جھک کے تھال سے مزید گارا ہاتھوں پہ اٹھا رہا تھا۔ انداز میں ناخوشی تھی۔

''ہم شہر سے باہر تک گئے' پھر بے چ تالیہ ہمیں واپس لے آئیں۔ وہ آپ کو چھوڑ کے نہیں جانا چاہتی تھیں۔''

''بے وقوف!'' خفگی سے سر جھٹک کے سیدھا ہوا اور پتھروں کی تہہ پہ گارا ابھرا۔ ''ابھی کہاں ہے وہ؟''

''صبح ہم نے ایک گھر سے کپڑے.....ادھار لے کر پہنے (تھوک نگل کے کہا) اور پھر ہم بازار آ گئے۔ وہاں سے وہ مجھ سے رات میں ملنے کا کہہ کے بنداہارا کے محل چلی گئیں۔''

''وہ محل کیوں چلی گئی؟''

ایڈم نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کے فاتح کو دیکھا' جس کا یہاں سے نیم رخ نظر آتا تھا۔ وہ سنجیدہ صورت بنائے گارے کی تہہ پہ پتھروں کی تہہ لگا رہا تھا۔ پسینے سے بھیگے بال شکن آلود پیشانی پہ جمے تھے۔

''وہ دراصل.....بات یہ ہے کہ.....'' ایڈم نے تھوڑی کھجائی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے یہ بات کہے۔ ''بے چ تالیہ کو ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ.....وہ خود ہی.....دراصل.....شہزادی تاشہ ہیں۔''

گارا لیپتے وان فاتح کے ہاتھ تھم گئے۔ بالکل ساکت۔

''جی' یہ سچ ہے سر۔'' اس کی خاموشی پہ ایڈم کا حوصلہ بڑھا۔ ''وہ شہزادی تاشہ جن کے قصے ہم پڑھتے تھے' جن کے بارے میں بنگارایا ملایو لکھی گئی تھی' وہ دراصل بے چ تالیہ ہی ہیں۔ وہی بنداہارا کی بیٹی ہیں' اور وہ.....''

فاتح سر جھکا کے ایک دم ہنس پڑا۔ ایڈم کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔

''اس نے محل کی طرف جانے سے پہلے تمہیں کہا کہ وہ شہزادی تاشہ ہے اور تم نے یقین کر لیا؟'' محظوظ انداز میں سر جھٹکا تو ایڈم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

''سر' وہ واقعی.....''

''this is Taliyah for you, Adam! (تمہارے لیے وہ تالیہ ہے ایڈم) وہ اب بدقت مسکراہٹ دبا کے دیوار پہ گیلی مٹی لیپ رہا تھا۔ ''وہ ایک کون آرٹسٹ ہے' وہ کہانیاں گھڑتی ہے She lies for a living۔ (وہ زندہ رہنے کے لیے جھوٹ بولتی ہے)

اس نے تم سے مذاق کیا.....ایک کہانی گھڑ لی اور تم نے یقین کر لیا۔ تمہیں کتنی دفعہ بتایا ہے میں نے کہ وہ تمہیں تنگ کرنے کے لیے ایسا کرتی ہے۔''

''نہیں سر' آپ غلط سمجھ رہے ہیں' وہ واقعی.....''

''وہ جہاں بھی جا رہی ہو گی' وہ شیئر نہیں کرنا چاہتی ہو گی۔ تھوڑی عقل استعمال کرو۔ اس کی عادت ہے تمہارے ساتھ مذاق کر کے تمہیں شرمندہ کرنا۔''

خوانچہ فروش اب ایڈم سے مایوس ہو چکا تھا جو ہر چیز کو مسلسل الٹ پلٹ کے دیکھے جا رہا تھا مگر خریدنے کی بات نہیں کرتا تھا۔ تنگ آ کے وہ اپنی ریڑھی دھکیلنے لگا۔ پہریدار دور کھڑے نگرانی کر رہے تھے۔ ایڈم نے بے بسی سے اطراف میں دیکھا۔ یہاں کھڑے رہنے کا جواز چھوٹ رہا تھا۔

''سر.....وہ واقعی میں شہزادی تاشہ ہیں' وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں' وہ.....''

''مراد کو ڈھونڈو۔ الور سونگائی جاؤ اور چابی لے کر آؤ۔ اور اگر مراد قید میں ہے تو اس قید خانے کا پتا لگاؤ۔''

فاتح کام میں مصروف تھا۔ ایڈم کے پاس اب آگے بڑھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

تھال خالی ہوا تو فاتح نے زنجیر والے ہاتھوں سے اسے اٹھاتے ہوئے پیچھے دیکھا۔ ایڈم اب وہاں نہیں تھا۔

''تالیہ بھی اس بے چارے کے ساتھ بہت زیادتی کر دیتی ہے۔'' مسکراہٹ دبا کے سر جھٹکا اور تھال اٹھائے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

عشاء کی اذان کے ساتھ ہی ملاکہ شہر کی ساری مشعلیں اور قندیلیں بجھتی گئیں۔ مسجدوں سے گھروں کا رخ کرنے کے بعد لوگوں نے دروازوں کے کنڈے چڑھا لیے اور کھڑکیوں کے پردے گرا دیے۔ شہر گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اوپر تاروں سے جھلملاتا آسمان البتہ خوب روشن تھا۔

ایسے میں چند مکانوں کے عقب میں ایک درخت تلے ایڈم بیٹھا تھا۔ تھیلے کو سینے سے لگائے' وہ احتیاط سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے گرد و نواح میں دیکھتا تھا۔ رات کے اس پہر سب کچھ سنسان اور خاموش تھا۔

''ایڈم!'' پیچھے سے نسوانی سرگوشی ہوئی تو وہ اچھل ہی پڑا۔ پھر تالیہ کو دیکھ کے جان میں جان آئی۔ وہ صبح والے لباس میں ہی تھی' مگر سر پہ لٹو والا ہیٹ تھا۔ ایڈم نے چہرے پہ خفگی طاری کی۔

''کہاں تھیں آپ؟'' دبی دبی آواز میں پوچھا۔

''میں اپنے بابا کے پاس گئی تھی۔ راجہ مراد میرے بابا ہیں۔'' وہ اس کو دیکھتے ہوئے جلدی سے بولی۔ اداس بھی لگ رہی تھی۔ سنہری بال جوڑے میں تھے اور چند لٹیں گالوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایڈم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ مذاق تو نہیں کر رہیں نا؟''

''نہیں۔ میں تو کامیڈین ہوں۔ میری زندگی میں تم سے مذاق کرنے کے علاوہ دوسرا کام کون سا رہ گیا ہے؟'' اس کے تو سر پہ لگی تلووں پہ بجھی۔ ایڈم خفیف سا ہوا۔

''نہیں' میرا مطلب ہے' میں کیسے یقین کروں کہ آپ ایک دم سے شہزادی نکل آئی ہیں' ہاں؟ کل تک تو

آپ لکڑ ہارے کی بیٹی تھیں' اور آج بنداہارا کی؟"

تالیہ نے گہری سانس لی۔

"دیکھو ایڈم!" آرام سے سمجھانے لگی۔ "اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کی حیثیت کے مطابق نوازتا ہے۔ کسی کو کچھ کم دیتا ہے' کسی کو زیادہ دیتا ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ نے صرف کھوپڑی سے نوازا ہے' اور اندر دماغ کے نام پہ جو دیا ہے نا' وہ پہلے ہی بہت تھوڑا ہے۔ اس پہ زیادہ زور دو گے تو خدانخواستہ ختم ہو جائے گا۔ سو چپ کر کے میری بات سنو!" لہجہ بدل کے غرائی تو ایڈم کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔

"اچھا۔ مان لیا۔ آپ ہی شہزادی ہیں۔" بھنویں اکٹھی کر کے ناراضی سے بولا۔ "تو پھر شہزادی تاشہ پہ اتنے دن سے غصہ کیوں کر رہی تھیں؟"

"کیونکہ میں اپنے خواب کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکی تھی۔ جس شہزادی کو اس میں ظالم کہا جا رہا تھا وہ یان سوفو تھی۔ شہزادی تاشہ کوئی نہیں تھی۔ میرے بابا سلطان مرسل کے پھوپھی زاد ہیں۔"

سلطان مرسل کے والد کی حکومت میں ان کو شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ وہ الور سونگائی نامی گاؤں چلے گئے اور وہاں باغیوں کی ایک تنظیم بنالی جس کا نام پمبورو تھا۔ وہ سلطان کی پالیسیوں سے نالاں تھے اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے مگر جب سلطان مر گیا اور اس کا بیٹا مرسل سلطان بن گیا اور اس کے بنداہارا اور شہزادی یان سوفو نے مل کے پمبورو کے لوگوں کو گرفتار کیا اور ان کے گھر اجاڑ دیے' تو بابا نے اپنے لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور بنداہارا کے ساتھ مل گئے۔ یوں بنداہارا نے ان کو دوست سمجھ کے ان کو مرسل سے معافی دلوادی۔ اس کے بعد بابا نے مرسل شاہ پہ جانے کون سا جادو کیا کہ بابا کے کہنے پہ مرسل نے پچھلے بنداہارا کو پھانسی چڑھادیا اور بابا کو بنداہارا کی گدی دے دی۔

اب شہزادی یان سوفو بابا کی دشمن ہو گئی ہے۔ چند دن بعد اس کی سلطان مرسل سے شادی ہو رہی ہے مگر مجھے لگتا ہے مرسل شاہ اپنی شہزادی سے زیادہ میرے بابا کے زیر اثر ہے۔"

"بڑے کوئی ولن ہیں آپ کے بابا۔ تو وہی تو میں سوچ رہا تھا کہ آپ کس پہ گئی ہیں۔" پھر تالیہ کے گھور کے دیکھنے پہ گہری سانس لی۔ "خیر...... ہمیں ان کی لڑائیوں سے کیا۔ آپ یہ بتائیں' آپ کے بابا چابی دے رہے ہیں یا نہیں؟"

"یہ سب اتنا سادہ نہیں ہے۔" وہ ڈپٹ کے بولی اور سارے دن کی روداد سنا دی۔ اندھیرے میں درخت تلے کھڑے وہ دو ہیولے لگتے تھے جو دبی سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔

"یعنی راجہ مراد آپ کو اسی دنیا میں رکھنا چاہتے ہیں' اور وہ چابی کے بارے میں کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں؟" وہ ساری بات سن کے سوچتے ہوئے بولا۔

"وہ عجیب انسان ہیں' ایڈم۔ شاطر' چالاک اور بہت ہشیار۔ ہمیں ان سے چھپا کے پلان کرنا ہے جو بھی کرنا ہے۔"

"آپ باہر کیسے نکلیں محل سے۔"

"چھتیں پھلانگنا اور دیواریں کودنا آتی ہیں مجھے۔" ناک سے مکھی اڑائی۔

"تو اب آپ محل میں رہیں گی؟" قدرے رشک سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ تم ابھی کسی سرائے میں رہ لو۔ میں تمہارے لیے سکے لائی ہوں۔" اس نے ایک پوٹلی سی ایڈم کی طرف بڑھائی۔ ایڈم نے جلدی سے وہ تھام لی۔ "یہ تو بھاری ہے۔ خیر...اب تو آپ کے پاس کافی دولت آگئی ہوگی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بمشکل ایک کمرے سے نکال کے لائی ہوں۔ کسی کو اپنی طرف سے مشکوک بھی تو نہیں کر سکتی نا۔" پھر ٹھہر گئی۔ اور غور سے دیکھا۔ ایڈم تھیلے میں پوٹلی ڈال رہا تھا۔

"یہ تم نے کہاں سے لیا؟ دکھاؤ۔" مشکوک انداز میں بولی تو اس نے جھٹ تھیلا کھول کے دکھایا۔

"ایک سرائے میں بیٹھے کسی آدمی کا چرایا ہے

۔ وہ بنگارایا ملایو کے نام سے کتاب لکھ رہا تھا مگر پیسے وغیرہ نہیں تھے اس کے پاس۔ کنگال رائٹر۔ ہونہہ۔" مایوسی سے کورے صفحے نکال کے دکھائے اور واپس اندر ڈال دیے۔ پھر یاد آیا۔

"میں آج ملا فاتح صاحب سے۔"

تالیہ چونکی۔ "واقعی؟"

"جی جے تالیہ۔ ان کو ساتھی قیدیوں سمیت اس احاطے کے باہر والی دیوار کی تعمیر کا حکم ملا ہے' وہ وہیں تھے۔ میں نے ان سے بات کی۔ ان کو یہ سب....." (تالیہ کی طرف شرمندہ سا اشارہ کیا۔) "بھی بتایا۔"

"یہ سب کیا؟"

"یہی کہ.... آپ ہی.... (تھوک نگلا) شہزادی تاشہ ہیں۔"

"اچھا!" اس نے گردن ذرا اکڑاتے ہوئے نزاکت سے لٹ انگلی سے پیچھے کی۔ "تو کیا کہا انہوں نے؟" سرسری سا پوچھا۔

"یہی کہ آپ تو پیدائشی چور ہیں اور ماشاءاللہ سے جھوٹی کہانیاں گھڑنا آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے اس لیے یہ بھی کوئی کہانی ہی ہے جو آپ نے مجھے فیڈ کر دی ہے اور بہتر ہے کہ میں آپ کی بات کا یقین نہ کروں اور الور سونگائی جا کر لکڑ ہارے مراد کو ڈھونڈوں' اس سے چابی لوں اور ہم تینوں واپس چلے جائیں۔ ان کو لگتا ہے میں آپ کی من گھڑت کہانیوں پہ جلدی اعتبار کر لیتا ہوں کیونکہ....." آنکھیں سادگی سے جھپکائیں۔ "میں کتابیں جو بہت پڑھتا ہوں۔"

ادھر اس کی بات ختم ہوئی' ادھر دانتوں پہ دانت جمائے تالیہ مراد کا چہرہ مارے غصے کے سیاہ پڑتا گیا۔

"ہونہہ۔ ان کو انسانوں کی پہچان کبھی بھی نہیں تھی۔" اور پیر پٹخ کے اٹھ گئی۔ ایڈم نے ہڑبڑا کے پکارا۔

"آپ جا رہی ہیں.... تو پھر اب ہم کہاں ملیں گے؟"

"کل صبح احاطے کے سامنے وان فاتح کے ساتھ میرا انتظار کرنا۔ روشنی ہونے کے پورے گھنٹے بعد میں تم سے ادھر ہی ملوں گی۔" وہ مڑے بغیر بولی اور آگے بڑھ گئی۔ ایڈم ارے ارے کرتا رہ گیا مگر وہ اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔

ایڈم نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ شہر گھپ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ مکان تاریک پڑے تھے۔ سرائے چند کوس کے فاصلے پہ تھی۔ وہ وہاں پہلے ہی کمرہ لے چکا تھا' اور اسے چینی سمجھ کے اشاروں کی زبان میں بات کر کے سرائے کے مالک نے تسلی بھی کر لی تھی۔ اس کا کمرہ فی الحال اس کا انتظار کر رہا تھا سو وہ اسی سمت میں چل دیا۔ یہ تھیلی اس کے لیے کافی تھی۔

☆☆☆

صبح سورج کا تھال ملاکہ کے قدیم آسمان پہ نمودار ہونے لگا تو روشنی کی کرنیں سلاخ دار دیوار سے اندر گرنے لگیں۔ دو پہریدار حسب معمول دروازے تک چلتے آئے تو ان کے قدموں کی چاپ سن کر قیدی بیدار ہونے لگے۔ گدلے میلے جسموں اور کپڑوں والے بے حال قید لوگ...... کوئی اٹھ کھڑا ہوا' کوئی کونے میں کھسک گیا۔

ایسے میں اپنی جگہ پہ اکڑوں بیٹھا وان فاتح بار بار اس الینو کو دیکھ رہا تھا جو پہریداروں کی آمد کے ساتھ ہی غصے میں نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پہ کرب اور نفرت کے ملے جلے تاثر نمودار ہو گئے تھے جیسے وہ ایک خاموش احتجاجی لڑائی کے لیے تیار ہو۔ ہر روز اس کا کھانا گرا دیا جاتا تھا اور اسے ذلیل کیا جاتا تھا۔ شاید وہ کوئی معزز آدمی تھا جو ان کی قید میں آ پھنسا تھا اور وہ اپنی خودداری اور باعزت زندگی کو بھول نہیں پا رہا تھا۔

تالا کھول کے دونوں پہریدار اندر داخل ہوئے۔ ایک ہنٹر لہرا رہا تھا اور دوسرے نے کھانے کا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ باری باری کھانا بانٹتا وہ پہریدار آگے بڑھتا گیا' یہاں تک کہ وہ الینو کے پاس آرکا۔ دوسرے قیدی خاموشی سے انہیں دیکھنے لگے کہ چلو دیکھتے ہیں آج کیا ہوتا ہے۔

پہریدار نے تمسخر سے اسے دیکھتے تھیلے سے چاولوں کی گیند نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔ پھر ابرو سے اشارہ کیا گویا کہہ رہا ہو "لے لو۔"

فاتح تیزی سے اٹھا اور پہریدار کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

جہاں پہریدار چونکا' وہیں سارے میں خاموشی چھا گئی۔ سب نے دم سادھ لیے۔

فاتح نے کھانا لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اپنی گہری آنکھیں وہ پہریدار کی آنکھوں میں ڈالے ہوئے تھا۔ کوئی رعب تھا یا کیا' پہرے دار نے کھانا گرانے کی بجائے اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

فاتح نے اس کی آنکھوں سے نظریں ہٹائے بغیر.... گیند کو خود زمین پہ گرا دیا۔

بہت سے لوگوں کے منہ کھل گئے۔ الینو خود دھک سے رہ گیا۔ ہنٹر والے کا ہوا میں ہنٹر لہراتا ہاتھ ٹھہر گیا۔

پھر فاتح نیچے جھکا' گرد آلود گیند اٹھائی' اس کی گرد جھاڑی اور کھڑے ہوتے ہوئے الینو کی طرف مڑا۔

"اٹھو!" جدید ملے میں کہتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا۔ بھلے الفاظ الینو کی سمجھ میں نہ آئے ہوں' مگر اشارہ سب کی سمجھ میں آرہا تھا۔ الینو بس اسے دیکھتے ہوئے ڈھیرے سے اٹھ گیا۔

"اسے کھاؤ! ابھی!" سختی سے کہہ کے کھانا اس کے ہاتھ پہ رکھا۔ "کسی دوسرے سے دشمنی میں اللہ کے رزق سے منہ نہیں موڑتے۔ ہمارا جسم بھی ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے۔"

الینو نے میکانکی انداز میں کھانا لبوں کی طرف بڑھایا' تو فاتح نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ "ٹھہرو۔" پھر مڑا اور ہنٹر والے کی طرف اشارہ کر کے تھیلے والے سے بولا۔

"یہ آئندہ.... اس قید خانے میں.... یہ ہنٹر لے کر.... نہیں آئے گا۔ اس سے کہو.... یہ واپس جائے۔" وہ چبا چبا کے کہتا ساتھ میں اشارہ بھی کر رہا تھا۔ دو دفعہ پھر اس نے اپنی بات دہرائی۔

"یہ آدمی آج سے روز کھانا کھائے گا' ہر آدمی کھانا کھائے گا مگر یہ ہنٹر لے کر دوبارہ اندر نہیں آئے گا۔ ٹھیک؟" اس کی آنکھیں پہریدار کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔ پیچھے الینو لبوں کے قریب توشہ روکے ہوئے کھڑا تھا۔ سارے قیدی دم سادھے اس طرف دیکھ رہے تھے۔

تھیلے والے نے اثبات میں سر ہلایا اور ہنٹر والے کو اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پہ غصہ اور مزاحمت در آئی۔ اس نے احتجاجاً کچھ کہا مگر جواباً تھیلے والے نے اسے جھڑک دیا۔ ہنٹر والے نے برہمی سے فاتح کو دیکھا' پھر زور سے ہنٹر زمین پہ مارا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

فاتح نے الینو کو اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا اور کھانا کھانے لگا۔ تھیلے والے پہریدار نے ایک گیند نکال کے فاتح کی طرف بڑھائی۔ فاتح نے ایک نگاہ غلط اس پہ ڈالتے ہوئے اسے تھام لیا۔

پہریدار اب خاموشی سے باقی قیدیوں کو ان کا کھانا دینے لگا' البتہ بار بار وہ مڑ کے فاتح بن رامزل کو دیکھتا ضرور تھا۔

☆☆☆

سنہری صبح ملاکہ کی اس پہاڑی پہ پھیل رہی تھی۔ نیچے سمندر کی لہریں ٹھاٹھیں مارتی دکھائی دے رہی تھیں اور اوپر محل کی اونچی کھڑکیوں کے پردے ہوا سے لہرا رہے تھے۔ ایسی ہی ایک کھڑکی سے اندر جھانکو تو سامنے مسہری پہ تالیہ مراد بیٹھی نظر آرہی تھی۔

کسی بت کی طرح گردن اکڑائے' کمر سیدھی رکھے' وہ سپاٹ چہرہ لیے ہوئے تھی۔ دو کنیزیں اس کو تیار کر رہی تھیں۔ اس نے سرخ کامدار لباس پہن رکھا تھا' جیسے لہنگا ہو اور اوپر لمبی قمیص۔ کانوں میں قیمتی پتھر جڑے آویزے تھے۔ ایک کنیز اس کے بالوں کا اونچا جوڑا بنا رہی تھی اور دوسری ناخن تراش رہی تھی۔ شریفہ نامی کنیز ہاتھ باندھے سامنے کھڑی تھی۔

"بابا کہاں ہیں؟" دفعتاً تالیہ نے شریفہ سے سپاٹ انداز میں پوچھا۔

"راجہ مراد محل کے لیے روانہ ہونے والے ہیں۔" (اس کا اشارہ سلطان کے محل کی طرف تھا جو یہاں سے چند کوس کے فاصلے پہ واقع تھا۔)

"مجھے ان سے ملنا ہے۔" تالیہ نے ایک دم ہاتھ کھینچا اور بے چینی سے کھڑی ہوئی۔ دوسری کنیز کے ہاتھ سے اس کے بال بھی نکل گئے۔

"میں ان کو خبر کر دیتی ہوں شہزادی۔ وہ ملنا چاہتے ہوں گے تو روانگی کو موخر کر دیں گے۔ آپ یہیں بیٹھیے۔" شریفہ نے ادب سے کہا تو وہ ذرا سنبھلی۔ پھر سرسری سا "ہاں' خبر کر دو" کہہ کے مصنوعی انداز میں گردن اکڑائی اور واپس بیٹھ گئی۔ شریفہ باہر نکل گئی اور دونوں کنیزیں اس کو تیار کرنے لگیں۔

"شہزادی آپ کے بالوں کا رنگ اتنا حسین کیسے ہے؟" پیچھے کھڑی کنیز نے اس کے بال سنوارتے ہوئے حسرت سے پوچھا۔

"زیادہ سوال مت پوچھو۔ اپنا کام کرو۔" وہ رعب سے بولی تو کنیز خفیف سی ہو کے جلدی جلدی بال بنانے لگی۔

دوسری کنیز اٹھی اور پاؤڈر سے بھرا پیالہ لے آئی۔ تالیہ نے اس میں جھانکا اور ناک چڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ سنگھار ہے۔ خالص ترین گندم کو پانی میں پندرہ دن تک رکھتے ہیں' پھر پیس کے' چھان کے' سکھا دیتے ہیں۔ استعمال کرنے سے پہلے اسے عرق گلاب میں ملاتے ہیں۔ چہرے کو خوب سفید کر دیتا ہے یہ۔"

(آہ۔ فاؤنڈیشن۔) وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ کنیز مہارت سے وہ اس کے چہرے پہ لگا رہی تھی۔ پھر انجلیکا کے سرخ پتوں کے سفوف سے اس کے گالوں کو گلابی کیا۔ اس کے بعد ڈبیا سے ایک پیسٹ انگلی پہ نکالا اور ہونٹوں پہ ملنے لگی۔ وہ چربی اور ناریو سے تیار کردہ لپ اسٹک تھی۔ دوسری کنیز اس کا جوڑا بنا چکی تھی اور سامنے کو نکالی لٹوں کو اب گرم دہکتے لوہے کے راڈ پہ لپیٹ کے گھونگریالا کر رہی تھی۔

وہ چپ چاپ سارے کام اپنے اوپر ہوتے دیکھتی رہی۔ دیوار پہ لگے آئینے میں اس کا سجا سنورا روپ بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ جنگل میں اتنے دن مٹی سے اَٹے چہرے سے پھرنے کے بعد اسے ہر شے قبول تھی۔

☆☆☆

راجہ مراد جس کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا وہ اس کا دربار تھا۔

تالیہ کے سامنے جب پہریداروں نے دروازے کھولے تو اس نے دیکھا' وہ مستطیل کمرہ ہے' اور سیدھ میں قالین بچھے ہیں۔ دائیں بائیں کرسیاں قطار میں رکھی ہیں۔ جب دربار لگتا تو وہاں درباری بیٹھتے تھے۔ ابھی وہ خالی تھیں۔

قالین جہاں ختم ہوتا وہاں اونچا چبوترہ بنا تھا جس پہ راجہ مراد تخت پہ شان سے بیٹھا میز پہ رکھے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ سنہری اور سفید شاہی پوشاک پہنے' سر پہ سرخ ریشمی پٹی باندھے' اس کی نظریں کاغذوں پہ جھکی تھیں۔ آہٹ پہ محض نظر اٹھا کے دیکھا تو سامنے سے سرخ سنہری لباس میں مسکراتی ہوئی تالیہ چلتی آرہی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا' یہاں تک کہ وہ قریب آگئی اور چبوترے کے زینوں کے ساتھ رکی۔

"بابا!" مسکرا کے بولی۔ "صبح بخیر۔"

راجہ مراد نے صرف سر کو خم دیا۔ ہاتھ ہنوز روکے ہوئے تھا۔

"آپ کو محل کے لیے روانہ ہونا ہے' اس لیے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ میں اس چابی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مجھے وہ چابی دوبارہ بنا دیں' تو میں اپنی دنیا میں واپس جا سکتی ہوں۔ مجھے وہاں چند ایک کام نپٹانے ہیں' اس کے بعد میں واپس آجاؤں گی' یہی میرا گھر ہے اور میں اپنے محل کو کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے واپس آنا ہی ہے۔ مگر چند دن کے لیے مجھے ادھر جانا ہوگا' سو اگر آپ...." وہ ایسے پیار سے کہہ رہی تھی جیسے کسی

بچے کو بہلایا پھسلایا جاتا ہے۔

''تم سیدھ میں نہیں چلتیں۔'' وہ سنجیدگی سے اس کو دیکھتے ہوئے بولا تو تالیہ کے الفاظ ٹوٹ گئے۔

''جی؟''

''تمہاری چال درست نہیں ہے' تمہارا لہجہ خراب ہے' تمہارے آدھے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے' تم بہت تیز تیز گفتگو کرتی ہو۔ تم نے بات کا آغاز کرنے سے پہلے سر جھکا کے مجھے سلام نہیں کہا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ محل میں آنے کے بعد تم مجھے 'بابا' نہیں 'بنداہارا' کہو گی۔ تمہیں ابھی تربیت کی ضرورت ہے۔'' اس نے کاغذ رکھے' اور ایک شان سے اپنا چغہ سمیٹتے ہوئے اٹھا۔ چبوترے پہ کھڑا وہ تالیہ کو بہت اونچا' بہت پرُہیبت لگا تھا۔

اس نے بے اختیار تھوک نگلا۔

''چابی۔ مجھے وہ چابی چاہیے' بابا۔''

''میرے پاس کوئی چابی نہیں ہے' تاشہ۔ آج کے بعد میں اس کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتا۔ وہ سب پیچھے رہ گیا ہے۔'' وہ چبوترے کے زینے اترا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا' پھر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پہ رکھے۔ ایسی آہنی گرفت تھی وہ کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''تمہاری دنیا یہ ہے' وہ نہیں۔ وہاں تمہارے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں تم اس دنیا کو بھلا کر یہیں رہو۔ عیش و عشرت سے زندگی گزارو۔ راج کرو۔ دولت اور طاقت کا مزہ حاصل کرو۔ میں کبھی بھی دوبارہ تمہارے منہ سے اس دنیا کا ذکر نہیں سننا چاہتا۔ وہ باب اب بند ہو چکا' تاشہ!'' اس کے الفاظ تھے کہ کوئی یخ بستہ ہوا جو تالیہ کی ہڈیوں میں گھس کے خون کو جما رہی تھی۔

وہ پھیکا سا مسکرائی اور سر کو اثبات میں خم دیا۔

''جیسے آپ کا حکم' بابا۔'' مراد نے اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹائے اور آگے بڑھ گیا۔

حالم کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔ ایک دم وہ مڑی۔

''مگر اُس دنیا کے محل زیادہ خوبصورت تھے آقا۔ میں تو ایک دن میں ہی اس محل سے اکتا گئی ہوں۔ کیا ہم اس کی تزئین و آرائش نہیں کر سکتے؟''

مراد کمر پہ ہاتھ باندھے باہر جا رہا تھا' اس بات پہ رکا اور واپس پلٹا۔

''یہ محل کافی خوبصورت ہے' تاشہ! اور محل تو کیا' ملاکہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ تمہاری دنیا سے زیادہ خوبصورت۔'' پھر وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ''تمہیں شاید اس بات پہ یقین نہیں ہے۔ تم یوں کرو' اپنے شاہی عملے کے ساتھ شہر کا دورہ کر آؤ۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ملاکہ اور تمہاری دنیا میں کیا فرق ہے۔'' اور پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔

(ہماری دنیا اور آپ کی دنیا بہت مختلف ہے' راجہ مراد!) وہ تندی سے سوچ گئی۔ ماتھے پہ بل پڑے تھے۔ پہلا مرحلہ تو طے ہوا۔ اسے باہر جانا تھا مگر حالم ہمیشہ ایسے بات کرتا تھا کہ سامنے والے کو لگے' سارا آئیڈیا اسی کا تو تھا۔ اب وہ بہ آسانی باہر جا سکتی تھی۔ پلان اے۔

چابی مانگنے کی آخری کوشش بھی ناکام گئی تھی۔ مگر خیر۔ وہ صرف ایک کمزور سا پلان اے تھا۔ اب اسے پلان سی' پہ عمل کرنا تھا۔

☆☆☆

ملاکہ شہر کے بازار میں صبح سویرے ہی رونق لگ گئی تھی۔ گاہکوں کا رش دکانوں پہ لگا تھا۔ خوانچہ فروش صدا لگاتے اپنا سامان بیچ رہے تھے۔ ایسے میں بازار کی اس گلی میں آؤ جہاں وہ احاطہ واقع تھا تو اس کے سامنے والی زیر تعمیر حویلی کے اندر باہر مزدور کام پہ لگے دکھائی دیتے تھے۔ حویلی کی چار دیواری ایک جگہ سے چار ہاتھ اونچی تھی اور اس کے اوپر وان فاتح جھکا کھڑا تھا۔ اس کے پاس ڈرائی ڈ ڈ اور پتھروں کی بنی اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا' اور وہ گارے سے لتھڑے ہاتھوں سے ان کو اٹھا اٹھا کے دیوار پہ جما رہا تھا۔ سفید گدلی شرٹ مزید گدلی ہو چکی تھی۔ بانہوں پہ کل والی مٹی ہنوز جمی تھی اور ذرا ذرا سا گارا ماتھے اور گال پہ بھی

لگا تھا جس سے وہ بے نیاز' بے خبر نظر آتا تھا۔

''سر!'' ایڈم نے قریب آ کے پکارا تو وہ چونک کے پلٹا۔ ایڈم کے سر پہ ہیٹ تھا اور ہاتھ معزز افراد کی طرح کمر پہ باندھ رکھے تھے۔ لباس کل والا تھا۔ فاتح نے فوراً پہرے داروں کی طرف دیکھا' اور پھر قریب کھڑے الیپو کو اشارہ کیا۔ الیپو نے سر ہلایا اور آس پاس کھڑے تین چار قیدیوں کو نگاہوں کی زبان میں کچھ کہا۔ چند ہی لمحوں میں تمام مزدور اپنی اپنی جگہ سے آگے پیچھے ہٹ گئے' اور انہوں نے کچھ اس طرح سے اپنی ترتیب جوڑی کہ دور کھڑے پہریداروں کے راستے میں حائل ہو گئے۔ فاتح اور ایڈم ان کی نظر سے چھپ گئے۔

''لگتا ہے آپ نے کچھ نئے دوست بنا لیے ہیں' سر!'' ایڈم متعجب ہوا۔ جس ریڑھی کی اوٹ میں وہ کھڑا تھا' اس کو بھی بھول گیا کیونکہ اب کوئی پہرے دار اس طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ''کل تک تو یہ آپ کے دوست نہیں تھے۔''

فاتح نے مسکرا کے گارے میں لتھڑی اینٹ اٹھائی اور دیوار پہ جمائی۔

''کل تک وہ مجھے کوئی جنگجو سمجھ رہے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے لیے پہریداروں سے لڑائی کر لوں۔''

''تو کیا آپ جنگجو نہیں ہیں' سر؟''

''ہر ایک کا لڑنے کا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ میں سیاست دان ہوں۔ میں مفاہمت' بات چیت اور تدبیر سے درمیانی راہ نکالنے پہ یقین رکھتا ہوں' جس میں دونوں فریقین کو ان کی مرضی کی شے مل جائے۔ خیر۔'' اس نے سر جھٹکا۔ پھر احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ ''تم بتاؤ' کیا تم الور سونگائی جا رہے ہو تالیہ کے بابا کو ڈھونڈنے؟''

''نہیں۔ چے تالیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے یہیں ملیں گی۔ ابھی کچھ دیر میں۔'' ایڈم نے ہیٹ ذرا اوپر سرکایا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا یہاں آنا خطرناک ہے۔ تم دونوں کو چاہیے کہ فوراً یہاں سے نکلو۔'' وہ واقعی جھنجلایا۔

''سر... وہ...'' ایڈم نے بار بار لب کھولے' پھر بند کر دیے۔ فاتح گارے سے لتھڑے ہاتھ کمر پہ رکھے' ناخوشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم وقت ضائع کر رہے ہو۔''

''سر... شہزادی تاشہ دراصل (تھوک نگلا) چے تالیہ ہی ہیں۔''

فاتح نے اچنبھے سے دونوں ابرو اٹھائے۔ ''واقعی؟ اور یہ تمہیں تالیہ نے خود بتایا ہے؟''

''جی۔ وہ سچ کہہ رہی ہیں۔ بنداہارا ان کے بابا ہی ہیں۔ راجہ مراد۔ اور وہ اب محل کی مکین ہیں۔''

''اچھا اور تم نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا ہے؟ اس کا محل' اس کا باپ؟''

ایڈم نے بے اختیار گردن کی پشت کھجائی۔ ''نہیں' مگر انہوں نے کہا تھا کہ شہزادی تاشہ وہ خود ہی ہیں... وہ شہزادی تاشہ جن کے قصے ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ وہ تمام قصے ابھی پیش نہیں آئے۔ وہ اب پیش آنے ہیں۔ اور اب وہ تاریخ کا حصہ بنیں گے۔''

''او کے!'' وہ قدرے برہمی سے مڑا اور زور زور سے اینٹیں اٹھا کے دیوار پہ جمانے لگا۔

ایڈم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''سر... اگر وہ واقعی شہزادی ہیں تو وہ بے پناہ اختیارات کی مالک ہوں گی' اور یوں...''

فاتح تیورا کے اس کی طرف گھوما اور افسوس سے اسے دیکھا۔

''تمہیں واقعی اس کے اس افسانے پہ یقین ہے؟''

ایڈم نے جواب نہیں دیا۔ وہ فاتح کے کندھے سے پیچھے کچھ دیکھ رہا تھا۔ لب آدھے کھل گئے تھے۔ بازار میں شور سا مچا تھا۔ منادی کرنے والے نے اعلان کیا۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ سپاہیوں نے بگل بجائے۔ بازار میں بکھرے لوگوں نے سمٹ

کے دونوں اطراف میں قطاریں بنالیں۔ سرادب سے جھکالیے۔ راستہ صاف ہوگیا۔

فاتح بن رامزل کسی خواب کی سی کیفیت میں گھوما۔

سامنے سڑک صاف تھی اور اس پہ شاہی سپاہی چمکتی تلواریں لیے چلتے آرہے تھے۔ ان کے پیچھے سنہری اور چاندی رنگ کی بگھی تھی جس کی چھت کھلی تھی۔ ایسے کہ بگھی میں بیٹھی 'شاہزادی' صاف دکھائی دے رہی تھی۔

وقت کا جادو تھا.... یا تاشہ پسونا کا سحر.... وہ بالکل مبہوت رہ گیا.....

سرخ زرتار لباس پہنے.... بالوں کا جوڑا بنائے .... بالوں پہ ہیروں کا تاج سجائے.... بڑی شان سے کہنیاں اطراف میں جمائے' وہ مسکراتی ہوئی قطار میں ہاتھ باندھے کھڑے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ سرخ لباس بگھی کی سیٹ پہ پھول کی طرح پھیلا تھا۔ منادی کرنے والا اس کے بارے میں لوگوں کو آگاہی دے رہا تھا اور لوگ اشتیاق سے گردنیں اٹھا اٹھا کے' ایڑیاں اونچی کر کے بنداہارا کی سندر بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔

اور وان فاتح بالکل ساکت ہوئے کے ایل کی اس بہروپی کو دیکھ رہا تھا جس کو ہر طرح کا بھیس بدلنا آتا تھا۔ وہ پلک تک نہیں جھپک پا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت سے زیادہ بے یقینی اور تعجب تھا۔

شہزادی تاشہ نے ہاتھ اٹھا کے اشارہ کیا تو بگھی بان نے بگھی روک دی۔ کسی نے لپک کے دروازہ کھولا۔ کسی نے نیچے پائیدان رکھا۔ وہ اسی شان سے زینے اترتی نیچے آئی۔

لوگ مزید پیچھے ہٹنے لگے۔ تالیہ ٹہلنے والے انداز میں دکانوں کے سامنے سے گزرنے لگی۔ پھر ایک دکان کے چھپر کے قریب رکی۔ ادھر میز پہ بہت سے سرخ سیبوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ تالیہ نے سیبوں میں ہاتھ ڈالا.... چند سیب ادھر ادھر ہٹائے اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک موٹی سی سنڈی تھی۔

"کیا تم سنڈیوں اور کیڑوں والے سیب لوگوں کو کھلا رہے ہو؟" سنڈی لہرا کے اس نے دکاندار کو دکھائی اور پھر غصے سے نیچے پٹخی۔ دکاندار کا منہ کھل گیا۔ ہجوم میں کئی لوگوں نے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"گرفتار کر لو اس دکاندار کو۔ اس کو اپنی لاپروائی کی سزا ملنی چاہیے۔" شہزادی تحکم سے بولی تو سپاہیوں نے جھٹ سے دکاندار کو پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے آگے لے گئے۔ وہ بے چارا چیختا چلاتا رہا مگر اس کی کوئی نہیں سن رہا تھا۔

لوگ مزید پیچھے کھسکنے لگے۔ بازار میں ایک خوف کی فضا قائم ہو رہی تھی۔

اور وان فاتح.... وہ بالکل خاموشی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

شہزادی اب سڑک پہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک ادا سے وہ اپنا انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ ریڑھیوں کے کناروں پہ پھیرتی جا رہی تھی۔ دفعتاً وہ ٹھہری۔ دائیں جانب ایک ریڑھی پہ کپڑوں کے تھان رکھے تھے۔ ریڑھی والے نے اسے اپنے پاس رکتے دیکھ کے ہی دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ تالیہ نے دو انگلیوں میں مسل کے کپڑے کو دیکھا۔

"کیا یہ تم چین سے لائے ہو؟"

ریڑھی بان نے جھٹ سر اثبات میں ہلایا۔ "جی!"

"اسے بھی پوچھ گچھ کے لیے محل لے جاؤ۔ میں جاننا چاہتی ہوں یہ دوسرے ملک سے مال برآمد کرنے پہ محصول (ٹیکس) بھی دیتا ہے یا نہیں۔" شہزادی نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تو ریڑھی بان نے گھبرا کے سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ بنا کسی تامل کے اس پہ جھپٹے اور اسے کھینچ کے لے گئے۔

"بے تالیہ ویسے شہزادی کے روپ میں اتنی بری نہیں لگ رہیں۔" ایڈم نے قدرے جوش سے فاتح کے قریب سرگوشی کی۔ (رش کے باعث سب اکٹھے کھڑے ہو گئے تھے.... ایڈم کا اس کے ساتھ کھڑے ہونا کسی کو قابل توجہ نہیں لگا تھا۔)

"یہ معصوم لوگوں کو کیوں گرفتار کر رہی ہے؟" وہ دور سے آتی شہزادی کو دیکھ کے ذرا الجھن سے بولا۔

"یقیناً یہ لوگ معصوم نہیں ہوں گے۔ بے شک بے تالیہ چور ہیں' فراڈ ہیں' مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ کسی اچھے اور نیک انسان کو کبھی گرفتار نہیں کروائیں گی۔" ایڈم نے خلوص سے کہتے ہوئے اسے تسلی دی۔ وہ ہیٹ ذرا اٹھا کے تالیہ کو دیکھتا فخر سے مسکرا رہا تھا۔ اس سے سارے گلے شکوے اس کو اس پر اعتماد روپ میں دیکھ کر ختم ہونے لگے تھے۔

"اس ہیٹ والے آدمی کو بھی گرفتار کر لو۔ یہ گستاخ میری طرف دیکھ کے تمسخرانہ اشارے کر رہا ہے۔" شہزادی نے تندی سے ایڈم کو دیکھتے ہوئے دور سے اس کی طرف اشارہ کیا تو سپاہی اس جانب لپکے۔ دوسرے لوگوں نے جلدی جلدی راستہ چھوڑا۔

ایڈم بن محمد کا منہ کھل گیا۔ بے اختیار وہ پیچھے ہٹا۔

"مم.... میں نے کیا کیا ہے؟ بے تا.... شہزادی تاشہ.... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ چھوڑو مجھے.... ارے چھوڑو مجھے۔" مگر اس کی چیخ و پکار کا سپاہیوں پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے دبوچ کے آگے لے گئے۔ ایڈم ان کی گرفت میں مسلسل پھڑپھڑاتے ہوئے چلا رہا تھا۔ ششدر' حیران' پریشان۔

تالیہ نے گردن اٹھا کے اوپر دہکتے سورج کو دیکھا اور پھر نزاکت سے اپنی پیشانی چھوئی جس پہ پسینے کی نادیدہ بوندیں موجود تھیں۔

"میری طبیعت خراب ہو رہی ہے واپس چلو۔" غلام کو اسی بے نیازی سے حکم دیا اور بگھی کی طرف مڑی۔ مڑتے مڑتے ایک لمحے کو اس نے فاتح کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ شہزادی کو متوجہ پا کر ایک ابرو اٹھائی اور لب بے آواز ہلائے۔ "سیر یسلی؟"

ملاکہ کی شہزادی نے دور کھڑے اس بدحال 'غلام' پہ نظریں جمائے ادب سے پلکیں جھپکا کے اٹھائیں اور ہونٹوں کو جنبش دی۔ "توانکو" (میرے آقا) اور دونوں پہلوؤں سے کامدار لباس اٹھائے بگھی پہ سوار ہو گئی۔

لوگ پھر سے اطراف میں سمٹ کے شاہی قافلے کو راستہ دینے لگے۔

وہ اسی طرح خاموشی سے دور جاتی بگھی کو دیکھے گیا۔

("وہ اتنی پیاری تھی ڈیڈ کہ وہ کسی پریوں کی وادی سے آئی ہوئی لگتی تھی۔"

"میرا خیال ہے وہ کوئی فراڈ تھی جو کسی دوسرے کی جگہ ناجائز طریقے سے ہتھیانے جا رہی تھی۔"

"ہر کوئی آپ کے ان سیاستدانوں جیسا نہیں ہوتا' ڈیڈ۔"

"میں سچ بولوں بیٹا تو تمہیں برا لگتا ہے۔ مگر وہ کوئی پری نہیں تھی۔"

"پھر وہ شہزادی تھی۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔")

اور اب بھی ننھی آریانہ اس کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی۔

"وہ شہزادی ہے' ڈیڈ۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔"

☆☆☆

تالیہ محل کے اندر سبزہ زار پہ آ کے بگھی سے اتری تو دیکھا.... سبزے کے اختتام پہ جہاں سے محل شروع ہوتا تھا' وہاں بیرونی زینے بنے تھے۔ ان کے قدموں میں مسلح سپاہیوں کا ہجوم تھا۔ وہ لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے' تیز تیز چلتی سامنے آئی تو سپاہیوں نے راستہ چھوڑا۔

زمین پہ ایک پھٹے پرانے لباس والا بدحال آدمی رسیوں سے بندھا' سجدے کی حالت میں پڑا تھا۔ اس کے بال لمبے اور سفیدی مائل تھے۔ چہرے اور بازوؤں پہ تشدد کے صاف نشانات نظر آتے تھے۔

دائیں جانب ایک جلاد کھڑا تھا جس کا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا تھا اور ہاتھ میں تیز دھار چمکتی ہوئی ننگی

تلوار تھی۔ وہ بار بار اوپر محل کے داخلی دروازے کی طرف دیکھتا جہاں دروازے بند تھے۔ گویا وہ سب کسی کے منتظر تھے۔

"کون ہے یہ آدمی؟ اس کو کیوں مارا جا رہا ہے؟" وہ بے یقینی اور اضطراب سے ان سب کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

اندر اپنے کمرے میں بنداہارا مراد راجہ کھڑا تھا۔ اس کے سامنے کنیز شریفہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ مراد کمر پہ ایک ہاتھ رکھے، سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیا تم میری بیٹی پہ نظر رکھ رہی ہو؟"

"جی راجہ۔" اس نے سر کو کھڑا خم دے کر نظریں اٹھائیں۔ "شہزادی کی ہر حرکت پہ میری نظر ہے اور میں اس کی خبر آپ کو دیتی رہوں گی۔ ابھی ابھی شہزادی بازار سے واپس آئی ہیں۔ میں قافلے سے آگے تھی اس لیے جلدی پہنچ گئی۔ بازار میں....." وہ تذبذب سے رکی۔

"بازار میں کیا؟" وہ سپاٹ سا بولا۔

"شہزادی کافی نازک طبع واقع ہوئی ہیں۔ انہوں نے کھڑے کھڑے معمولی باتوں پہ تین راہگیروں اور دکانداروں کو گرفتار کر کے شاہی قید خانے میں ڈلوادیا ہے۔"

"کیسی باتوں پہ؟" اس نے سوچتے ہوئے ابرو اٹھائی۔

"میں وہیں موجود تھی۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ کسی کو محصول نہ دینے، کسی کو صفائی کا خیال نہ رکھنے پہ گرفتار کیا ہے اور ایک کو تو صرف اس بات پہ کہ اس نے شہزادی کی طرف دیکھ کے اشارہ کیا ہے۔ شہزادی شاید صرف ان لوگوں کو اذیت دینا چاہتی تھیں۔"

"اونہوں۔ وہ مجھے تنگ کرنا چاہتی ہے تا کہ میں اسے واپس بھیج دوں۔" وہ سوچ میں ڈوبا بولا۔ شریفہ چونکی۔

"واپس کہاں؟ چین؟"

مراد نے چونک کے اسے دیکھا، اور سر جھٹکا۔ "ہاں۔ چین۔ اب تم جاؤ اور اس پہ نظر رکھو۔ اس کی ایک ایک حرکت کی خبر مجھے ہونی چاہیے۔"

"راجہ....." وہ ڈرتے ڈرتے نظریں جھکائے بولی۔ "شہزادی آپ کی صاحبزادی ہیں۔ کیا آپ کو ان سے..... کسی قسم کا کوئی..... خطرہ ہے؟ یا کوئی.....؟" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کے تھوک نگلا۔

مراد راجہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔ شریفہ کا دل زور سے دھڑکا۔ سر مزید جھکا لیا۔

"نیچے دالان میں ایک آدمی جلاد کے ہاتھوں اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ جانتی ہو اس کا جرم کیا تھا؟"

شریفہ نے نظریں مزید نیچے کرلیں اور کپکپاتی آواز میں بولی۔ "کیا؟"

"وہ میرے ہر کام کی ٹوہ رکھتا تھا۔"

"مجھے معاف کر دیجیے، راجہ۔" وہ ایک دم جھکی اور راجہ مراد کے جوتوں پہ دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ "میری جان لے لیجیے۔ آئندہ آپ میرے لبوں سے کوئی سوال نہیں سنیں گے۔"

مراد نے کوفت سے پیر ہٹایا اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ محل سے نکلا اور بیرونی زینے اترنے لگا تو اس کی شاہی پوشاک زمین کو چھو رہی تھی اور بازو کمر پہ بندھے تھے۔

نیچے جلاد کے قریب تالیہ کھڑی تھی۔

"بابا....." اسے دیکھتے ہی بے چینی سے زینے چڑھتی اوپر آئی۔ "یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ آدمی پرانے بنداہارا کا تانی ژیان (غلام) ہے۔ کیا آپ اس کو اس لیے سزا دے رہے ہیں کیونکہ....." آواز دھیمی کی۔ "کیونکہ یہ آپ کے مخالف کا آدمی تھا؟ یا واقعی اس نے کوئی ناقابلِ تلافی جرم بھی کیا ہے؟"

تالیہ اس سے تین زینے نیچے کھڑی تھی۔ اس لیے راجہ کو دیکھنے کے لیے گردن پوری اٹھائے ہوئے تھی۔

"اور اگر اس نے کوئی جرم نہیں کیا سوائے جنگی جرائم کے تو آپ اس کو معزول کر کے جلاوطن کر دیں۔ یہ آپ کی سلطنت میں کبھی دوبارہ داخل نہیں ہو سکے گا۔ لیکن کیا اس کو مارنا ضروری ہے؟"

راجہ مراد نے اپنا ہاتھ کمر کے پیچھے سے نکالا اور ہتھیلی پھیلائی۔ تالیہ نے نازک انگوٹھیوں سے مزین اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے نیچے اترنے لگا۔

سیڑھیوں کے ... آخر میں کھڑے سپاہی منتظر سے راجہ کو کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں نیچے اُتر آئے تو راجہ اس کو ساتھ لیے آگے چلا گیا۔ سپاہی پیچھے رہ گئے۔ وہ دونوں گھاس کنارے بنی پتھریلی روش پہ آگے بڑھتے گئے۔

دفعتاً راجہ ٹھہرا اور پورا اس کی طرف گھوما۔ تالیہ کا ہاتھ ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا۔

"تاشہ....." وہ نظریں اس پہ جمائے نرمی سے پوچھنے لگا۔ "تم اپنی اس دنیا میں سب سے زیادہ کس چیز کے پیچھے بھاگی تھیں؟"

"دولت کے!" وہ بنا پلک جھپکے اس کی گہری آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

"اور کیا تم اس دولت کو حاصل کر پائیں؟"

اس کی نگاہوں کے سامنے حالم کا بنگلہ، قیمتی لباس اور زیور گھوم گئے تو اس نے سر ہلا دیا۔

"کسی حد تک۔ جی ہاں۔"

"اور کیا تم وہ ساری دولت دنیا کو دکھا پائیں یا تم نے اس کا ایک بڑا حصہ چھپا دیا؟ صندوقوں میں؟ زمین میں؟ دور دراز جزیروں پہ؟ جیسے ہماری دنیا میں چھپایا جاتا ہے۔"

مراد نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔ بنا پلک جھپکے اب وہ تالیہ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سرد تھے مگر تالیہ کے گرم تھے۔

"جی۔ چھپا دیا تھا۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ (حالم کے مکان کے تہ خانے میں چھپائی گئی پینٹنگز، اور نوادرات۔ بینکوں میں رکھا گیا پیسہ۔ اسے سب یاد آ گیا۔) "میں نے تقریباً سب کچھ ہی چھپا دیا۔"

"کیونکہ دولت چھپانے سے محفوظ رہتی ہے مگر طاقت دکھانے سے بڑھتی ہے۔ تم دولت کی تمنا کرتی ہو۔ میں طاقت کی کرتا ہوں۔ تب ہی تو دولت چھوڑ کے الورسونگائی جا بسا تھا۔ کیونکہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتیں۔ جب دولت ملے تو صرف دولت ملتی ہے۔ مگر جب طاقت ملے تو دولت خود بخود کھنچی چلی آتی ہے۔ اس لیے طاقت چھپا کے نہیں رکھی جاتی۔ اس کو دکھانا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ آدمی....." تالیہ کی آنکھوں پہ نظریں جمائے ابرو سے قیدی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ایک آدمی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک 'قربانی' ہے۔ اس کی موت ظلم نہیں ہے، بلکہ ایک پیغام ہے۔ جب نیا حکمران کسی علاقے میں آتا ہے تو وہ ایک بستی کو تباہ ضرور کرتا ہے تا کہ ساری سلطنت میں ایک پیغام چلا جائے کہ حکمران..... بدل چکا ہے۔ اور وہ کسی کو رعایت نہیں دے گا۔ مجھے افسوس ہے اس تانی ژیان کے لیے مگر اس کو چھوڑ دینے سے میں دنیا کو کیا پیغام دوں گا؟ کہ راجہ مراد ایک پھانسی چڑھے بنداہارا کے خاص غلام کو مار تک نہیں سکا؟ کیا راجہ مراد اتنا کمزور نکلا؟ چڑیا کے دل جیسا کمزور؟" وہ تعجب سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھوں میں تالیہ کے ہاتھ مقید تھے اور وہ یک ٹک اس کو دیکھ رہی تھی۔ سارے الفاظ ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

"طاقت دولت کی طرح چھپانے والی چیز نہیں ہے۔ یہ مظاہرے سے بڑھتی ہے۔ مضبوط ہوتی ہے۔ اور یہ آدمی صرف ایک پیغام ہے۔ کہ اس ملک پہ حکمرانی کرنے والا چہرہ بدل چکا ہے۔ دھاک بٹھانے کے لئے ایسے پیغام دینے پڑتے ہیں۔"

اس نے تالیہ کا ایک ہاتھ چھوڑ دیا، اور دوسرا تھامے واپس قدم بڑھا دیے۔ وہ بالکل گم صم سی اس کے ساتھ چلی آئی۔ یہاں تک کہ وہ دونوں اس قیدی کے قریب آ رکے۔

سجدے میں جھکے، رسیوں سے بندھے قیدی

نے اپنا چہرہ اٹھایا اور آنکھیں چندھیا کے راجہ مراد کو دیکھا۔

"ایک دن یہ وقت تم پہ بھی آئے گا' مراد راجہ ڈرو اس وقت سے....'' وہ غم و غصے سے اونچی آواز میں بولا تھا۔

راجہ مراد نے کمر پہ دونوں ہاتھ باندھ لیے اور گردن جھکا کے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔

"تمہاری کوئی آخری خواہش؟"

قیدی نے گہری سانس لی اور قدرے سیدھا ہو کے بیٹھا۔ پھر گردن اکڑائی اور ذرا ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔

"میری آخری خواہش یہ ہے کہ میرے دونوں بیٹوں اور میری بیوی کو....''

راجہ مراد نے ایک دم قریبی سپاہی کے نیام سے تلوار کھینچی اور ایک ہی وار میں قیدی کی گردن پہ پھیر دی۔

اس کے الفاظ ٹوٹ گئے۔ گردن سے لکیر کی صورت خون نکلا۔ ساتھ ہی چہرے پہ شاک.. اور خوف ابھرا۔ پھر لبوں سے خون باہر کو چھلکا۔

گردن سے چند چھینٹے تالیہ کے چہرے پہ گرے۔ اس کی آنکھیں مارے شاک کے پوری کھل گئیں۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹی۔

اگلے لمحے.... قیدی بیٹھے بیٹھے منہ کے بل زمین پہ گر گیا۔

خاک کا جسم خاک میں جاملا۔

مراد راجہ نے استعجاب سے ابرو اُچکا کے اپنے پیروں میں گٹھڑی صورت پڑی نعش کو دیکھا۔

"کیا اسے واقعی لگا تھا کہ مجھے اس کی آخری خواہش سننے میں دلچسپی ہے؟"

پھر اس نے اپنے لباس سے رومال کھینچ اتارا اور تلوار پہ شروع سے آخر تک پھیرا۔ رومال نے خون صاف کر دیا۔ تلوار کی چمک لوٹ آئی۔ اس نے تلوار سپاہی کی طرف اچھال دی۔

"اس کی گردن اتار کے چوک میں لٹکا دو اور لوگوں میں منادی کرا دو کہ سلطان مرسل شاہ کے بندا ہارا کے خلاف سازشیں کرنے والوں کا ایسا انجام ہوتا ہے۔'' کہہ کے وہ مڑا۔ ہاتھ پیچھے باندھ لیے اور زینے چڑھنے لگا۔

تالیہ ابھی تک ہکا بکا کھڑی تھی۔ چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور گالوں پہ خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔

☆☆☆

ملاکہ کے بازار پہ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ مزدور ابھی تک زیرِ تعمیر حویلی پہ کام میں مصروف تھے۔ بھوکے پیاسے' تھکے ہارے' وہ نڈھال سے ایک ایک شے اٹھا کے مطلوبہ جگہوں پہ فراہم کر رہے تھے۔ فاتح ایک ریڑھی پہ لکڑیاں لادے' زنجیروں کے باعث بدقت اس کو دھکیلتا آگے بڑھ رہا تھا۔ بار بار آستین سے پیشانی کا پسینہ بھی پونچھتا۔ پھر دانت پہ دانت جمائے ضبط سے اسے آگے دھکیلنے لگتا۔

دفعتاً کسی نے اس کا کندھا تھپتھپایا تو وہ ذرا چونک کے گھوما۔

سامنے دو پہرے دار کھڑے تھے۔ ایک وہی تھا جو صبح کھانا دینے آتا تھا۔ دوسرا کوئی اور تھا۔

"کیا؟'' اس نے کندھے اچکا کے پوچھا۔

جواب میں پہرے دار دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اسے کچھ سمجھانے لگا۔ فاتح نے آنکھیں چندھیا کے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ آؤں؟''

اشارے سے تصدیق چاہی۔ پہرے دار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا۔ چلو۔'' فاتح نے گردن کو جنبش دی اور ریڑھی کو ذرا دھکیل کے ایک طرف کھڑا کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ریڑھی پہ رکھی لکڑیوں میں سے ایک نوکیلا تیز لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کے مٹھی میں دبا لیا اور پھر ان کے ہمراہ چلنے لگا۔

وہ دونوں اسے واپس احاطے میں لے آئے۔ اس نے سختی سے نوکیلا ٹکڑا مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔ جسم کا رواں رواں چوکنا تھا۔ اب کسی نے اسے نقصان

پہنچانے کی کوشش کی تو وہ اس کو ان کے اندر اتارنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

احاطے کا اندرونی دروازہ کھول کے وہ ایک راہداری میں آگے بڑھتے گئے۔ وان فاتح کے اعصاب تن رہے تھے۔ وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ مگر رکا نہیں۔ ان کے ساتھ چلتا گیا۔ ایک کے بعد دوسری راہداری۔ یہ حویلی کا اندرونی حصہ تھا اور کافی خوبصورت تھا۔ دیواروں میں بنے خانوں میں چینی کے خوبصورت برتن سجے تھے۔ چھت سے جلتے ہوئے فانوس لٹک رہے تھے۔ وہ اطراف کا سرسری جائزہ لیتا آگے بڑھتا گیا۔

وہ اسے ایک بڑے کمرے میں لے آئے۔ مستطیل کمرہ جو بہت وسیع تھا۔ وہ استعجاب سے گردن گھما گھما کے دیکھنے لگا۔ مٹھی میں بھینچے لکڑی کے ٹکڑے پہ گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

وہاں لکڑی کی اونچی لمبی میزیں بچھی تھیں۔ چولہے بنے تھے۔ ٹوکریوں میں سبزیاں رکھی تھیں۔ پکوان چڑھے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبو۔ دھواں۔

یہ یقیناً اس حویلی کا باورچی خانہ تھا۔

"یہ ساتھ والا کمرہ تمہارا ہے۔ اور یہ لباس تم آج سے پہن کے کام کرو گے۔'' پہرے دار نے ایک تہ شدہ لباس اس کی طرف بڑھایا تو وہ چونکا۔

لکڑی کا ٹکڑا آہستہ سے پہلو میں گرا دیا اور پھر احتیاط سے لباس تھام لیا۔ باورچی خانے میں موجود تمام لوگ اس طرح کے سرمئی لباس میں ملبوس تھے۔ پاجامہ اور ڈھیلی سی لمبی قمیص۔ وہ سب ہاتھ روک کے اس کو دیکھنے لگے۔

ایک سفید بالوں والا آدمی قریب آیا اور اپنی زبان میں پہرے دار سے کچھ پوچھا۔ پہرے دار نے جواباً کچھ بتایا اور پھر فاتح کی کلائیوں کی زنجیر چابی سے کھولنے لگا۔ پھر اس نے اس کے پیر آزاد کیے۔ ان کا کام ختم ہوا۔ وہ فاتح کو اس بوڑھے کے حوالے کر کے چلے گئے۔

بوڑھا اسے اپنے ساتھ ایک اور کمرے میں لے آیا جہاں حمام تھا۔

بھاپ اُڑاتا پانی۔ صاف کپڑے۔ صندل کی خوشبو لیے ٹکیاں۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ باورچی خانے میں داخل ہوا تو اس کے گیلے بال پیچھے کو سمٹ چکے تھے اور سرمئی پاجامے قمیص میں وہ تر و تازہ اور نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ بوڑھے نے فوراً ایک پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ فاتح نے اسے تھام لیا تو دیکھا' اندر سوپ تھا جس میں گوشت کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اس نے بے اختیار دوسرے کارکنوں کو دیکھا جو اب چوکیوں پہ بیٹھے اپنا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے پیالے اس سے چھوٹے تھے اور ان میں جھلکتا سوپ پتلا تھا اور کم بھی۔

بوڑھے نے اشارہ کیا تو وہ ایک لکڑی کے اسٹول پہ بیٹھا اور پیالہ لبوں سے لگایا۔ لذیذ سوپ اندر تک اُتر کے جسم میں توانائی بھرتا گیا۔ گھونٹ بھر کے فاتح نے یوں ہی کھڑکی کو دیکھا تو عقبی طرف باغیچہ سا نظر آرہا تھا جس میں دنبے اور بکرے بندھے کھڑے تھے۔ قطار میں بندھے پہلے بکرے کو ایک آدمی جھک کے گھاس کھلا رہا تھا۔

ہری ہری ڈھیر ساری گھاس.... اس آدمی کی پشت فاتح کی طرف تھی۔ بکرا نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی پشت پہ ایک تیز دھار ٹوکا بندھا تھا۔ ایسا ٹوکا جس سے بکرے کو بہ آسانی ذبح کیا جا سکتا تھا۔ وان فاتح نے ایک نظر اس کے آگے ڈالے گئے گھاس پہ ڈالی اور دوسری اپنے پیالے میں تیرتے ابلے گوشت کے ٹکڑوں کو۔

اس کا دل ایک دم کھانے سے بیزار ہونے لگا۔ وہ بے دلی سے پیالہ واپس رکھ دینا چاہتا تھا مگر.... کسی بھی وجہ سے رزق سے منہ نہیں موڑتے۔ رزق اللہ بھیجتا ہے۔ وہ جبراً سوپ پینے لگا۔

☆☆☆

محل کے گنبد دھوپ میں پگھل رہے تھے۔ کھلی کھڑکیوں کے باعث اندر بھی سارے میں روشنی پھیلی تھی مگر تہ خانے میں جاتی گول گول سیڑھیوں

سے نیچے جاؤ تو وہاں بنی جیل تاریک پڑی تھی۔ دیوار پہ مشعلیں روشن تھیں جن سے اتنا نظر آتا تھا کہ بڑے سے کمرے میں دو اطراف میں کوٹھڑیاں بنی ہیں جن کے سلاخ دار دروازے ہیں اور درمیان میں گزرنے کا راستہ ہے۔

ایسی ہی ایک کوٹھڑی میں بیڑیوں سے بندھا ایڈم موجود تھا۔ زمین پہ اکڑوں بیٹھے' ہاتھوں میں سر گرائے' وہ حیران پریشان سا لگ رہا تھا۔ بار بار پیشانی پہ بل آتے' کبھی آنکھوں میں غصہ در آتا' اور کبھی مضطرب ہو جاتا۔ سارا دن گزر گیا' نہ کچھ کھانے کو ملا نہ کوئی حال پوچھنے آیا۔ باقی دونوں قیدی جو اس کے ساتھ کوٹھڑی میں بند تھے' مسلسل آہ و بکا کر رہے تھے۔ وہ بھی بار بار اپنا قصور پوچھے جا رہا تھا مگر پہرے داروں کے کانوں پہ جوں تک نہ رینگی تھی۔

اوپر محل کی بارہ دریوں سے گزر کے شہزادی تاشہ کی خواب گاہ میں آؤ تو کھڑکیوں کے ریشمی پردے ہٹے ہوئے تھے اور ڈھلتے سورج کی دم توڑتی روشنی اندر جھانک رہی تھی۔

تالیہ اسی زرتار لباس میں ملبوس' بے چینی سے دائیں بائیں ٹہل رہی تھی۔ کنیز شریفہ ہاتھ باندھے سامنے کھڑی تھی۔ نظریں دائیں سے بائیں گھماتی وہ تالیہ کو ٹہلتے دیکھ رہی تھی۔

''آپ پریشان ہیں' شہزادی!''

''صرف پریشان؟'' وہ رکی اور بگڑ کے اسے دیکھا۔ ''میں بہت زیادہ پریشان ہوں شریفہ! میرے سامنے میرے بابا نے ایک شخص کی گردن مار دی۔ (اس نے ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑا جسے وہ کتنی ہی دفعہ دھو چکی تھی) مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے اور مجھے دیکھو... میں بھرے بازار سے تین دکانداروں کو گرفتار کروا لائی' اور اب میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان کے ساتھ کیا کروں۔'' وہ قریباً روہانسی ہو گئی تھی۔

''شہزادی! جب بھی کوئی قیدی گرفتار ہو کے آتا ہے تو بنداہارا اس کو سزا سنا دیتے ہیں یا اگر ان کے مزاج اچھا ہو تو اسے معاف کر دیا جاتا ہے۔'' شریفہ محل میں عرصے سے کام کر رہی تھی۔ پانچ دن پہلے آنے والے نئے بنداہارا سے عہدہ وفا کرنے سے پہلے وہ پچھلے بنداہارا کی کنیز بھی رہی تھی۔ ''آپ ان کو معاف کر سکتی ہیں' یا سزا سنا سکتی ہیں۔''

''معاف کرنے سے تو میں کمزور لگوں گی۔ ہرگز نہیں۔'' اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ پھر پلنگ کے کنارے پہ بیٹھی اور دونوں ہتھیلیوں سے دائیں بائیں پلنگ کی ریشمی چادر کو بھینچ لیا۔ وہ مضطرب بے چین میں لگتی تھی۔

''ان تینوں نے گستاخی کی تھی اور ان کو اس کی کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔''

شریفہ نے گہری سانس لے کر افسوس سے سر جھٹکا۔ شہزادی کا رہا سہا رعب جو کل تک شریفہ نے محسوس کیا تھا' اس کے بچکانہ رویے کے باعث اب اس کے دل سے جانے لگا تھا۔ سو وہ گردن پوری اٹھائے کھل کے بولنے لگی۔ ''شہزادی آپ اب ایک قدم اٹھا چکی ہیں۔ اب آپ کو شرمندگی سے بچنے کے لیے اس پہ قائم رہنا چاہیے۔''

''شرمندگی؟''

''شہزادی یان سوفو کو جانتی ہیں آپ؟ وہ چینی بادشاہ کی صاحبزادی ہیں۔ چند ماہ قبل وہ سلطان مرسل سے شادی کرنے کے لیے اپنے والد کی رضا مندی کے ساتھ ایک بڑے چینی قافلے کے ہمراہ ملاکہ آئی ہیں۔ وہ بوکی چینہ (چینی پہاڑی) والے محل میں قیام پذیر ہیں مگر ان کا اکثر یہاں آنا جانا رہتا ہے۔ یہ چند ماہ ان کی شادی کی تیاریوں میں گزر گئے۔ دو ہفتے بعد ان کی اور سلطان مرسل کی شادی ہے۔ شہزادی یان سوفو نے ان چند ماہ میں اپنے بہت تعلقات بنا لیے ہیں اور وہ سلطان کے فیصلوں پہ اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔ انہوں نے ہی الور سونگائی کے لوگوں پہ ظلم ڈھایا اور وہ آپ کے والد کی دشمن ہیں۔ ان کو خبر مل گئی کہ آپ جذباتی فیصلے کرتی ہیں تو وہ آپ کو شرمندہ کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گی۔''

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' تالیہ کے کندھے ڈھیلے پڑے اور رنگت پھیکی پڑ گئی۔

''شہزادی!'' وہ سبھاؤ سے سمجھانے لگی۔ ''آپ کو قیدیوں کو سزا دینی ہو گی۔''

''سزا....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں ان کو سخت سے سخت سزا دوں گی۔ ان سے بھاری سے بھاری مشقت کروائی جائے گی۔ یہ ٹھیک رہے گا۔''

''بالکل شہزادی۔ یہ بہترین رہے گا۔''

تالیہ ایک دم کھڑی ہوئی اور جیسے اعتماد کو بحال کرتے ہوئے گردن اکڑا کے بولی۔

''میں.... میں خود اپنے سامنے ان کو سزا سناؤں گی۔ مجھے قید خانے میں لے چلو۔''

''جو آپ کا حکم شہزادی۔'' شریفہ نے گہری سانس لے کر تالیہ کے چہرے کو دیکھا جو تائی ژیان کی گردن مار دینے کے بعد سے مرجھایا ہوا تھا' اب کھل اٹھا تھا۔

ایڈم سر جھکائے نڈھال پڑا تھا جب اس نے قریب آتے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ چونک کے سیدھا ہوا۔ کونے میں لگی گول سیڑھیوں سے چند افراد نیچے اتر رہے تھے۔ ایڈم تیزی سے کھڑا ہوا۔ اسے سرخ اور سنہری لباس کی جھلک دکھائی دی تھی۔

نیچے آنے والوں میں سب سے آگے تالیہ تھی۔ اس کا لمبا لباس زمین پہ جھاڑو دے رہا تھا اور وہ ہاتھ باہم پھنسائے بہت شان سے چلتی ہوئی سلاخ دار دروازے تک آئی تھی۔ سر کا تاج نیم اندھیرے میں بھی دمک رہا تھا۔

باقی دونوں قیدی بھی شہزادی کے احترام میں ہاتھ باندھے کھڑے ہو گئے تھے۔

''اتنا تو بتا دیں کہ آپ نے مجھے کیوں پکڑوایا ہے' شہزادی صاحبہ!'' ایڈم سلاخوں کو پکڑے روہانسا ہو کے بولا۔ ''صبح سے بھوکا پیاسا پڑا ہوں۔ کوئی پوچھنے تک نہیں آیا۔ اچھا فائدہ ہوا ہمیں آپ کے شہزادی ہونے کا۔''

شہزادی نے اچنبھے سے اسے دیکھتے ہوئے ساتھ کھڑے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

''میں خود نہیں سمجھ پا رہا۔'' سپاہی نے لاعلمی ظاہر کی۔

ایڈم نے افسوس سے ان دونوں کو دیکھا جو ناسمجھی سے ایڈم کو دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔

''آپ کی یہ اداکاری مجھے گراں گزر رہی ہے' بچے تالیہ۔ آپ سمجھتی کیا ہیں مجھے؟ میں انسان نہیں ہوں کیا؟ میرے اندر سیل ڈالے جاتے ہیں کیا؟''

وہ کوفت سے سپاہیوں کی طرف گھومی۔ پھر ایڈم نے دیکھا کہ وہ باری باری تینوں کی طرف اشارہ کر کے ان کو ہدایات دے رہی تھی۔ زبان انجان تھی۔ مگر جیسے ہی باقی دونوں قیدیوں نے اس کے الفاظ سنے وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے نیچے کو جھک گئے۔ ایڈم ہیجان میں کھڑا رہ گیا۔ وہ آخر کیا حکم دے رہی تھی؟

تالیہ ان ہی اجنبی نظروں سے اسے دیکھتی سلاخ دار دروازے کے قریب آئی' اور اپنے مرمریں ہاتھ سے ایک سلاخ تھامی۔ پھر قدرے برہمی سے ایڈم کو دیکھ کے اسی انجان زبان میں کچھ بولی جیسے اس کی سرزنش کر رہی ہو اور سنگین نتائج کی دھمکی دے رہی ہو۔

''مجھے کچھ کھانے کو ہی بھجوا دیں' یار۔ وہ پنجرے والے کم از کم کھانا تو اچھا دیتے تھے۔'' وہ روہانسا ہو گیا۔ تالیہ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور پلٹ گئی۔ اس کی معیت میں سپاہی بھی مڑ گئے اور چند لمحوں میں وہ لوگ جیسے آئے تھے ویسے ہی واپس چلے گئے۔

ایڈم سلاخوں کے قریب آیا اور آہستہ سے اپنا جوتا اس شے کے اوپر رکھا جو تالیہ کے ہاتھوں سے پھسل کے نیچے جا گری تھی۔ وہ چند لمحے دم سادھے وہاں کھڑا رہا پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ دوسرے قیدی نڈھال سے واپس بیٹھ گئے ہیں اور پہرے دار اس طرف متوجہ نہیں ہیں تو وہ دھیرے سے وہیں بیٹھتا گیا اور پھر آہستہ سے وہ شے اٹھائی۔

وہ ایک ننھا سا کاغذ کا ٹکڑا تھا۔

ایڈم نے اسے کھولا اور مشعل کی پھڑ پھڑاتی روشنی میں غور سے پڑھا۔ اس پہ انگریزی میں لکھا تھا۔

”مجھے پلان بنانے آتے ہیں‘ ایڈم مگر تمہیں صرف کتابیں پڑھنا آتی ہیں۔“

ایڈم نے پیغام کو مٹھی میں دبالیا اور بے چینی سے پہلو بدلا۔

(سچ تالیہ کے ہر پلان میں مجھ پہ طنز کرنا ضروری ہوتا ہے کیا؟)

☆☆☆

شام ڈھلتے ہی محل کی بیرونی دیوار پہ لگی قندیلیں روشن ہونے لگیں تو سارا محل دور سے جگمگاتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

محل کے اندر بہت سے چوکور باغ تھے۔ ایسے ہی ایک باغ کے وسط میں تالاب بنا تھا جس کے اندر سنگِ مرمر کا نیلا — فرش بچھا تھا۔ دیواروں پہ جگمگاتی مشعلوں کے باعث تالاب کا پانی جھلملاتا دکھائی دیتا تھا۔

تالاب کے زینوں پہ تالیہ بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے‘ آنکھیں بند کیے وہ مغموم سی بیٹھی نظر آتی تھی یا شاید بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔

برآمدے سے شریفہ طشتری اٹھائے گزر رہی تھی۔ تالیہ کو بے خبر پا کے اس نے رفتار تیز کردی۔

محل کے اندر دیواروں پہ جا بجا قندیلیں اور لالٹینیں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں موم بتیوں کے اسٹینڈ تھے۔ چھتوں سے روشن فانوس لٹک رہے تھے۔ یہ زرد روشنی ماحول کو مزید پُرفسوں اور خوابناک بنارہی تھی۔

شریفہ تیزی سے اوپر آئی اور شہزادی تاشہ کی خواب گاہ کا دروازہ کھولا۔ پہرے داروں کو وہ پہلے ہی بھیج چکی تھی۔

دروازہ بھیڑ کے وہ اندر آئی اور جلدی سے الماری کی طرف بڑھی۔ اس میں بڑے بڑے دراز بنے تھے۔ وہ ایک ایک کو کھولنے لگی۔ شام میں اس نے دیکھا تھا کہ تالیہ نے اس کے آتے ہی کوئی شے جلدی سے گاؤ تکیے کے پیچھے چھپائی تھی۔ وہ کوئی ریشمی گلابی رومال میں بندھی شے تھی جو شریفہ کے ذہن میں کھٹک گئی تھی۔

آخر شہزادی کا راز کیا تھا؟

اس نے بستر کے ساتھ رکھا صندوق کھولا اور چیزیں اوپر تلے کیں۔ کونے میں وہ اسے نظر آ ہی گیا۔ گلابی ریشم میں لپٹا ہوا کوئی بنڈل ہو جیسے۔ شریفہ مسکرائی اور اسے نکال کے چہرے کے سامنے لائی۔

یکدم کمرے میں جلتی قندیل بجھ گئی۔ ایک دم سارے میں اندھیرا چھا گیا۔ شریفہ چونک کے گھومی۔

کھڑکی کے پٹ اچانک سے کھل گئے تھے اور تیز ہوا کے باعث پردے اڑ — رہے تھے۔ آسمان پہ بادل گرج رہے تھے۔ وقفے وقفے سے بجلی بھی چمکتی۔

ہوا نے ہی قندیل بجھائی تھی۔

شریفہ قندیل جلانے آگے بڑھی‘ مگر اسی پل بجلی چمکی تو سامنے کوئی ہیولہ سا نظر آیا۔ وہ بالکل ساکت رہ گئی۔ اندھیرا دوبارہ چھا گیا۔

کنیز ریشمی رومال میں لپٹی شے سینے سے لگائے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ دل زور سے دھڑکا۔

”کل رات کیا ہوا تھا شریفہ؟“ بجلی دوبارہ چمکی تو پل بھر کو کمرہ روشن ہوا۔

کھڑکی کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ اس کے کھلے سنہری بال ہوا سے پیچھے اڑ رہے تھے۔ آنکھیں شریفہ پہ جمی تھیں۔ اور آواز.... یہ وہ آواز نہیں تھی جس میں وہ دو دن سے اس سے بات کرتی آرہی تھی۔

یہ تو لگتا تھا جیسے کوئی اور عورت ہے۔

”کل رات تمہیں یاد ہے کیا ہوا تھا شریفہ؟“

نیم اندھیرے میں وہ سرخ لباس کو دونوں پہلوؤں سے اٹھائے قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ شریفہ خوف سے پیچھے ہونے لگی۔

”تم رات کے دوسرے پہر کسی کھٹکے سے اٹھی تھیں۔ تم نے اپنے کمرے میں کوئی آہٹ سنی تھی۔ یاد ہے؟ تم نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بلی کی آواز آئی تو تم مطمئن ہو گئیں۔“ تالیہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھتی

آگے بڑھ رہی تھی۔ شریفہ پیچھے ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کی کمر دیوار سے ٹکرائی۔

"تم دوبارہ سو گئیں۔ پھر تم نے کوئی آہٹ نہیں سنی کیونکہ بلی کوئی آہٹ پیدا ہی نہیں کرتی۔ وہ دبے قدموں آتی ہے۔ سانس بھی نہیں لیتی۔ آہستہ آہستہ....وہ تمہاری موجودگی میں...." بجلی کڑکی تو کمرہ روشن ہوا اور کھلے بالوں والی حسین شہزادی نظر آئی۔ اس کی تیز نظریں اور وہ آنکھیں....شریفہ کا خون منجمد ہونے لگا۔

"تمہاری موجودگی میں وہ تمہارے سارے سامان کی تلاشی لے لیتی ہے مگر سانس لینے کی آواز بھی نہیں نکالتی۔ اور اسی خاموشی سے واپس چلی جاتی ہے۔ مگر اس شے کے ساتھ۔"

"شہزادی' میں آپ کے کمرے میں صرف صفائی کے لیے ....." اس نے کہنا چاہا' مگر پھر تالیہ کے الفاظ پہ چونکی۔ کرنٹ کھا کے اپنے ہاتھوں میں موجود شے کو دیکھا۔ "جی؟"

"اسے کھول کے تو دیکھو کہ یہ کیا ہے؟"

باہر وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی۔ بارش کی بوندیں تڑتڑ برسنے لگی تھیں۔ ایسے میں شہزادی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتی قندیل کے پاس رکی اور دیا سلائی لگا کے اسے آنچ دکھائی۔ شعلہ سا بھڑکا اور سارا کمرہ روشن ہو گیا۔

شریفہ نے تیزی سے رومال اتارا۔ اندر چند کاغذ سیدھے رکھے تھے۔ وہ دراصل کاغذات کا ایک بنڈل تھا۔

شہزادی آگے بڑھی اور کھڑکی بند کر دی۔ پھر پردے جھٹکے سے برابر کیے۔ ہوا کا راستہ رک گیا۔ بارش کی تڑتڑاہٹ ختم ہو گئی۔ اب صرف زرد روشن کمرہ تھا اور شریفہ جو ان کاغذوں کو کھول کے دیکھ رہی تھی۔ پہلے صفحے پہ نگاہ دوڑائی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ بے یقینی سے چہرہ اٹھا کے تالیہ کو دیکھا جو گردن اٹھائے' شان سے مسکرا رہی تھی۔

"یہ تمہارے خطوط ہیں۔ جو تمہارے نام لکھے ہیں کسی نے۔ بھلا کس نے؟" شہزادی — لمحے بھر کو رکی۔ "سابق بنداہارا کی فوج کے جرنیل بھوپالن نے۔ وہ پہلے اسی محل میں رہتا تھا۔ تم سے محبت بھی کرتا تھا' مگر اب وہ تمہیں خط لکھ کے مراد راجہ کی فوج اور اس کے رازوں کے بارے میں سوال کرتا رہتا ہے۔ وہ مفرور ہے اور میرے بابا کے آدمی اس کی تلاش میں ساری سلطنت میں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں لیکن اس کو ڈھونڈ نہیں پا رہے۔ کیا ان کو معلوم ہے کہ وہ تم سے رابطے میں ہے؟"

خطوط شریفہ کے ہاتھ سے پھسل گئے۔ وہ ایک دم دوڑتی ہوئی آئی اور تالیہ بنتِ مراد کے قدموں میں گر گئی۔ "شہزادی میری جان لے لیجیے' مگر خدارا میرا یقین کریں۔ میں نے اس کو کبھی کوئی راز نہیں بتایا۔"

تالیہ تیزی سے جھکی اور جھٹکے سے اسے کندھے سے دبوچ کر اوپر کھڑا کیا۔

"جان لے لوں گی تمہاری اگر تم دوبارہ میرے قدموں میں گریں۔ میرے سامنے ایک انسان کی طرح کھڑے ہو کے بات کیا کرو شریفہ! یوں جانوروں کی طرح قدموں میں نہ گرا کرو!" وہ غصے سے غرائی تو شریفہ ہاتھ باندھے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ خوف اور گھبراہٹ سے سفید پڑ چکا تھا۔

"شہزادی....میں قسم کھاتی ہوں میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔"

"میں جانتی ہوں...." تالیہ نے جھٹکے سے اسے چھوڑا اور گہری سانس بھری۔ "جو خط تم نے اسے کل لکھا تھا اور ابھی بھیجا نہیں تھا' وہ میں نے پڑھ کے واپس رکھ دیا تھا۔ تم اسے کچھ نہیں بتاتیں۔ میں جانتی ہوں۔ کیونکہ تمہیں محل کا عیش و آرام پسند ہے۔ تم اس سے صرف محبت بھری باتیں کرنا چاہتی ہو مگر وہ صرف تم سے دفاعی حکمت عملی کے رازوں کے بارے میں جاننے کے لئے رابطہ رکھتا ہے۔ البتہ...." وقفہ دیا.... "کوئی صرف اس کے خط پڑھے تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ رازوں کی تجارت دو طرفہ ہے۔"

شریفہ نے گھبرا کے نفی میں سر ہلایا۔ "خدارا

راجہ کو مت بتائیے گا۔ آپ جو کہیں گی میں کروں گی۔ خدا کے لیے شہزادی' مجھے معاف کر دیں۔ بدلے میں آپ مجھ سے جو چاہے کروا لیں۔"

تالیہ نے نزاکت سے چہرے پہ آئی سنہری لٹ پیچھے کی۔ "تمہاری باتیں مجھے اچھی لگ رہی ہیں۔ مگر یہ تم دل سے نہیں کہہ رہیں۔ تم اندر ہی اندر یہ سوچ رہی ہو کہ صبح ہوتے ہی تم یہ خط میرے کمرے سے چرا لو گی اور دوبارہ سے میرے باپ کے ساتھ مل جاؤ گی۔ ہے نا؟"

"شہزادی' میں....."

"تمہیں کیا لگتا ہے بے وقوف' میں نہیں دیکھ رہی کہ تم کس کس وقت میرے بابا سے مل کے آئی ہو اور ان کو میری ہر بات کی خبر دیتی ہو؟ چھپ کے کسی کی نقل و حرکت پہ نظر رکھنے کے کام میں تم مجھ سے اچھی نہیں ہو سکتیں۔ تم ابھی تاشہ بنتِ مراد کو جانتی نہیں ہو۔"

شریفہ نے خفت سے آنکھیں جھکا دیں۔ شہزادی آگے بڑھی اور نیچے گرا بنڈل اٹھایا' پھر واپس صندوق تک گئی اور اسے اندر ڈال کے بے نیازی سے ڈھکن گرا دیا۔ پھر اسی شان سے واپس گھومی۔

"یہ خط اب اسی جگہ رہیں گے' اور تم چاہو تو ان کو واپس چرا سکتی ہو' لیکن بات یہ ہے شریفہ کہ تاشہ بنتِ مراد کا کوئی کچھ بھی نہیں چرا سکتا۔ کیونکہ...." وہ پلنگ تک آئی اور تکیے تلے سے ایک بنڈل نکالا۔ پھر اوپری کاغذ اٹھا کے شریفہ کے سامنے لہرایا۔

"کیونکہ تاشہ صرف شہزادی نہیں ہے۔ وہ ایک ساحرہ بھی ہے' جسے دنیا کا ہر کام آتا ہے۔"

شریفہ نے چہرہ اٹھا کے اس کاغذ کو دیکھا اور جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی اس کی آنکھیں حیرت اور الجھن سے پھیلتی گئیں۔

"یہ اس جرنیل کا خط ہے شریفہ' اور اس پہ اس کی مہر بھی لگی ہے اور اس میں وہ تمہاری راجہ مراد کے خلاف مدد پہ تمہارا شکریہ ادا کر رہا ہے۔"

"یہ خط.... یہ خط تو میں نے کبھی نہیں پڑھا۔"

"درست۔ کیونکہ اس نے یہ خط تمہیں کبھی نہیں لکھا۔ یہ خط میں نے لکھا ہے۔ اس کی لکھائی میں۔ اس کی مہر لگا کے۔ چند منٹوں میں میں نے ایک پورا خط لکھ لیا۔ نقول تیار کرنا میرے لیے بہت آسان ہے' شریفہ۔"

کنیز نے حیرت' الجھن اور خوف سے اسے دیکھا۔ ہاتھ پھر سے جوڑ لیے۔ "شہزادی میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔"

"جس دن یہ خط میرے صندوق سے غائب ہوئے نا' اس دن میں اس طرح کے پچاس نئے خط بنا کے راجہ مراد کو دکھا دوں گی۔ جرنیل کی خفیہ مہر اور لکھائی وہ پہچانتے ہیں اور میں ان خطوط میں وہ وہ باتیں لکھوں گی کہ راجہ تمہاری گردن ایک لمحے میں اتار دیں گے۔"

کہہ کے اس نے جعلی خط زور سے بستر پہ پھینکے۔ شریفہ کو خوف سے جھٹکا سا آیا۔

"میں تاشہ پسوتا ہوں اور جو چیز ایک دفعہ دیکھ لوں' وہ مجھے نہیں بھولتی۔ میرے دماغ سے تم ان خطوط کو...." اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے' اس نے کنپٹی پہ انگلی سے دستک دی۔ "کبھی نہیں چرا سکتیں۔"

"شہزادی!" شریفہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے چہرہ جھکا دیا۔

"میں آج سے آپ کی غلام ہوں۔ راجہ نے مجھے آپ کی جاسوسی کرنے کا کہا تھا اور میں یہ صرف اس لیے کر رہی تھی کیونکہ میں ان کی غلام تھی مگر آج سے مجھ پہ سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ میں آپ کے لیے وہ سب بھی کروں گی جو میں کسی اور کے لیے نہیں کرتی۔ بس مجھے معاف کر دیجیے شہزادی۔" وہ دوبارہ جھکنے لگی مگر تالیہ کی تنبیہ یاد آ گئی۔ سو ہاتھ باندھے کھڑی رہی۔

تالیہ مسہری تک آئی' ایک شان سے لباس پھیلا کے اس پہ بیٹھی' اور ٹانگ پہ ٹانگ جما لی۔ پھر گالوں پہ جھومتی سنہری لٹ دو انگلیوں کے درمیان سے گزارتے ہوئے گویا ہوئی۔

"تم آج سے نہ صرف میری کنیز ہو بلکہ تم اس محل میں میری آنکھیں اور میرے کان ہو گی۔ تم میرا ہر حکم بلا چوں چراں مانو گی۔ تم میرے لیے ہر وہ کام کرو گی جو میں تمہیں کہوں گی۔ اس کے بدلے میں میں تمہیں اچھا مال اور اچھی خوراک دوں گی۔ اور سب سے بڑھ کے میں تمہیں عزت دوں گی۔ میں تمہیں اپنے پیروں کو چاٹنے سے بچاؤں گی۔ میں تمہیں ایک انسان کی طرح رکھوں گی۔ لیکن جس دن تم نے مجھ سے غداری کی' اس روز.... میں.... تمہاری.... جان لے لوں گی۔"

آخری الفاظ چبا چبا کے ادا کیے۔ اس کی آنکھیں شریفہ کے اندر تک اتر رہی تھیں۔ وہ فوراً بولی۔

"آپ مجھے ہمیشہ وفادار پائیں گی شہزادی! میں نے محل سے کوئی غداری نہیں کی' نہ کروں گی۔ آپ حکم دیجیے' میں آپ کے لیے کیا کروں؟"

"ہوں۔" تالیہ نے ایک انگلی اپنے کان کے آویزے پہ پھیرتے ہوئے سوچتی نظروں سے شریفہ کو دیکھا۔

"آج جب ہم بازار گئے تھے تو وہاں ایک عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ وہ اور اس کے سامنے والی حویلی کس کی ہے؟"

"وہ؟" شریفہ نے جلدی جلدی ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے اور بتانے لگی۔ "وہ دونوں حویلیاں ابوالخیر کی ہیں۔ وہ ملاکہ کا سب سے بڑا تاجر ہے۔ بہت مال' بیٹوں اور غلاموں والا۔"

"ہوں.... کس چیز کا تاجر ہے وہ؟"

"مچھلی' گوشت اور مسالوں کا۔ وہ ہندوستانی تاجروں سے سخت خار کھاتا ہے اور ان کے مسالے چرا لیتا ہے یا خراب کروا دیتا ہے' اور اپنے مسالے مہنگے دام بیچتا ہے۔ وہ رئیس ہے اور اس کے ہاں سلاطین' وزراء اور امراء کا روز کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ راجہ مراد کا خاص دوست ہے وہ۔"

"اور وہ لوگ جو عمارت تعمیر کر رہے تھے' وہ کون تھے۔"

"وہ اس کے غلام ہیں۔ عام لوگوں کی طرح وہ منڈی سے غلام نہیں خریدتا بلکہ لوگوں کو اغوا کر کے زبردستی غلام بنا لیتا ہے۔ پھر ان سے مفت میں کام کرواتا ہے۔ برسوں سے لوگ اس کے پاس یوں ہی قید ہیں مگر اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ وہ ہر بنداہارا کا دوست جو ہوتا ہے۔"

"تو کیا سارے غلام ہمیشہ اس کے پاس قید رہتے ہیں؟"

"نہیں۔ وہ چند غلاموں کو جو کسی ہنر سے آراستہ ہوں' اور دیکھنے میں تنومند اور مضبوط ہوں' ان کو وہ الگ کر لیتا ہے۔"

تالیہ چونک کے سیدھی ہوئی۔ "اچھا۔ اور ان کو وہ اچھی خوراک دیتا ہے نا؟ تاکہ وہ صحت مند لگیں؟"

شریفہ نے سر ہلایا۔

"جی ہاں۔ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے' انہیں سارے ہنر سکھاتا ہے اور انہیں خوب تیار کر کے ہر تھوڑے عرصے بعد نیلامی میں بیچ دیتا ہے۔"

"نیلامی؟" وہ چونکی۔ "انسانوں کی نیلامی؟"

اس کا دل ڈوبا۔

"جی شہزادی۔ چین میں بھی تو ہوتی ہوں گی نیلامیاں۔" اس کا انداز دفاعی مگر مغموم ہو گیا۔ "بڑے بڑے امراء اور شہزادے ایسی نیلامیوں سے اپنے لیے خاص غلام خریدا کرتے ہیں۔" وہ رکی۔ "کیا آپ اس کے پاس سے کسی غلام کو خریدنا چاہتی ہیں؟"

"جو میں چاہتی ہوں وہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں' اور ہو سکتا ہے کہ تم وہ نہ کر سکو' لیکن اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ کام تم کو ہی کرنا ہے۔ ہر صورت۔" اس کے الفاظ سرد تھے اور سنگین بھی۔ دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔

دیوار پہ لگی قندیل ہلکی سی پھڑپھڑا رہی تھی۔ باہر تڑاتڑ بارش برسے جا رہی تھی۔

☆☆☆

ابوالخیر کی حویلی کے باورچی خانے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کمرے بنے تھے۔ ان کے اندر فرش

پہ بھوسے کے بستر تھے اور دروازوں کی جگہ پردے لہرا رہے تھے۔ ایسے ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں وہ چت لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ بازوؤں کا تکیہ بنا کے سر تلے رکھا تھا اور گہری سوچ میں گم لگتا تھا۔

باہر بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ وقفے وقفے سے بجلی چمکتی اور اوپر لگے روشن دان سے اندر آ کے سارا کمرہ روشن کر دیتی۔ روشن دان چند فٹ ہی اونچا تھا۔ اور شیشے کا بنا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔

یکدم پردہ ہلکا سا سرکا اور ننھی سی آریانہ اندر داخل ہوئی۔ کھلے بالوں پہ سفید ہیئر بینڈ لگائے' سفید فراک پہنے وہ آہستہ سے ایک دیوار سے جا لگی اور اداسی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ڈیڈا!"

"ہوں۔" وہ چھت کو تکتے ہوئے بڑبڑایا۔

"آپ دکھی ہیں نا؟ ہونا بھی چاہیے۔ آخر آپ ایک قیدی ہیں۔ وقت کے قیدی۔ اس گندے میلے احاطے میں پھنسے قیدی' جہاں کوئی بھی آپ کو زخمی کر سکتا ہے۔ مار بھی سکتا ہے۔ جہاں پہ آپ سے جانوروں کی طرح کام کرواتے ہیں۔ آپ کو اب اس زندگی' اور اللہ سے مایوس ہو جانا چاہیے۔" وہ دھیرے دھیرے اس کو تلخ حقیقت سے روشناس کروا رہی تھی

"تمہیں معلوم ہے میں جب لاء پڑھ رہا تھا تو میں کیا بننا چاہتا تھا؟" وہ چھت کو دیکھتے ہوئے بولا تو وہ چڑ سی گئی۔

"آپ کو اپنی قسمت کو کوسنا چاہیے' آپ کو رونا چاہیے۔ آپ کو اچھی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔"

"میں شیف بننا چاہتا تھا۔" وہ چھت کو دیکھ کے مسکرایا۔ "مجھے کھانے سے محبت تھی۔ سلاد کے پتوں کا رنگ۔ آگ پہ پیاز بھوننے کی خوشبو.... اسٹیک کے پکنے کی آوازیں۔ مکئی کے دانوں کی ساخت.... مجھے کھانے سے محبت تھی آریانہ۔ اور مجھے کچن کاؤنٹر پہ کھڑے ہو کے سبزیاں کاٹنے میں جو مزا آتا تھا وہ اور کسی چیز میں نہیں آتا تھا۔ مگر میں اتنا مصروف ہوتا تھا کہ کچھ نہیں بنا پاتا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے یاد کر کے کہہ رہا تھا۔ چہرے پہ زخم کے نشان ابھی تک نظر آ رہے تھے۔ تازہ شیو کی تھی مگر بلیڈ سے چند خراشیں پڑ گئی تھیں۔

"ڈیڈ.... اس مایوسی اور بددلی کو دیکھیں جو آپ کے اردگرد پھیلی ہے۔ یہ کچرا.... یہ انسانوں کو جانوروں کی طرح استعمال کرنا.... ڈیڈ...." اس کا 'دماغ' آریانہ کے روپ میں اس کو یاد کروا رہا تھا کہ اسے دنیا کے دوسرے اکثر لوگوں کی طرح صرف برا ہی سوچنا ہے مگر وہ اپنے دل سے کچھ اور کہے جا رہا تھا۔

"شادی کے بعد ویسے ہی عصرہ کھانا بناتی تھی۔ پھر میں سیاست میں آ گیا۔ امریکہ میں جب میں اسٹیٹ اٹارنی کا الیکشن لڑنے نکلا تو میرے ساتھ پی آر کے لوگ ہوتے تھے ہر وقت۔ اور جب میں مشہور ہوتا گیا تو میرا اسٹاف بڑھتا گیا۔ لوگ میری ہر حرکت پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں ملائیشیا واپس آیا تو میرا نام مزید مشہور ہو گیا۔ پرائیویسی ختم ہو گئی۔ ملازم' کنسلٹنٹ' کیمپئین اسٹاف۔ باڈی مین۔ ہر وقت کوئی ساتھ چپکا ہوتا تھا۔ سیاست' ٹی وی شوز' پبلک اپیئرنس' میرا ایک بزنس فیس تھا۔ مجھے اپنے امیج کے مطابق کام کرنا تھا۔ میں کرتا رہا۔"

بارش کی بوندیں گرتی رہیں' بجلی چمکتی رہی اور وہ بولتا رہا۔ آریانہ ساتھ ہی کچھ کہہ رہی تھی مگر وہ اسے نہیں سن رہا تھا۔

"ہر وقت میڈیا' رپورٹرز' مخالف سیاستدان' میری اپنی پارٹی کے لوگ اور میرا خاندان' میرے فینز میری ہر حرکت کو جج کر رہے ہوتے تھے۔ اور جب میں تنہا ہوتا تو بھی اتنا مصروف ہوتا کہ کچن میں قدم تک نہ رکھ پاتا۔ مگر وہ شوق کبھی ختم نہیں ہوا۔ میں قید تھا۔ مجبوریوں اور کاموں میں۔ مگر اب.... اب میں آزاد ہوں۔"

"آپ قید ہیں' ڈیڈا!" وہ روہانسی ہوئی۔ "ہر

چیز میں مثبت پہلو دیکھنا چھوڑ دیں' ڈیڈ۔''

''نہیں۔ میں آزاد ہوں۔ پہلی دفعہ میں آزاد ہوا ہوں' آریانہ!'' اس نے نظروں کا زاویہ بدلا اور مسکرا کے دیوار سے لگی پریشان اور ڈری ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ ''مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا۔ کوئی میرا اسکینڈل نہیں بنائے گا۔ کوئی مجھے جج نہیں کرے گا۔ میں کبھی اتنا آزاد نہیں ہوا۔ میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مجھے اس ملک کو نہیں چلانا۔ مجھے کوئی پارٹی نہیں چلانی۔ دیکھو اردگرد.... یہاں کوئی مجھ میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ مجھے کسی کے سامنے اپنا بزنس فیس قائم نہیں رکھنا۔ میں آزاد ہوں۔ اور میں اس باورچی خانے میں کھانا پکا سکتا ہوں۔''

''آپ پھنس چکے ہیں۔ آپ مظلوم ہیں۔ آپ وکٹم ہیں۔ آپ....''

''میں مظلوم نہیں ہوں۔ میں نے اپنی مرضی سے وہ دروازہ پار کیا تھا۔ یہ میری چوائس تھی۔ اور میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں یہاں خوش ہوں۔ نہیں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں مشکل وقت میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھوں گا۔ میں اس سے کچھ سیکھ کے ہی نکلوں گا۔ تمہارے باپ نے آج تک ہمت نہیں ہاری۔ گیواپ نہیں کیا۔ تو اب وہ کیوں ہمت ہارے گا۔ نکل تو میں آؤں گا اس سے۔ مگر مجھے اس قید کو بھی ایک تجربے جیسا سمجھنا ہے جو مجھے کچھ سکھائے۔ مجھے اس سے بہتر انسان بن کے نکلنا ہے۔ زیادہ آزاد۔''

''آپ کو ڈرنا چاہیے کہ یہ جنگلی لوگ آپ کو مار نہ دیں۔''

''مرنا کیا ہوتا ہے آریانہ؟'' اس نے گہری سانس لی اور بازوؤں کا تکیہ سر تلے رکھے دوبارہ سے اوپر دیکھنے لگا۔ ''ایک دنیا سے دوسری میں چلے جانا اور جب آپ ایک نئی دنیا میں چلے جاتے ہیں تو پچھلی کے فائدے نقصان بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر مار بھی دیں تو کیا ہوگا؟ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ موت بھی صرف ایک تجربہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں دنیا سے جانے سے پہلے وہاں کتنی اچھائی اور پوزیٹی وٹی پھیلا کے جاتا ہوں۔ جب انسان کو یہ ایمان آ جاتا ہے نا' تو وہ موت سے نہیں ڈرتا۔''

اس نے پھر سے دیوار کو دیکھا تو اب آریانہ وہاں نہیں تھی۔ وہ اپنے تمام تر واہموں اور خدشات سمیت غائب ہو چکی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ اس کی مثبت سوچ نے اندر سر اٹھاتی منفیت ہے کو شکست دے دی تھی۔

گہری سانس لے کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بارش اب ہلکی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

صبح کا سورج ابھی پوری طرح قدیم ملاکہ پہ طلوع نہیں ہوا تھا۔ نارنجی لکیریں جامنی آسمان پہ بکھری تھیں' جب سپاہی ان تین قیدیوں کو اپنے نرغے میں لیے محل کے سبزہ زار پہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ زنجیروں میں بندھے تھے اور وہ جھکے سروں کے ساتھ قطار میں چل رہے تھے۔

ایڈم سب سے پیچھے تھا اور اس کا چہرہ سب سے زیادہ لٹکا ہوا تھا۔

(جب ہم واپس جائیں گے تو ان شاء اللہ جے تالیہ کے خلاف عدالت میں گواہی دینے اور ان کو جیل بھجوانے والا پہلا شخص میں ہوں گا۔ وہ بار بار زنجیر میں مقید ہاتھ شیو پہ پھیر کے تہیہ کرتا تھا۔)

سپاہی ان کو لیے گھوڑوں کے اصطبل تک آ گئے۔

تلوار کی نوک سے ایک سپاہی نے پہلے قیدی کو اصطبل کے اندر دھکیلا۔ وہ ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا۔ وہاں موجود مستعد کھڑے سپاہی نے کندھے سے پکڑ کے قیدی کا جائزہ لیا' پھر اس کو گھما پھرا کے دیکھا' پھر اس کی زنجیر کھول دی اور اسے کوئی پُر مشقت کام سمجھانے لگا۔ قیدی مرے مرے انداز میں سر ہلانے لگا۔ پھر اس نے جھک کے کدال اٹھائی۔ سپاہی اس کو رعب سے ہدایات دیتا ایک طرف لے گیا۔

تو یہ تھی ان کی سزا۔

ہر قیدی کو مشقت کرنی تھی۔ ایڈم بن محمد کا دل مزید بجھ گیا۔

دیگر سپاہی ان دونوں کو لیے آگے بڑھ گئے۔ محل کی عقبی طرف ایک جگہ بہت سے جنگی آلات رکھے تھے اور منہ اندھیرے ہی شاہی غلام ان کو بنانے اور ان کی صفائی پہ جُت جاتے تھے۔ بھٹی جل رہی تھی اور لوہے کو اندر دہکایا جا رہا تھا۔ وہاں موجود سپاہیوں نے دوسرے قیدی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور فوراً کام پہ لگا دیا۔

اب وہ ایڈم کو لیے مزید آگے آئے۔ وہ گم صم سا ان کے ساتھ چلتا آیا۔

(جے تالیہ پہ ملائیشیاء کے آئین کے مطابق چوری اور دھوکہ دہی کے ساتھ ساتھ معصوم شہریوں کو اغوا کر کے حبس بے جا میں رکھنے اور ان سے مشقت کروانے کا مقدمہ بھی بنتا ہے۔) لب کاٹتے وہ سوچ رہا تھا۔

آسمان کی رنگت ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسے لیے محل کی عمارت کے ساتھ ساتھ چلتے جا رہے تھے۔ بہت سے دروازوں پہ پہرے دار کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ وہ آگے بڑھتے گئے۔ پھر ایک اونچے اور بھاری لکڑی کے دروازے کے سامنے رکے۔ ایڈم ذرا ٹھٹھک کے آہستہ ہوا۔

وہاں شریفہ اور ایک دوسری کنیز کے ہمراہ.... وہ کھڑی تھی۔

تاج سر پہ سجائے' بالوں کا جوڑا بنائے ہوئے تھی۔ سر پہ کپڑا تھا جو تاج سے نکلتا ہوا کمر تک گر رہا تھا۔ نیچے اس نے گہرا نیلا اور سنہری لباس پہن رکھا تھا۔ ایڈم کو دیکھ کے شان سے مسکرائی تھی۔

''میری کیا سزا تجویز کی ہے جے تالیہ آپ نے؟'' وہ اسے دیکھتے ہی خفگی سے بولا۔ اس کے الفاظ کسی کی سمجھ میں نہیں آئے تھے نہ کسی نے توجہ دی۔ بس پہرے داروں نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔ اور خود دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ شہزادی کے سامنے کھڑا اپنی سزا کا منتظر تھا۔

''جیسے میں نے آپ سے گیلری میں بدتمیزی نہیں کی تھی' مگر آپ نے وہاں بھی خوب واویلا مچایا تھا' ویسے ہی میں نے آپ سے اب بھی بدتمیزی نہیں کی تھی' لیکن پھر بھی آپ نے مجھے گرفتار کروا دیا اور۔''

.... وہ غصے سے بولنے لگا مگر شہزادی تاشہ نے ہاتھ اٹھا کے نزاکت سے اشارہ کیا تو پہرے داروں نے جھٹ اس دروازے کے پٹ اندر کی طرف دھکیل دیے۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ایڈم نے چونک کے دیکھا۔

اندر ایک طویل ہال تھا۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ وہاں قطار در قطار لکڑی کے ریکس لگے تھے۔ جن پہ ترتیب سے کتابیں سجی تھیں۔ ایڈم کا منہ کھل گیا۔

''یہ شاہی لائبریری ہے' ایڈم۔'' وہ اس کو دیکھ کے مدھم آواز میں بولی۔ (پہرے دار اور کنیزیں اس کو اجنبی زبان میں بات کرتے دیکھ کے بھی خاموش رہے۔ جب شہزادی کچھ بول رہی ہو تو وہ گونگے بہرے بن جاتے تھے) ''اور تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اس کی تمام کتابوں کو نئی جلدیں عطا کرو گے۔ یعنی جلد بھی بناؤ گے اور اس کو چپکاؤ گے بھی۔ یوں تم ساری کتابیں پڑھ بھی لو گے جو کہ قدیم ملے میں لکھی ہیں۔ ہمارے اسکولز میں کلاسیکل ملے کی چند کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ تم نے بھی پڑھی ہوں گی۔ تم ذہین ہو' رسم الخط سے واقف ہو' چند دنوں میں الفاظ اور زبان پہ عبور حاصل کر لو گے۔ کرنا بھی چاہیے کیونکہ جب تک تم زبان نہیں سیکھو گے' ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ اس لیے جب تالیہ کہے کہ اس کے پاس پلان ہے تو اس پہ بھروسہ کیا کرو کیونکہ تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔'' وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی۔ چہرہ سنجیدہ تھا اور وہ ہکا بکا سن رہا تھا۔

پھر وہ کنیزوں اور غلاموں کی طرف متوجہ ہوئی۔''

''تمہاری شہزادی کو سات زبانیں آتی ہیں۔ یہ قیدی تامل زبان بولتا ہے اور یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی فضول گوئی نہیں سمجھ سکوں گی۔ ہونہہ۔'' غرور سے کہہ کے' لباس پہلوؤں سے اٹھائے آگے بڑھ گئی۔ کنیزوں اور غلاموں کی گردنیں فخر سے اٹھ سی گئیں اور وہ اس کے پیچھے ہو لیے۔ دوسرے سپاہی ایڈم کو

لیے اندر کی جانب بڑھ گئے۔ وہ ابھی تک اُدھ کھلے منہ کے ساتھ بار بار گردن موڑ کے شہزادی کو دیکھتا تھا۔

اندر کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ایک دیوار سے دوسری تک۔ قطار در قطار ریکس۔ علم کے خزانے۔ قدیم کتابیں۔ ان کی خوشبو۔ مدھم جلتی روشنیاں۔ لکھائی کے لئے بنی میزیں۔ ان پہ رکھی سیاہی کی ڈبیاں۔ پرندوں کے پروں والے قلم۔ وہ مسحور سا گول گھوم گھوم کے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

سپاہی اب درشتی سے اس کو کام سمجھانے لگا۔ جلد کیسے بنانی ہے' اور کیسے کتاب پہ لگانی ہے۔ ایڈم نے بالآخر گہری سانس لی۔

(چلو....اغوا اور حبس بے جا کی دفعات میں اپنے مقدمے سے نکال دوں گا۔)

اس نے رحم دلی سے تالیہ کے بہت سے گناہ معاف کیے اور سپاہیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔

اس کی مشقت سب سے دلچسپ تھی۔

☆☆☆

ابوالخیر کی حویلی پہ وہ رات جب گہری ہونے لگی تو اس کی ساری کھڑکیوں کی روشنیاں دھیرے دھیرے گل ہوتی گئیں۔ ایسے میں باورچی خانے میں ہنوز لالٹین جل رہی تھی۔ سفید مونچھوں والا باورچی آستین چڑھائے' ڈوئی ہاتھ میں پکڑے تندی سے ایک کم عمر لڑکے کو جھڑک رہا تھا جو سر جھکائے' مٹھیوں سے آٹے نما کوئی شے گوندھ رہا تھا۔ ادھر اس کا ہاتھ درست طریقے سے نہ مڑتا' ادھر باورچی ڈوئی کھینچ کے اس کے کندھے پہ مارتا۔

وان فاتح ٹوکری پہلو پہ اٹھائے باورچی خانے میں داخل ہوا تو مچھلیوں کی بُو بھی ساتھ ہی اندر آئی۔ ٹوکری کٹی ہوئی صاف مچھلیوں سے بھری تھی جسے اس نے میز پہ لا دھرا اور پھر ناگواری سے باورچی کو دیکھا جو اس لڑکے کو کوستے ہوئے ڈانٹ مار کے کام کروا رہا تھا۔ لڑکے کے آنسو بہہ رہے تھے اور شانے سے خون بھی رس رہا تھا۔ فاتح خاموش کھڑا اسے گھورتا رہا۔

باہر سے کسی نے آواز دی تو باورچی برا منہ بنائے باہر نکل گیا۔ لڑکے نے بھیگا چہرہ اٹھا کے گلہ آمیز نظروں سے فاتح کو دیکھا۔

"غصے والی شکل کیوں بنا رہے ہو اگر میری مدد نہیں کر سکتے تو؟" اس کو جیسے آس ٹوٹنے کا دکھ تھا۔ الفاظ نہ سمجھ آئے ہوں' انداز بتاتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"مجھے اس پہ نہیں' تم پہ غصہ ہے۔ اگر کوئی تمہیں مار رہا ہے' اور تم اس کا ہاتھ خود نہیں پکڑ سکتے تو کوئی تمہیں اس کے ظلم سے نہیں بچا سکتا۔ جب تک تم اپنے لیے نہیں لڑو گے' کوئی تمہارے لئے نہیں لڑ سکتا۔"

لڑکے کی سمجھ میں البتہ کچھ نہ آیا۔ بس خفگی سے آنسو پونچھتا پھر سے آٹا گوندھنے لگا۔

فاتح اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ رات سیاہ پڑ رہی تھی اور دھیرے دھیرے ساری حویلی نیند کی آغوش میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ وہ بھوسے کے بستر پہ چت لیٹا کافی دیر بس چھت کو دیکھتا رہا۔ ذہن میں وہ آریانہ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

رات گہری ہوتی گئی۔ دوسرا پہر گزرنے لگا۔ جب ایک دم اسے لگا کہ اوپر روشن دان سے کوئی سانپ گرا ہے۔ وہ کرنٹ کھا کے اٹھا' اور چند قدم پیچھے ہٹا۔ پھر اندھیرے میں آنکھیں چندھی کر کے دیکھا۔

وہ سانپ نہیں تھا۔ وہ روشن دان سے لٹکی رسی تھی۔ وان فاتح کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔

رسی سے اوپر چڑھنا قطعاً مشکل نہ تھا۔ چند منٹ میں وہ روشن دان سے نکل کے اوپر آ گیا جہاں چھت کا شیڈ بنا تھا۔ طویل شیڈ جو مخروطی تھا اور اوپر عمارت کے مینار تک جاتا تھا۔ رسی وہاں چمنی سے بندھی تھی۔ اور چمنی کے پاس....وہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔

فاتح احتیاط سے اوپر چڑھتا اس تک آیا۔ پھر گردن گھما کے دیکھا۔ پہرے دار بہت نیچے تھے۔ وہ انہیں

نہیں دیکھ سکتے تھے۔

تالیہ نے شاہی لباس کی بجائے سادہ کھلا سیاہ پاجامہ اور سیاہ لمبی قمیص پہن رکھی تھی۔ آلتی پالتی مار کے بیٹھی' وہ سنہرے بالوں کا جوڑا بنائے' بس سادگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب فاتح نے قدم روکے۔

''شہزادی!'' سر کو خم دیا۔

وہ اٹھی نہیں۔ بس سر کو جنبش دی۔ ''تو انکو!''

(جگہ مخروطی تھی۔ ذرا اٹھتی تو نیچے پھسل سکتی تھی۔)

فاتح نے ادھر ادھر دیکھا۔ ''تم یہاں کیسے آئیں؟''

تالیہ گردن اٹھا کے اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھ کر مسکرائی۔

''جو مجھے آتا ہے' وہ میری جان بچا سکتا ہے۔ اور مجھے دو ہی کام آتے ہیں۔ بلی کی طرح دیواریں پھاند کے دوسروں کے گھروں میں داخل ہو جانا' اور کسی بھی آرٹ ورک کی ہو بہو نقالی کر لینا۔ ان کاموں نے مجھے ایک کنیز کی وفاداری خرید دی اور وہ مجھے یہاں تک لے آئی۔''

فاتح احتیاط سے اس کے ساتھ بیٹھا۔ ''تو کیا تم واقعی شہزادی تاشہ ہو؟''

وہ اداسی سے مسکرائی۔ ''جی ہاں۔ وہ تاشہ جس کا ذکر آپ کتابوں میں پڑھتے تھے' وہ میں ہی ہوں۔ وہ تمام کام جو اس نے کیے تھے' وہ میں اب کروں گی۔ ماضی نہیں بدل سکتا۔ ہم دراصل تاریخ کو بدل نہیں رہے۔ بلکہ ہم اس وقت تاریخ میں موجود ہیں اور ہم تاریخ کو بنا رہے ہیں۔''

''تم نے بنگارا یا ملایو پڑھی ہے؟''

وہ دونوں مخروطی چھت پہ بیٹھے تھے اور ان کو سامنے دور دور تک ملاکہ کا قدیم شہر پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔

''نہیں' تو ان کو۔'' اس نے فاتح کو دیکھ کے کہا۔ دونوں نے چہرہ ایک دوسرے کی طرف موڑ رکھا تھا۔ ''میں نے صرف شہزادی تاشہ کا نام سنا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس نے کون سے کارنامے انجام دیے تھے۔''

''میں جانتا ہوں۔ میں نے بنگارا یا ملایو پڑھی ہے۔''

تالیہ کا دل زور سے دھڑکا۔

''تو مجھے بتائیے کہ میں یہاں کون سے بڑے کام کرنے جا رہی ہوں۔'' وہ بے چینی سے پوچھنے لگی۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ کتاب تمہارے بارے میں لکھی گئی تھی مگر اس میں ان عظیم کاموں کا ذکر بھی ہے جو میں نہیں جانتا تم کر سکتی ہو یا نہیں۔ اس لیے میں تمہیں ان کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ تم اپنی فری ول (آزادانہ مرضی) کو استعمال کر کے اپنی مرضی سے جو کرنا ہے کرو۔ یا تو وہ کتاب جھوٹی تھی یا تم واقعی اتنی ہی عظیم ہو جتنا کہ اس میں لکھا تھا....'' اس نے گہری سانس لی۔ ''خیر.... ایڈم کو تم اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب ہو گئیں۔''

وہ جو انہماک سے سن رہی تھی' اس کے بات بدل دینے پہ بدمزہ ہوئی۔ ذرا سے شانے اچکائے۔ ''ہاں' وہ محل میں پورے عیش و آرام سے رہ رہا ہے۔ درجنوں غلام اس کی خدمت پہ مامور ہیں۔ چھ سو کتابیں اس کو مطالعے کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ تین وقت کا کھانا شاہی باورچی خانے سے آتا ہے اس کا۔ اور کیا چاہیے اس کو۔''

''مطلب تم نے اس کو شاہی لائبریری میں قید بامشقت پہ رکھ دیا ہے۔''

''اب یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے' تو انکو۔ چونکہ میری نظر مثبت ہے تو میرے خیال میں وہ بڑے آرام سے ہے۔'' مزے سے بولی اور مسکراہٹ دبائی۔ فاتح بھی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

سلطنتِ ملاکہ کا قدیم چاند آسمان پہ تیر رہا تھا اور ایسے میں وہ دونوں اس مخروطی شیڈ پہ بیٹھے

اطراف سے بے خبر نظر آتے تھے۔

''تم کیسی ہو؟'' فاتح نے دھیرے سے پوچھا۔

''میرے پاس پلان ہے' تو انکو۔ راجہ مراد مجھے چابی نہیں دیں گے' اس لئے میں ایڈم کو زبان سکھا رہی ہوں تاکہ وہ میرے ساتھ رہ سکے۔ آپ کو بھی میں آپ کے مالک سے خرید کے محل میں لے جاؤں گی پھر ہم اس چابی کو مل کے تلاش کریں گے اور....''

''میں پوچھ رہا ہوں' تم کیسی ہو' تالیہ؟'' وہ نرمی سے بولا تو تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

''میں؟'' وہ گم صم ہوئی۔

''اپنے بابا سے اتنے عرصے بعد ملی ہو۔ اپنے ملک میں واپس آئی ہو۔ خوش ہو؟''

وہ اسے دیکھ کے رہ گئی۔ ''یہ میرا ملک نہیں ہے۔ یہ میرے لوگ نہیں ہیں۔ میرا ملک صرف ملائیشیا ہے۔ 2016ء کا ملائیشیا اور مجھے وہیں واپس جانا ہے۔''

''اور تمہارے بابا؟''

''مجھے ان سے کوئی اپنائیت' کوئی محبت محسوس نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ میری فیملی صرف داتن ہے۔ اور کوئی نہیں۔'' وہ اداس ہوئی۔ چہرہ موڑ لیا۔ اب وہ دور اندھیرے میں ڈوبے شہر کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ تو تم محسوس کر رہی ہو۔ راجہ مراد کیسا محسوس کرتا ہے؟''

''پتا نہیں۔ میرا نہیں خیال ان کو مجھ میں کوئی دلچسپی ہے۔ انہوں نے پہلے ہی دن میرے پیچھے ایک کنیز کو لگا دیا۔''

''یا شاید تم فرض کر چکی ہو کہ تمہیں کوئی بھی انسان اپنی فیملی نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے تم اپنی اصل فیملی سے مل کے بھی پُرامید نہیں ہو۔ تم اپنی عزت نہیں کرتیں' تالیہ۔''

اس نے شاکی نظریں فاتح کی طرف موڑیں۔ ''میں سترہ سال بعد ان سے مل رہی ہوں مگر ان کے انداز میں کوئی محبت' کوئی والہانہ پن نہ تھا۔''

''تم اس سے سترہ سال بعد مل رہی ہو' وہ تم سے پانچ دن بعد مل رہا ہے۔ پانچ دن صرف تم اس سے دور رہی ہو۔ ظاہر ہے وہ نارمل ہوگا۔''

''کیا آریانہ کو کھونے کے پانچویں دن آپ نارمل تھے؟'' الفاظ تھے کہ کیا.... فاتح ایک دم خاموش ہو گیا۔

''کیا اگر پانچویں دن اس چیئر لفٹ ٹریک پہ آپ جاتے اور وہ آپ کو مل جاتی تو کیا آپ اس سے محبت کا اظہار کرنے میں سرد مہری یا کنجوسی سے کام لیتے۔''

''میرا کیس مختلف ہے۔ میں اکیسویں صدی کا باپ ہوں۔ پہلے زمانے میں لوگ اتنے ایکسپریسو نہیں تھے۔ باپ عموماً سخت گیر ہوتے تھے۔''

''ہاں!'' اس نے گہری سانس بھر کے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہماری دنیا اور اس دنیا میں بہت فرق ہے۔ اور اپنی دنیا میں واپس جانے کے لیے ہمیں راجہ مراد سے لڑنا پڑے گا۔''

''تم اپنے باپ کو اپنا دشمن کیوں سمجھتی ہو؟''

''کیونکہ وہ کوئی ہیرو نہیں ہیں۔ وہ خطرناک ہیں۔ قاتل ہیں۔ ظالم ہیں۔ انہوں نے اپنے لوگوں سے وعدہ کیا تھا' ان کی بھلائی کا وعدہ اور پھر انہوں نے اپنا ضمیر بیچ کے اس وعدے کو بھلا دیا اور ایک طاقت ور عہدہ حاصل کر لیا۔ ایسے شخص کو کیا کہتے ہیں' تو انکو؟''

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر آہستہ سے بولا۔ ''سیاست دان۔''

وہ لمحے بھر کو کچھ بول نہ پائی۔ ''میرے بابا.... ایک ظالم' خطرناک....''

''سیاست دان ہیں۔ تمہارے بابا صرف ایک سیاستدان ہیں۔ اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ تحمل سے کہہ رہا تھا۔ ''سیاستدان سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی جنگ' کسی لڑائی' کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے تمہیں' سوائے ایک چیز کے۔''

''کیا؟''

"The art of Politics" (فن سیاست)

تالیہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "جو ہماری دنیا کے سیاستدان کرتے ہیں؟ ملک کا پیسہ چوری کرنا' لوگوں سے وعدے کرکے ووٹ لینا' اور پھر ان کو بھلا دینا' طاقت کا غلط استعمال کرنا.... یہ سب چیزیں اس پندرہویں صدی کے ملاکہ میں فٹ نہیں بیٹھتیں۔"

"اوہ تالیہ!" وہ پیچھے ہوا اور بازوؤں کا تکیہ بنا کے نیم دراز انداز میں مخروطی شیڈ سے ٹیک لگا لی۔ تالیہ کو گردن موڑ کے اسے دیکھنا پڑا۔ وہ اوپر آسمان پہ نظر آتے تاروں کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

"یہ تو برے سیاستدان کرتے ہیں۔ میں تمہیں برا بننے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم راجہ مراد سے چابی حاصل کرسکتی ہو اگر تم اس کو اسی کے انداز میں ہینڈل کرو۔"

"اور ان کا انداز جانتے ہیں آپ؟ کل ایک آدمی کی گردن اڑا دی صرف عوام کو پیغام دینے کے لیے کہ ملک میں نیا بندا پارا آگیا ہے۔"

"ملک میں نئی شہزادی بھی تو آئی ہے۔ کیا شہزادی نے چند لوگ گرفتار کرنے کے علاوہ لوگوں کو کوئی پیغام دیا؟"

"میں طاقت کا اظہار کرنے کے لیے لوگوں کی گردنیں نہیں مار سکتی۔"

"گردنیں مارنا طاقت کے اظہار کا واحد طریقہ نہیں ہوتا۔ وہ برا ہے' تم اچھی ہو۔ تم اپنے طریقے سے اپنی طاقت کا اظہار کرو۔ طاقت کوئی ہموار زمین نہیں ہوتی۔ یا تو یہ اوپر جا رہی ہوتی ہے یا نیچے۔ تمہیں اس کو بڑھانا ہوگا۔"

"مگر کس طرح؟" وہ الجھن سے بولی۔ پھر چونکی۔ "آپ نے بگارایا ملایو پڑھی تھی۔ اس میں لکھا تھا کچھ ایسا کیا؟ کہ شہزادی تاشہ نے محل میں آتے ہی طاقت کا اظہار کیا تھا؟ کیا کیا تھا میں نے؟" وہ بے چین ہوگئی۔

"کیا تھا نہیں.... کرو گی۔ اب تم جو کرو گی وہ تاریخ بنے گا۔ اور ابھی وہ کتابوں میں بھی لکھا جائے گا۔ وہی جو میں نے پڑھا ہے یا تو وہ سچ ہے' یا جھوٹ۔ مگر میں یہ دیکھنا چاہوں گا کہ تم حقیقت میں کیا کرتی ہو۔ ہوسکتا ہے مورخین نے کتابوں میں سچ نہ لکھا ہو۔"

اس نے بددلی سے ابرو بھینچے۔ "یعنی آپ نہیں چاہتے کہ میں "اپنی" ہی نقل کروں۔"

"جو تم سمجھو۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر میں وہی کروں گی جو مجھے درست لگے گا۔ لیکن مجھے صرف ایک بات بتا دیں۔ شہزادی تاشہ کا انجام کیا ہوا تھا؟ عصرہ کہتی تھیں' اس کا انجام ٹریجک تھا۔ میں نے نہیں پڑھ رکھا۔ آپ نے تو پڑھا ہے نا۔"

وہ چند ثانیے کو اسے دیکھتا رہا' پھر گہری سانس لی۔ "کیا تمہارے بابا کے پاس چابی موجود ہے یا اس کو نئی بنانی پڑے گی؟" وہ بات ٹال گیا تھا۔ تالیہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ مت بتائیں۔ وقت خود ہی سب ظاہر کردے گا۔" پھر اس کا چہرہ دیکھ کے عجیب سے لہجے میں بولی۔ "آپ کو کسی چیز سے خوف کیوں نہیں آتا؟ کبھی مایوس کیوں نہیں ہوتے آپ؟"

وہ جو گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے بیٹھا تھا' اس بات پہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"میں نے زندگی میں بہت سی جنگیں لڑی ہیں۔ مجھے بھی سیٹ بیک ملتے ہیں مگر میں ایک دن کی بری باتوں کو صرف اس دن تک خود پہ طاری رکھتا ہوں۔ اگلی صبح میں نئی امید اور فریش ذہن کے ساتھ اٹھتا ہوں اور اپنے مقصد پہ فوکس کرتا ہوں۔"

"سب آپ جیسے نہیں بن سکتے۔"

"ظاہر ہے سب میرے جیسے نہیں بن سکتے۔ آسان تھوڑی ہے میرے جیسا بننا۔"

تالیہ اداسی سے مسکرا دی۔ پھر گردن گھما کے نیچے پھیلے احاطے کو دیکھا۔ یہاں سے احاطے کی صرف چاردیواری نظر آتی تھی۔ تب ہی وہ پہرے داروں کی نظروں سے محفوظ تھے۔

"میں اب چلتی ہوں۔ آپ نیچے اتر جائیں اور آرام کریں۔"

"اپنا خیال رکھنا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے سج سج قدم اٹھاتے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر لباس میں چھپایا۔ بٹوہ نکالا۔ گیلا بٹوہ اب سوکھ چکا تھا اور اس میں وان فاتح کے آئی ڈی کارڈ' کریڈٹ کارڈ' رقم اور پاپ کارن کے ٹکڑے اسی طرح رکھے تھے۔ وہ بٹوہ واپس کرنے آئی تھی مگر نہیں کرسکی۔ نہ جانے کیوں۔

چند ساعتوں بعد محل کے سبزہ زار پہ وہ خاموشی سے شریفہ کے ساتھ چل رہی تھی۔ دونوں نے چغے پہن رکھے تھے اور ٹوپیاں سروں پہ گرا رکھی تھیں۔ لائبریری کے سامنے وہ رکی اور چغے کی ٹوپی پیچھے گرائی تو پہرے دار اسے دیکھ کے چونکے۔ پھر ادب سے پیچھے ہٹ گئے۔

اندر فرش پہ کتابیں پھیلائے' چمڑے کو کاٹتا ہوا ایڈم بیٹھا تھا۔ چراغ اور قندیلیں روشن تھیں۔ وہ گال تلے ہاتھ رکھے ایک کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ ایک کتاب کی جلد چپکا کے اسے سوکھنے کے لیے سامنے رکھا تھا۔

آہٹ پہ وہ ہڑبڑا کے سیدھا ہوا۔ پھر جلدی سے سیدھا کھڑا ہوا۔

چغے والی شہزادی قریب آرہی تھی۔ ساتھ کوئی نہ تھا۔

"آپ کو معلوم ہے بے تالیہ.... اسکول میں ہمیں قدیم ملے میں لکھی چند کتابیں پڑھائی گئی تھیں۔ قدیم ملے بھی قدیم انگریزی کی طرح ہے۔" وہ کتاب ہاتھ میں لیے جوش سے بتانے لگا۔ تھکا ہوا لگ رہا تھا مگر جوش قابل دید تھا۔ "Chaucer کی کینٹربری ٹیلز چودھویں صدی میں لکھی گئی تھی اور پہلی نظر میں اس کی انگریزی بالکل سمجھ میں نہیں آتی مگر غور سے پڑھو تو زبان وہی ہے' صرف تلفظ اور ہجے مختلف ہیں۔ یہ قدیم ملے کی کتابیں میں تھوڑی بہت سمجھ سکتا ہوں کیونکہ صرف الفاظ کے ہجے زیادہ ہیں اور یہ لوگ ان کو مختلف طریقے سے ادا کرتے ہیں ورنہ زبان تقریباً وہی ہے۔"

"تم نے بگارایا ملایو پڑھی ہے؟ شہزادی تاشہ کی داستان؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"نہیں تو.... کبھی دل ہی نہیں چاہا۔"

"یعنی تمہیں نہیں معلوم کہ شہزادی تاشہ نے کون کون سے کارنامے سرانجام دیے تھے؟"

"نہیں بے تالیہ۔ مجھے نہیں معلوم۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔" پہلے وہ الجھا۔ پھر چونکا۔ "اوہ میں سمجھ گیا۔ آپ ہر دفعہ کی طرح اس امتحان میں بھی چیٹنگ کرکے پاس ہونا چاہتی ہیں' ہے نا۔ آپ اس کتاب سے آئیڈیاز چرانا چاہتی ہیں۔ سچ کہتے ہیں' چور چوری سے جائے' ہیرا پھیری سے نہ جائے۔"

"چور ہیرا پھیری سے جائے یا نہ جائے' یہ قیدی ضرور اپنے سر سے جائے گا۔" دانت جما کے سرد لہجے میں بولی تو ایڈم کا منہ بن گیا۔

"میں ملائیشیا ء کا ایک قانون پسند شہری ہوں۔ آپ جو سارا دن میرے اوپر ظلم ڈھاتی ہیں' ان کا حساب آپ کو ایک دن دینا ہوگا۔"

"کام پہ دھیان دو اور زیادہ دماغ خرچ مت کرو۔ کہیں ختم ہی نہ ہو جائے۔" اور پھر ایک برہم سا 'ہونہہ' کرکے وہ پلٹ گئی۔

وہ ماتھے پہ لکیریں ڈالے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

"اگر بے جا گمان کرنا گناہ نہ ہوتا تو میں ضرور سوچتا کہ کہیں بے تالیہ نے اصلی شہزادی تاشہ کو قید کرکے اس کی جگہ تو نہیں لے لی۔ ویسے ملائیشیاء کے قانون کے مطابق کسی دوسرے کی شناخت اپنا لینے پہ کون سی دفعہ لگتی ہے؟"

وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس بیٹھا اور چمڑے کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ ابھی اسے کافی سارا کام کرنا تھا۔

☆☆☆

صبح کی سفیدی محل کے میناروں سے ٹکرائی تو جامنی آسمان پہ تیرتے بادلوں کے نارنجی کنارے غائب ہونے لگے' یہاں تک کہ دودھیا پن سارے پہ چھا گیا اور آسمان خوب روشن ہوگیا۔

شہزادی تاشہ کی خواب گاہ میں سنگھار میز کے

سامنے کرسی پہ وہ بیٹھی تھی اور ٹیک لگائے' بے نیاز' مغرور نظروں سے آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ پیچھے کھڑی شریفہ اس کے بالوں میں نرمی سے ہاتھی دانت کا بنا کنگھا پھیر رہی تھی۔

ایک بازو اس نے پھیلا رکھا تھا جس میں ایک دوسری کنیز سونے کے کنگن چڑھا رہی تھی۔

"راجہ نے کہا ہے کہ شاہی اتالیق کو بلوایا جائے۔ وہ آپ کو مختلف فنون اور آداب کی تربیت دیں گے۔ اس کے علاوہ...."

تالیہ نے ابرو اٹھا کے برہمی سے عکس میں اپنے پیچھے کھڑے اسے دیکھا۔

"تاشہ کو سب آتا ہے۔ اسے کچھ بھی نیا سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مگر شہزادی' میری عرض سنیے۔ شہزادیوں کو شاہی آداب سیکھنے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔"

"میں پہلے ہی بہت با ادب اور سلیقہ مند ہوں۔ راجہ سے کہو میری فکر نہ کیا کریں۔"

شریفہ خاموش ہو گئی۔

تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی اور ایک تائی ژیان ہاتھ باندھے اندر داخل ہوا۔

"شہزادی یان سوفو آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

تالیہ چونکی۔ فوراً شریفہ کو دیکھا۔ پھر آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کا سنگھار مکمل ہو چکا تھا' لبوں پہ لپ اسٹک بھی لگی تھی اور آنکھوں میں کاجل بھی۔ مگر بال بنانے ابھی رہتے تھے۔

"شہزادی کو انتظار کرواؤ۔ مجھے ابھی لگے گی۔"

بے نیازی سے بولی اور واپس پیچھے ہو کے بیٹھ گئی۔ آئینے میں وہ اپنی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی جن میں یان سوفو کے ذکر کے بعد سے تپش سی بھر گئی تھی۔

وہ ظالم شہزادی جس نے الور سونگائی کے لوگوں پہ ظلم ڈھایا تھا.... اور نہ جانے کتنے لوگوں کو قید میں ڈالا تھا.... جس کی حد سے بڑھی حرکتوں پہ بھی سلطان اس کو ٹوکتا نہ تھا کیونکہ وہ چین کے بادشاہ کی بیٹی تھی اور سلطان کی محبوب منگیتر.... جس سے چند دن بعد سلطان کی شادی ہونا تھی.... وہ اس وقت ملاکہ کی سب سے طاقتور عورت تھی۔ سوائے راجہ مراد کے' اس کے مقابلے پہ کوئی نہ تھا۔

اس کی سازشیں وجہ بنی تھیں کہ تالیہ کا الور سونگائی اُجڑ گیا اور وہ وقت کا دروازہ پار کر گئی۔

اور آج وہ اس شہزادی سے ملنے جا رہی تھی۔

تالیہ نے آج گلابی زرتار لباس پہنا تھا۔ شوخ گلابی لہنگا سا قدموں کے نیچے سے فرش پہ جھاڑو دیتا تھا' اور قمیص گھٹنوں تک آتی تھی۔ دونوں کہنیوں پہ ریشمی دوپٹا پیچھے سے ڈال رکھا تھا جو لباس کے ساتھ ہی فرش کو چھوتا تھا۔ سنہری بال آدھے باندھے' وہ بالوں پہ تاج پہنے' باہر محل کے سبزہ زار کی روش پہ چلتی آ رہی تھی۔ دونوں کنیزیں اور خادم ایک قدم پیچھے تھے۔

باغ میں ایک جگہ چھوٹے چھوٹے درخت لگے تھے۔ ان کے ساتھ شہزادی یان سوفو کھڑی تھی۔ اس نے چینی طرز کی لمبی میکسی پہن رکھی تھی' اور بالوں کے جوڑے میں لمبی اسٹک اٹکی نظر آتی تھی۔ سیاہ بالوں والی دراز قد اور پرکشش شہزادی مسکرا کے دور سے اس کو آتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ جو کنیزیں اور خادم کھڑے تھے' وہ سب بھی چینی تھے۔

گلابی لباس والی تاشہ دونوں پہلوؤں سے لباس اٹھائے' قریب آئی تو اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔

"شہزادی۔" اس نے سر جھکا کے آداب کہا تو یان سوفو نے جواباً اپنا سر بھی جھکایا۔ "شہزادی!" پھر مسکرا کے اسے دیکھنے لگی۔

"ماشاء اللہ۔ راجہ مراد کی بیٹی تو میری سوچ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ آپ کو اس محل میں دیکھ کے بہت خوشی ہوئی' شہزادی تاشہ۔ مگر اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ تین ماہ سے ہم ملاکہ میں رہ رہے ہیں' مگر کسی نے ہم سے ذکر تک نہ کیا کہ سلطان کے پھوپھی زاد راجہ مراد کی کوئی بیٹی چین میں بھی رہتی تھی۔ ویسے چین کے کس شہر میں اتنے سال گزارے آپ نے؟"

تالیہ جبراً مسکرائی۔

"کسی ایک شہر میں گزارے ہوں تو بتاؤں۔ اتنے شہروں میں رہی ہوں کہ مجھے تو سارا چین اپنا ہی لگتا ہے۔"

یان سوفو کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔

"آپ کی بہن کی گمشدگی کا سن کے افسوس ہوا۔ کیا تالیہ ابھی تک نہیں ملی؟"

"تاشہ اور میں نے تالیہ کا معاملہ اللہ پہ چھوڑ دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ ضرور مل جائے گی۔"

آواز پہ وہ چونک کے بے اختیار گھومی۔ راجہ مراد روش پہ چلتا آ رہا تھا۔ ہاتھ کمر پہ باندھ رکھے تھے اور سپاٹ چہرے پہ سرد سی مسکراہٹ تھی۔ کندھوں پہ پہنی پوشاک قدموں تک آ رہی تھی۔

تالیہ کے تنے اعصاب قدرے ڈھیلے ہوئے۔ وہ اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا تو اسے مضبوط سہارے کا سا احساس ہوا۔ نہ جانے کیوں۔

"راجہ! آپ کو دیکھ کے اچھا لگا۔ کیا آپ نے میرا کام کر دیا؟ پوچھتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا' آپ کو زحمت بھی بہت دے رہی ہوں' مگر کام ضروری تھا۔" یان سوفو نرمی اور خفت سے بولی تھی۔ وہ خفت مصنوعی تھی یا شاید اس کا انداز ہی ایسا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے شہزادی۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔ جو سامان آپ کو درکار تھا وہ میں نے آپ کے محل بھجوا دیا ہے' اور ہاں.... آپ کا چور بھی پکڑا گیا ہے۔"

"آپ کا بہت شکریہ' راجہ!" وہ ممنون ہوئی۔ پھر تالیہ کا چہرہ دیکھا جو باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"میرے محل سے تھوڑا سا سونا چوری ہوا تھا۔ راجہ نے وعدہ کیا تھا کہ ان کے سپاہی چور کا سراغ لگا لیں گے۔ میرا ہی ایک ملے غلام تھا جو بھاگا ہوا تھا۔ اور بالآخر راجہ نے اس کو ڈھونڈ ہی نکالا۔"

تالیہ نے محض سر ہلا دیا۔ اس کے اعصاب تن رہے تھے۔ شہزادی اب پھر سے راجہ کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ شہد سے میٹھے لہجے' ممنون چہرے۔

کیا یہ دونوں دشمن نہیں تھے؟

"یہ رہا آپ کا مجرم!" چند سپاہی دور ایک شخص کو رسیوں میں باندھے لے کر جاتے نظر آ رہے تھے۔ غالباً وہ راجہ کے ساتھ ہی آئے تھے۔ راجہ نے اشارہ کیا تو وہ اس شخص کو وہیں لے آئے۔ اس کی آنکھوں پہ پٹی بندھی تھی اور ہاتھ پیر بھی زنجیر پا تھے۔

یان سوفو نے ایک محظوظ نظر اس پہ ڈالی۔ وہ اب سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"اس کی پٹی کھولو۔ میں چاہتی ہوں کہ سزا کے وقت یہ میری آنکھوں میں دیکھے۔"

"آپ اس کو ابھی سزا دینا چاہتی ہیں۔" راجہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

یان سوفو نے چمک کے اسے دیکھا۔ "کیا آپ نہ دیتے؟"

"میرا مطلب تھا' اس جگہ؟ باغ میں؟ خیر!" راجہ خاموش ہو گیا۔ سپاہیوں نے قیدی کی پٹی کھول دی۔ اس نے شہزادی کو دیکھا اور نظریں خفت سے جھکا لیں۔ تالیہ کو عجیب سا احساس ہوا۔

شہزادی نے ایک ہاتھ پھیلایا تو ایک سپاہی نے اس پہ تلوار رکھی۔ دوسرے سپاہی نے قیدی کا دایاں ہاتھ رسی سے نکال کے زور زبردستی سے سامنے کیا۔ تالیہ کا سانس تھم گیا۔

(یہ آدمی چور نہیں ہے۔ اگر چور ہوتا تو منت سماجت کرتا۔ یہ تو سزا کے لیے تیار ہے۔) اس نے چونک کے راجہ مراد کو دیکھا جو کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا' سنجیدگی اور خاموشی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

(یہ آدمی بابا نے پکڑا ہے۔ اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔ بابا نے اصل چور کو بچانے کے لیے اس کو سامنے کر دیا ہے۔) ایک سنسنی خیز لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی گئی۔

"اسلام میں جو چور کی سزا ہے' وہی میں' شہزادی یان سوفو' تمہیں دیتی ہوں۔" کہہ کے شہزادی نے مہارت سے تلوار بلند کی۔ چور نے آنکھیں سختی سے میچ

لیں۔ تلوار نیچے آئی اور اس کا ہاتھ کلائی سے کاٹ کے نیچے گرا گئی۔ خون کے چھینٹے سیدھے تالیہ کے اوپر آتے مگر وہ تیزی سے پیچھے ہوگئی۔ بے اختیار اس نے باپ کی کہنی کو مضبوطی سے پکڑلیا۔

وہ آدمی درد سے چلا رہا تھا۔ بازو سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔

یان سوفو نے تلوار واپس تھمادی اور مسکرا کے تالیہ کو دیکھا۔ وہ لوگ سپاہی کو لیے واپس مڑ گئے۔ اس کا خون یہاں وہاں گھاس پہ گرتا جا رہا تھا۔

''شکریہ بنداہارا۔ مجھے امید ہے آیندہ بھی آپ میرے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے میری مدد کرتے رہیں گے۔''

یہ کہہ کے شہزادی مڑ گئی۔ اس کا عملہ بھی ساتھ ہی پلٹ گیا۔ اور سبک رفتاری سے وہ روش پہ آگے بڑھتے گئے۔

تالیہ اسی طرح سن کھڑی تھی۔ مراد کی کہنی سے آستین اس نے سختی سے بھینچ رکھی تھی۔ آنکھیں دور جاتی یان سوفو پہ جمی تھیں۔

''بابا'' لب پھڑپھڑائے۔ مراد نے گردن موڑ کے غور سے اس کا سفید پڑتا چہرہ دیکھا۔

''شریفہ کہہ رہی تھی کہ آپ میرے لیے شاہی اتالیق بھجوانا چاہتے ہیں جو مجھے شاہی آداب کی تربیت دیں۔'' اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور نظریں وہیں جمی تھیں۔ ''آپ کل صبح اس کو میرے پاس بھجوادیں۔ میں شہزادیوں کی طرح رہنا' سیکھنا چاہتی ہوں۔''

راجہ مراد ہلکا سا مسکرایا۔ ایک ہاتھ سے تالیہ کا کندھا ذرا دبایا اور آگے بڑھ گیا۔ تالیہ کی بھنچی مٹھی سے اس کی کہنی پھسل گئی۔ مٹھی خالی رہ گئی۔ اور دور اسی نکتے پہ جمی نظریں ویسے ہی خالی تھیں۔

☆☆☆

قدیم کتب خانے میں قدرے اندھیرا تھا۔ کونے میں زمین پہ دوزانو بیٹھا ایڈم ایک چوکی پہ کاغذ پھیلائے' سیاہی میں قلم ڈبو ڈبو کے لکھ رہا تھا۔ چراغ چوکی پہ رکھا تھا اور اس کی پھڑپھڑاتی زرد روشنی صفحات کو روشن کیے ہوئے تھی۔

(میرا نام ایڈم بن محمد ہے اور میں ہمیشہ سے ایک مستقبل کے خوف کا شکار انسان رہا ہوں۔) وہ قدیم جاوی رسم الخط میں لکھ رہا تھا....

(میں اپنے اتوار' سوموار کے آنے کے خوف میں ضائع کردینے والا انسان ہوں۔ میں ہمیشہ کل کیا ہوگا اور میں یہ کیسے کروں گا' سوچنے والا انسان ہوں۔)

ابوالخیر کی حویلی کی رسوئی میں کھڑا بوڑھا باورچی سیخوں پہ گوشت کے ٹکڑے پر و رہا تھا' اور ساتھ کھڑے فاتح کو سمجھا رہا تھا۔ وہ پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے' غور سے اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہا تھا۔

(مستقبل کے خوف کے ساتھ ناکامی کا خوف بھی میرے اوپر ہمیشہ طاری رہا ہے۔ میں زندگی کا ہر باب شروع کرنے سے قبل یہ سوچتا ہوں کہ کیا کروں جو ہار سے بچ جاؤں؟)

محل کے برآمدے میں اتالیق چند خادموں کے ہمراہ کھڑا تھا' اور انگلیوں پہ لمحے شمار کر رہا تھا۔ جبکہ تالیہ سر پہ سیبوں کا تھال رکھے' آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سیدھی لکیر میں۔ چند قدم اٹھائے ہی تھے کہ توازن بگڑا۔ سارے سیب نیچے آگرے۔

(مگر وان فاتح کہتے ہیں کہ زندگی ان پہ مہربان ہوتی ہے جو یہ سوچ کے نیا باب شروع کرتے ہیں کہ ہمیں جیتنا کیسے ہے؟)

فاتح چولہے پہ چڑھے برتن میں بوتل سے مائع انڈیل رہا تھا.... آگ نے مائع کو چھوا' اور شعلہ سا بھڑکا۔ اس کے ہاتھ کو آگ کی لپٹ نے چھوا اور وہ کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹا.... جلن کا شدید احساس....

(میں ان ساری کتابی باتوں کو مانتا ہوں کہ ہاں' ہمیں ہمیشہ مثبت ہی سوچنا چاہیے وغیرہ وغیرہ مگر میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ مثبت سوچنے کا آغاز کیسے کیا جائے۔)

چھوٹی میز کے گرد وہ دونوں بیٹھے تھے۔ درمیان میں بڑے پیالے میں پانی رکھا تھا۔ اتالیق غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ بار بار پانی میں ہاتھ مارتی تھی۔ پانی اچھل کے باہر آگرتا۔ وہ بے بسی سے اس کو دیکھتی اور کندھے اچکاتی۔ (اس کا کیا فائدہ' استاد؟)

(میں بھی فاتح صاحب جیسا مثبت آدمی بننا چاہتا ہوں مگر میں کہاں سے شروع کروں؟)

فاتح جلے ہاتھ کے ساتھ گوندھے میدے کو بیل رہا تھا۔ روٹی بار بار ٹوٹ جاتی۔ وہ ضبط کر کے پھر سے شروع کرتا۔ پھر ایک دم اس نے روٹی اکٹھی کر کے مٹھی میں بھینچی اور دیوار پہ دے ماری۔ پھر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ چند لمحے گزرے اور اس نے گہری سانسیں لے کر خود کو نارمل کیا اور دوبارہ سے پیڑے بنانے لگا۔

(اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ پہلے میں اپنے اندر کے منفی پن کو نکالنے کی سعی کروں؟ مجھے سب سے پہلے کون سی چیز منفی ردعمل کی طرف دھکیلتی ہے؟ لوگوں کی باتیں۔ غصہ دلاتی' خوف دلاتی باتیں۔)

وہ مسہری پہ بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں ریشمی کپڑا تھا جس پہ سوئی سے وہ کچھ کاڑھ رہی تھی۔ اتالیق اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا' کمر پہ ہاتھ باندھے' جھک کے ٹانکا دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا تو تالیہ نے غصے سے کپڑا گول مول کر کے واپس پھینک دیا۔ اتالیق آگے بڑھا' جھک کے کپڑا اٹھایا اور ادب سے واپس شہزادی کو لا دیا۔ تالیہ نے روہانسی ہو کے اسے دیکھا اور تھام لیا۔

(انسان جلد باز بنایا گیا ہے۔ یعنی جلد ردعمل دینے والا۔ اس کا مطلب ہے ہم انسانوں کو اپنی اصلاح کرنا ہوگی۔ ہمیں ذرا ذرا سی بات پہ ردعمل دینے سے خود کو روکنا ہوگا۔)

وہ رسوئی میں کھڑا تھا۔ اور سامنے ڈھیروں پیالیاں رکھی تھیں۔ وہ چائے دان کو ہوا میں کئی فٹ بلند کیے' پیالیوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ قہوے کی دھار سی نیچے آتی اور ایک ایک کپ کو بھرنے لگتی۔ جہاں اس کا ہاتھ ڈھیلا ہوتا اور قہوہ باہر چھلکتا' وہیں ایک ہٹا کٹا پہرے دار زور سے چھڑی اس کی کمر پہ مارتا۔ وہ ضبط سے لمحے بھر کو آنکھیں میچتا' پھر دوبارہ سے گہری سانس لے کر چائے انڈیلتا....

(میں نے یہ سیکھا ہے کہ جب تک میں ہر ایک کی ہر بات کو دل سے لگاتا رہوں گا' تب تک میں اذیت میں رہوں گا۔ کسی دوسرے انسان کو صرف الفاظ سے میرا سکون چھیننے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔)

وہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی تھی اور ہاتھوں میں ستار اٹھا رکھا تھا۔ اس کے مختلف تاروں کو چھیڑتی وہ اسے بجانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتالیق کھڑا افسوس سے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ وہ دانت کچکچا کے مزید تیز تیز انگلیاں تاروں پہ رگڑنے لگی۔ انگلیوں کے پوروں سے خون نکلنے لگا۔

(اصل طاقت تو ٹھنڈے رہنے میں ہے۔ اصل طاقت ور لوگ وہی ہیں جو لوگوں کی ہر بات پہ یقین نہیں کر لیتے بلکہ اکثر باتوں سے درگزر کر جاتے ہیں اور ان کو بے جا سوچتے نہیں رہتے۔)

دو چولہوں پہ کڑاہیاں رکھی تھیں۔ وہ بیک وقت تیزی سے دونوں ہاتھوں سے ان میں چیزیں الٹ رہا تھا۔ پھر کڑاہی کے ہینڈل کو پکڑ کے اٹھا کے سبزیوں کو الٹا پلٹا۔ انداز میں مہارت اور چہرے پہ سنجیدگی تھی۔

دور بیٹھے بوڑھے باورچی نے محض نظر اٹھا کے اسے دیکھا' اور مسکرا کے جھک کے اپنا کام کرنے لگا۔

(اگر دوسروں کے منہ سے نکلے الفاظ ہمیں کنٹرول کرنے لگ جائیں تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم نے اپنی پوری ذات کا کنٹرول دوسروں کے ہاتھوں میں دے رکھا ہے۔ نہیں۔ اگر مجھے مثبت انسان بننا ہے تو مجھے پہلے قدم کے طور پہ اپنے ''موڈ'' کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں واپس لینا ہوگا۔)

وہ سر پہ ایک کتاب کے اوپر سیب رکھے' سفید چاک کی کھینچی لائن پہ سیدھ میں چل رہی تھی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اب پیر نہیں رپٹ رہا تھا۔ وہ بالکل سیدھی چل رہی تھی۔

(میں بطور انسان اکیلا ہی اس دنیا میں آیا تھا اور اکیلا ہی جاؤں گا۔ میرے دوست اور میرے گھر والے بھی ہر وقت میری پسند کی بات نہیں کہہ سکتے۔ میں دن میں بہت دفعہ بہت سی باتوں پہ دکھی ہوں گا' اور اس دکھ سے بچنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟)

ابوالخیر کی طویل ڈائننگ ٹیبل سجی تھی۔ اوپر فانوس جل رہا تھا۔ سربراہی کرسی پہ ابوالخیر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کھڑا' غلام چائے دان سے اس کی ننھی پیالی میں سُرعت سے قہوہ انڈیل رہا تھا۔ دھار برابر تھی۔ ایک قطرہ بھی باہر نہیں چھلکا تھا۔

(مثبت سوچ! مجھے یہ مثبت سوچ رکھنی ہے کہ جو بری بات یہ شخص میرے بارے میں منہ سے نکال رہا ہے' یہ اس کی رائے ہے اور جیسے اس کی زندگی کے بارے میں بہت سی دوسری آرا غلط ہو سکتی ہیں' ویسے ہی یہ بھی غلط ہے۔)

تالیہ اور اتالیق لکڑی کی میز کے دونوں سروں پہ بیٹھے تھے۔ اس نے زور سے پانی کے پیالے پہ ہاتھ مارا۔ پانی چھلکا۔ اتالیق نے دوبارہ کرنے کو کہا۔ اس نے دوبارہ سیدھا ہاتھ مارا مگر اتالیق نے جلدی سے پیالہ ہٹا لیا۔ اس کا ہاتھ میز پہ پوری قوت سے لگا۔ لکڑی کی میز تڑاخ سے تین ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ تالیہ کی آنکھیں حیرت اور استعجاب سے پھیل گئیں۔

(اور کسی کی غلط بات کے پیچھے صرف بے وقوف لوگ اپنا موڈ خراب کرتے ہیں۔)

اس کے سامنے tapestry (موٹا بُنا ہوا کپڑا جو آرائش کے لیے دیواروں پہ لٹکاتے ہیں) رکھی تھی اور وہ کھڑے کھڑے اس پہ مہارت سے سوئی سے ٹانکے کاڑھے جا رہی تھی۔ ایک پورٹریٹ سا نقش ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا کے رفتار تیز کرنے لگی۔

(میں یہ نہیں جانتا کہ کس طرح مجھے وان فاتح کی طرح ہمیشہ جیت کا سوچنا ہے یا مستقبل کے خوف سے نکل آنا ہے۔ میں واقعی نہیں جانتا مگر میرے خیال میں' زندگی کو جتنا اب تک میں سمجھا ہوں' اگر میں مثبت انسان بننا چاہتا ہوں تو مجھے سب سے پہلے اپنے موڈ' اپنی مسکراہٹ اور اپنے آنسوؤں کا اختیار دوسروں کی زبانوں سے واپس لینا ہوگا۔)

وہ سلائیوں کو ہاتھ میں پکڑے' باغیچے میں کرسی پہ بیٹھی' تیزی سے اون کے دھاگے کو بُنے جا رہی تھی۔ الٹا' سیدھا' اون کے گھر' ہر شے اس کے ہاتھوں میں بہت آسان ہوتی جا رہی تھی۔

(جب تک میں ہر آدمی کی رائے پہ دکھی ہوتا رہوں گا یا جواب میں اس پہ غصہ کرتا رہوں گا' میں بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔)

وہ چمٹے کی مدد سے بھنی ہوئی بوٹیاں اٹھا اٹھا کے طشتری میں رکھ رہا تھا۔ سارے باورچی خانے میں باربی کیو کا دھواں اور مہک پھیلی تھی۔ باورچی نے کلیجی کے ایک ٹکڑے کو منہ میں رکھا تو اس کے تاثرات خوشگوار ہو گئے لیکن پھر چہرہ سنجیدہ بنائے آگے بڑھ گیا۔

(میں یہ بھی نہیں جانتا کہ بڑا آدمی کون ہوتا ہے مگر اتنا ضرور معلوم ہے مجھے کہ سارے بڑے آدمی مثبت سوچ والے لوگ ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ایک بات مجھے اچھے سے معلوم ہو گئی ہے۔)

اتالیق کتاب اٹھائے اس سے کچھ پوچھ رہا تھا اور وہ سامنے کرسی پہ مودب بیٹھی' کتاب کو دیکھے بغیر مسکرا کے لفظ بہ لفظ سب سنائے جا رہی تھی۔

(انسان کو چھوٹا اس کی سوچ بناتی ہے۔ بڑی سوچ' اچھی سوچ اسے آزاد کرتی ہے۔)

وہ چھرا ہاتھ میں لیے لکڑی کے تختے پہ کھٹ کھٹ سرخ ہری سبزیاں کاٹ رہا تھا۔

(اگر میں اپنی سوچ کو آزاد کرنا سیکھ جاؤں' اور میں اپنے ہر قسم کے خوف کو دل سے نکال دوں' تو میں اتنا ہی ٹھنڈا اور آزاد انسان بن جاؤں گا جتنا فاتح صاحب ہیں۔ جتنے سارے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ ہاں میں ابھی سارے گر نہیں سیکھ پایا لیکن تھوڑی بہت زندگی کی حقیقت مجھے معلوم ہو رہی ہے۔)

تالیہ تیر کمان کو تانے فضا میں نشانہ باندھے' زور

سے کمان کھینچ رہی تھی۔ تیر فضا میں اڑتا ہوا سیدھا ایک پرندے کے اندر پیوست ہو گیا۔ اس نے مسکرا کے کمان نیچے کی۔ پرندہ گھائل ہو کے نیچے آن گرا۔

(اور جو ہمیں معلوم ہوتا ہے' وہ ہماری جان ہمیشہ بچاتا رہے گا)

ایڈم نے سیاہی میں ڈوبا قلم پرے رکھا اور اداس مسکراہٹ سے کاغذ اٹھا کے دیکھا۔ اس پہ سیاہی ابھی گیلی تھی۔ اس نے کاغذ کا کنارہ چراغ کے شعلے پہ سلگایا۔ آگ نے کاغذ کو پکڑ لیا اور وہ پھیلنے لگی۔ وہ اپنے الفاظ کو جلتے ہوئے دیکھنے لگا۔

چند ہی لمحوں میں اس کے الفاظ راکھ کا ڈھیر بن گئے۔

قدیم ملے میں لکھے خوبصورت' پختہ الفاظ۔

☆☆☆

(چار ہفتے بعد)

اس صبح سورج نکلتے ہی بادل ایسے چھائے کہ آسمان پھر سے سیاہ پڑنے لگا۔ سارے پہ چھاتا سا تن گیا اور ٹپ ٹپ بارش برسنے لگی۔

محل کے کتب خانے کی کھڑکی کے ساتھ کرسی میز پہ بیٹھے ایڈم نے کتاب سے سر اٹھا کے کھڑکی کے شیشے سے تڑ تڑ ٹکراتی بوندوں کو دیکھا اور پھر چہرہ موڑا۔ مناسب خوراک اور صاف لباس کے باعث وہ نارمل لگ رہا تھا۔

''کیا میں اب شہزادی تاشہ سے مل سکتا ہوں؟ چار ہفتے سے میں قید ہوں اور شہزادی اول روز کے بعد دوبارہ مجھ سے نہیں ملیں۔'' انداز شکایتی تھا مگر لہجہ صاف تھا۔

پیچھے کھڑے پہرے دار سپاہی نے بس ایک تیز نظر اس پہ ڈالی۔

''شہزادی آج کل اتالیق کے ساتھ مصروف ہیں۔ اور وہ ہر وقت قیدیوں سے ملاقات نہیں کرتیں۔ اس لیے اپنے کام سے کام رکھو۔''

ایڈم نے گہری سانس لے کر چہرہ واپس کتاب پہ جھکا دیا۔ اس کے ساتھ کے دونوں قیدیوں کو شہزادی کے فرمان کے مطابق رہا کر دیا گیا تھا۔ ایک وہ ہی رہ گیا تھا۔ مگر اس دوران وہ قدیم ملے بول' سمجھ اور لکھ لیتا تھا۔ وہ جدید ملے سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ پھر بہت سی کتابیں یہاں دستیاب تھیں اور کتابیں پڑھنے میں وہ ہمیشہ سے اچھا رہا تھا۔

کتب خانے سے دور محل کے ایک اونچے مینار میں بنی کھڑکی' شہزادی تاشہ کی خواب گاہ میں کھلتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کھڑکی پہ بھی بوندیں تڑاتڑ برسے جا رہی تھیں۔

اندر پلنگ پہ ٹیک لگائے تالیہ بیٹھی تھی۔ ریشمی لحاف سینے تک ڈالے' وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ بال کھلے تھے اور ہاتھوں میں کوئی کتاب پکڑ رکھی تھی۔ بار بار جمائی روکتی تھی۔ قریب شریفہ ہاتھ باندھے کھڑی بتا رہی تھی۔

''سلطان مرسل کو پیغام بھجوایا تھا کہ آپ ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ پچھلے چار ہفتوں میں کئی بار پیغام پہنچا چکے ہیں ہم مگر ملکہ یان سوفو منع کروا دیتی ہیں۔ آپ اپنے بابا سے کیوں نہیں کہتیں کہ وہ سلطان سے آپ کی ملاقات کروا دیں۔'' (یان سوفو کی سلطان سے شادی ہو چکی تھی اور اب وہ ملکہ بن کے سلطان کے محل میں منتقل ہو چکی تھی۔ تالیہ شادی پہ نہیں گئی تھی۔ ابھی وہ اتنے سارے لوگوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔)

''رہنے دو۔'' کتاب پڑھتے پڑھتے تالیہ نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ ''بابا کو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ کافی دن سے سلطان سے' ملنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ملکہ اس کے قاصد کو سلطان تک پہنچنے سے قبل ہی واپس بھیج دیتی تھی۔

''آپ اتالیق کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کے سوا سارا دن اس کمرے میں پڑی رہتی ہیں۔ آپ بیمار تو نہیں ہیں شہزادی؟ میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کیونکہ اتنے پُرتعیش کمرے اور ہر طرح کی اچھی

خوراک کے باوجود بھی آپ اداس نظر آتی ہیں۔"

ثالیہ نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ (کیونکہ یہاں زندگی بہت آسان ہے۔ یہ دنیا بہت مختلف ہے۔ یہاں کھانے کو بہت کچھ ہے۔ تلے ہوئے' بھنے ہوئے گوشت سے بھرپور کھانے۔ اتنی کیلوریز۔ اور پھر یہاں میں میلوں جاگنگ نہیں کر سکتی۔ یہاں جم نہیں ہے۔ یہاں پارٹیز نہیں ہیں۔ یہاں سوئمنگ نہیں کی جا سکتی۔ صرف ایک چیز ہے۔ ٹارگٹ۔ راجہ کی دسترس سے وہ چابی چرائی ہے مجھے۔ سارے پلان اسی کے گرد گھومتے ہیں۔)

سوچتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔ پھر احساس ہوا شریفہ کچھ کہہ رہی ہے وہ چونکی۔ "کیا؟"

"آپ کو ابوالخیر کی حویلی میں دلچسپی تھی نا شہزادی۔ آج شام ابوالخیر نے راجہ مراد کو اپنے ہاں دعوت پہ مدعو کیا ہے۔ سلطان مرسل اور ملکہ بھی وہاں ہوں گے۔"

"اچھا!! واقعی۔" وہ کتاب پرے پھینک کے ایک دم سیدھی ہوئی۔

("کھانے کی دعوت ہے۔ جانے کھانا کون بنا رہا ہوگا؟") دل اس خیال پہ زور سے دھڑکا۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ "تم میرا بہترین لباس اور زیور تیار کرو۔"

"آپ... آپ بھی جائیں گی دعوت میں؟"

"تاشہ کو کوئی روک کے دکھا سکتا ہے کیا؟" وہ شریفہ کو دیکھ کے مسکرائی تھی۔

☆☆☆

ابوالخیر کی حویلی کے احاطے میں بنی جیل شام ڈھلتے ہی بھرنے لگی تھی۔ قیدی غلاموں کو واپس لا کے اس میں بھرا جا رہا تھا۔ سارے دن کی مشقت کے بعد تھکے ہارے قیدی اندر آ کے نڈھال سے اِدھر اُدھر لڑھکنے لگے تھے۔

ایسے میں صرف وہی غلام باہر تھے جو احاطے کے دوسرے کاموں پہ مامور تھے یا جن کو حویلی کے اندر خدمت پہ رکھ لیا گیا تھا' جیسے فاتح رامزل جو باورچی خانے میں کام کر رہا تھا۔

وہ سر جھکائے کھڑا مچھلی کے قتلے بناتا نظر آتا تھا۔ ماتھے پہ مقامی لوگوں کی طرح پٹی باندھ رکھی تھی۔ سرمئی پاجامے کے اوپر کرتے کی آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ رنگت کافی جھلس گئی تھی۔ پہلے سے کمزور بھی لگ رہا تھا گو کہ اسے اچھی غذا ملتی تھی مگر وہ جو بہت مناسب ڈائٹ فوڈ کھانے کا عادی تھا' اسے یہ غذا اب کہیں جا کے بمشکل راس آئی تھی' ورنہ شروع شروع میں اکثر معدہ الٹنے کو آ جاتا تھا۔ مگر وہ تحمل سے برداشت کر لیتا تھا۔

ایک ساتھی باورچی ساتھ آ کے کھڑا ہوا اور چولہے پہ چڑھے پتیلے کا ڈھکن اتار کے دیکھنے لگا تو فاتح نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"کون آ رہا ہے جس کے لیے اتنا اہتمام کیا جا رہا ہے؟" وہ اب قدیم ملے کے چند الفاظ بول اور سمجھ لیتا تھا۔ ایڈم جیسی شستہ تو نہیں کر—— مگر اشاروں اور چند الفاظ سے بات سمجھا لیتا تھا۔

"سلطان مرسل... ملکہ یان سوفو... بنداہارا راجہ مراد..." دوسرا باورچی مہمانوں کے نام گنواتا گیا۔

فاتح کے سبزی کاٹتے ہاتھ دھیمے پڑے۔

"کیا بنداہارا کے ساتھ کوئی اور نہیں آئے گا؟" سر جھکائے سرسری سا پوچھا۔

"مثلاً کون؟" وہ دیگچے میں ڈوئی ہلا رہا تھا۔

"ملکہ ایک خاتون ہیں اور ابوالخیر کے گھر میں کوئی خاتون نہیں رہتی تو کیا ملکہ تنہا بیٹھیں گی؟ کس سے باتیں کریں گی؟" مزید سرسری سا پوچھا۔

"وہ تنہا کیوں ہوں گی۔ ان کے سب سے معزز قرابت دار کو جو مدعو کر رکھا ہے ابوالخیر نے۔"

"کون؟" وہ چونکا۔ غلام نے ڈھکن واپس رکھا اور ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈالی۔

"وہ جس کو ابوالخیر ہر چند دن بعد حویلی میں بلا لیتے ہیں۔ جو رات گئے تک یہاں بیٹھا ملکی امور پہ گفتگو کرتا ہے اور شطرنج کھیلتا ہے.... سن باؤ تائی ژیان۔ (تین نگینوں والا غلام۔)"

فاتح نے اتنی تیزی سے گاجر کا ٹکڑا کاٹا کہ چھنکنے

کی زوردار آواز آئی۔ فوراً سے چہرہ اٹھایا تو اس پہ مختلف رنگ تھے۔ جیسے وہ شاک میں ہو۔

"سن باؤ۔ (تین خزینے) تائی ژیان (غلام)؟" باورچی کو دیکھ کے دہرایا۔ "یعنی چینی بادشاہ کا تائی ژیان (مخنث غلام) جو ملکہ یان سوفو کے ساتھ چین سے آیا تھا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"وانگ لی۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

فاتح کا چہرہ یوں تھا گویا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ پھر وہ جبراً مسکرایا۔ "مجھے اس کو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کیا آج میں برتن لگا سکتا ہوں؟"

باورچی نے چونک کے اسے دیکھا' پھر فوراً دور کھڑے بوڑھے نگران کو۔ اس کا چہرہ جیسے دمک اٹھا تھا۔ "ہاں کیوں نہیں۔ تم سب سیکھ تو چکے ہو۔ میں تمہارے کمرے میں آج آرام کر لوں گا۔ تم نگران کو کہنا میری طبیعت خراب ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں تمہاری جگہ سنبھال لوں گا۔" وہ بدقت مسکرایا۔

"تو پھر یہ شوربہ تم ہی اندر لے جاؤ۔ وانگ لی کب کا آیا بیٹھا ہے۔ ابھی دوسرے مہمان نہیں آئے۔" دیگچے کی طرف اشارہ کر کے وہ غلام خوشی خوشی پیچھے ہٹ گیا۔ فاتح نے دور دوسرے ملازموں کے سر پہ کھڑے نگرانی کرتے بوڑھے کو دیکھا اور گہری سانس لی۔ چند منٹ اس کو راضی کرنے میں بھی لگنے تھے۔

جس لمحے وہ لکڑی کی طشتری میں چاندی کے پیالے میں شوربہ رکھے باورچی خانے سے نکلا تو سامنے طویل راہداری نظر آ رہی تھی۔ وان فاتح قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

(یہ سن باؤ وانگ لی کا مجسمہ ہے۔ سن باؤ... یعنی تین خزانے یا نگینے۔ بدھ مت کے تین نگینے ہوتے ہیں (تین عقائد)۔ بدھا۔ دھرما۔ سنگھا۔)

وہ طشتری اٹھائے راہداری میں آگے چلتا جا رہا تھا۔ بار بار لب کاٹتا۔ سر جھٹکتا۔

(وانگ لی ایک چینی غلام تھا۔ پندرہویں صدی میں وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کے بل بوتے پہ کم عمری میں ہی محل میں اعلا مقام حاصل کر لیتا ہے۔)

اس نے راہداری کا موڑ کاٹا اور بڑے سے دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وہاں ایک کونے میں شطرنج کی بساط میز پہ بچھی تھی اور اس کے گرد دو کرسیوں پہ آمنے سامنے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ ابوالخیر اور..... اور وانگ لی۔

(پھر وہ چینی بادشاہ کا خاص سفیر مقرر ہوتا ہے اور ایک بہت بڑا تاجر بن جاتا ہے۔)

فاتح ان کے قریب آیا اور ادب سے طشتری سے پیالہ نکال کے ابوالخیر کے سامنے رکھا۔

ابوالخیر مہندی رنگ کے لمبے بالوں والا آدمی تھا۔ جیسے ببر شیر کے بال اس کے چہرے کے دائیں بائیں پڑے ہوتے ہیں۔ اس کی ایک آنکھ تیر لگنے سے ضائع ہو چکی تھی مگر وہ اس کے اوپر کسی قسم کا پیچ نہیں پہنتا تھا۔ "ہیئت' مجروح' کانی آنکھ جو چھوٹے انگور کی طرح تھی' اسی طرح سب کو نظر آتی رہتی اور طبیعت عجیب کر دیتی۔ غلام دبے الفاظ میں اس کو 'کانا دجال' بھی کہتے تھے۔

(یہ گھر وانگ لی نے بنوایا تھا۔ میں چھوٹا تھا تو ایک دفعہ یہاں آیا تھا۔ تب کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ وانگ لی کا گھر ہے۔)

پھر وہ ترچھا ہوا اور دوسرا پیالہ وانگ لی کے سامنے رکھا اور پھر.... نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

(میں باپا کے ساتھ سامنے کسی دکان پہ بیٹھا تھا' پھر ادھر آ گیا۔ یہ مجسمہ.... تب یہ ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔ عصرہ نے بعد میں اس کو ٹھیک کروایا۔ یہ مجسمہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔)

وہ فربہ سا' لمبے سیدھے سیاہ بالوں والا ایک ادھیڑ عمر چینی شخص تھا۔ پیروں تک آتا چغہ پہن رکھا تھا اور ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھے سوچ میں ڈوبا شطرنج کی بساط کو دیکھ رہا تھا۔ سارے بال پتلی پتلی مینڈھیوں میں بندھے تھے۔ سر پہ چینی طرز کی ٹوپی تھی۔ پھولے گال اور چھوٹی آنکھیں۔ اور چہرے کی وہ سادگی۔ ہو بہو مجسمے سا۔

(عجیب کشش تھی اس مجسمے میں۔ اب بھی ہے۔

مانوسیت۔ اپنائیت.... جیسے کوئی دوست ہوتا ہے نا۔)

وانگ لی نے یکدم نظر اٹھا کے اس غلام کو دیکھا' اور ہلکا سا مسکرایا' پھر شوربے کا پیالہ اپنے آگے کرتے ہوئے دوبارہ توجہ شطرنج کی طرف مبذول کر لی۔

''تمہاری چال کا توڑ سوچ رہا ہوں' ابوالخیر۔ کیوں نا یہ پینے تک ہم کھیل کو روک دیں۔'' شوربے (سوپ) کو چمچ میں بھرتے ہوئے وہ بولا تھا۔ انداز میں ایک خوش مزاجی اور زندہ دلی تھی۔ جیسے وہ بات بہ بات ہنس دینے کا عادی ہو۔

(کس نے بنایا تھا یہ مجسمہ؟)

''میری چال کا توڑ کرنا اتنا آسان نہیں ہے' وانگ لی۔ میں وہاں سے آتا ہوں جہاں سے دوسروں کے فرشتوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔''

وان فاتح خالی طشتری اٹھائے پلٹ گیا۔ اب وہ قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔

(کس نے بنایا تھا یہ مجسمہ؟) سکندر نے اس کو روک کے پوچھا تھا۔

(شہزادی تاشہ نے۔) اس نے جواب دیا تھا۔

وہ اب واپس راہداری میں جا رہا تھا۔ باورچی خانہ چند گز کے فاصلے پہ تھا۔

(پھر تاشہ کا کیا ہوا؟)

(معلوم نہیں.... کہتے ہیں اس کی کہانی کا انجام دکھی تھا۔ مگر وہ اکثر سن باؤ کے گھر آیا کرتی تھی۔ اسی نے یہ مجسمہ بنایا تھا۔ کہتے ہیں سن باؤ سے اس کی دوستی تھی۔ یا معلوم نہیں کیا تھا جو وہ اس گھر میں اکثر آتی تھی۔)

باورچی خانے میں واپس آ کے وان فاتح نے طشتری (ٹرے) میز پہ دھری اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔

وقت بھی کیا عجیب چیز ہے۔ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ کب کسی کو کہاں لے جائے' کیا سے کیا بنا دے۔

☆☆☆

شام مزید گہری ہوئی اور مغرب اتر آئی تو رات کے کھانے کا وقت ہو چلا۔ ملاکہ میں لوگ سر شام ہی کھانا کھا کے سو جاتے تھے۔ پھر علی الصباح فجر کی پہلی اذان کے ساتھ اٹھتے اور کاموں میں بجت جاتے۔

ابوالخیر کے دیوان خانے میں آدھ درجن فانوس جگمگا رہے تھے۔ طویل کھانے کی میز پہ جگہ جگہ کینڈل برار رکھے تھے جن میں لمبی کھڑی موم بتیاں سارے کو روشن کر رہی تھیں۔ خوبصورت دیوان خانے میں وہ زرد روشنی خوابناک سا ماحول بنائے ہوئے تھی۔

سربراہی کرسی پہ سلطان مرسل بیٹھا تھا' جو بہت مرغوبیت سے بھنے ہرن کا گوشت کھا رہا تھا۔ سر پہ قیمتی پتھروں سے مزین ٹوپی اور نیچے سرخ زرتار چغہ پہنا تھا۔ وہ بمشکل چوبیس پچیس برس کا خوش شکل اور لاابالی سا نوجوان لگتا تھا۔ لمبے بال چوٹی میں بندھے تھے۔

اس کے دائیں ہاتھ پر ملکہ یان سوفو بیٹھی تھی۔ لاپروا' شوہر کی نسبت وہ سلجھے ہوئے انداز میں کھانا تناول کر رہی تھی اور بار بار چھوٹی آنکھوں سے اطراف کا جائزہ بھی لیتی تھی۔ سن باؤ وانگ لی' ملکہ کے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور وہ کھانا کھاتے ہوئے عادتاً مسکرا کے ذائقے کی تعریف بھی کر رہا تھا۔

سلطان کے بائیں ہاتھ پر موجود ابوالخیر بس خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا' البتہ وہ کچھ بے چین تھا۔ بار بار اپنے ساتھ بیٹھے مراد کو دیکھتا جو اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی تسلی دے دیتا۔ وہ سب سے زیادہ مطمئن' پرسکون اور پُراعتماد تھا۔ جیسے وہاں موجود ہر شخص کی سوچ سے واقف ہو۔ جب ابوالخیر کی نگاہوں کا اصرار بڑھتا گیا تو مراد نے مسکرا کے مرسل شاہ کو مخاطب کیا۔

''آقا.... جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا کہ محل کو اس وقت ایک نئے خزانچی کی ضرورت ہے۔ ایک قابل وزیر خزانہ۔ جو محل میں سارے ملک سے آئے گئے خراج اور محصول (ٹیکس) کا حساب رکھ سکے اور اسے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اچھے سے خرچ کر سکے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

''ہاں تو کرو نا۔'' دونوں کہنیاں میز پہ جمائے مرسل نے خوش دلی سے کہا اور پھر دانتوں سے ہرن کی بوٹی توڑی۔ ذائقہ منہ میں گھلا تو اس نے جیسے سر دھنا۔ ''ابوالخیر تم اتنا اچھا ہرن بنا سکتے ہو۔ تمہیں تو ہمارے شاہی باورچی خانے میں ہونا چاہیے۔ اتنا ہرن تو میری ماں بھی نہیں بنا سکتی۔'' ساتھ ہی وہ ہنسا۔

جواباً کوئی بھی نہ ہنسا۔ ملکہ نے آنکھیں میچ کے جیسے ضبط کیا اور ابوالخیر نے ایک شاکی نظر مراد پہ ڈالی۔ مراد نے جواباً پلکیں جھپکا کے اشارہ کیا۔ (دھیرج۔ صبر ٹھنڈا کر کے کھاؤ۔)

ابوالخیر نے سر جھٹکا اور مسکرا کے بولا۔ ''آقا کو پسند آیا' میری خوش نصیبی ہے۔''

وانگ لی نے محض ایک افسردہ نظر مرغوبیت سے کھانا کھاتے سلطان پہ ڈالی۔ اسے جیسے ملاکہ کی قسمت پہ افسوس ہوا تھا۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی تو ابوالخیر نے نظر اٹھائی۔ نیا غلام صراحی اندر لا رہا تھا۔ ابوالخیر نے سر کے خم سے اسے تائیدی اشارہ کیا تو فاتح اندر آیا' رواج کے مطابق جھک کے سلطان کو سلام کیا۔ باقی سب کھانے میں اور اپنی سوچ میں گم تھے' اور سلطان کھانے میں۔ ایسے میں صرف وانگ لی نے محسوس کیا' کہ اس توانا' وجیہہ مرد غلام نے سلطان کے سامنے سر جھکاتے ہوئے بھی گردن پوری نہیں جھکائی' اور اپنی آنکھیں مسلسل اٹھائے اس نے گہری نظروں سے سلطان کو بغور دیکھا تھا۔ پھر سیدھا کھڑا ہوا' نظریں جھکا دیں اور صراحی سے سلطان کی پیالی میں قہوہ انڈیلنے لگا۔

وانگ لی یوں ہی اس کو دیکھنے لگا۔ قہوے کی دھار پیالی میں گر رہی تھی۔ فاتح کی نظریں جھکی تھیں۔ ایک دم اس نے نظریں اٹھائیں اور وانگ لی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔

غلام کی نظروں میں ایسی چمک تھی.... ایسا ٹھنڈا آدمی لگا تھا وہ اس کو کہ وانگ لی نظر نہ جھکا سکا۔ پھر فاتح نے نظریں جھکا دیں اور اپنا کام کرنے لگا۔

یکدم دروازے پہ ہلچل مچی۔ ابوالخیر چونک کے اٹھا.... سلطان نے بھی چہرہ اٹھایا۔

''کیا کوئی اور بھی مدعو ہے' ابوالخیر۔'' مرسل شاہ کے چہرے کے زاویے بگڑے۔ باہر سے تیزی سے خادم اندر داخل ہوا اور ہاتھ باندھ کے سر جھکا کے اطلاع دی۔

''شہزادی تاشہ بنت مراد تشریف لائی ہیں۔''

میز پہ بیٹھے سب افراد چونکے تھے۔ اور سر جھکائے قہوہ انڈیلتا فاتح ہلکا سا مسکرایا تھا۔

One a socialite

Always a socialite!

(ایک سوشلائیٹ ہمیشہ سوشلائیٹ ہوتی ہے)

(وہ یقیناً پارٹیز کو مس کرتی ہے)

ابوالخیر نے فوراً اثبات میں سر کو جنبش دی۔ چوبداروں نے دیوان خانے کے دروازے کھولے۔ چوکھٹ پہ وہ کھڑی تھی۔

وہ دو پیالوں میں قہوہ انڈیل چکا تھا۔ صراحی سیدھی کر کے نظریں اٹھائیں تو وہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔

سنہرے بال گھونگریالے کر کے آگے ڈالے تھے۔ سر پہ حجاب کے نام پہ ریشمی سبز کپڑا تھا جو برائے نام تاج تلے اٹکا تھا اور پیچھے کمر پہ گرتا تھا۔ وہ پاؤں تک آتی لمبی کامدار میکسی پہنے ہوئے تھی۔ گھاس جیسے سبز رنگ کی میکسی اور موٹے موٹے زمرد سے جڑے زیورات۔ ایسا خوبصورت سبز رنگ کہ چہرہ دور سے دمکتا دکھائی دیتا تھا۔

اس نے قہوہ ڈالتے غلام کو ایک نظر بھی نہ دیکھا۔ بس خوبصورت آنکھیں سلطان پہ جمائے رکھیں۔

''دیر سے آنے کے لیے معذرت چاہتی ہوں' آقا۔ آج طبیعت ذرا سست تھی۔ تیاری میں وقت لگا۔'' سامنے آ کے پوری جھکی اور سیدھی ہوئی۔

سلطان مرسل نے پرندے کی بوٹی دانت سے توڑتے نظریں اٹھائیں تو ٹھٹھک گیا۔ وہ سجی سنوری لڑکی اب باقی سب کو باری باری تعظیم پیش کر رہی تھی۔ مرسل شاہ کی نظر اس سے ہٹنا بھول گئی۔

ملاکہ میں سنہرے بالوں والی عورت اس نے پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ وہ بھی اتنی حسین۔

''آپ کی آمد ہمارے لیے فخر کا باعث ہے شاہزادی۔'' ابوالخیر اٹھا اور سر کو تعظیم سے جھکایا۔ خادم نے سلطان کی سیدھ میں پڑی' میز کی دوسری سربراہی کرسی اس کے لیے کھینچی۔ وہ مسکرا کے لباس پھول کی طرح گرد پھیلاتی اس پہ بیٹھی تو سلطان ہنوز اسے تک رہا تھا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی مدعو ہیں' شہزادی!'' ملکہ بظاہر مسکرا کے بولی تو راجہ مراد ہلکا سا کھنکھارا۔

''ابوالخیر نے بمع اہل و عیال مدعو کیا تھا' اور تاشہ ہی میرا پورا خاندان ہے۔'' کہہ کے وہ گھونٹ گھونٹ قہوہ پینے لگا۔

''آپ کی بہن کے بارے میں سن کے افسوس ہوا۔'' سلطان مرسل نے زبان کھولی۔ پھر مدد طلب نظروں سے بائیں ہاتھ بیٹھی بیوی کو دیکھا۔

''تالیہ'' اس نے سرگوشی کی۔

سلطان نے فقرہ دہرایا۔ ''آپ کی بہن تالیہ کے بارے میں سن کے افسوس ہوا۔ کیا اس کی کوئی خیر خبر ملی؟''

صراحی میز پہ رکھ کے فاتح قدم قدم پیچھے ہٹا اور ابوالخیر اور مراد کی کرسیوں کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ اس سوال پہ اس نے بھی تالیہ کی طرف نگاہیں موڑ دیں۔

''آپ کا شکریہ' آقا۔'' اس کے چہرے پہ اداسی پھیلی۔ ''تالیہ ایسی کھوئی ہے کہ نہ جانے اب واپس آسکے گی بھی یا نہیں۔ خدا معلوم کیسے لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی ہو۔ برے برے خیال آتے ہیں مجھے۔ جیسے وہ کسی قید میں ہے اور بے بس ہے۔''

مراد نے گھونٹ بھرتے ہوئے غور سے اسے دیکھا' پھر خاموشی سے سلطان کو' جس نے افسوس سے سر ہلا دیا تھا۔

''اللہ پاک آپ کی مشکلات آسان کرے۔''

پھر ذرا کھنکھارا اور ٹوکری سے ایک پھل نکال کے اس میں دانت گھاڑے۔

(ملکہ اب پریشان نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ بار بار ناگواری سے تالیہ کو دیکھتی تھی جو کھانا شروع کر چکی تھی۔)

''چین کے کس شہر میں اتنے برس گزارے ہیں آپ نے؟''

''دارالحکومت میں کچھ عرصہ رہی ہوں۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''مگر اس سے زیادہ وقت ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزارا ہے۔ اس کا نام تو کچھ اور ہے مگر میں اس کو کوالالمپور کہتی تھی۔''

ہاتھ باندھے کھڑے فاتح نے ابرو اکٹھے کر کے ناد یبی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر وہ سوپ میں چمچ ہلاتی' سلطان کو دیکھ کے سادگی سے بتا رہی تھی۔ ''کوالالمپور۔ یعنی گدلے پانیوں کا سنگم۔''

''واہ۔ اور کیسا تھا آپ کا کوالالمپور؟'' وہ پھل کا ٹکڑا چباتے ہوئے محظوظ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے ایک نظر چھت اور اطراف پہ ڈالی۔

''اس دنیا سے بہت مختلف۔ ایک ترقی یافتہ خوبصورت شہر۔ جہاں ہر قسم کا عیش میسر تھا' مگر لوگ خالص نہیں تھے۔ وہ لالچ' اور طاقت کی ہوس کا شکار تھے۔

وہاں کچھ لوگ بھیس بدل کے دوسروں کی قیمتی چیزیں چرا لیتے تھے۔ رات کی تاریکی میں نقب لگا جاتے تھے۔ اور کچھ....'' وہ اداسی سے مسکرائی۔

''کچھ دن دہاڑے' بھیس بدلے بغیر سیاست کے نام پہ لوگوں سے ان کا اعتماد مانگتے' اور پھر حکومت کے بہانے خراج کے پیسوں کو بے نامی جائیدادوں میں چھپا دیتے ہیں۔ کھلم کھلا چوری۔

''وہاں ایسے ایسے ملازم بھی تھے جو ایک شخص کی چاکری کرتے مگر تنخواہ کسی اور سے لیتے....'' (فاتح بس اس کو دیکھ رہا تھا۔ باقی سب بھی سن رہے تھے اور وہ بولے جا رہی تھی۔)

''وہاں ایسی طاقتور بیویاں بھی تھیں جو بیٹھے بولوں سے دوسروں سے فائدے حاصل کرتیں اور پھر مکھی کی طرح ان کو نکال باہر کرتیں۔ (یان سوفو نے پہلو بدلا)

''وہاں ایسے بدعنوان عہدیدار بھی تھے جو عوام کے خراج کے پیسوں سے ڈھیروں جائیدادیں اور اونچے قلعے نما گھر بنا لیتے تھے۔ (ابوالخیر داڑھی کو نوچتے ہوئے سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔)

''وہاں ایسے حکمران بھی تھے جو اپنی ناک تک نہیں پونچھ سکتے تھے مگر ان کو حکومت کے لیے ان کے ماں یا باپ کی گدی پہ بٹھا دیا جاتا تھا۔

(وانگ لی نے فوراً سلطان کی طرف دیکھا مگر یہ باتیں اس بگڑے بادشاہ کی عقل سے اوپر کی تھیں۔)

''وہاں لوگوں کو خراج اور سودی معاشی نظام کے ذریعے ان دیکھی زنجیروں میں باندھا جاتا تھا۔ قوموں کی قومیں قرضے دے دے کے غلام بنا لی جاتی تھیں۔ دن رات وہ غلام قومیں مشقت کرتی تھیں مگر ان کی زنجیریں ان کو بھاگنے دوڑنے تک نہیں دیتی تھیں اور وہ اپنے حقوق سے بے خبر کام کرتے رہتے تھے۔

کوالالمپور' ملاکہ سے بہت مختلف تھا میرے آقا! وہاں عوام کے خراج کا پیسہ چوری کیا جا رہا تھا مگر عوام کو خبر ہی نہ تھی۔ مگر وہاں بھی ایک آدمی ایسا تھا جس سے مجھے امید تھی کہ وہ سب سے مختلف ہے۔''

اس نے نظریں موڑ دیں اور راجہ مراد کو دیکھا۔ وان فاتح اس کے پیچھے کھڑا تھا' مگر وہ مراد کو دیکھتی رہی۔ سب کی نگاہیں مراد کی طرف مڑیں۔

''مجھے یقین ہے کہ وہی ایک ایسا شخص ہے جو ملاکہ کے لوگوں کے مسائل حل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی بیٹی کو کھونے کا دکھ سہا ہے۔''

مراد ہلکا سا مسکرایا' اور سر قدرے جھکا لیا۔ تالیہ نے نظریں ذرا اوپر اٹھائیں۔ فاتح اسی کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہ ملی۔ کچھ نہ تھا ان نگاہوں میں۔

''وہ ایسا شخص ہے جو سیاست اور حکومت کے فن سے آشنا ہے۔ ایک وہی ہے جو مجھے لگتا تھا کہ اگر میرے ملک کا سب سے طاقتور عہدہ سنبھال لے ....وزیراعظم بن جائے ....یعنی کہ بنداہارا....تو میرے ملک کے اکثر مسائل حل ہو جائیں گے۔''

اس نے نظریں سلطان کی طرف موڑیں۔ ''اسی لیے میں واپس آئی ہوں تاکہ ان کو مضبوط کر سکوں۔ ان کی مدد کروں۔ ان کا دایاں بازو بن جاؤں۔ اور میں وہ سب کام کروں جن کے باعث وہ مجھ پہ فخر کریں۔''

پھر گردن فخر سے بلند کی۔ ''میں تاشہ بنتِ مراد ہوں۔ میں کوئی عام عورت نہیں ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ میرے اردگرد موجود مرد مجھے کوئی بے مصرف خوبصورت عورت سمجھ کے نظر انداز نہ کریں۔''

(بورنگ پریٹی وومن) کرسی کے پیچھے کھڑا غلام مسکرایا تھا۔

تالیہ اب کھانا نکالنے لگی۔ سلطان جو سحر زدہ سا پھل کھانا بھول گیا تھا' آخر میں اثبات میں سر ہلانے لگا اور دوبارہ سے پھل اٹھا لیا۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد راجہ مراد کھنکھارا۔

''آقا....شہزادی تاشہ اپنا تعارف کروا چکی ہیں۔ اس لیے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں' وزیر خزانہ کے لئے ابوالخیر سے بہتر نام کسی کا نہیں ہو سکتا۔ یہ میری ایک تجویز ہے۔''

یان سوفو نے اتنی گہری سانس بھری کہ وہ سب اسے دیکھنے لگے۔ وہ دانت پہ دانت جما کے مسکرائی۔

''آقا....مراد راجہ کی ذہانت اور وفاداری پہ کوئی شک کر بھی نہیں سکتا۔ ان کا تجویز کردہ نام بہت مناسب ہوگا' میں جانتی ہوں۔ لیکن ابوالخیر کے لیے اس عہدے سے زیادہ بہتر کام ہیں جہاں ان کی قابلیت کو ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس عہدے کو اگر سن باؤ کے حوالے کر دیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔''

''سن باؤ ملے نہیں ہیں' ایک چینی باشندے ہیں۔ معذرت کے ساتھ۔'' راجہ مراد نے فوراً ہاتھ اٹھا کے ملکہ کو ٹوکا۔ ''سن باؤ چینی حکومت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ان کے اوپر اگر ہم اپنے کاموں کی بھی ذمے داری ڈال دیں تو ہمارے دوست ملک چین کو یہ بات

اچھی نہیں لگے گی۔ ہمیں سن باؤ کو ایسے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہیے۔“

اپنے ذکر پہ سن باؤ نے سر جھکا دیا تھا۔ ابوالخیر البتہ دلچسپی سے داڑھی کے بال نوچتا دونوں اطراف کے دلائل سن رہا تھا۔

”بس بہت ہو گیا۔“ مرسل شاہ نے میز پہ ہاتھ مارا تو ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایک موم بتی نیچے گر گئی۔ فاتح فوراً آگے بڑھا اور موم بتی اٹھا کے سیدھی کھڑی کی۔ پھر واپس اپنی جگہ پہ جا کھڑا ہوا۔

”شہزادی تاشہ کا کیا خیال ہے‘ اس عہدے کا اہل کون ہے۔“

سلطان کے الفاظ تھے‘ یا کیا۔ راجہ مراد کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ملکہ کا رنگ اڑا۔ ابوالخیر نے برہمی سے بھنویں بھینچیں اور سن باؤ نے حیرت سے پہلے سلطان اور پھر تالیہ کو دیکھا۔

تالیہ نے رومال سے نزاکت سے لب تھپتھپائے اور پلکیں اٹھائیں۔ پھر مسکرا کے نرمی سے بولی۔

”آقا‘ مجھے اپنا خیال ظاہر کرنا ہے‘ تجویز پیش کرنی ہے یا مشورہ دینا ہے۔“

”مشورہ!“ مرسل نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

”اچھا مشورہ اگلے ہی لمحے نہیں دیا جا سکتا‘ آقا! آپ کے سامنے دو نام ہیں۔ ابوالخیر اور سن باؤ وانگ لی۔ مجھے ان دونوں شخصیات کا مطالعہ کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ اگر آقا مجھے صبح تک کا وقت دے دیں تو میں کل محل میں حاضر ہو کے خود آقا کو اپنا مشورہ سنا دوں گی۔ عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کی اپنی صوابدید پہ منحصر ہوگا۔ ایسے ٹھیک ہے نا‘ ملکہ!“ سادگی سے پلکیں جھپکا کے یان سوفو کو دیکھا۔

وہ خون کے گھونٹ بھر کے رہ گئی تھی۔ مگر جبراً مسکرائی۔ ”ہاں‘ یہ مناسب رہے گا۔“

”بالکل۔ کل صبح آپ مشاورت کے لیے تشریف لے آیئے گا شہزادی۔“ مرسل شاہ اس سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ ملکہ نے بے چینی پہلو بدلا۔ ابوالخیر نے خشمگیں نگاہوں سے مراد کو گھورا جس نے جواب میں ”دھیرج“ کا اشارہ کیا اور تالیہ کو دیکھا۔ مگر سنہرے بالوں والی شہزادی شاہی آداب کا خیال رکھے پوری توجہ سے قہوے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

وان فاتح ہاتھ باندھے کھڑا مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بنگارایا ملایو کے پہلے باب میں یہی لکھا تھا ......مگر آگے.....آگے کیا ہوگا؟ اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

☆☆☆

رات مزید سیاہ ہوئی تو ابوالخیر کی حویلی سے چلتے قافلے بنداہارا کے محل کے اندر پڑاؤ ڈالتے دکھائی دینے لگے۔ محل کے باہر بگھی رکی اور خادم نے دروازہ کھولا تو تالیہ پائے دان پہ پیر رکھتی‘ ایک شان سے نیچے اتری۔ لباس پہلوؤں سے اٹھایا اور قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ.....گھوڑے کی تیز ٹاپ قریب آتی سنائی دی۔

وہ رک کے دیکھنے لگی۔

مراد راجہ اپنا سیاہ چمک دار گھوڑا دوڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ ماتھے پہ سرخ پٹی بندھی تھی اور لمبے سیاہ بال ہوا سے پیچھے اڑ رہے تھے۔ وہ کھڑی رہی‘ یہاں تک کہ وہ اس کے قریب آیا اور گھوڑا روک لیا۔ پھر ہاتھ سے اشارہ کیا تو تمام غلام اور کنیزیں دور ہٹتے چلے گئے۔

”اچھا لگا تمہارا آنا۔ تمہاری باتیں بھی اچھی لگیں۔ سلطان بھی کافی متاثر ہوئے تم سے۔“ گھوڑے پہ بیٹھے بیٹھے اس نے نظریں جھکا کے نیچے کھڑی تالیہ کو دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ دونوں محل کی عمارت کے باہر کھڑے تھے۔

”سلطان؟ کون سلطان؟ وہ بچہ جس کو تخت پہ بٹھا دیا گیا ہے اور جو کھانے پینے اور موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے بعد فارغ اوقات میں آپ کے حکم کے مطابق شاہی حکم ناموں پہ مہر لگا دیتا ہے؟ وہ سلطان؟“

”وہ ہمارے آقا ہیں‘ تاشہ!“ مراد کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آواز میں گرج پیدا کی۔ تالیہ گردن

اٹھائے اس کو دیکھتی رہی۔ چند ثانیے کو قدیم ملاکہ کے اس محل کے سبزہ زار پہ خاموشی چھا گئی۔ آسمان پہ دمکتا چاند اور بادل بھی ٹھہر کے ان دونوں کو دیکھتے رہے۔

”Cesium-137“

مراد کے ابرو ناسمجھی اور کوفت سے بھنچے۔ ”کیا؟“

”آپ نے مجھ سے پوچھا تھا راجہ‘ کہ تمہاری اور ہماری دنیا میں کیا فرق ہے۔ صرف Cesium-137 کا فرق ہے۔ (سر اٹھا کے آسمان کو دیکھا اور ناک سے سانس اندر کھینچی۔) ابھی یہ عنصر ہوا میں شامل نہیں ہوا مگر.....(واپس چبھتی نظروں سے باپ کو دیکھا۔) آج سے پانچ سو سال بعد جب ایٹم بم پھٹے گا‘ اور دوسری جنگِ عظیم ہوگی تو یہ اس دنیا کی فضا میں شامل ہو جائے گا۔

کوالالمپور اور قدیم ملاکہ میں صرف Cesium-137 کا فرق ہے ورنہ خدا کی قسم‘ دنیا تب بھی ایسی ہی ہوگی اور دنیا اب بھی ویسی ہی ہے۔“ وہ ایک دم اتنی نفرت سے بولی کہ مراد اسے دیکھ کے رہ گیا۔

”وہی لالچ.....وہی حکومت ملتے ہی اپنی پسند کے آدمی اعلا عہدوں پہ لگانا...عوام کا خراج (ٹیکس) چوری کرنا...موروثی سیاست کرنا.....باپ کی جگہ پہ بغیر کوئی کامیابی حاصل کیے بگڑے بیٹے کو بٹھا دینا.....آپ بنداہارا نہیں ہیں‘ راجہ.....آپ صرف .....ایک...سیاستدان ہیں۔ اور یہ مت سمجھیں کہ میں سیاستدانوں سے پہلی دفعہ مل رہی ہوں۔“ آخر میں استہزائیہ مسکرا کے سر جھٹکا تو گھوڑے پہ بیٹھا مراد نیچے اترا۔ پیر رکاب سے آزاد کیے‘ گھوڑے کو تھپکا تو وہ ایک طرف بھاگ گیا‘ اور پھر وہ تالیہ کی طرف گھوما اور تحمل سے بولا۔

”ایسے ہی ہوتا ہے۔ طاقت ملتی ہے تو شروع شروع میں سب کے دماغ ایسے ہی اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ دھیرج‘ تاشہ۔ میرے ساتھ مل کے کام کرو۔ یان سوفو کے آدمی کو لگانے کا مطلب جانتی ہو وہ سارا خزانہ لوٹ کے چین بھجوا دے گا۔ اگر تمہیں سلطان نے یہ طاقت دے ہی دی ہے کہ تم اس فیصلے میں ان کی معاونت کر سکو تو تمہیں وہ فیصلہ کرنا چاہیے جو اس ملک کے لیے اچھا ہو۔ ہم ایک چینی عورت سے سلطان کی شادی تو کروا سکتے ہیں مگر سارا ملک بیچ کے اس کے حوالے نہیں کر سکتے۔“

تالیہ اس بات پہ مسکرا دی۔

”جیسا کہ میں نے کہا‘ میری دنیا اور آپ کی دنیا ایک سی ہے‘ راجہ۔ مگر ان دونوں دنیاؤں میں آج بھی بڑے مقاصد کے لیے جینے والے‘ نڈر اور اچھے لوگ موجود ہیں۔ یقین مانیے‘ آپ کی بیٹی اگر پہلے ان لوگوں میں سے نہیں تھی‘ تو اب ہوگی۔ اب میں سیدھ میں چلتی ہوں اور آپ کو راجہ کہہ کے پکارتی ہوں۔ آپ کو ایک اچھی بیٹی سے نہیں ڈرنا چاہیے‘ راجہ۔“ اس نے نرمی سے مسکرا کے باپ کی کہنی تھامی اور جیسے یقین دلایا۔

”اور ان دونوں دنیاؤں میں سارے برے حادثات اچھے لوگوں کے ساتھ ہی ہوتے ہیں‘ میری بیٹی۔“ وہ ہموار لہجے میں کہہ کے آگے بڑھ گیا۔

اس کی کہنی تالیہ کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔

”شریفہ۔“ اپنی خواب گاہ میں آتے ہی تالیہ نے کنیز کو اشارہ کیا تو وہ فوراً دروازہ بھیڑ کے چلی آئی۔

”جی شہزادی۔“

”آج رات تم بابا کے پاس جا کے ان کو یہ بتاؤ گی کہ میں ابوالخیر کے حق میں فیصلہ دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں میری باتوں سے یہی لگتا ہے‘ ٹھیک۔“

”لیکن شہزادی اگر آپ نے سن باؤ کے حق میں فیصلہ دے دیا تو وہ مجھ پہ شک کریں گے۔“ وہ متامل ہوئی۔

”اپنے وزن سے زیادہ بھاری ضرب نہ لگاؤ‘ شریفہ! جو کہا ہے‘ وہ کرو۔“

اس نے کنیز پہ ایک برہم نظر ڈالی تو اس نے جلدی سے سر تسلیم خم کر دیا۔ تالیہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اس کا دماغ مسلسل تانے بانے بن رہا تھا۔

☆☆☆

حویلی کے باورچی خانے کے باہر وہ ایک کھلی جگہ پہ بیٹھا تھا جہاں پانی کے ٹب بھرے رکھے تھے‘

اور وان فاتح دوسرے غلاموں کے ساتھ برتن دھو رہا تھا۔ غلام دبے لفظوں میں آج کے شاہی مہمانوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ جس نے جس کی جتنی جھلک دیکھی تھی، وہ اس کو بڑھا چڑھا کے بتا رہا تھا۔

"بندا ہارا کی حسین بیٹی" گفتگو کا مرکز تھی۔ وہ جاتے وقت ایک غلام کو موتیوں کی مالا دے گئی تھی اور ان موتیوں کی چمک باقی سب کی آنکھیں خیرہ اور دل مغموم کیے ہوئے تھی۔ فاتح مسکرا کے سر جھکائے برتن دھوتے ہوئے سنتا رہا۔

"جلدی اندر آؤ۔ تمہیں مہمان کے لیے شوربہ لے کر جانا ہے۔" بوڑھا باورچی عجلت میں اس کے سر پہ آ کے بولا تو فاتح نے چونک کے سر اٹھایا۔ گیلی پلیٹ رکھ دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"مہمان تو جا چکے ہیں۔"

"سن باؤ کو ابوالخیر نے شطرنج کی ایک بازی کے لیے روک لیا ہے۔ میں نے شوربہ تیار کر دیا ہے، تم لے جاؤ۔"

بوڑھا کچھ بے چینی سے کہہ رہا تھا۔ فاتح نے سر کو خم دیا اور ہاتھ پونچھتا اندر آیا۔ سامنے لکڑی کی میز پہ سنہری طشتری رکھی تھی جس میں سنہرا پیالہ سوپ سے لبالب بھرا پڑا تھا۔ ساتھ میں سنہرا چمچ بھی رکھا تھا۔ یہ کھانا ہضم کرنے کا شوربہ تھا جو رات گئے پیا جاتا تھا۔

"کیا ہم اس پیالے میں پیش کریں گے؟ اور ان چاندی کے برتنوں کا کیا؟"

"جو کہا ہے وہی کرو۔ لے جاؤ اسے۔" بوڑھے نے ہاتھ جھلا کے کہا۔

فاتح میز کے قریب آیا۔ سوپ میں سے تھوڑی بہت بھاپ نکل رہی تھی۔ وہ کافی دیر پہلے ڈالا گیا تھا۔ ابھی اس نے باورچی خانے میں ابوالخیر کی آواز سنی تھی۔ وہ باورچی سے کچھ کہنے آیا تھا۔ سوپ کا پیالہ بھی پیتل کا تھا۔ نہ کہ چاندی کا۔

طشتری اٹھاتے ہوئے اس کا ذہن تیزی سے چلنے لگا۔

بوڑھا باورچی اڑی رنگت کے ساتھ وہیں نیچے بیٹھ گیا اور سر جھکائے، آنکھیں میچ کے قرآنی آیات پڑھنے لگا۔ استغفار۔ توبہ۔ گلٹ۔

وان فاتح کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے آہستہ سے قدم آگے بڑھا دیے مگر ذہن اسی پیتل کے پیالے پہ اٹک گیا تھا۔

کیا ابوالخیر، سن باؤ کو زہر دینے جا رہا تھا؟

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ مگر اب وہ رک نہیں سکتا تھا۔ وہ غلام تھا۔ اسے آگے جانا تھا۔

(اس زمانے میں عموماً آرسینک (سنکھیا) بطور زہر استعمال ہوتا تھا۔ چاندی کے برتن میں آرسینک ملا کھانا اگر ڈالا جائے تو برتن سیاہ پڑ جاتا تھا اور زہر کی تشخیص ہو جاتی تھی۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کے باعث بھی امراء اور اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے کیونکہ چاندی جراثیموں کو بھی مار دیتی تھی اور زہر کے بارے میں خبردار بھی کر دیتی تھی۔)

دیوان خانے میں شام والی جگہ پہ اسٹول کے اردگرد وہ دونوں بیٹھے تھے۔ مگر اب پہلے جیسی شگفتگی ان کے مزاجوں میں نہ تھی۔ ابوالخیر خاموشی سے سن باؤ کا جائزہ لے رہا تھا جو منہ پہ دو انگلیاں رکھے غور سے بساط کو دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پہ ابوالخیر نے فاتح کو آتے دیکھا تو سر کو خم دیا۔ (ادھر رکھ دو۔)

چند گز کا فاصلہ میلوں کا ہو گیا تھا۔ وہ بھاری قدم اٹھاتا قریب آیا اور جھک کے اسٹول پہ طشتری رکھی، ایسے کہ اس کی پشت ابوالخیر کی طرف تھی اور چہرہ سن باؤ کی طرف۔ سن باؤ نے شطرنج سے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

فاتح نے سیدھے ہوتے ہوئے آنکھوں کو پہلے پیالے پہ جھکایا.... پھر سن باؤ کو دیکھا.... اور ہونٹوں کو "نو" میں گول کر کے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ (نہیں۔)

سن باؤ چونکا۔

فاتح نے نظریں جھکا دیں اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سن باؤ بظاہر شطرنج کو دیکھنے لگا مگر اس نے تھوک نگلا تھا۔ لمحے بھر کا کھیل جیسے برسوں کا احسان چڑھا گیا۔

(باقی آئندہ)

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتحِ زمانہ

کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی نازِ بے نیازی، وہی شانِ خسروانہ

ترے عشق کی کرامت، یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

تری دُوری و حضوری کا ہے عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت ابھی زندگی فسانہ

میں وہ صاف کیوں نہ کہہ دوں جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک! یہ شکستِ فاتحانہ

جگر مراد آبادی

بے پروا

جب آخری بار ہم ملے تھے
ٹھہر گئی تھی وہ شام جیسے
ہماری پلکوں پہ بوجھ بن کے
ہمارے سینے کا زخم بن کر
فضا پہ تھا جس کا تسلط
کہ سبز موسم دُھواں دُھواں تھا

لہو لہو آسماں تھا جب
جکڑ لیے تھے قدم زمیں نے
یں دلدلوں میں دھنسی ہوئی تھی

عجیب سماں تھا
ہوائیں سہمی ہوئی تھیں
ڈر کر گھنے درختوں میں چھپ رہی تھیں
تمام خوشبوئیں سانس روکے ہوئے کھڑی تھیں
سماعتیں انتظار میں تھیں
بہار موسم کو سامنا تھا خزاں کے دُکھ کا
سب ہی کو معلوم تھا، تمہارا جو فیصلہ تھا
بس ایک موہوم آس تھی جو ابھی باقی تھی
نظر تمہارا طواف کر کے لوٹتی تھی
مگر وہ تم تھے
جو بے نیازی سے روند کر کانپتی زمیں کو
جھٹک کے دامن چلے گئے تھے

شازیہ مفتی

جس دم دیکھا عکس تمہارا پانی میں
ڈوب گیا دریا کا کنارا پانی میں

ٹھہر ٹھہر کے دیکھ رہی ہیں موجیں بھی
چاند سا چہرہ نین ستارہ پانی میں

آنکھیں جیسے موسم بھیگی رہتی ہیں
ڈوب گیا ہر خواب ہمارا پانی میں

کس نے چاندنی راتوں کو رنگین کیا
کس نے ترا یہ عکس اُتارا پانی میں

رنگ دھنک کے پہن لیے سب موجوں نے
ڈوب گیا آنچل جو تمہارا پانی میں

لہروں نے افسوس کہ بے ترتیب کیا
ورنہ تھا کیا خوب نظارا پانی میں

نیّر ہم پھر لکھنے پر مجبور ہوئے
دیکھا ہے وہ آج نظارا پانی میں

نیّر رضادی

میلا ہے یا اُجلا سائیں
تن ہے تیرا حجرہ سائیں

جاگ رہی ہے رات لہو میں
ہجر ہے پہلا پہلا سائیں

کھلتا جاتا ہے رستے میں
خوابوں والا بستہ سائیں

تُو بھی نہیں ہے آئینے میں
میں بھی عکس تماشا سائیں

تُو دریا ہے، تیرے کنارے
خالی پڑا ہے پیالہ سائیں

میرا جاگنا، میرا سونا
تیرے کام نہ آیا سائیں

تجھ سے مل کے، تجھ سے بچھڑ کے
کیا کھویا، کیا پایا سائیں

نذیر قیصر



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔
"جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا۔ اور جو کسی مسلمان کی کوئی مصیبت دُور کرے گا تو اللہ قیامت کے روز قیامت کی مصیبتوں میں سے اس کی کوئی مصیبت دُور کرے گا۔"
(صحیح بخاری و مسلم)

قلم عکس ہے،

- ہر آدمی کی زندگی پر عقل کی نہیں تقدیر کی حکمرانی ہے۔
- اللہ تعالیٰ ہمارے مقدر میں اگر پتھریلے راستے لکھتا ہے تو ہمیں مضبوط جوتے بھی بخشتا ہے۔
- جو شخص وعدہ کرنے سے جتنا زیادہ گریز کرتا ہے وہ وعدے کا اتنا ہی زیادہ پابند ہوتا ہے۔
- یقین لہجے سے بولتا ہے، کردار میں نظر آتا ہے اور اندھیرے کو روشنی میں بدلتا ہے۔
- جو چیزیں پُراسرار ہوتی ہیں وہ پُرکشش بھی ہوتی ہیں۔
- محبتوں میں کیا جانے والا ضبط بہت کڑا ہوتا ہے۔
- انسان کا کردار اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس شے سے خوش ہوتا ہے۔
- اگر بازی با اصول طریقے سے جیتی جائے تو ہارنے والا بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔
- جو اچھے کو اچھا نہ جانے تو وہ بُرے کو بھی بُرا نہیں سمجھتا۔
- جس سے مل کر خوشی نہ ہو، اس سے بچھڑ کر غم بھی نہیں ہوتا۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران۔ گجرات

خوف،

عزبت کا مارا عیسٰی دبئی کمانے پہنچا تو قسمت مہربان رہی۔ الٹے سیدھے دو چار جھک پاٹ لگے تو پیسوں میں کھیلنے لگا۔ ترقی کرتے کرتے بڑا بزنس مین بنا اور دفتر آسمان کو چھوتی اونچی عمارت میں بنا لیا۔

بوڑھے باپ کی یاد آئی تو اسے وزٹ ویزا بھیج کر بلوایا۔ ڈرائیور کو نشانی بتا کر ایئر پورٹ لینے کے لیے بھیجا۔

باوردی ڈرائیور باپ کو چمچماتی لمبی کار میں ایئر پورٹ سے لایا۔ دفتر والی بلڈنگ میں لگی شیشے والی لفٹ میں سوار کرا کے اوپر لے جانے لگا۔ پہلی بار لفٹ میں سوار بوڑھا خوف زدہ ہو کر باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ ساتھ والی عمارتیں نیچے رہ گئیں۔ بادل بھی نیچے رہ گئے تو خوف سے نکلتی جان کے ساتھ ڈرتے ڈرتے ڈرائیور سے پوچھا۔
"اے پُترا! مینوں کیہڑے عیسٰی کول لے کے چلا ایں؟؟"

اقصیٰ ناصر۔ گلستان جوہر

وقت کا مجسمہ،

صدیاں گزریں ملک یونان کے ایک شہر کے درمیان ایک عجیب و غریب مجسمہ کھڑا تھا۔ اس عجیب و غریب مجسمے کی شکل و صورت کچھ اس طرح سے تھی کہ وہ سر سے بالکل گنجا تھا لیکن ماتھے پر بالوں کا ایک گچھا موجود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں

ایک تیز دھار والی قینچی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے دو لمبے پر تھے جو اس انداز سے ہوا میں لہراتے ہوئے دکھائی دیتے تھے جیسے مجسمہ اڑ رہا ہو۔
سنگ تراش نے اسے کچھ اس طرح بنایا تھا کہ لوگ بے اختیار اس کے متعلق پوچھتے ——— کہ اس کے پر کیوں ہیں؟
بتانے والا بتاتا۔ "یہ ہر وقت اڑتا رہتا ہے۔"
لوگ پوچھتے۔ "اس کا سارا سر گنجا اور ماتھے پر بال کیوں ہیں؟"
جواب ملتا۔ "اسے جو پکڑنا چاہتا ہے، صرف اور صرف سامنے سے پکڑ سکتا ہے۔"
لوگ پھر یہ سوال اٹھاتے۔ "اس کے پاس قینچی کیوں ہے؟"
تو آواز آتی۔ "جو اس سے غافل ہوتا ہے تو یہ اس کے بے دردی سے ٹکڑے کر دیتا ہے۔"
آخر میں لوگ حیرت زدہ ہو کر اس کا نام دریافت کرتے تو بتایا جاتا۔
"اس مجسمے کا نام وقت ہے۔ جس نے اس کی قدر کی وہ کامیاب ہو گیا۔ اور جس نے اس کا ضیاع کیا وہ خود ضائع ہو گیا۔"
عمرہ، اقرأ۔ کراچی

اصل بات،
حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں: "اللہ کو ماننا اصل بات نہیں کیونکہ اللہ پاک اپنی قدرت اور شان سے خود کو منوا لیتا ہے۔ اصل بات کو اللہ کو منا لینے میں ہے جس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔
ندا طارق، قفضہ۔ کراچی

یہ عالم شوق کا،
ایک مرتبہ گاؤں میں سیلاب آ گیا۔ ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لیے ہیلی کاپٹر کا استعمال کیا گیا۔ ایک سو پچاس کی آبادی والے گاؤں سے پانچ سو آدمیوں کو گن کر نکالا گیا۔ پھر ہیلی کاپٹر والے سرپنچ کے پاس گئے اور پوچھا۔
"آپ کے گاؤں کی کل آبادی ایک سو پچاس ہے اور میں اب تک پانچ سو آدمی نکال چکا ہوں۔ ایسا کیوں؟"
سرپنچ نے کہا۔ "سر! گاؤں والوں نے ہیلی کاپٹر پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ آپ ایک طرف سے نکالتے ہو، یہ دوسری طرف سے پھر آ جاتے ہیں۔ میں خود تیسری بار آیا ہوں۔"
کرن رحمٰن۔ فیصل آباد

قسمت،
کسی نے مجھ سے پوچھا۔ "قسمت کیا ہے؟"
میں نے جواب دیا۔ "دنیا میں سات براعظم دو سو چھ ممالک اور شاید بیالیس سو مذاہب۔ پھر بھی میں دین اسلام میں پیدا ہوا۔ یہ ہے قسمت۔"
نخبہ اکرم۔ گاؤں گولیکی

المناک،
کل اخبار میں ایک آرٹیکل آیا۔
"بیوی کو قابو میں کیسے رکھیں؟"
اتنی خوشی ہوئی ——— کہ دھڑکن بڑھ گئی۔ پورا آرٹیکل ایک ہی سانس میں پڑھ لیا۔ لکھا تھا۔
"صبح ٹہلنے جائیں۔ زیادہ ہری سبزیاں کھائیں۔ غصہ نہ کریں۔ کھانے پینے کا دھیان رکھیں۔ ریگولر چیک اپ کرائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔" بعد میں پھر سے عنوان پڑھا۔ دماغ خراب ہو گیا۔ لکھا تھا۔
"بی پی کو قابو میں کیسے رکھیں؟"
اب کل آنکھیں چیک کرانے جا رہا ہے۔

موتی مالا،
- جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے، وہ اپنی سلامتی کو محفوظ رکھتا ہے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)
- جو رئیس اپنی دولت میں عزیزوں کو شریک نہ کرے، اسے دریا میں غرق کر دو۔
(یحییٰ برمکیؒ)

- نہایت خوشحالی اور نہایت بدحالی دونوں برائی کی طرف لے جاتے ہیں۔
(بوعلی سینا)
- یہ خیال غلط ہے کہ وقت گزر جاتا ہے۔ وقت ٹھہرا رہتا ہے، ہم گزر جاتے ہیں۔
(مارکوپولو)
- دوستی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ دوست ایک دوسرے کی فضیلت کو پہچانیں۔
(ارسطو)
- پہاڑ سے گرا ہوا اٹھ سکتا ہے لیکن نظروں سے گرا ہوا نہیں اٹھ سکتا۔
(بوعلی قلندر)
- جس شخص کو اپنا رازدار بناتے ہو، اپنی آزادی اس کے ہاتھ میں دیتے ہو۔
(البن)
- اگر پہاڑوں کو سرکانے کی خواہش ہے تو پہلے ذروں کو سرکانا سیکھو۔
(البیرونی)
- روز محشر یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا پڑھا، بلکہ یہ کہ تم نے کیا کیا ہے۔
(ڈکنز)
- جھوٹ خواہ کسی لباس میں ہی کیوں نہ ہو، اس کی حقیقت بالآخر ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔
(جارج ہربرٹ)
- میں نے غفلت کی بنا پر ایک جھوٹ بولا اور تیس سال روحانی کرب میں مبتلا رہا۔
(جارج فریزر)
- دوسروں کو حقیر سمجھنا بے حد آسان ہے مگر خود کو حقیر سمجھنا بے حد مشکل ہے۔
(بوروف)

اقرأ عزیز۔ گاؤں دریا خان جلبانی

پریشانی،
کلب میں پریشان اور اداس بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھنے پر اپنے دوست کو بتایا۔
"میری بیوی میری کار لے کر کسی آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"
"کون تھا وہ آدمی؟" دوست نے پوچھا۔
"وہ کوئی بھی ہو، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔" وہ شخص بولا۔ "لیکن وہ تو میری نئی کار لے کر بھاگ گئی ہے۔"
فاکہہ سہیل۔ کراچی

نصیحت،
ایک بزرگ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے گزارش کی کہ کچھ نصیحت کیجیے۔ انہوں نے مجھ سے عجیب سوال کیا۔
"کبھی برتن دھوئے ہیں؟"
میں ان کے سوال پر حیران ہوا اور جواب دیا۔
"جی دھوئے ہیں۔"
پوچھنے لگے۔ "کیا سیکھا؟"
میں نے کہا۔ "اس میں سیکھنے والی کیا بات ہے؟"
وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ "برتن کو باہر سے کم اور اندر سے زیادہ دھونا پڑتا ہے۔"
نادیہ اشرف۔ راولپنڈی

پیاری باتیں،
- سب سے زیادہ عاجز و لاچار شخص وہ ہے جو دوست نہ بنا سکے اور اس سے زیادہ بدنصیب وہ ہے جو دوست بنا کر چھوڑ دے۔
- جو لوگ کسی بڑے مقصد کو لے کر خلوص و صداقت کے ساتھ والہانہ کام کرتے ہیں اور اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔
- جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے کہ سچ بول کر ہار جاؤ۔

نور عبدالسلام۔ نواب شاہ



خالدہ جیلانی



مسرت الطاف احمد ——— کراچی

عشق بھی کھیل ہے نصیبوں کا
خاک ہو جائیں، کیمیا ہو جائیں

ثمینہ اکرم ——— کراچی

بہت مسکرائے ہیں، بہت روئے ہیں
ہم اپنے میں یوں ہی تو نہیں کھوئے ہیں

ثوبیہ قطب ——— کراچی

نہیں یاد اتنی بڑی عمر میں
کسی رات آرام سے سوئے ہیں

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش تو ہے پر کیا کیجیے
ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اقراء عزیز ——— گاؤں دریا خان جلبانی

دونوں کو اپنی اپنی انائیں عزیز ہیں
لیکن کسی کو نظرِ ملامت کیے بغیر

ریحانہ چوہدری ——— مدوکے

کل بچھڑنا ہے تو پھر عہدِ وفا سوچ کے باندھ
ابھی آغازِ محبت ہے گیا کچھ بھی نہیں
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

کوثر خالد ——— جڑانوالہ

وہ چاند ہے تو عکس بھی پانی میں آئے گا
کردار خود ابھر کے کہانی میں آئے گا

نخبہ اکرم ——— گاؤں گوپیکی

تجھے دشمنوں کی خبر نہ تھی مجھے دوستوں کا پتا نہیں
تری داستاں کوئی اور تھی، مرا واقعہ کوئی اور ہے

ثناء عبدالقیوم ——— بنگہ چیمہ

جنگل کی ایک کہانی، وہی بھینٹ وہی قربانی
گونگی بہری ساری بھیڑیں چرواہوں کی جاگیریں ہیں

فاکہہ سہیل ——— کراچی

عرضِ غم کبھی اس کے روبرو بھی ہو جائے
شاعری تو ہوتی ہے، گفتگو بھی ہو جائے

سحر سہیل ——— کراچی

کرچیاں بن کے کبھی چبھتے بہت ہیں
زخم جو دِکھتے ہیں، دُکھتے بہت ہیں

نمرہ، اقراء ——— کراچی

مرے مہ و سال کی کہانی کی دوسری قسط اس طرح ہے
جنھوں نے رسوائیاں لکھی تھیں انھوں نے تنہائیاں لکھی ہیں

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

یوں بھی نہیں کہ شہر کو ویران چھوڑ آئے
لوگوں میں اس کے عشق کے امکان چھوڑ آئے
لہجے کے بعد بدلتا وہ نگاہ بھی
لیکن یہ راستہ بدل کر ہم اسے حیران چھوڑ آئے

نوال افضل گھمن ——— کراچی

چلو وہ عشق نہیں چاہنے کی عادت ہے
پر کیا کریں ہمیں ڈوبنے کی عادت ہے
وصال میں بھی وہی فراق کا عالم
کہ اس کو نیند مجھے رتجگے کی عادت ہے

شازیہ ہاشم میواتی ——— کھڈیاں قصور

تم گزرو اور وقت نہ ٹھہرے ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے
یاد آؤ اور درد نہ بھڑکے، ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے
ترکِ محبت کر لینے سے ترکِ محبت ہو بھی جائے
کوئی اسے جا کر سمجھائے ایسا تھوڑی ہو سکتا ہے

شازیہ گلزار ——— منڈی ٹاؤن بھکر

تماشائی تھے سننے والے نہ تھے
میں چپ ہو گیا گنگنانے کے بعد

امت الصبوح

جاوداں کی ڈائری

ریحانہ چودھری کی ڈائری سے

موجودہ حالات کی عکاسی کرتی عمار مسعود کی یہ غزل میری دوست نے مجھے بھیجی۔ قارئین کی نذر۔

کہاں کسی کی حمایت میں مارا جاؤں گا
میں کم شناس مروت میں مارا جاؤں گا

میں مارا جاؤں گا پہلے کسی فسانے میں
پھر اس کے بعد حقیقت میں مارا جاؤں گا

مجھے بتایا ہوا ہے مری چھٹی حس نے
میں اپنے عہدِ خلافت میں مارا جاؤں گا

مرا یہ خوں مرے دشمنوں کے سر ہو گا
میں دوستوں کی حراست میں مارا جاؤں گا

یہاں کہاں اُٹھانا مری ضرورت ہے
وگرنہ میں بھی شرافت میں مارا جاؤں گا

میں چپ رہا تو مجھے مار دے گا میرا ضمیر
گواہی دی تو عدالت میں مارا جاؤں گا

فراغ میرے لیے موت کی علامت ہے
میں اپنی پہلی فراغت میں مارا جاؤں گا

نہیں مروں گا کسی جنگ میں یہ سوچ لیا
میں اب کی بار محبت میں مارا جاؤں گا

سدرہ نوید کی ڈائری سے

انا محبت کی دشمن ہوتی ہے۔ رنگ، دھنک، خوشبو اور چاندنی کے مفہوم بدل جاتے ہیں۔ دلوں کے درمیان دُوریاں بچھ جاتی ہیں اور دلوں کی راہ ایک نہ ہونے سے زندگی اذیت میں بدل جاتی ہے۔

ناصرہ زبیری کی یہ غزل آپ کی نذر۔

محبتیں بھی کبھی اپنے درمیاں کتنی
بچھا گئی ہے انا ہم میں دُوریاں کتنی

یہ کیسا ضبط کا موسم بتایا آنکھوں نے
گزر گئی ہیں بِنا برسے بدلیاں کتنی

سحاب، رنگ، دھنک، چاندنی، گھٹا، خوشبو
وہ اِک خیال دکھاتا ہے جھلکیاں کتنی

کچھ احترام بھی ہے اور تھوڑی بندش بھی
وگرنہ چیخ میں ڈھل جائیں سسکیاں کتنی

یہی کہ ایک پُرانی روش کو بدلا تھا
اُٹھی ہیں ہم پہ زمانے کی انگلیاں کتنی

نئی جفا بھی گوارا مگر خبر تو ملے
کہ جھیلنی ہیں ہمیں اور سختیاں کتنی

دلوں کی راہ کے اک سمت میں نہ ہونے سے
بدل گئی ہیں اذیت میں شادیاں کتنی

بدن ہیں موم مگر حوصلہ چٹانوں سا
دکھائی دیں ہمیں ایسی بھی لڑکیاں کتنی

ثنا عبدالقیوم کی ڈائری سے

جون ایلیا کی شاعری زندگی کا سفرنامہ ہے۔ ان کی شاعری میں روانی اور سادگی کے ساتھ ساتھ احساس کی شدت اور زندگی کی اذیت کا احساس بھی ہے۔ ان کی یہ غزل ان ہی احساسات کی ترجمان ہے۔

لمحے لمحے کی نارسائی ہے
زندگی حالتِ جدائی ہے

مردِ میداں ہوں اپنی ذات کا میں
میں نے سب سے شکست کھائی ہے

جاں! یہ تیرے وصل کے ہنگام
تیری فرقت کہاں سے آئی ہے

اک عجب حال ہے کہ اب اس کو
یاد کرنا بھی بے وفائی ہے

اب یہ صورت ہے جانِ جاں کہ تجھے
بھولنے میں مری بھلائی ہے

خود کو بھولا ہوں، اس کو بھولا ہوں
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

ناہید اسماعیل کی ڈائری سے

لیاقت علی عاصم کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ کی نذر۔

بادل سا پھرا، دشت میں برسات نہیں کی
اس بار بھی پانی نے ملاقات نہیں کی

کیا پوچھتا اس سے کہ وہ قطرہ ہے کہ دریا
پیاسا تھا بہت، میں نے کوئی بات نہیں کی

سورج سے سوا چاند سے وحشت ہوئی مجھ کو
دن کاٹ دیا میں نے وہاں رات نہیں کی

کس دن تجھے ملنے کی دعا [illegible]
کس رات تجھے [illegible]

کس اسم میں میں نے تجھے معنی [illegible]
کس جسم میں محسوس تری ذات [illegible]

ثمینہ اکرم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ غزل [illegible] سب قارئین بہنوں کے لیے۔

ہم سلیقے جو وفا کے رکھتے ہیں
تو کو صلے بھی انتہا کے رکھتے ہیں

ہم کبھی بددعا نہیں دیتے
سلیقے دُعا کے رکھتے ہیں

ان کے دامن بھی جلتے دیکھے ہیں
وہ جو دامن بچا کے رکھتے ہیں

ہم نہیں ہیں شکست کے قابل
ہم سفینے جلا کے رکھتے ہیں

جس کو جانا ہے وہ چلا جائے
ہم دیے سب بجھا کے رکھتے ہیں

ہم بھی کتنے عجیب ہیں محسن
دردِ دل میں چھپا کے رکھتے ہیں

سرورق کی شخصیت

ماڈل	[illegible]
میک اپ	[illegible]
فوٹو گرافی	[illegible]





خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

ثوبیہ نور......کشن گڑھ

سردیاں اپنا بوریا بستر سمیٹ چکی ہیں، نتیجے میں ہم نے بھی بستر سمیٹ دیے ہیں۔ گرمیاں ابھی کچھ فاصلے پر ہیں، ہمارے ہاں اس موسم کو "ٹھنڈا" موسم کہا جاتا ہے۔ اس ٹھنڈے موسم کو مزید ٹھنڈک بخشنے کو تاحد نگاہ پھیلا سرسبز فرش ہے (گندم کی فصل) اس کے پیچھے سے جھانکتے سرسوں کے زرد پھول، بہار واقعی آنے کو ہے اور اس میٹھے موسم کو مزید میٹھا کرنے کو بیلنے بھی بس لگا ہی چاہتے ہیں کچھ وقت جاتا ہے کہ فضا میں گڑ کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی شامل ہو جائے گی۔ حالم کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوا موجودہ شور و ہنگامے سے ایک دفعہ تو دور نکل آئے ہیں۔ بلاشبہ یہ نمرہ احمد کا کمال ہے۔
آیو شمتی ایک بھٹکتی روح، جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں، اب تو لگتا ہے آمنہ جی خود بھی واقف نہیں۔
نیم کا پیڑ اپنی طرز کا منفرد افسانہ تھا، بہت خوب۔
فاخرہ جبیں کو ایک عرصے بعد دیکھ کر اچھا لگا، اب ثنا فٹ ان کا انٹرویو بھی کریں۔

☆ ثوبیہ کراچی میں بھی جو برائے نام سردی آئی تھی رخصت ہو چکی ہے لیکن سردی کے بعد یہاں بہار نہیں آتی بلکہ گرمی کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ فی الحال تو پنکھوں پر گزارہ ہے لیکن لگتا ہے کہ ایک دو دنوں میں اے سی کی ضرورت پڑ جائے گی۔
آیو شمتی کا راز بھی کھلنے کو ہے، جہاں اتنا انتظار کیا تھوڑا اور کر لیں۔

شاہانہ بلوچ......رینالہ خورد

فروری کا شمارہ بہت اچھا تھا، نمرہ احمد کا "حالم" خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ "کب ٹھہرے گا دل" فاخرہ جبیں بہت دنوں بعد آئیں۔ ہمارے رسالے ہیں بھی تعریف کے قابل، مگر آج سے زیادہ نوے کی دہائی میں بہتر تحریریں ہوتی تھیں۔ خیر یہ تو میری رائے ہے، بچیوں کو پسند ہیں آج کی رائٹرز تو ٹھیک ہے۔

☆ پیاری شاہانہ! مدت بعد آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ انسان کی زندگی کا سنہرا دور وہ ہوتا ہے جب وہ اپنی عمر کی ابتدائی منزلوں میں ہوتا ہے۔ اس وقت اسے ہر چیز نئی، پُراسرار اور دلچسپ محسوس ہوتی ہے۔ زندگی کے بارے میں وہ سنہرے خواب دیکھتا ہے، جوں جوں وقت آگے بڑھتا جاتا ہے۔ زندگی ہمارے سامنے عیاں ہوتی جاتی ہے، ہم زندگی کے ہر زاویے سے واقف ہوتے جاتے ہیں۔ تتلی کے پر جھڑ جاتے ہیں اور سنڈی سامنے آ جاتی ہے جو چیزیں بہت دلکش اور سہانی نظر آتی تھیں، اب پہلے جیسی نہیں لگتیں۔ آپ نوے کی دہائی کے پرچے پڑھیں، آپ کے تاثرات مختلف ہوں گے۔

اروی رباب......سیالکوٹ

بے پناہ مصروفیت کے باوجود خط لکھنے کی واحد وجہ نفسیاتی الجھنیں میں بہن "ع" کے خط کے متعلق تمام بہنوں کے تبصرے تھے اگر ایک راہ راست سے بھٹکی ہوئی لڑکی مشورہ کر رہی ہے تو بجائے اسے صحیح گائیڈ کرنے کے الٹا اس پر تنقید کرنا اور برا بھلا کہنا یہ کہاں کا انصاف ہے؟

آپ نے صحیح سمجھا پایا کہ غلطی پر مطعون وملعون کرنے کے بجائے سمجھانا چاہیے۔
اس ماہ کی ماڈل کچھ خاص پسند نہ آئی۔ ایک ناخن پر نیل پالش بھی رہ گئی بس بال اور آنکھیں اچھی تھیں۔ سب سے پہلے "دشت جنوں" پڑھا۔
دشت جنوں کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ آیو شمتی تو کوئی ہے نہیں۔
"اسے ہم فرض ہیں" پہلی قسط جتنی جان دار تھی، دوسری قسط اس قدر شان دار نہیں تھی۔
نمرہ کی ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے، بہترین ہوتی ہے۔ آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا؟ مکمل ناول میں فاخرہ جبیں کا "کب ٹھہرے گا درد دل" بے پناہ پسند آیا' یوں کہیں پسندیدگی کی آخری حدوں کو چھو گیا۔
نعیمہ ناز کا "جھوٹی" آخری جملہ "چل جھوٹی" ہنسی آ گئی، ساری زندگی سچ پر طعنے سننے والی کو آخر میں خطاب ملا بھی تو کیا؟ "محبت تیرے رنگ" بشریٰ احمد کا ناولٹ مزے دار تھا۔ عفان کا کردار پسند آیا۔ خانم کا "نعل" پسند نہ آیا۔
"جیون ساتھی" بھئی یہ تو راشدہ رفعت نے میرے شوہر کے متعلق تحریر کر دیا۔ ان کا بھی یہ ہی کہنا ہے تمہارے میکے میں دامادوں کی کوئی عزت نہیں۔ مجھے کوئی پروٹوکول نہیں ملتا، میری عزت نہیں۔ سچی بات ہے میں تو بڑی تنگ ہوں ان آفٹر آل ٹائپ دامادوں سے، فوراً میاں جی کو سنائی خوب شرمندہ ہوئے۔ بولے آج سے میں ماما کا بیٹا ہوں، مجھے نہیں پتا تھا تمہیں اتنی تکلیف ہوتی ہے۔ شکریہ راشدہ آپ نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ "عقل سے" میں روزینہ معرفت نے زبردست سبق دیا۔ ظالم ساس میں پری زاد نے میرے دل کی بات ہے کی ہے، میری ساس کا رویہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی ہے۔ ان کے معیار بیٹیوں اور بہوؤں کے لیے الگ ہیں، ہماری ماما تو بیٹیوں سے زیادہ بہوؤں کا خیال رکھتی ہیں۔
"رہے نام اللہ کا" سارہ عرفان نے باپ بیٹی کی محبت کو جیسے بیان کیا، رونا آ گیا۔ میرے بابا نے بھی یہ ہی سب میرے لیے کیا "نیم کا پیڑ" دیا۔ فاری نے بہترین سبق دیا۔
آئینہ میں عطیہ خالد نے اپنی تحریر میں ثابت کیا انسان برائی سے بچنے کا دل میں ارادہ کرے تو اب اسباب و مواقع خود بناتا ہے۔ اب کی دفعہ پورا شمارہ پسندیدگی کی سند لے گیا۔
موسم کے پکوان میں جیلی ڈیلائٹ بنا کر داد وصول کی۔ دراصل دودھ گھر کا ہوتا ہے وافر ہوتا ہے تو سویٹ ڈش بنائی بھی زیادہ جاتی ہے اور سب میٹھے کے شوقین بھی ہیں۔ خط آپ کے میں امامہ راشد کے خط نے بے پناہ خوشی دی کہ ہمارے رسالے انڈیا میں بھی اس قدر مقبول ہیں۔

☆ اروی جی! مکمل تبصرہ آپ نے کیا ہے، بہت شکریہ۔ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ہمیں یاد کیا، آپ قارئین کی حوصلہ افزائی کے باعث ہی ہم پرچے کا معیار قائم رکھے ہوئے ہیں۔
بہن "ع" پر قارئین کی تنقید کی وجہ یہ تھی کہ قارئین کو حیرت ہوئی کہ وہ قرآن اور تفسیر کا علم حاصل کر چکی ہیں۔ سب کچھ جانتی ہیں پھر بھی عدنان بھائی سے سوال پوچھ رہی ہیں۔ انہیں خود پتا ہونا چاہیے تھا کہ وہ غلط راستے پر جا رہی ہیں۔ بہرحال ہم نے اس کی وضاحت کر دی تھی اب اس بات کو ختم کر دینا چاہیے۔

طیبہ سعید......نواب چوک گوجرانوالہ

خواتین ڈائجسٹ جیسی سبق آموز کہانیاں اور کسی ڈائجسٹ میں نہیں ہوتیں۔ نمرہ احمد، آمنہ ریاض، سمیرا حمید، سائرہ رضا اور عمیرہ احمد بہت بہت ہی اچھا لکھتی ہیں۔ ہم جیسی عام لڑکیوں کو بھی ڈائجسٹ میں جگہ دے دیا کریں، اتنا پیارا سا دل ہے ہم لڑکیوں کا اور آپ توڑنے میں سیکنڈ بھی نہیں لگاتیں۔

☆ پیاری طیبہ! ہمیں اپنی قارئین کے پیارے سے دل کا بہت احساس ہے، اسی لیے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ان کے لیے اچھی کہانیوں کا انتخاب کریں۔ آپ اطمینان رکھیں قابل اشاعت ہوئی تو کہانی ضرور شائع ہوگی۔

ساجی رضوانہ......ٹنڈو آدم

ماڈل ذرا آنٹی ٹائپ لگی، نہ میک اپ اچھا نہ ڈریس...... ہاں آنکھیں پیاری تھیں۔ محترمہ تصویر بنواتے لاکٹ کو ذرا سیٹ کر لیتیں۔ آمنہ باجی پلیز پلیز آیو شمتی آنٹی کو سامنے لے بھی آئیں۔ ''حالم'' کے بارے میں کیا کہوں، بس مجھے ڈر ہے اتنی نامور رائٹر کا یہ ناول کہیں فلاپ نہ چلا جائے۔ نمرہ جان آپ...... ناممکن کو ممکن تو نہ بناؤ۔ اب آتے ہیں فاخرہ باجی کے پاس ہائے اوئے آئیں اور چھا گئیں' وہی پرانا انداز۔ فاخرہ جی، ویل ڈن جی۔ امامہ راشد کی بریکٹ میں لکھی ہوئی بات اندر تک دکھی کر گئی، باقی تمام افسانے اور سلسلے پسند آئے۔

☆ پیاری ساجی! کبھی کبھی جو ناممکن نظر آتا ہے، وہ ممکن ہو جاتا ہے۔ آپ آج سے دو سو سال پہلے کا تصور کریں کبھی سوچا تھا کہ ایک چھوٹی سی ڈبیہ سے آپ سات سمندر پار رو برو بیٹھ کر باتیں کریں گی۔ نمرہ احمد جو لکھ رہی ہیں' وہ وقت سے تھوڑا آگے کی چیز سمجھ کر پڑھیں لطف آئے گا۔

آیو شمتی کا راز کھلنے والا ہے، یہ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ راز کون کھولے گا۔

رانی گل......لکی مروت

میری ستائیس سالہ زندگی میں یہ پہلا خط ہے، میں خواتین ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں نے آٹھویں تک پڑھا ہے بقول ہمارے والد صاحب کے لڑکیوں کو زیادہ نہیں پڑھنا چاہیے ورنہ ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ ہم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں جہاں بچوں کو ملا کے کل 130 افراد ہیں۔ ہمارے خاندان میں لڑکوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ لڑکیوں پر موبائل، کمپیوٹر کی پابندی ہے۔ خاندان میں کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہو تو وہاں جاتے ہیں اور پھر اپنی اس چار دیواری میں بند ہو جاتے ہیں۔ ہمارے شہر میں نہ کوئی پارک ہے، نہ شاپنگ سینٹر ہے جہاں پر ہم عورتیں یا لڑکیاں جا سکیں۔ گھر سے نکلتے وقت سفید برقعہ ٹوپی والا اوڑھتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ مہینے میں دو بار آئے تو کتنا مزا آئے گا۔ خواتین ڈائجسٹ میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے، میں شادی شدہ ہوں، میرے شوہر انجینئر ہیں۔ میرے دو بچے ہیں بڑا بیٹا عثمان اور بیٹی عائشہ ہے، دونوں بچوں کو ایسی بیماری لاحق ہے جس کا علاج پورے پاکستان میں نہیں ہے۔ ہماری کزن میرج ہے اور ڈاکٹروں کے مطابق یہ بیماری کزن میرج کی وجہ سے ہے۔ اس ماحول اور بیمار بچوں کے ساتھ میں خواتین ڈائجسٹ پڑھنا نہیں بھولتی۔

☆ پیاری رانی! آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے بچوں کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ ان کو صحت و تندرستی عطا کرے۔ آپ مایوس نہ ہوں اللہ سے دعا کرتی رہیں، سائنس جس تیزی سے ترقی کر رہی ہے ممکن ہے جلد ان کی بیماری کا علاج دریافت ہو جائے۔

نجمہ منگل......اوستا محمد بلوچستان

حمد و نعت سے دل کو پر نور کرتے ہوئے آگے بڑھی۔ پیارے نبی ﷺ کی پیاری پیاری اور مقدس و پاکیزہ فرامین کی طرف جنہوں نے دل کو عجب روشنی اور محبت سے آشنا کیا۔ ''حالم اور دشت جنوں'' کی کسی بھی قسط نے ہمیں بور نہیں کیا۔ میں اور میری کزن ثمینہ جو کہانی پڑھتے ہیں، تبصرہ ضرور کرتے ہیں۔

☆ پیاری نجمہ! خواتین میں آپ کی شرکت سے دلی خوشی ہوئی، آپ کی تعریف نمرہ احمد اور آمنہ ریاض تک پہنچائی جا رہی ہے۔

مہدیہ ممتاز......اٹک، کینٹ

سلسلہ وار ناول ''حسن المآب اور'' بہت زبردست تھا، میری زندگی میں بھی ایک ایسا وقت آیا تھا کہ میں مسلمانوں سے بدظن ہو گئی اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا لیکن پھر میں نے ترجمہ و تفسیر اور حدیث کا مطالعہ کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے ذہن میں تبدیلی آئی ۔ ہمارے اردگرد بکثرت ایسے کردار موجود ہیں، جو صرف مذہب کے نام سے عشق کرتے ہیں لیکن کردار کی تاثیر سے محروم ہوتے ہیں۔

تیرے محسن خلق کی اک رمق بھی میری زندگی میں نہ مل سکی

میں اسی میں خوش ہوں کہ شہر کے در و بام کو تو سجا دیا

انٹرویو میں چائلڈ اسپیشلسٹ کو شامل کریں۔

☆ پیاری مہدیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرم کیا اور آپ کی صحیح راستے کی طرف رہنمائی کی۔ قرآن پاک کی تلاوت کا بہت ثواب ہے لیکن ترجمہ اور تفسیر پڑھنا بھی بہت ضروری ہے تاکہ ہم جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کلام نازل کیا اس کے معنی کیا ہیں۔

مہناز رانی، رمشا شہزادی......مانانوالہ ضلع شیخوپورہ

سب سے پہلے نفسیاتی و ازدواجی الجھنیں' بھائی عدنان کے مشورے پڑھے، ہمیں یہ سلسلہ بہت پسند ہے۔ عدنان بھائی تمام بہنوں کو بہت اچھے مشورے دیتے ہیں پھر کرن کرن روشنی کی طرف آئے۔ نبی پاک ﷺ کی پیاری پیاری احادیث سے جمعہ کی نماز کی فضیلت پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔ انٹرویو میں مدیحہ لطیف اور شاہین خان سے مل کر خوشی ہوئی۔ افسانے سارے بہت اچھے تھے۔ ''نیم کا پیڑ'' ''رہے نام اللہ کا'' اور ''جیون ساتھی'' یہ تینوں تو سرفہرست ہیں۔ ''محبت تیرے رنگ'' بشریٰ احمد کی تحریر بھی بہت زبردست تھی۔ ''جھوٹی'' نعیمہ ناز کی تحریر بھی بہت واضح اور تھوڑے سے کرداروں میں بہت کچھ سمجھا گئی۔ ''کب ٹھہرے گا دل'' فاخرہ جبیں نے بہت اچھے طریقے سے بہنوں کو پیغام دیا ہے' ''اسے ہم فرض کرتے ہیں'' صدف نثار کی کہانی بھی زبردست رہی۔

☆ مہناز رانی اور رمشا شہزادی! اگر آپ اپنا ایڈریس لکھ کر بھجوا دیں تو ہم آپ کو جنوری اور مارچ کے پرچے وی پی کر دیں گے۔ آپ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ آپ کو کس سال کے پرچے چاہئیں۔ ایڈریس لکھیں تو یہ وضاحت کریں۔ پرچے آپ کو گھر بیٹھے مل جائیں گے۔ آپ کو ڈاکیے کو 200 روپے دینا ہوں گے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فوزیہ......از بکی شاہ مردان، میانوالی

ٹائٹل گرل ذرا بڑی عمر کی لگی۔ ''کرن کرن روشنی'' نے ہمیشہ کی طرح ذہن و دل کی روشنی میں اضافہ کیا۔ البتہ روزینہ معرفت شاہ نے بہت کم جملوں میں بہت بڑا مسئلہ حل کرنے کا گر سکھایا ہے خواتین کو۔ نعیمہ ناز کا انداز کچھ کچھ سمیرا حمید سا ملتا جلتا لگتا ہے کبھی کبھی۔ بس ایک بات ضرور کہنی ہے ان سے کہ ان کے پاس خیالات کا بہت وسیع ذخیرہ ہے' انتہائی اچھوتے فقرے بھی ہیں ان کے پاس لیکن پلیز ان کو پہنچانے میں جلدی نہ کیا کریں کہ بندہ بار بار دقیق فقروں پر اٹک جائے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ ایک کہانی میں ایک دو نکتے ہی سوچنے کے لیے دیں تاکہ قاری بہت سارا غور کر سکے۔ پلیز مائنڈ مت کیجیے گا کیونکہ آپ کا لکھنا پسند آیا تب ہی اتنی تفصیل سے سوچا۔

فاخرہ جبین نے اگرچہ ایک پرانے موضوع کا چناؤ کیا لیکن اول تا آخر تحریر پر گرفت مضبوط رہی۔

ایک درخواست ہے آپ سے کہ خواتین میں اگر کسی عالم بلکہ عالمہ کی خدمات لی جائیں اور عورتیں اپنے سوالات اپنے مسائل کے جوابات جان سکیں۔

☆ پیاری فوزیہ! عالمہ والی تجویز اچھی ہے لیکن ہمارے ہاں اتنے مسلک اور فرقے ہیں کہ ہماری عالمہ کے جوابات بحث کا باعث بن جائیں گے۔ احادیث ہم انتہائی مستند حدیث کی کتابوں سے جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سارے لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے۔ ہمیں بار بار وضاحت کرنا پڑتی ہے جب کہ ہم حوالہ بھی دیتے ہیں' اس لیے اس سلسلہ کے لیے معذرت۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سحرش حسن......راولپنڈی

میں نے خواتین ڈائجسٹ سے بہت کچھ سیکھا ہے، زندگی کا قرینہ، دوسروں کی خوشی اور دکھ میں شامل ہونا۔

فروری کے اس شمارے میں فاخرہ جبین کی تحریر ''کب ٹھہرے گا درد دل'' بہت عمدہ تحریر تھی۔ بہت سبق آموز۔

صدف نثار کی تحریر ''اسے ہم فرض کرتے ہیں'' بہت بہترین کہانی تھی، پہلی قسط پڑھ کر ہی دوسری قسط کا انتظار رہا اور دوسری قسط سے جیسے ماسٹر پیس ثابت ہوئی۔ جیسے بہت تھکن میں گرما گرم چائے کا کپ مل جائے۔ ہلکے پھلکے

رومانس سے پُر اس کہانی میں تجسس بھی بہت تھا، سادہ الفاظ، سادہ انداز جو دل میں اتر گیا۔صدف جی! اتنی دل چھولینے والی کہانی لکھنے پر مبارک باد۔

☆ پیاری سحرش! خواتین ڈائجسٹ سے آپ نے اگر کچھ سیکھا ہے تو اس کا کریڈٹ ہم اپنی مصنفین کو دیتے ہیں۔محمود ریاض صاحب نے جو پالیسی متعین کی' ہم ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی اسی راہ پر گامزن رہے اور ہماری مصنفین نے بھی ہمارے ادارے کی پالیسی سے اتفاق کرتے ہوئے اسی کے مطابق لکھا۔ رب کریم نے کامیابی دی، اس کے ممنون ہیں۔صدف نثار کی یہ پہلی تحریر تھی، ہمیں توقع ہے کہ وہ مزید بہتر لکھیں گی۔آپ کی تعریف ان تک پہنچا رہے ہیں۔

سونیا یٰسین......خیرپور ٹامیوالی

ٹائٹل نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔

''حالم'' ونڈرفل، شہزادی تاشہ تالیہ نکلی ویری امیزنگ۔ فوزیہ (بہن) کہتی ہے واہ نمرہ احمد آپ نے ہمیں یہ تو بتادیا کہ ہاتھوں سے زیور کیسے اتارا جاتا ہے مگر اللہ جی میں بھی چوری کروں تو گناہ نمرہ احمد کے حالم کی تالیہ کے کھاتے میں ڈالیے گا (ہاہا)۔حالم میں تالیہ نے ہرن ذبح کیا، میں نے تو سنا تھا کہ عورتیں ذبح نہیں کرسکتیں۔ اس سے متعلق آپ اگر کوئی حدیث شائع کردیں تو بہتر ہے۔

اب آتے ہیں آمنہ ریاض کے ''دشت جنوں'' کی طرف۔کچھ زیادہ ہی طوالت پکڑ رہا ہے، یہ حقیقت پرمبنی ہے یہ بات ہضم نہیں ہوتی، پر کوشش جاری ہے (ہاہا)۔

صدف نثار کا ''اسے ہم فرض کرتے ہیں'' سیکنڈ کی نسبت فرسٹ ایپی سوڈ زیادہ متاثر کن تھی، پر پھر بھی اچھا رہا۔فاخرہ جبیں کا ناول ''کب ٹھہرے گا دل'' کافی سبق آموز ہے مگر بس ٹھیک لگا۔بشریٰ احمد کا ''محبت تیرے رنگ'' اُف......کیا کہانی ہے، میں تو اس کے سحر سے نکل ہی نہیں پارہی۔قاسم خان اور خانم بی بی اب بھی تو شادی کرسکتے ہیں، اب کیا تھا۔بس یہ ہی خلش باقی رہ گئی۔

سارہ عرفان کا افسانہ ''رہے نام اللہ کا'' بہت اچھا افسانہ ہے۔سائیکالوجسٹ مدیحہ لطیف سے ملاقات بہت اچھی لگی۔''ہمارے نام'' میں امامہ راشد فرام انڈیا کا خط پڑھ کے بہت خوشی ہوئی۔محبوب! (چھوٹا بھائی جو ساتویں کے ایگزام دے رہا ہے) کہتا ہے ڈائجسٹ کی اسٹوریز میں جب بھی مزا دوبالا ہونے لگتا ہے' باقی آئندہ ماہ منہ چڑاتا ہے۔نعیمہ (بہن) کے پاس شعاع اور خواتین کے پچھلے پانچ سالہ ڈائجسٹ کی تمام اقساط موجود ہیں۔

☆ آپ سب بہن بھائی خواتین ڈائجسٹ اتنے شوق سے پڑھتے ہیں، اسے سنبھال کر رکھتے ہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔آپ کا تفصیلی تبصرہ بھی بہت عمدہ ہے۔تالیہ کس طرح چورنی، آپ جان چکی ہیں اور یہ بھی کہ تالیہ خود بھی چوری کو اچھا نہیں سمجھتی، آپ فوزیہ کو بتادیں کہ اگر انہوں نے چوری کی تو گناہ ان کے سر ہوگا نمرہ احمد کے نہیں۔

عورتوں کے ذبح کرنے پر پابندی کی کوئی حدیث ہماری نظر سے نہیں گزری، آپ خود سوچیں' صحابیات نے میدان جنگ میں جاکر دشمنوں سے لڑائی میں حصہ لیا ہے تو ایک جانور کے ذبح کرنے پر کیوں پابندی ہوگی۔

زرتاشہ اکرم......راولپنڈی

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواتین اور شعاع ڈائجسٹ سے بہت کچھ سیکھا، ہر مہینے شعاع اور خواتین کا گھر آنا' پڑھنا، سیکھنا، تبصرے، انٹرویوز ایسے جیسے ایک رشتہ جڑ چکا ہے' ایسے میں میرا دل بھی کرتا ہے کہ اس میگزین کا حصہ بنوں۔اس کا اسلامک پورشن بہت اچھا ہے، اللہ آپ کی اتنی اچھی معلومات پہنچانے پر ثواب دے۔

علی جوش کا انٹرویو اچھا تھا، آمنہ ریاض کا ''دشت جنوں'' عمدہ جارہا ہے۔

صدف نثار کا ''اسے ہم فرض کرتے ہیں'' سسپنس سے پُر رہا۔نسوار خان کے بھیس میں ابراہیم کو دیکھ کر تو ہم خود حیرت کے سمندر میں غوطے کھاگئے۔ صدف نثار جی، پہلی کہانی ہی آپ نے اتنی شان دار لکھی ہے کہ میرا دل ہے کہ اس کہانی کو دوبارہ پڑھوں۔حیا بخاری کا ''نیم کا پیڑ'' بہترین تھا۔

فاخرہ جبین ایک بہت بڑا نام ہے لکھائی کی دنیا میں

''کب ٹھہرے گا دل'' اچھا لگا مگر تھیم بہت پرانی لگی۔

☆ خواتین کی محفل میں خوش آمدید، آپ ہمارے پرچے کا حصہ بنیں' ہمارے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہوگی۔

فاخرہ جبیں کی تحریر میں تھیم پرانی لگی لیکن آپ یہ تو دیکھیں کہ فاخرہ جبیں نے اس کو کتنے اثر انگیز اور دل کو چھولینے والے انداز میں پیش کیا۔

شازیہ ستار......ڈی جی خان

ہر ماہ کی طرح اس دفعہ بھی زبردست رہا شمارہ، پہلے صفحے پر آپ کی بات بھی بہت متاثر کرگئی کہ مادیت پرستی کی اپنی جگہ حقیقت ہے مگر ہمارے بھی کچھ فرائض ہیں جن کو ہم نے نبھانا ہے۔مدیحہ لطیف سے ملاقات اچھی رہی۔آمنہ ریاض کی ''دشت جنوں'' میں خوش نصیب کے نصیب مجھے لگتا ہے کہ اب کھلنے والے ہیں۔نعیمہ ناز کی ''جھوٹی'' مزہ دے گئی، جب پری معصوم ہر بات پر سچ بولتی تھی تو ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑتا تھا۔حیا بخاری کی ''نیم کا پیڑ'' بھی سبق دے گئی۔سارہ عرفان کی ''رہے نام اللہ کا'' بیٹی کا رات کو کھیتوں میں ہل چلانا ہمیں شرمندہ کرگیا کہ ہم تو گھر کے کاموں میں سستی کرجاتے ہیں۔فاخرہ جبیں کا ناول اس دفعہ بیسٹ رہا ''کب ٹھہرے گا درد دل''۔''آئینہ'' عطیہ خالد زبردست افسانہ رہا، بہت دکھ ہوا۔اب بات ہوجائے ہمارے من پسند ناول ''حالم'' کی فنٹاسٹک ناول، زبردست رہا اس دفعہ۔''مجھے بہت حیرت ہوئی' اکثر پڑھتی رہی کہ یہ ناول تو بھئی، حقیقت سے دور لگتا ہے، نہ مجھے بتاؤ ''ہیری پورٹر'' کو ''ڈریم لینڈ'' جیسی کہانیوں و ناول کو تو ہم بڑا ہی مشہور کردیتے ہیں' بڑا ڈنکا بجتا ہے ان کا تو ''حالم'' میں تو حقیقت بھی ہے تھوڑا سادہ ہمیں پرانے زمانے میں چابی کے ذریعے لے گئیں تو کیا برا ہوا۔

''پری زاد'' کی ظالم ساس، دو صفحوں کی اچھی تحریر۔آپی! میری کمزوری ہے کہ میں ناکامی پر بہت جلد مایوس ہوجاتی ہوں۔

☆ پیاری شازیہ! ایک بار ناکامی کا مطلب یہ نہیں کہ کامیابی کبھی نہیں مل سکتی۔انسان مسلسل کوشش کرتا رہے تو کامیاب ہوجاتا ہے۔اور ہم اتنے ظالم نہیں کہ اگر آپ کی کہانی میں کوئی کمی یا خامی ہو تو آپ کو ''تاحیات نااہل'' قرار دے دیں، آپ کوشش کرتی رہیں ان شاءاللہ ضرور کامیاب ہوں گی۔

فاطمہ عزیز......کراچی

بہت سالوں سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں' بیس سال پہلے جو معیار تھا اس میں تبدیلی آچکی ہے مثلاً پہلے قسط وار ناول کے اختتام پر لکھا ہوتا تھا، باقی آئندہ کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں (طائر لاہوتی......رفعت سراج) اور اب...... ایسی تحریریں جو مسکرانے پر مجبور کردیں کم ہیں پھر بھی معیار بہتر ہے۔ہر ماہ کے شمارے میں اسکیچز آرٹسٹ کی تقریباً پندرہ بیس ڈرائنگ کی تصاویر ہوتی ہیں جو فنکارانہ صلاحیت سے بھرپور ہوتی ہیں۔مثلاً شائستہ، جنید انصار، صبا اور بھی کئی نئے نام۔میری آپ سے درخواست ہے کہ باری باری ان تمام خاکہ نگاروں کے انٹرویو شائع کریں۔چند ناول اچھے ہیں، نمل، حالم، نمرہ احمد، امربیل...... عمیرہ احمد۔مجھے ذاتی طور پر سمیرا حمید کی تمام تحریریں پسند ہیں' خاص طور پر پورشے...... لاجواب تحریر۔

☆ فاطمہ بہن! کہتے ہیں ہر عشرہ کے بعد کوئی تبدیلی ضرور آتی ہے، خواتین ڈائجسٹ کو چار عشروں سے زیادہ وقت گزر چکا ہے اور نائن الیون کے بعد تو جیسے دنیا ہی بدل گئی ہے تو تبدیلی تو لازمی آنا ہے۔ہاں ایک بات ضرور کہیں گے' یہ خودستائی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ خواتین ڈائجسٹ آج بھی اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے تب ہی تو آپ جیسی ذہین قارئین آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔

طاہرہ یاسمین......ٹیکسلا کینٹ

غم دنیا میں اتنا الجھے ہیں کہ اپنے لیے فرصتیں ہی نہ رہیں۔ایک وقت تھا کہ کوئی سلسلہ ایسا نہ تھا جس میں ہم نہ ہوتے تھے۔سب بہنیں بہت اچھا لکھ رہی ہیں، سائرہ رضا جی آپ کی تو کیا بات ہے۔نمرہ احمد اور آمنہ ریاض آپ کے دم سے محفل میں رونق ہے۔صدف نثار ''اسے ہم فرض کرتے ہیں'' اچھا لگا۔ثریا شاہ کہروڑپکا آپ کیسی

ہیں؟ ہمیں بھول گئیں کیا؟ نمرہ اقراء مسرت الطاف دیگر سب دوستوں کو سلام۔

☆ طاہرہ یاسمین! دیر لگی آنے میں پر آئے تو...... آپ نے طویل مدت بعد یاد کیا۔ کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا ہی بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔

ثمینہ اکرم......لیاری، کراچی

اپنے خط میں قاری "ع" سے متعلق اپنے سخت لہجے اور لفظوں پر شرمندہ ہوں، بس غصے اور جذبات میں آکر نہ جانے کیا کچھ لکھ بیٹھی (بہت معذرت)۔ اس مرتبہ خواتین سالگرہ سروے کے سوالات ایک ماہ پہلے ہی دے دیے گئے، بہت دانش مندانہ فیصلہ...... (کوثر خالد جی! آپ کہاں غائب ہیں) امامہ راشد کا انڈیا سے خط مزہ دے گیا۔ آپ کے لیے خواتین ڈائجسٹ پاکستان سے جان کاری کا ذریعہ بنا، یہ جان کر خوشی ہوئی۔ صابرہ بیگم (چک شالی) کا خط پڑھ کر ایک انجانی خوشی ملی۔ کرن کرن روشنی میں جمعہ کے دن کی فضیلت، شکر گزاری اور سجدۂ شکر کی ترغیب، تہجد کی فضیلت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔ یقین جانیں کہ بے اختیار آپ لوگوں کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ مجھے یہ سلسلہ سارے شمارے کی جان لگتا ہے، شاہین رشید کی فیملی کیسے سانحہ سے گزری، یہ سن کر دل جیسے ایک دم مٹھی میں آگیا۔ مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ "اسے ہم فرض کرتے ہیں" صدف ثنار کا مکمل ناول کی دوسری قسط تو بہت دھماکے دار ثابت ہوئی، نمرہ احمد کا ناول "حالم" کچھ کچھ مزے دار ہوگیا ہے۔ میں نے اس دفعہ کہانی کو بہت ریلیکس موڈ میں پڑھا تو کہانی آسانی سے سمجھ میں آگئی۔

افسانوں میں "رہے نام اللہ کا" سارہ عرفان کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ دوسرے حیا بخاری کا افسانہ "نیم کا پیڑ" ایک بہترین پیغام قاری تک پہنچا۔ اس ماہ عدنان صاحب نے شبنم (راولپنڈی) اور نسیم بانو کو بہت اچھے اور سمجھ داری سے سمجھایا۔ اب میں بات کرنا چاہوں گی ایک اسپیشل ناولٹ کی، جو فاخرہ جبیں نے لکھا "کب ٹھہرے گا درد دل" اس کہانی کو پڑھ کر مجھے کتنا دکھ اور افسوس ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ اگر کسی ایک حوا کی بیٹی نے بھی، اس کہانی اور زرناب کے انجام کو پڑھ کر عبرت حاصل کی تو سمجھ لیں کہ فاخرہ جبیں آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگیا۔ راشدہ رفعت کا افسانہ "جیون ساتھی" ایک اچھی تحریر۔ آفٹر آل میں داماد ہوں، جیسے داماد ہر سسرال میں ایک دو تو ضرور پائے جاتے ہیں۔ صد شکر کہ میرے والدین کی چار کے چار داماد ہی حمزہ احمد جیسے ہیں، بالکل بیٹوں کی طرح۔ میرے صاحب (اکرم) بھی ہر دل عزیز داماد ہیں۔ عبدالمقیت (مومن) نے آپ کا بہت شکریہ ادا کیا ہے، آپ نے اسے (آمین) حافظ قرآن بننے کی مبارک باد دی ہے۔ (مگر طلحہ کو بہت شکوہ ہے کہ کبھی میں اس کا تذکرہ ڈائجسٹ میں نہیں کرتی)۔ طہٰ کو اچھے شعر پڑھنے کا بہت شوق ہے اس کی فرمائش کہ اشعار دو صفحات پر دیا کریں اور ساتھ شاعر کا نام بھی (اگر ہو سکے تو)۔

"ہمارے نام" دلچسپ خطوط، دلچسپ ترین۔ آج کل تقریباً ہر دوسرے خط میں لکھا ہوتا ہے کہ والدین یا بھائی ہمیں ڈائجسٹ پڑھنے نہیں دیتے۔ میری ایسے تمام گھر والوں سے گزارش ہے کہ یہ انٹرنیٹ کا دور ہے، گھر میں جب ہر فرد اپنا موبائل یوز کر رہا ہے اور بنا کسی پابندی کے لڑکیاں فیس بک، واٹس اپ، ٹوئٹر، اسنیپ چیٹ یوز کر رہی ہیں ایسے وقت میں ڈائجسٹ (صاف ستھرا معیاری رسالہ) پر پابندی لگانا کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ آپ ایک دن خود خواتین، شعاع اور کرن کا مطالعہ کریں اور پھر کھلے دل سے اپنی بچیوں کو یہ ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت دے دیں۔

☆ پیاری ثمینہ! جن گھروں میں والدین اور اولاد کے درمیان فاصلے ہوتے ہیں، وہاں اس قسم کی صورت حال ہوتی ہے۔ بچے والدین سے چھپ کر کام کرتے ہیں اور اکثر غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ والدین اگر اپنے بچوں کو اعتماد دیں تو وہ والدین سے چھپا کر کوئی کام نہ کریں۔

طہٰ کو پیار...... اس کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔

اقراالیاس......مرید کے، ضلع شیخوپورہ

خوب صورت سے میک اپ اور جیولری والی ماڈل بے حد پسند آئی، اوپر سے لمبے بال۔ سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" میں جمعہ کے دن غسل کے فضائل کے متعلق آگاہی ہوئی۔ انٹرویو میں سائیکالوجسٹ "مدیحہ لطیف" سے کافی معلومات ملی، کیوں کہ سائیکالوجی اور پالیٹکس میرے پسندیدہ سبجیکٹس رہے، جن میں سے انتخاب پالیٹکس کا کیا اور پلیز ہر ماہ اس طرح کی شخصیات سے ملاقات کرواتی رہا کریں۔ فرحین اظفر کے متعلق جان کر اچھا لگا۔ سلسلے وار ناولز کی جانب آئے تو سب سے پہلے "دشت جنوں" آمنہ ریاض صاحبہ مزید الجھن میں ڈالتی جا رہی ہیں۔ کہانی دلچسپ موڑ کی جانب جانے والی ہے اور یہ ماہ نور، شاہ میر اور باقی گھر والے اچانک کہاں غائب ہوگئے۔ "راشدہ رفعت" کا تو نام ہی کافی ہے، مجھے تو لگا آخر میں ثانیہ نے خود دونوں بہنوئیوں کا عہدہ سنبھال لیا ہو۔ "روزینہ معرفت نے کیا کمال کا پوائنٹ اٹھایا، اتنے زیادہ برتن جمع کر لینے کے بعد انہیں دھونا بلکہ ساتھ ساتھ رونا بھی، بہتر نہیں کہ اسی وقت دھو کر رکھ دیے جائیں۔ دوسروں کی آنکھوں کو پھیلا دینے والا ڈھیر تو جمع نہ ہو۔ امی کو افسانہ سنایا تو کافی متاثر ہوئیں "جھوٹی" نفسانفسی کے اس دور میں کبھی کبھار تو لوگ سچ کہنے والوں کی زبان تک کھینچ لینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ "اسے ہم فرض کرتے ہیں" صدف ثنار شاید نئی رائٹر ہیں۔ مگر بہت اچھا لکھا، ابراہیم خان کی پشتون لہجے میں بولی جانے والی اردو بے حد پسند آئی۔ افسانے بھی سب کے سب اچھے تھے۔ عطیہ خالد کے افسانے "آئینہ" میں اپنی جھلک نظر آئی۔

ج:۔ تفصیلی تبصرے کا شکریہ اقراء!

صفیہ مہر، عطیہ باسط......موضع کوٹلی

خواتین ڈائجسٹ کی بے شکر گزار ہوں میں کہ یہ مجھے باکردار، باحیا اور نیک لڑکی بننے میں معاون رہا۔ فروری کی ماڈل براؤن لباس میں ہمارے دل میں بھی جا رہی تھی، فہرست کے بعد کہنی سنی سے مستفید ہو کر سب سے پہلے آپو شمتی کے گھر فلک بوس جا پہنچے منفرد سی پریشانی ہمیں پریشان کر گئی۔ نیون ساتھی [illegible] کا سادہ مگر فہم و فراست والا قلم ہمیں از حد پسند [illegible] ناز جھوٹی میں تو ہماری کہانی لکھ ڈالی، پریسا کی طرح ہم نے بھی گھر والوں کو عاجز کر رکھا ہے۔ ہلکے پھیٹ اور [illegible] پھٹ اور پتا نہیں کیا کیا القاب ملتے ہیں، حیا بخاری نیم کا پیڑ ہر بار قلم کو اچھوتے اور سبق امور موضوع پر اٹھاتی ہیں۔ فاخرہ۔ باغات، موسم بارش کو چھوڑ کر یہ کیسا درد قلم میں لے آئیں۔ زرناب کے ساتھ جو ہوا حقیقت ہے، مگر پھر بھی دل دکھی ہوا اسے پڑھ کر۔ صدف ثنار کا دوسرا حصہ متاثر کرنے میں ناکام رہا، ایسے لگا جیسے رائٹر اسے کھینچ کر دوسرا حصہ بنانے پر تلی تھیں۔ عطیہ خالد کی کہانی میں بڑے پیار اور غور سے پڑھتی ہوں، موضوع بہترین تھا، ان کی وہ کہانی جس میں ہیرو تاجر تھا، بڑی پسند ہے مجھے، عطیہ اس طرح گھوڑے پر بیٹھا ہیرو والی کہانیاں مزید لکھیں۔ (پلیز)

ج:۔ پیاری صفیہ! آپ کا تبصرہ ہمیں تاخیر سے موصول ہوا۔ صفحات کی کمی کے باعث ہم پورا شائع نہیں کر سکے۔ سچ بولنا اچھی بات ہے، لیکن سچ بولنا آسان ہے، سچ سننا مشکل ہے، اب ذرا سوچیں پریسا نے نہایت آسانی سے کہہ دیا کہ ٹرک ڈرائیور ہے، کیا ترقی کرے گا۔ یہ سچ تھا، لیکن یہی سچ ہم اپنے بھائی یا بیٹے کے لیے نہیں سن سکتے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ رکشا چلاتا ہے۔ اس کے کام میں کیا ترقی ہوگی، لیکن ہمارے سامنے ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے ایک رکشے سے کام کا آغاز کیا اور اب ٹرانسپورٹر ہیں۔ اس لیے ایسا سچ بولنے سے گریز کریں جو کسی کی دل آزاری کا باعث ہو یا کسی پر تنقید کا پہلو نکلتا ہو۔



بقیہ علی مرتضیٰ

☆ہاہاہا......اور ہاہاہا......

58۔ کوئی کھانا جو کئی دن تک کھا سکتے ہیں؟

☆قورمہ۔

59۔ دوسرے ملک جا کر کیا بات نوٹ کرتے ہیں؟

☆وہاں کے لوگوں کا لائف اسٹائل۔

60۔ اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟

☆لیپ ٹاپ۔

61۔ کوکنگ سے آپ کا لگاؤ؟

☆بالکل بھی نہیں ہے۔

62۔ ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟

☆مولا جٹ کا۔

63۔ ایک کردار جو مقبول ہوا؟

☆"فرہاد" کا۔

64۔ ایک کردار جو کر کے پچھتائے؟

☆نہیں کوئی ایسا کردار نہیں ہے۔

65۔ آپ کی فیوچر پلاننگ؟

☆اپنا فلم پروڈکشن ہاؤس بنانے کا ارادہ ہے۔

66۔ عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟

☆ذہین۔

67۔ ایک خواب جو بار بار دیکھتے ہیں۔

☆فلم کرنے کا خواب بار بار دیکھتا ہوں۔

68۔ پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ۔

☆خیابان بخاری۔

69۔ آئینہ دیکھ کر سوچتے ہیں؟

☆اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ گزارہ ہو رہا ہے۔

70۔ شادی میں پسندیدہ رسم؟

☆مہندی۔

71۔ شادی میں گفٹ دینا چاہیے یا کیش؟

☆گفٹ دینا اچھا لگتا ہے۔

72۔ ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟

☆امی کے ہاتھ کا۔

73۔ بدلہ لیتے ہیں؟

☆نہیں۔

74۔ کب فریش ہوتے ہیں؟

☆کافی پی کے۔

75۔ اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے تجربے سے؟

☆دوسروں کے تجربے سے سیکھتا ہوں۔

76۔ دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ؟

☆والدین۔

77۔ لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟

☆نمبر مانگتے ہیں۔

78۔ آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟

☆دنیا بھر میں لاتعداد سینما ہاؤس بنا دوں۔

79۔ فلم، ماڈلنگ، کمرشلز کیے آپ نے؟

☆جی کر چکا ہوں۔

80۔ بچپن کا کوئی کھلونا آپ کے پاس ابھی تک ہے؟

☆کوئی نہیں ہے۔ سب توڑ دیے ہوں گے۔

81۔ آپ کو فوبیا ہے؟

☆نہیں......بالکل نہیں۔

82۔ کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟

☆ہاں جی......اندھی ہوتی ہے۔

83۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟

☆ہاں کر لیتا ہوں۔ کبھی جلدی کبھی دیر میں۔

84۔ دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟

☆دونوں کی......اور سننی بھی چاہیے۔

85۔ غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟

☆اسٹوپڈ۔

86۔ بستر پر لیٹتے ہی سو جاتے ہیں یا......؟

☆نہیں جی...... اچھا خاصا ٹائم لگ جاتا ہے۔

87۔ سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتے ہیں؟

☆دعا مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ سے۔ خیر و برکت کی، صحت و تندرستی کی۔

88۔ محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟

☆دونوں سے......مگر محنت پر زیادہ یقین ہے۔

89۔ ایک تہوار جو آپ کو پسند ہے؟

☆عیدالاضحیٰ۔

90۔ زندگی کب بری لگتی ہے؟

☆جب کام پورے نہ ہوں، خواب پورے نہ ہوں۔

91۔ مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟

☆اچھے لگتے ہیں۔ انجوائے کرتا ہوں۔

92۔ کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟

☆پاور بینک، موبائل اور والٹ۔

93۔ پاکستان کے لیے سوچتے ہیں؟

☆کہ ہمارے ملک میں تعلیم عام کیوں نہیں۔ میرے اختیار میں ہو تو لازمی کر دوں۔ تعلیم سب کو حاصل کرنا چاہیے۔

94۔ شوبز میں نہ ہوتے تو کہاں ہوتے؟

☆آرمی میں۔

95۔ ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟

☆اگر زوال آ گیا تو۔

96۔ کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟

☆کوئی بھی نہیں۔ شریف انسان ہوں۔

۔ آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟

☆اللہ کی رضا میں راضی ہو جاؤں گا۔

❁

خبریں وبریں

واصفہ سہیل



حسد

صائمہ اور سید نور کے درمیان جھگڑے اور علیحدگی سے متعلق خبریں کافی دنوں سے گردش کررہی تھیں۔ گزشتہ دنوں صائمہ نے اپنے متعلق پھیلائی گئی اس خبر کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ "میں اور شاہ جی انتہائی خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں اور ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے، اکثر اوقات ہمیں اپنے بارے میں اختلاف اور طلاق کی خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ کیوں کہ جو لوگ ہم سے حسد کرتے ہیں ان کی یہ ہی کوشش ہے (اس عمر میں بھلا کون حاسد؟) لیکن ان لوگوں کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی (کن لوگوں کی......نام تو بتائیں) کیوں کہ ہم دونوں کے درمیان دنیا کی کوئی طاقت اختلاف پیدا نہیں کرسکتی (اختلاف کا مطلب علیحدگی تو نہیں صائمہ!)۔

سید نور نے اس حوالے سے کہا کہ "جس ادارے نے ان کے حوالے سے یہ "جھوٹی" خبر دی ہے اگر اس نے اس خبر کی تردید نہ کی تو میں اس ادارے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کروں گا۔ ایسی بے بنیاد اور جھوٹی خبریں پھیلانے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی ضروری ہے

اور متعلقہ اداروں کو بھی اس سلسلے میں کارروائی کرنا چاہیے۔

آفر

ڈرامہ سیریل "رنگریزہ" میں اپنی بہترین اداکاری کے جوہر دکھانے کے بعد سجل علی اب دوبارہ سلور اسکرین پر جگمگانا چاہتی ہیں۔ سجل علی کا کہنا ہے کہ ٹی وی ڈراموں میں حقیقت کے قریب کردار نبھانے پر لوگوں سے پیار ملتا ہے (اور فلموں میں......؟) اور لوگ اپنی فیملی کے ساتھ تصویر لینا چاہتے ہیں آٹوگراف (ہائیں سیلفی کے زمانے میں آٹوگراف؟) لینا چاہتے ہیں۔ ایک فنکار کی کامیابی کا اصل ایوارڈ لوگوں کا پیار ہی ہوتا ہے (پھر فنکاروں کو ایوارڈ نہ ملنے پر ناقدری کا شکوہ ہوتا ہے سجل) پھر وہ چاہے فلم میں



کام کر کے ملے یا ٹی وی ڈراموں میں۔

سجل علی نے مزید کہا کہ "فلم کی کامیابی یا ناکام ہونا کسی کے اختیار میں نہیں (لیکن کامیابی ہو تو اس کا کریڈٹ ہر کوئی لینا چاہتا ہے) مگر ایک بات جو خاص ہے کہ ہماری فلموں کے معیار میں بہتری آئی ہے (ہیں...... بہتری......مثلاً......؟ کیا......بھئی بہتری اور کیا......؟)۔

بولی ووڈ کے حوالے سے سجل نے کہا کہ بولی ووڈ میں فلم سازی کا اپنا کلچر ہے جس کے مطابق وہاں کام کرنے والی اداکارائیں اپنے سین عکس بند کرواتی ہیں جب کہ مجھے ایسے کردار کرنے کا کوئی شوق نہیں جس سے میرے کام کو پسند کرنے والے میرے ناظرین مجھ سے ناراض ہوں۔ میں شوبز سے وابستہ ضرور ہوں مگر مجھے اپنی حدود کا پوری طرح احساس ہے (آہم!) اسی لیے میں ایسی کسی آفر کو قبول نہیں کروں گی جو میرے مزاج کے خلاف ہو۔ (سجل سوچ تو اچھی ہے مگر آفر ملنے کے بعد [illegible] اکثر [illegible]...؟)

جذبہ

گزشتہ دنوں میرا نے کراچی میں ذہنی معذور بچوں کے ادارے دارالسکون کا دورہ کیا اور بچوں کے ساتھ گھل مل گئیں۔ وہاں انہوں نے کہا کہ "دارالسکون میں ذہنی معذور بچوں کو دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا مگر مجھے یہاں سے بھی

ایک جذبہ اور حوصلہ ملا کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان بچوں کے لیے بھی وقت نکالنا چاہیے، کیوں کہ انہیں پیار کی اشد ضرورت ہے (تو میرا اگلا دورہ کب کررہی ہیں یہاں کا؟)۔

میرا کا کہنا تھا کہ وہ پاکستانی فلم ڈائریکٹر کو یہ بات باور کرائیں گی کہ ان ذہنی معذور بچوں کو اپنی فلم کی کہانیوں کا موضوع بنا کر ان پر فلمیں بنائی جائیں تاکہ ان کے مسائل کو اجاگر کیا جاسکے (تو میرا! شروعات آپ ہی کیوں نہیں کر دیتیں؟)۔

میرا نے مزید کہا کہ کچھ عرصہ قبل انہوں نے ایک اسپتال بنانے کا اعلان کیا تھا جس کے پیچھے دکھی لوگوں کی خدمت کرنا تھا اور انہوں نے پنجاب حکومت سے



درخواست کی تھی کہ انہیں زمین مہیا کی جائے مگر اب تک انہیں زمین مہیا نہیں کی گئی۔"

اِدھر اُدھر سے

☆ بہاول نگر میں 29 ستمبر 2008ء کو قرآن پاک کی بے حرمتی کرنے کے الزام میں ایک شخص کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ایک گونگے بہرے شخص نے امام مسجد کو اشاروں سے بتایا تھا، امام مسجد نے معاملہ پنچایت میں رکھا جہاں ملزم کو مارا پیٹا گیا اور پھر پولیس کے حوالے کردیا۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن نے 2009ء میں عمر قید کی سزا سنادی۔ لاہور ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ برقرار رکھا پھر عدالت عظمیٰ نے گونگے بہرے شخص کی گواہی کو ناکافی قرار دیا اور اس کو رہا کردیا۔

لیکن یہ رہائی 9 سال بعد ہوئی اس پر جو تشدد ہوا اس کے 9 سال جو قید میں گزرے۔ اس کے گھر والوں اور عزیز و اقارب پر کیا گزری ہوگی، جو لعنت ملامت انہوں نے سہی اس کا حساب کون دے گا؟

(روزنامہ جسارت)

آپ کا باورچی خانہ

فردوس نصیب

جب سے سائرہ رضا کا ناول ''سرسوں کا پھول'' پڑھا تب سے اس سلسلے میں شرکت کرنے کی ٹھان لی۔ تو جوابات حاضر ہیں۔

س: کھانا بناتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں ؟

ج: کھانا بناتے وقت کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔ سب کی سب چیزیں بنتی ہیں۔ ہاں بنانے سے پہلے پوچھ لیا جاتا ہے سب سے ''آج کیا بنانا ہے''۔ زیادہ تر جواب ''جو مرضی'' کی صورت میں ملتا ہے۔ ویسے بھی فیملی ممبر بہت کم ہیں۔ صرف پانچ اور ان میں سے بھائی بھی اکثر مختلف شہروں میں جاتا رہتا ہے۔

س: کھانے کا وقت ہے، گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب جو فوراً بن سکے ؟

ج: مہمان اچانک آنے کا رواج تو سچ میں ختم ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ شاید موبائل فون ہیں۔ جو کہ آج کل غریب سے غریب گھر میں بھی موجود ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے تقریباً زیادہ تر رشتہ دار یہیں رہتے ہیں۔ ایک تایا، دو عدد چچا اور ایک خالہ جو چچی بھی ہیں۔ باقی ماموں اور خالہ ہیں تو وہ بتا کر ہی آتے ہیں۔ ایک پھوپھو ہیں تو وہ تایا کے گھر ٹھہرتی ہیں۔ اور کبھی خاص انتظام نہیں ہوا ان رشتہ داروں کے آنے پر۔ جو ہم کھاتے ہیں' وہ ان کو کھلا دیتے ہیں۔ نہ کبھی میٹھے کا اہتمام نہ گوشت۔ ہاں اگر دعوت کرنی ہو کسی شادی شدہ جوڑے کی تو وہی عام سی ڈشز جن میں قورمہ، بریانی وغیرہ شامل ہیں، بنائی جاتی ہیں۔ اور میٹھے میں سویاں وغیرہ۔ میرے پاس ایسی کوئی خاص ڈش نہیں بتانے کو مگر ایک ہلکی پھلکی سی ڈش بتاتی ہوں، چند منٹ میں تیار ہوگی اور یہ خالصتاً ہماری اپنی ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ۔

آلو مسالہ

بنانے کی ترکیب: ''مسالا وغیرہ۔ مثلاً پیاز، ادرک، لہسن، ہری مرچ جیسے سبزی بنانے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ویسے تیار کرلیں، چاہیں تو باریک باریک کر کے آلو بھی ڈال لیں جو بھوننے کے دوران پک جائیں۔ گھی میں پیاز وغیرہ ڈال کر بھون کر آلو بھی بھون لیں۔ پھر جناب اس میں دہی ڈال دیں۔ (نمک مرچ ڈال کر) اور چند منٹ پکائیں۔ مزیدار سی ڈش تیار ہے جو پراٹھے سے کھانے کا بہت مزہ آتا ہے۔''

س: آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

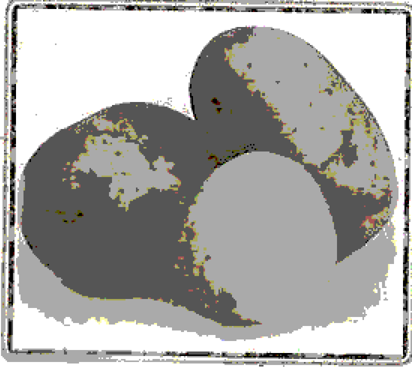
ج: میرا تعلق ایک غریب سے گھرانے سے ہے اور شہر بھی بہت بڑا نہیں اس وجہ سے ہوٹلز وغیرہ میں بھی کھانا نہیں کھایا۔ ہاں ایک دفعہ فیصل آباد سے آگے خالہ کے پاس جا رہے تھے۔ فیصل آباد میں بھوک لگی تو وہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔

س: صبح ناشتے میں کیا بناتی ہیں۔ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں؟

ج: ناشتے میں اہتمام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس رات کے سالن کے ساتھ روٹی یا پراٹھا یا پھر روٹی کو دل نہ چاہے تو چائے کے ساتھ کوئی چیز کھالی جاتی ہے یا ایک چھوٹی سی ترکیب، چائے بنائیں۔ ساری پتی کو الگ کرلیں۔ اس میں سویاں ڈال دیں، گرما گرم ہی کھائیں۔ چائے اور سویاں دونوں کا مزہ مل جائے گا۔

س: کچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج: کچن......؟ ناں جی ناں، ہمارے گھر میں کچن نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ گھر میں بس دو کمرے ہیں۔ دونوں میں سویا جاتا ہے۔ سردیوں میں ایک کمرہ کھانا پکانے کے لیے استعمال ہو جاتا ہے اور گرمیوں میں گیس والا چولہا اٹھا کر باہر صحن میں رکھ لیا



جاتا ہے۔ ہاں چولہے کی صفائی ہفتے یا دو تین دن بعد ہوتی ہے۔ مسالوں والے ڈبے سب ہی ہفتے بعد صاف ہوتے ہیں۔

س: کھانا پکانے کے لیے آپ موسم کا خیال رکھتی ہیں ؟

ج: جی ہاں، موسم کو مدنظر رکھ کے ہی ڈشز بنائی جاتی ہیں۔ ڈشز دہراؤں تو وہی پرانے نام ہوں گے جو اکثر بہنیں لکھتی ہیں، اس وجہ سے چھوڑیں۔

س: اچھا کھانا بنانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں ؟

ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھا بنانے کے لیے محنت ضروری ہے۔ ورنہ کھانا تو ہر کوئی بنا لیتا ہے۔ مگر جتنی محنت کی جائے، اتنا ہی رنگ اچھا آئے گا، ذائقہ دار ہوگا۔

س: کچن کی کوئی آزمودہ ٹپ ؟

ج: ٹپ......کوئی خاص ٹپ نہیں معلوم، میں تو خود زبیدہ آپا سے ٹپس لیتی ہوں۔ لوگوں کو کیا دوں گی۔ ہاں ایک ناول میں ایک ٹپ پڑھی تھی کہ کمس سبزیاں بناتے وقت اگر گاجر پہلے ابال لی جائے تو اس طرح سبزی میٹھی نہیں بنتی۔

تو یہ تھے میرے جوابات، ہم غریبوں کے جوابات۔ امید کرتی ہوں میرے جوابات پسند آئیں گے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ورقی پراٹھے اور بھنا قیمہ

اجزاء:-

ورقی پراٹھے بنانے کے لیے:-

آٹا	ایک کپ
میدہ	چار کھانے کے چمچے
سوجی	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت
دودھ	آدھا کپ
پانی	حسب ضرورت

ترکیب:

تھوڑے سے نیم گرم دودھ میں سوجی بھگو دیں۔ اس کے بعد آٹا اور میدے کو چھان کر اس میں نمک شامل کریں۔ دودھ میں بھگوئی ہوئی سوجی دودھ کے ساتھ ڈالیں اور مکس کرنے کے بعد بقیہ دودھ شامل کرتے ہوئے تھوڑا سخت آٹا گوندھ لیں اور گیلے کپڑے سے ڈھانپ کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گندھے ہوئے آٹے کے پیڑے بنائیں۔ خشک آٹا لگاتے ہوئے اسے بیلیں تھوڑا گھی لگا کر فولڈ کریں اور دوبارہ بیلیں۔ اس طرح چار پانچ مرتبہ تھوڑا تھوڑا گھی لگاتے ہوئے پیڑوں کو بیلیں آخر میں گول پراٹھے بیل کر دونوں طرف سے سنہری ہونے تک گرم توے پہ گھی لگاتے ہوئے سینک لیں مزے دار خستہ کرارے ورقی پراٹھے تیار ہیں۔ گرم گرم پیش کریں۔

بھنا ہوا قیمہ

ضروری اشیاء:

قیمہ	ایک پاؤ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	دو عدد
ٹماٹر (چوپ کرلیں)	ایک عدد
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
نمک، سفید مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

تیل گرم کر کے اس میں قیمہ ڈال کر ایک منٹ تک بھونیں کریں۔ اس کے بعد اس میں پیا ہوا لہسن، ادرک —— ہری مرچیں، ٹماٹر، نمک، سفید مرچ پاؤڈر اور سرکہ ڈال کر پانچ منٹ تک درمیانی آنچ پر بھونیں اور ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں۔ ہرا دھنیا ڈال کر سرونگ ڈش میں نکالیں اور ورقی پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔

کریمی چکن کافتا کباب

ضروری اشیاء:

چکن کا قیمہ	آدھا کلو
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز (چورا کی ہوئی)	آدھا کپ
گرم مسالا پاؤدر	ایک چائے کا چمچہ
فریش کریم	چوتھائی کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

چکن کا قیمہ، سرخ مرچ پاؤڈر، براؤن پیاز، گرم مسالا پاؤڈر اور نمک باریک پیس لیں، قیمے کا آمیزہ پیالے میں نکال کر فریش کریم ڈال کر مکس کر دیں اور ایک گھنٹے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ قیمے کے آمیزے سے چھوٹے سائز کے کافتا

کباب بنالیں۔ توے یا فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے کباب ڈال کر تل لیں، سنہری ہو جائیں تو سرونگ پلیٹ میں نکال کر حسب پسند چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

چکن برگر

ضروری اشیاء:

مرغی کا گوشت	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچیں (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
بریڈ سلائس	دو عدد
انڈا	ایک عدد
چلی سوس	ایک عدد
چیڈر چیز	دو کھانے کے چمچے (کدوکش کی ہوئی)
چیز (سلائس)	حسب ضرورت
سلاد کے پتے	حسب ضرورت
برگر بن	حسب ضرورت
مایونیز	حسب پسند

ترکیب:

قیمہ دھو کر چھلنی میں رکھ دیں تاکہ پانی نکل جائے۔ قیمہ اور بریڈ سلائس پیس لیں اور پیالے میں نکال کر اس میں نمک، کٹی ہوئی سیاہ مرچیں، کارن فلور، انڈا، چلی سوس چیڈر چیز ڈال کر اچھی طرح ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ قیمہ کے آمیزے کے کباب بنالیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کر کے کباب تل لیں۔ سنہرے ہو جائیں تو نکال کر کاغذ پر رکھیں۔ گرم توے پر برگر بن کو ہلکا سا سینک لیں۔ ایک حصے پر مایونیز لگا کر اس پر سلاد کا پتہ، چیز سلائس اور کباب رکھ کر اوپر سے دوسرا حصہ رکھ دیں اور گرم گرم پیش کریں۔

خوبانی کا میٹھا

اجزاء:-

دودھ	آدھا لیٹر
چینی	تین چمچ کھانے کے
خوبانی	ایک پاؤ
ونیلا کسٹرڈ	تین کھانے کے چمچ

ترکیب:-

خشک خوبانی صاف کر کے رات کو بھگو دیں، صبح کو گٹھلی نکال کر ڈیڑھ گلاس پانی ڈال کر ابال لیں جب خوبانیاں خوب گل جائیں تو اسے ٹھنڈا کر لیں۔ خوبانی کی گٹھلیاں توڑ کر گری نکال لیں۔ دودھ کو ابال کر اس میں چینی ڈال دیں، اب آدھا پیالی ٹھنڈا دودھ لے کر اس میں کسٹرڈ گھولیں اب آنچ ہلکی کر کے ابلتے ہوئے دودھ میں چمچ چلاتے ہوئے کسٹرڈ ڈالتی جائیں۔ چند منٹ کے بعد چولہے سے اتار کر ایک ڈش میں نکال لیں، اس کے اوپر خوبانی کا میٹھا ڈالیں پھر اس کے اوپر خوبانی کے اندر کے بیج چھیل کر سجا دیں، مزے دار خوبانی کا میٹھا تیار ہے۔

ٹماٹو رائس

ٹماٹو پیوری	ایک کپ
چاول باسمتی	ایک کپ
ثابت بڑی الائچی	ایک عدد
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
گھی	ایک چائے کا چمچ
پانی	دو کپ
نمک	حسب ذائقہ

ایک بڑے پین میں گھی گرم [illegible] اس میں بڑی الائچی ڈال دیں [illegible] ٹماٹو شامل کریں پھر تمام مسالے [illegible] کے تھوڑی دیر پکائیں پھر چاول [illegible] ڈالیں اور پک جانے پر گرم گرم پیش [illegible]

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

عدنان

ص…… خان پور

س: میری امی تسلط پسند طبیعت کی مالک خاتون ہیں، ہر بات، ہر کام ان سے پوچھ کر کرو۔ ویسے تو میں ٹھیک رہتی ہوں لیکن کبھی کبھی بہت غصہ آتا ہے، تو ان سے لڑتی بھی ہوں خوب، پھر میری امی اور بھائی مجھے مارتے ہیں۔ پھر میں ماں اور باپ کو گالیاں دیتی ہوں۔ میرا باپ پولیس میں ہے لیکن اس نے کبھی آج تک مجھے پیار نہیں کیا، نہ کبھی پیار سے بلایا ہے۔ ہمیشہ میری ماں اور بھائیوں کو صحیح کہا اور مجھے غلط۔ آپ بتائیں، کوئی بندہ ہمیشہ غلط کیسے ہوسکتا ہے۔ میں گھر میں سب سے بڑی ہوں لیکن میری ماں اور باپ نے کبھی میری کسی بات کو صحیح نہیں کہا۔ اس لیے مجھے اپنے ماں باپ دونوں سے نفرت ہوگئی ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے میری منگنی کردی ہے، میری خالہ کے گھر یعنی امی کے بھانجے کے ساتھ۔ میں اس منگنی سے خوش نہیں ہوں۔ میں سوچتی ہوں جس طرح کی امی ہیں اسی طرح کا ان کا بھانجا ہوگا۔ ایک بات میں بتادوں کہ میں صحیح نہیں چلتی، پنجوں کے بل چلتی ہوں۔ ایڑیوں پر دباؤ نہیں ڈالتی۔ اب آپ بتائیں اسے انکار کردوں؟ اور میرا ایک شوق بھی تھا پڑھا لکھا، نوکری والا بندہ ہو یعنی نوکری کرتا ہو، ویسے خود میں نے جھوٹ موٹ کا بی ایس سی کیا ہوا ہے، اصل میں ایک مضمون میں پاس نہیں ہوئی، چانسز ختم ہوگئے۔ ویسے سب خاندان کے لوگوں کو یہ ہی بتایا ہے کہ بی ایس سی پاس کرلیا ہے، آپ بتائیں کیا انکار کردوں؟

ج: اچھی بہن! آپ نے اپنی عمر نہیں لکھی لیکن تحریر سے لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت میں ابھی بہت بچپنا ہے۔ آپ کی پہلی شکایت کہ امی کہتی ہیں کہ ہر کام ان سے پوچھ کر کرو، تو آپ یہ بتائیں کہ اس میں آپ کو غصہ کیوں آتا ہے۔ وہ آپ کی ماں ہیں، آپ ان سے لڑتی ہیں، زبان چلاتی ہیں تو یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے اور ماں باپ کو گالیاں دینا اس سے بری بات تو اولاد کے لیے ہو ہی نہیں سکتی۔ والدین کو تو اُف بھی نہیں کہنا چاہیے، ان پر محبت بھری ایک نظر ڈالنے کا بھی ثواب ہے۔

آپ کے والد بھی اسی لیے آپ کے سر پر پیار سے ہاتھ نہیں رکھتے، آپ کے والد پولیس میں جاب کرتے ہیں، ممکن ہے ان کی ڈیوٹی سخت ہو، وہ تھکے ہارے گھر آئیں اور گھر میں آپ کو ماں اور بھائی سے لڑتے، ان کی شکائتیں کرتے دیکھیں تو کیا وہ آپ کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھیں گے؟ اس کے برعکس اگر آپ ان کو پانی کا گلاس لاکر دیں، ان سے چائے کا پوچھیں تو وہ آپ کو پیار کی نظر سے ضرور دیکھیں گے۔

آپ کی والدہ نے اپنے بھانجے سے آپ کی منگنی کی ہے، آپ کی یہ سوچ بالکل غلط ہے کہ وہ آپ کی والدہ کا بھانجا ہے تو وہ آپ کی والدہ جیسا ہوگا۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اس کا مزاج آپ کی والدہ جیسا ہو، ہر شخص کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اپنے حالات ہوتے ہیں جن کے تحت اس کا مزاج بنتا ہے، آپ بھی تو اپنی ماں جیسی نہیں ہیں۔

آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کا خالہ زاد کیا کرتا ہے، آپ پڑھا لکھا، نوکری پیشہ شخص چاہتی ہیں…… لیکن ضروری نہیں کہ ہر خواہش پوری ہوجائے۔ والدین اولاد کی بھلائی چاہتے ہیں، آپ کی والدہ نے کچھ سوچ کر رشتہ قبول کیا ہے، اگر آپ اپنی خالہ کے بیٹے کو پسند نہیں کرتیں تو آپ ان سے سنجیدگی سے بات کریں، ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ بات ہو کہ بھانجے سے بہتر رشتہ ملنا مشکل ہوگا۔

آپ ہر پہلو سے اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کریں، ضد میں یا لڑ جھگڑ کر نہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر بات یہ ہے کہ اپنے مزاج میں تبدیلی لائیں۔ والدین کا احترام کریں، ان کے حکم کی تعمیل کریں، جو آپ کی موجودہ عادتیں ہیں وہ آپ کو آئندہ زندگی میں بھی نقصان پہنچائیں گی۔

زینب…… بھلوال

س: بہت مجبور ہوکر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میری عمر اس وقت سولہ سال ہے، چار سال پہلے جب میں گیارہ سال کی تھی تو باپ مجھے اور میری ماں کو اکیلا چھوڑ گئے۔ وہ کراچی میں کام کی تلاش میں گئے نشانہ بن گئے۔ امی کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ کفن دفن کا انتظام ہوسکتا۔ سب انتظام چھوٹے بھائی تھے، نانا نانی کا انتقال ہوچکا تھا۔ امی کا بھائی کوئی نہیں تھا، ایک بڑی بہن تھیں جو دوسر تھیں۔ چچا اور خالہ تین دن تک ہمارے ساتھ رہے۔

تین دن بعد یہ سوال اٹھا کہ ہم ماں بیٹی کا کیا ہوگا، گھر کرائے کا تھا۔ چچا کا کہنا تھا کہ ہم ان کے ساتھ چلیں، جو ان کو میسر ہے وہ ہمارے لیے بھی حاضر ہے۔ امی انہیں انکار کرتیں تو کہاں جاتیں پھر بھی انہوں نے عدت تک اپنے گھر میں رہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چچا خاموش ہوگئے، گھر کا کرایہ بڑا مسئلہ تھا لیکن مالک مکان شریف آدمی تھا، اس نے کہا کہ وہ چار ماہ کرایہ نہیں لے گا۔ اس طرح کرایہ کا مسئلہ تو حل ہوگیا، گھر کے خرچ کے لیے کچھ پیسے خالہ نے دیے اور کچھ چچا نے۔

عدت کے بعد ہم چچا کے گھر شفٹ ہوگئے، میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ چچا ہر ممکن حد تک ہمارا خیال رکھتے، وہ بھی زیادہ خوش حال نہ تھے، تنگی ترشی میں گزر بسر ہورہی تھی۔ چچی کو ایک پل کے لیے بھی ہمارا وجود گوارا نہ تھا، امی گھر کا سارا کام کرتیں تاکہ چچی ان سے خوش رہیں لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے سے جھگڑا نکال لیتیں۔ امی سلائی کا کام جانتی تھیں، وہ اجرت پر کپڑے سی کر میرے تعلیمی اخراجات پوری کرتیں یوں میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ تین سال اسی طرح گزر گئے ہیں، نویں کلاس میں آگئی۔ اب چچی نے امی پر فضول قسم کے الزامات بھی لگانے شروع کردیے۔ چچا شہر سے باہر مال لینے گئے تو چچی نے امی سے خوب لڑائی کی۔ اپنے بہن بھائیوں کو بھی بلالیا اور ہمیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ امی مجھے لے کر خالہ کے گھر آگئیں۔

خالہ بے چاری خود غربت کی ماری ہوئی تھیں پھر بھی انہوں نے ہمیں تسلی دی۔ ان کا گھر چھوٹا تھا لیکن دل بڑا تھا۔ ایک مہینہ گزر گیا، اب خالو کی نظریں بدل رہی تھیں۔ امی پر ان کا غیر معمولی التفات بڑھتا جارہا تھا، خالہ بھی سب سمجھ رہی تھیں۔ امی دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں، انہیں میری فکر تھی لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہی تھیں کہ یہاں ان کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ بالآخر وہ دوسری شادی کے لیے راضی ہوگئیں۔ خالہ نے ہی رشتہ تلاش کیا۔ وہ کافی عمر رسیدہ تھے ان کا ایک جوان بیٹا تھا، بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ گھر بسانے کے لیے شادی کرنا چاہتے تھے۔ انہیں میرے ساتھ رہنے پر بھی اعتراض نہیں تھا۔ سادگی سے نکاح ہوا، امی رخصت ہوکر ان کے گھر آگئیں۔ ان کا بیٹا گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں شفٹ ہوگیا، اس کا کہنا تھا وہ اپنی ماں کی جگہ کسی اور کو لیتے نہیں دیکھ سکتا۔

میں نے دوبارہ اسکول میں داخلہ لے لیا لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ میرے سوتیلے والد کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں رشتوں کے تقدس کا بالکل احساس نہیں ہے، ان کی چبھتی نظریں، بہانے بہانے سے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنا، گلے لگانا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ ایک بار انہوں نے اس سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی، امی انہیں خوش رکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے ایک دن انہیں صاف صاف سب کچھ بتادیا تو وہ رونے لگیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ چھت ان سے چھن جائے۔ انہوں نے کہا کہ میں تھوڑا صبر کروں، ایک دو سال بعد وہ میری شادی کردیں گی لیکن آپ ہی بتائیے معمولی شکل و صورت معمولی تعلیم اور جہیز کے بغیر کون میرے لیے رشتہ لے کر آئے گا؟

ج: جو حالات آپ نے لکھے ہیں، انہیں پڑھ کر میں تھرا گیا ہوں۔ ایسے نفس پرست شیطان بھی دنیا میں بستے ہیں جنہیں رشتوں کے تقدس کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ آپ کی والدہ بھی مجبور ہیں، وہ دنیا کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، اس لیے آپ کو خود ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اس وقت آپ نویں کلاس میں ہیں، ایک سال جیسے تیسے گزار لیں۔ میٹرک کے بعد نرسنگ کا کورس کرلیجیے گا، نرسوں کی رہائش کے لیے ہاسٹل ہوتے ہیں، وہاں آپ کی رہائش کا بھی انتظام ہوسکتا ہے۔ نرسنگ کا کورس مکمل ہونے کے بعد جاب بھی مل سکتی ہے، اس دوران ممکن ہے کہ کہیں آپ کا رشتہ طے ہوجائے اور آپ کی شادی ہوجائے تو آپ کو تحفظ مل جائے گا۔

رشتے تعلیم، صورت اور جہیز سے نہیں ہوتے، قسمت سے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھیں اور دعا کرتی رہیں، وہ کوئی راستہ آپ کے لیے ضرور نکالے گا، ان شاء اللہ۔

بیوٹی بکس

امت الصبور

شاہین...... بھلوال

آپی! میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں پارلر کی سہولت نہیں۔ میں نے پڑھا ہے کہ فیشل سے جلد میں چمک اور شادابی آجاتی ہے۔ مجھے اس کا طریقہ بتادیں ایک ماہ بعد میری شادی ہے۔ مجھے شادی سے کتنے دن پہلے فیشل کرنا چاہیے؟

ج: اچھی بہن! آپ کو شادی کی مبارک باد۔ یہ درست ہے کہ فیشل جلد کو صاف کرتا ہے۔ یہ ہر طرح کی جلد کے لیے فائدہ مند ہے۔ بشرطیکہ اسے نرمی سے کیا جائے۔ اس سے میک اپ بھی چہرے پر دیر تک قائم رہتا ہے۔ فیشل شادی سے ایک دن پہلے کرنا چاہیے۔

گردن اور چہرے پر نقطوں کی شکل میں کلینزنگ کریم لگائیں۔ اس کو اچھی طرح جلد میں جذب کرلیں۔ تولیہ کو نیم گرم پانی میں ڈبو کر نچوڑ لیں۔ اب اس گرم تولیہ سے رگڑ کر کریم کو اچھی طرح صاف کرلیں۔ اس سے آپ کی جلد صاف ہوجائے۔ اب اس پر کوئی کولڈ کریم لگالیں۔ اب فیشل کے لیے درج ہدایات پر عمل کریں۔

(1) مساج کا آغاز گردن سے کریں۔ دونوں ہاتھوں سے باری باری مساج کریں؛ دونوں ہاتھوں کی حرکت کی سمت جبڑے کے نچلے حصے اور گالوں کی طرف ہونا چاہیے۔ جہاں ہنسنے کی وجہ سے لکیریں بن جاتی ہیں۔ وہاں سے مساج کا عمل شروع کریں۔ ناک سے اوپر کی طرف جائیں لیکن آنکھوں کے نیچے ہاتھ کا دباؤ ہلکا رکھیں۔ پھر ٹھوڑی سے شروع کریں اور دونوں ہاتھوں سے اوپر کی طرف حرکت دیتے ہوئے مساج کریں۔ پھر ناک کے اوپر سے نیچے کی طرف مساج کریں۔ ناک کے دائیں اور بائیں جانب بھی یہی عمل کریں۔

اس کے بعد چہرے پر ماسک لگائیں۔

انڈے کا ماسک بہترین ہے اسے ہر قسم کی جلد پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ایک انڈہ لیں۔ اس کی سفیدی الگ کرکے اسے اچھی طرح پھینٹ لیں پھر اس میں ایک چمچہ لیموں کا رس اور ایک چمچہ شہد ملالیں۔ پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیں پھر اچھی طرح چہرہ دھولیں۔

یہ تو شادی سے ایک دن پہلے کی تیاری ہے۔ اب شادی والے دن میک اپ سے ایک گھنٹہ پہلے آپ آلو یا کھیرے کے باریک قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں، اس سے آنکھوں کے حلقے فوری دور ہوجائیں گے۔

طاہرہ خان...... چونیاں

میرے دانتوں کا رنگ پیلا ہے۔ کیا یہ سفید ہوسکتے ہیں؟ میں کئی قسم کے ٹوتھ پیسٹ استعمال کرچکی ہوں۔ دن میں دوبار برش کرتی ہوں لیکن دانت صاف نظر نہیں آتے؟

ج:۔ اگر آپ ڈینٹسٹ کے پاس جاسکتی ہیں تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ دانتوں پر ڈینٹسٹ سے پالش کرالی جائے اس سے دانت صاف اور چمک دار ہوجاتے ہیں اگر آپ کے لیے پالش کرنا ممکن نہیں تو درج ذیل گھریلو نسخہ پر عمل کریں۔

کھانے کا میٹھا سوڈا	ایک چمچہ
نمک	ایک چمچہ
لیموں کا رس	ایک چمچہ

ان کو ملا کر محلول بنالیں اور سونے سے پہلے دانت برش کرکے اسے دانتوں پر لگائیں۔ پھر کلی نہ کریں سو جائیں۔ دانت موتی کی طرح سفید ہوجائیں گے۔

سعدیہ ناصر...... کراچی

میں لپ اسٹک خریدنا چاہتی ہوں لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ چہرے کی رنگت کے حساب سے کون سا رنگ میرے لیے مناسب ہوگا۔ لپ اسٹک کا انتخاب کیسے کیا جائے؟

ج: لپ اسٹک میک اپ کا نہایت اہم جزو ہے۔ سلیقہ سے میک اپ کیا ہو لیکن لپ اسٹک کا انتخاب درست نہ ہو تو چہرہ خوب صورت نہیں لگتا۔ لپ اسٹک کے ڈھیر سارے رنگوں میں سے کون سا رنگ آپ کے لیے مناسب ہے اس کے لیے ایک چھوٹا سا ٹیسٹ ہے۔

اپنے ہاتھ کو سیدھا رکھیں اور انگلی کی پوروں پر لپ اسٹک لگائیں۔ انگلی کی پوریں رنگت میں ہونٹوں کے قریب ہوتی ہیں۔ جو رنگ آپ کی پوروں پر اچھا لگے۔ وہی رنگ آپ کے چہرے اور رنگت کے لیے مناسب رہے گا۔ آپ لپ اسٹک دو رنگ ملا کر بھی استعمال کرسکتی ہیں